

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2013

نگران اعلیٰ
معراج رحمت



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انشائیہ

جون ایلینا

سیلاب کی تباہ کاریوں پر
ایک صاحب فکر کا نوحہ الم

یار وفادار

الیاس سیتا پوری

ماضی کا آئینہ اختیار اور اختیار انسانوں
کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

کشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تحریر کے پردے میں
لپٹا ایک منفرد و طویل سلسلہ

نیلا جھوٹ

ملک صفدر حیات

ملک صاحب کی ڈائری سے ایک اور
سبق آموز اور ناقابل فراموش واقعہ

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سپنس کی مجلس شاورت قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں گلے شکوے اور پر خلوص مشورے

زر و لہو

کاشف زبیر

پردیس کی فضا..... جذبات کا طوفان
اور وحشتوں کی منزل کا احوال

صابن کی چوری

نجمہ مودی

ہاتھوں سے پھسلنے والے صابن اور
قدیم قدم پر سنبھلنے والے چور کا ماجرا

بہروپ

ساحر جمیل سید

ظاہر اور باطن کے درمیان ایک فیصلہ کن
جنگ اور..... دنیا کی حیرانی

محفل شعر و سخن

قارئین

آپ کے ہاتھوں نئی ایک نئی نئی نئی
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

مسافر

ناصر ملک

گل گلزار سے راہ چننا تک ایک
مسافر بے نوا کی روداد حیات

وبال جان

سلیم انور

وقت کی تقسیم کا ہنر سیکھنے والے
ایک جوڑے کی دلچسپ کہانی

دشمن جاں

مریم کے خان

دل میں گھر کرنے والے
جانی دشمنوں کی الجھنوں کا ماحبرا

احسان

تنویر ریاض

ایک بددیانت محسن اور ایماندار احسان
مسند کے درمیان معرکہ آرائی

مبارکباد

منظر امام

جھوٹے گواہ گھر تک پہنچانے
اور سچ کو پہچاننے کا ایک کامیاب طریقہ

میان مین والا پیر

ضیاء تنسیم بلگرامی

حیران کن واقعات پر مشتمل اللہ
کے ایک برگزیدہ بندے کا زندگی نامہ

چشم دید گواہ

احمد اقبال

حسن کی سلطنت میں عشق کی رفاقتوں
اور رقیب کی رفاقتوں کا لرزہ خیز احوال

ہر قسم کے ناول، مامانڈا، ٹیسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران میر نے
آئیڈیل پبلک لائبریری نئی دہلی کو کرایہ
0334-9630911 0334-9630911

جون ايليا

2/7



اکتوبر 2013ء کا شمارہ آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اور ملکی صورت حال بھی ہم سب کی نظر میں ہے۔ امن و امان کے فقدان کی وجہ سے تاجر رفتہ رفتہ اپنا سرمایہ بہ حالت مجبوری بیرون ملک منتقل کر رہے ہیں۔ نئے وزیر اعظم نے اپنا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطاب میں انتخابی مہم کے بنیادی نکات دہرائے جن میں تین نکات عوامی مفاد سے وابستہ تھے یعنی دہشت گردی پر قابو، لوڈشیڈنگ کا خاتمہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کی روک تھام۔ مگر افسوس..... انتخابی مہم کے وہ نکات انتخابی مہم کے نعروں تک ہی محدود رہ گئے اور پچھلے دنوں کمال فراخ دلی سے قیمتوں میں اضافے کی منظوری دے کر جس طرح عوام پر "پیٹرول بم" گرایا ہے اسی سے عوام سے ہمدردی کا "اظہار" واضح طور پر ہو رہا ہے۔ آئی ایم ایف نے پاکستان کو 6.7 ارب ڈالر قرضے کی منظوری دے دی مگر..... پاکستان کی معاشی حالت میں بہتری کی ضمانت کہاں سے اور کون دے گا..... کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری جانب اپنی آنکھیں پوری کر کے صدر آصف علی زرداری خوشگوار موڈ میں رخصت ہوئے اور نئے صدر جناب ممنون حسین نے اپنی جگہ سنبھال لی..... اب دیکھنا یہ ہے کہ چہروں کے بدلنے کے ساتھ ساتھ نظام میں درست بدلاؤ کی بھی کوئی روایت ڈالنا ہے یا نہیں۔ گزشتہ ماہ کی 8 تاریخ کو یوم خواندگی کے حوالے سے عالمی دن منایا گیا مگر افسوس کہ اس دن کو فخریہ طور پر منانے کے لیے پاکستان میں تعلیمی نظام کی درستگی کے لیے کوئی نمایاں اقدامات نظر نہیں آتے..... پاکستان میں خواندگی کی شرح کچھ یوں ہے کہ ہر پانچواں بچہ تعلیم سے محروم ہے۔ غربت، بے روزگاری کی وجہ سے بچے تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ سرکاری سطح پر تعلیم کا نظام مذاق اور پرائیویٹ سیکٹر میں ایک بہترین کاروبار ہے۔ جبکہ عوام کے نزدیک تعلیمی معیار ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا ہے حالانکہ پاکستان میں بے روزگاری کی شرح اس خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے کہ پچھلے دنوں ایک شخص نے قاتلوں سے تنگ آکر اپنے دو معصوم بچوں کو قتل کر ڈالا..... اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے۔ کراچی جو پاکستان کا دل ہے..... آج اسی دل میں مافی افضا قائم ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ ہمارے ملک کو اپنی حفاظت میں رکھے اور حکمرانوں کو عوام کا ہمدرد و قادر بنادے (آمین)

ان مسائل سے گھبرا کر ہماری محفل ہمیں اس وقت ایک خوشگوار مجموعے کی طرح محسوس ہو رہی ہے جہاں بہت سے محبت نامے ہمارے منتظر ہیں۔

✽ مہرین ناز، حیدرآباد سے محفل میں تبصرہ کے ساتھ جلوہ گر ہیں "ستمبر 2013ء کا شمارہ۔ بدلتے موسم اور عید کے جیتے ہوئے خوشگوار لمحات کا احساس لیے، میرے ہاتھ میں آیا تو سرورق پر حسین چہرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جون ایلیا صاحب کی باتیں ہمیشہ دل پر اثر کرتی ہیں۔ خطوط کی محفل شروع ہی سے میری پسندیدہ رہی ہے۔ محمد خواجہ صاحب کا تبصرہ یا مقصد اور دل کو چھو لینے والا ہے، صمدارت مبارک۔ زویا اعجاز جی آپ کی سوچ اچھی ہے جو آپ کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ محمد صمد صاحب اینڈ قیصر اعوان صاحب آپ دونوں کے تبصرے زبردست ہیں۔ برادر بار عباس آپ کے تبصروں کا کیا کہنا، ہمایوں سعید آپ نے اپنے خطوں کے ذریعے دشمنیاں پال لی ہیں، اللہ خیر کرے۔ محمد یحیٰی آپ اپنے ہم عمر دوستوں کو انگل نہ کیا کریں۔ قیصر اقبال کچی جی، آپ دل بڑا اور نظر وسیع کر لیں۔ یہ ضروری ہے آپ کے لیے۔ اس بار دو لکھتے "کستوری لگا کے" اور "جگائی" محفل میں تو کیا بلک لٹ میں نظر نہیں آئے، خیر تو ہے.....؟ حبیب احمد، رانا حماد اینڈ قیصر گل آپ کے تبصرے دیکھ کر بے حد مسرت ہوں! برادر نیازی اینڈ انکل رمضان پاشا آپ کے تبصرے مثبت سوچ کے حامل ہوتے ہیں۔ ویکم بشری افضل جی! کہانیوں میں مسافر سب سے پہلے پڑھتی ہوں، اس بار شہرے اور گیت پر مشتمل اس قطعہ پر کسی فلم کا گمان ہو رہا تھا..... شاید شہر یار کی نظر اپنی بہن پروین پر پڑی ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید میرے پسندیدہ رائٹر ہیں وہ ہمیشہ اثر انگیز موضوع پر لکھتے ہیں جو حقیقت ہوتی ہے۔ ایک بوری مجھ کی دل پر اثر چھوڑ گئی۔ اشرف الاولیا نے روح سیراب کر دی۔ مصنفہ کم لکھتی ہیں مگر بہترین لکھتی ہیں۔ سہی حاصل مرزا امجد بیگ کی ایک اور فتح، اللہ پاک کی کواداد کی نعمت سے محروم نہ رکھے۔ سفینہ بدست بھی فیصل جیسے اچھے انسان کی قدر نہیں کی، اپنی بیٹی کو بھی کھو بیٹھی۔ طاہر جاوید محفل صاحب نے عقرب لوگوں کے لیے انکشاف کر کے نئی پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ بازوق قارئین کی عمدہ محفل شعر و سخن میں شائستہ، جنید احمد ملک، محمد واجد علی کچہ، رضوان خٹولی، رمضان پاشا کے اشعار پسند آئے۔ کتر نہیں بھی بہت معیاری ہیں، سہنس نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دل خوش کر دیا۔" (بہترین اور جامع تبصرہ کرنے کا شکریہ)

✽ احسان سحر، میانوالی سے تشریف لائے ہیں "گزری عید کی یاد تازہ کرتا، دلوں کی دھڑکن مندل کی طرح خوشبو والا سہنس صبح 9 بجے آنکھوں کی اسکرین پر نمودار ہوا..... ٹائٹل دیکھ کر سرزد ہو کر رہ گئے..... کول چہرہ..... دل کی شکل کے لب اور اس پر زلفوں کا جال، کوہ قاف کی پری ستاروں کے بیچ ستارہ لگ رہی تھیں۔ جون ایلیا کا انشاء یہ بیگ کی ہر لفظ میں موتی اور ہر لفظ میں کھراٹی تھی۔ محفل زعفران کی طرف قدم بڑھانے جس کی خوشبو ہر ماہ بے چین رکھتی ہے۔ اس ماہ پہلے نمبر پر جس نے صحیح طرح پھول کی خوشبو کو محسوس کیا اور اپنے انداز کا جاوہ جگا یا وہ تھے جناب محمد خواجہ صاحب اور مبارک ہو جناب۔ زویا جی جس سے پیار ہوا اس کے انتظار میں رہنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے کہ کرب میں بھی ایک لذت ہوتی ہے۔ بار صاحب! مبارک ہو آپ 70 کے ہو گئے۔ خون کا رشتہ..... جرم زدہ اور انہوں کی اپنایت سے ہماری شاہکار کہانی ثابت ہوئی۔ ایڈ نے خون کے رشتے کا حق ادا کر دیا۔ نئی

زندگی..... ایک بناوٹی اور بچوں جیسی تحریر ثابت ہوئی۔ امجد بیگ صاحب گھریلو ناچاقی کو سلجھاتے نظر آئے۔ شاہکار کہانیوں کے شاہکار تخلیق کار نے اس دفعہ شاہکار جھنڈ دے کر اگلے پچھلے گلے مٹا دیے۔ محبت کا ایک اور خوب صورت اور سحر انگیز انداز بیان کرنے والی تحریر نے کافی مسرور کیے رکھا۔ محبت ہوتی بھی کئی روپ میں ہے اور اس کا انجام بھی کئی روپوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ انوکھا انتقام تانیا کی گہری مہارت نے ریمکس کو خاک چٹائی۔ محفل شعر و سخن بھی اشعار پسند آئے..... مقابلہ..... دو محبت کرنے والوں کی حقیقی کہانی جن کے ایک ہاتھ میں موت اور دوسرے میں زندگی بند تھی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی محبت غریب لوگوں پر پھرا کر کرتے نظر آئے جو کہ آج کل کے لوگوں کو اس طرف کا دھیان ہی نہیں رہا کہ اس قسم کی محبت بھی ہوتی ہے۔ مریم کے خان بزدل کے ساتھ حاضر ہو گئیں وہی پیسے کا لالچ..... وہی دھوکا دہی..... شکوہ..... اس ماہ بھی ایف 16 کی طرح سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ تکمیل خواہش نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ محبت، رشتوں، جرم پر مبنی یہ کہانی کافی خوب صورت لگی، شہمت بیگ نے اپنی محبت کا حق ادا کیا۔ بہت کم لوگ زندگی میں ہی زندگی کا مقصد سمجھ پاتے ہیں۔ مسافر میں اس دفعہ قل اکیشن دیکھنے کو ملا شکر ہے میڈم سے جان چھوٹی ورنہ ہر قسط آدمی سے زیادہ میڈم کے ساتھ غرق ہو جاتی تھی۔"

✽ مظہر سلیم، رحیم یار خان سے محفل کی زینت بنے ہیں "ایک عرصہ گزر گیا سہنس کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی یکسانیت کا شکار نہیں ہوئے۔ ہر بار سہنس کو منفرد پایا۔ نئے نئے موضوعات پر لکھی گئی داستانوں کو منظر عام پر لانا سہنس کا طرہ امتیاز رہا ہے، معاشرے کی تلخ حقیقتوں، تاریخی داستانوں، اولیائے کرام کے مضمون سے عبارت ماہِ تبصر کا سہنس ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی حسین بڑے اٹھاک کے ساتھ کسی مظلوم الحال ستارہ بجاتے ہوئے گویے کی غزل سن رہی ہے۔ جون ایلیا صاحب اس مرتبہ بیگ کی کے ساتھ تشریف لائے اور ہر بار کی طرح ہماری سوچ کے درمیانے وا کر گئے۔ "آپ کے خط" میں موجودہ حالات کے تناظر میں لکھا گیا آپ کا ادارہ ارباب اختیار کے حوالے سے بہت کچھ لکھنے کو مجبور کر رہا ہے۔ لیکن ہم صرف اتنا کہیں گے اللہ پاک ان کے قلوب کو نرم کریں اور یہ عوام کے بارے میں کوئی مثبت لائحہ عمل ترتیب دیں۔ خطوط میں محمد خواجہ کرسی صمدارت پر براجمان نظر آئے، خواجہ جی مبارک باد قبول فرمائیے۔ دوسرے نمبر پر زویا اعجاز تشریف فرما تھیں، اب محترمہ کے قلم کی گرہیں کھل رہی ہیں اور وہ محفل کے شرکاء کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی ہیں جو اچھی پیش رفت ہے۔ قیصر اعوان صاحب تین ماہ بعد محفل میں دہناتے ہوئے آئے اور ناکام کامیابین کی طرح اسکرپٹ سے ہٹ کر بوتلیاں مارتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ہمایوں سعید صرف رمضان المبارک میں نامحرم خواتین کو نہیں دیکھتے باقی مہینوں میں تو نظروں ہی نظروں میں گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ بشری افضل صاحبہ جو مظہر سلیم قارئین بڑھنے کے لیے گئے تھے، وہ آپ کے شہر بہاولپور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ میں رحیم یار خان سے متعلق ہوں۔ رانا ششی حماد آپ کو بہت عرصہ ہو گیا ہے مٹی گیری کرتے ہوئے تاہم ڈھنگ کی بات بھی نہیں لگو سکے۔ کہانیوں میں مسافر سب سے پہلے پڑھی، معاشرے کی تلخ حقیقتوں کی عکاس اس داستان میں بھی برادران کا قصہ تمام ہوا۔ تکمیل خواہش میں شہمت بیگ نے محبت کی اٹھاکر دی۔ فیروز اور تبسم جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ رحیم یار خان کے کچے کے علاقہ میں سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی دیکھ بھال کے لیے اپنی ٹیم کے ساتھ مصروف رہا، وقت کی کمی کے باعث باقی رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین۔" (جزاک اللہ اس طرح کے کار خیر ہی انسان کی بخشش کا باعث بنتے ہیں)

✽ سیف علی اعوان، نور پور اعوانان سے تشریف لائے ہیں "اس سے پہلے بھی ایک عریضہ بھیجا ہے جسے آپ نے وینک لٹ میں ٹانک دیا (لیٹ ملا ہوگا یقیناً) بہر حال ہم تبصرے سہنس کے پرانے قاری، جب خطوط کی محفل میں در شہوار تبسم راجپوت (راجپوتانہ کی شہزادی) اور ٹرٹل ایس سٹریز کا طوطی بولتا تھا۔ پھر لکھنے کی جرات کر رہا ہوں (شاہباز) تبصر کے سہنس میں پہلی کہانی پر الیاس سیتا پوری کا نام دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور ہاں کیا لکھاری تاہم سلطانہ اختر صاحبہ سہنس میں ہم ان کی کہانی "زندہاں میں پھول" آج تک نہیں بھول سکے اور یہ نامر ملک صاحب تو بہت تیز جارہے ہیں۔ ملک صاحب سے کہیں کہ وہ کچھ ہاتھ ہلکا رکھیں۔ اعلیٰ علم صاحب بھی تو لکھتے تھے اتنا تیز تھو تو ان کی کہانی کا بھی نہ تھا۔ حالانکہ میری آج بھی رائے ہے کہ "موت کے سوداگر" دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں رکھی جاسکتی ہے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا کرے" (اعلیٰ علم صاحب ماشا اللہ صحت و تندرستی کے ساتھ حیات ہیں اور ادارے میں اہم ذمے داری نبھا رہے ہیں)

✽ بشری افضل، بہاولپور سے چلی آرہی ہیں "20 اگست کو سہنس ملا۔ ٹائٹل پر منصف نازک کی یاد آئی آنکھوں نے دل موہ لیا۔ انکل ذکر کرنے مخالف منصف کی سن لی اور کوئے کھدرے میں جگہ دے ہی دی۔ انکل نے ملکی حالات کا خوب نقشہ کھینچا ہے، بے چاری عوام بھی کیا کرے! اپنی محفل کی طرف دوڑ لگائی۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محمد خواجہ کو کرسی صمدارت پر براجمان پایا، خوشی سے چھوٹے نہیں سارے۔ مبارک ہو۔ ویسے تبصرہ اچھا تھا۔ زویا اعجاز میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ قیصر اعوان آپ تو رمضان پاشا کے پیچھے بچے جھاڑ کر پڑ گئے ہیں، آپ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ نام سے پکاروں کیا تاہم تمہارا۔ رمضان صاحب کے پاؤں بار بار ابابیر عباس دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ اچھی لگی، خدا ایسا ہی رکھے۔ محمد ہمایوں سعید آپ تو اپنے من مہیاں بخوبی رہے ہیں۔ ماہا ایمان آپ کو گاؤں کی سیر کی آفر ہوئی اور وہاں کے باغات کی سیر کرانا اور پھل توڑ کر کھانا۔ کہانیوں کی طرف آجائیں، تانیا لیوور نے واقعی (انوکھا انتقام) لیا عورت مرد کو کتنی بھادری سے بے وقوف بناتی ہے۔ اشرف الاولیا، اولیا کے بارے میں پڑھ کر دل کو تقویت اور سکون قلب ملا ہے۔ دل بہت ہی بزدل ثابت ہوا نہ چاہے ہوئے بھی ایک مجرم کے ساتھ کام کرنا پڑا۔ سہی حاصل اس کہانی کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں، اتنا سہنس اور ٹیپو خاصا تیز تھا اور کاش کے ساتھ آہ بھی نکلتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو (ایک بوری مجھ کی) بڑھاپے تک نہ بھولی، لوگوں کی محبت نے ڈاکٹر کو اپنا اسیر کر لیا وہ ان کے کام آکر خوش محسوس کرتا، اف روجی پر کیسے کیسے (انکشاف) ہوئے حالانکہ اس کے اندر جو احساسات چھپے ہوئے تھے، انہی کا انکشاف ستاروں کی صورت میں ہوا۔ جوڑے تو خدا نے آسمانوں پر بنائے ہوئے ہیں۔ آخری کہانی تکمیل خواہش، شہمت بیگ اور راشد کا کردار خاصا پور فل تھا۔ عشرت جہاں کی غلط فہمی دور ہوئی تو ان کے جھگڑے بھی ختم ہو گئے۔ فیروز خان نے اپنی بیٹی کو بچا لیا مگر اپنی جان دے

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تہجر کر رہے ہیں۔ تہجر کا سہل ملا۔ سرور قیڑا رو مانگ لگا۔ مجھ کو عاشق کے دل کی آواز میں بن کر عرش کی طرف جارہی ہے اور معشوق کی خاموشی ہے یا بے توجہی۔ جون ایلیا نے جو بھی لکھا جتنا بھی مختصر لکھا، دل پر اثر کرتا ہے۔ بیگانگی ہے یا دیوانگی پورے وجود میں سرایت کر چکی ہے۔ آخری پیرا اگر آف بار بار پڑھا۔ بہت اثر انگیز ہے۔ مون سون شروع ہو گیا۔ گاؤں اجڑ گئے۔ شہر اجڑ گئے۔ کیا یہ اللہ کا انعام نہیں جو قحط سے بچاتا ہے۔ ہم ڈیم نہیں بنے دیتے۔ پڑوسی ڈیم بنا رہا ہے، ہمیں توفیق نہیں۔ پھر ہم شور مچاتے ہیں۔ پانی کی کمی ہے، بجلی کی کمی ہے۔ اندھیروں نے گھر دیکھ لیا ہے، ملک بھر ہو رہا ہے۔ کیا ہمیں روشنی کی ضرورت نہیں۔ کیا ہم اندھے ہو چکے ہیں۔ محنتی انتہا کا بڑا شور تھا، ہو گئے۔ کیا ہم نے احتساب کیا۔ سیاست دان پھر نئے وعدے کر رہے ہیں۔ پھر ہماری سڑا میں 5 سال کا اضافہ۔ کیجیے کورنگی میں بم دھماکا۔ ایک شہری نہیں مرنے والا ایک خاندان ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قاتل ہمارے پیغمبرؐ کی امت سے نہیں ہو سکتے۔ الیاس بیٹا پوری کی تحقیق و ترتیب سے علمی بادشاہوں کے واپس اور کردہ کردار اور یقیناً ان کی بربادی تو لازم و ملزوم ہونا ہی تھی۔ کاشف زبیر نے اس دفعہ بڑی دلچسپ کہانی لکھی۔ خون کا رشتہ، اختتام بہت شاعرانہ رہا۔ ناصر ملک کے مسافر کی 19 ویں منزل ایک مرتبہ پھر بڑی معرکہ آرا رہی۔ شہر یا پھر مشکل میں، لہو لہان۔ اس دفعہ ایک نازک اعدام اور غیر ہنرمند سماجی کے ساتھ بڑا معرکہ سر کرنا تھا۔ ناصر ملک کے تخلیق کردہ کردار کو اتنا پر جوش اور خیر خیر بنا دیا ہے کہ نظریں کہانی سے ہٹتی نہیں اور اچانک ایسے موڑ پر کہانی رک جاتی ہے۔ مرزا احمد بیگ کی سہی حاصل عمدہ کہانی ہے۔ ہمارا معاشرہ ایسے بہت سے مسائل سے داغدار ہو رہا ہے جو یقیناً جمہوریت، امن، خد کی پیداوار ہے۔ بیگ صاحب کی عرق ریزی اور ذہانت کام دکھائی دے گا اور فیصل کو خوشگوار زندگی ملے گی۔ تیویر ریاض نے نئی زندگی میں ایک اچھوتی کہانی لکھی۔ ایک انتہائی مایوس شخص کی داستان، اگر وہ مایوسی میں جان دے دیتا تو کچھ نہ ہوا ہوتا۔ انکشاف میں طاہر جاوید منٹل نے بڑی طلسماتی کہانی لکھ ڈالی، بڑی عجیب اور حیرت انگیز کہانی، کیا آج کل کے دور میں ایسے مجذوب مل جاتے ہیں۔ روحی کو آگئی ایسی ہی ہراساں حالت میں ہوئی کہ ذہن قبول نہیں کرتا۔ سلیم انور نے انوکھا انتقام میں عورت کے انتقام کی بڑی خوب صورت کہانی پیش کی۔ میڈیا کے چکر باز جمہوریت تنقید کے جھنڈے گاڑنے والے ری پبلکن کو ایسا دموبی چٹا لگانے والی خاتون تانیا لیور کی بہترین منصوبہ بندی اور سادگی کے ساتھ بڑا مزہ دے گئی۔ روبینہ رشید کا مقابلہ بڑی گھمبیر داستان تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ صاحب کی مختصر لیکن دل چھو لینے والی کہانی۔ ایک مختصر داستان کو خوب دلکش بنا دیا۔ مریم کے خان نے ایک دفعہ پھر عمدہ تحریر پیش کی۔ ایک ایسا کھون جس میں ایک شریف انسان دو مجرم بھائی بہن کے درمیان چکی کے پاٹ میں پھنس گیا۔ نشور ہادی کی تکمیل خواہش بھی خوب کہانی ہے۔ شمشت بیگ اور ان کا خاندان اپنے اپنے توازن پر محو گردش تھا۔ اچانک ایک کڑا امتحان سامنے آ گیا۔ شمشت بیگ کے ماضی سے جڑے سارے خول اترتے چلے گئے اور فیملی مدد دے انہیں اس امتحان میں کامیاب کیا۔ محفل شعر و سخن ایک مہکتا ہوا گلدستہ ہے جس میں بہت اچھے منتخب اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ جنید احمد ملک کے دو مسروروں میں کراچی کا نقشہ دکھا دیا۔ منتخب کردہ اشعار بہت معیاری ہیں۔ کتر نہیں ہمیشہ عمدہ رہتی ہیں۔

سینس ڈائجسٹ 10 اکتوبر 2013ء

❦ قیصر اعوان، قیدی سزائے موت ڈاکٹر کت جیل سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "پورے ملک میں بھارت کی آبی جارحیت نے تباہی مچا رکھی ہے، اللہ پاک پاکستان اور پاکستانی عوام کو اس مشکل گھڑی میں صبر و استقامت کے ساتھ مقابلے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین۔ اس واقعہ ماہِ تبر کا شمار بغیر کسی تردد یا منت سماجت کے 26 اگست کی صبح موصول ہوا جو کہ ہم نے اپنی ڈائری میں واقعہ تاریخی حیثیت سے لکھ ڈالا کیونکہ اس سے پہلے تقریباً 3 سال سے میں ریگولر اسپنس پڑھ رہا ہوں ایسا واقعہ دیکھنا نہیں ہوا؟ سرسری انداز میں سرورق دیکھا کیونکہ حسینہ سرورق کو دیکھنا دل گردے کا کام تھا، کیا آنکھیں، کیا لب اور کیا محویت اف اللہ حتیٰ کری صدارت اس دفعہ محمد خواجہ، کورنگی والا کے حصے میں آئی۔ ملک کی صدارت ممنون حسین بھی کراچی اور اسپنس کی صدارت بھی کراچی کیا خوب احتجاج ہے۔ خیر بھیا مبارک باوقول فرمایں۔ خواجہ صاحب بھی ملکی حالات، لوڈ شیڈنگ اور نظام کی خرابی کا رونا روئے نظر آئے۔ یہاں زویا اعجاز اسپنس کی تاخیر پر واوٹ کرتی نظر آئیں۔ انکل بابر عباس آپ کو ہم قیدیوں کی طرف سے ول کی گھرائیوں سے Happy Birth Day اور دعا ہے کہ آپ کی آئندہ زندگی میں صرف خوشیاں ہوں اور کوئی غم یاد نہ لکھی آپ کو پریشان نہ کرے۔ آمین۔ اور انکل ہماری بہن ماجن کا کیا حال ہے ہماری طرف سے پیار۔ برادر ہانیوں آپ نے جو بات یہاں تصویر الحسن کے بارے میں کہی، اسے ذرا جامع الفاظ میں بیان کر دیں تو آسانی ہو جائے۔ یہاں سعدیہ بخاری کا تبصرہ پسند آیا۔ برادر قیصر اقبال محبتوں کے امن کے سفیر نظر آئے۔ ویسے برا درم بغیر کسی اختلاف کے آپ کی رائے سن کر دل چاہتا ہے کہ اگر میں سزائے موت کا قیدی نہ ہوتا تو بھیا اعجاز احمد راحیل سے ضرور ملاقات کرتا۔ اچھے دوست بنانا اور اچھے لوگوں سے ملنا مجھے پسند ہے۔ یہاں بشری افضل و یلم بیگ۔ محترم تابلی اور بالومیرے خیال میں قیصر اقبال اور جناب کستوری والا کو ہر اسان کرنے کی کوشش میں تھے؟ ہمارے قیدی بھائی منشی حماد فرباد اینڈ قیصر گل اللہ آپ سب بھائیوں کی مشکلات آسان فرمائے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب کا تبصرہ پسند آیا۔ محترم رمضان پاشا اپنے کیے پر نادم نظر آئے ویسے غلطی چھوٹوں سے ہوتی ہے۔ حافظ شاہد عمران سینئرل جیل گوجرانوالہ بھائی آپ سب لوگ کہاں ثابت ہیں؟ اپنی خیریت سے آگاہ کریں، تمام بھائیوں کو سلام دعا۔ بھائی جاوید بلوچ، یہاں ماہا ایمان، تصویر الحسن، ماریہ فاروق، طاہرہ مخزر، طاہرہ یاسمین، حمیرا ضلالا، سب کہاں ثابت ہیں۔ واپسی کی گاڑی پکڑیں اور جلد از جلد محفل کی رونق کو چار چاند لگائیں اور یہاں۔ اجده راجا..... آپ کو خصوصی مبارکباد آپ کے ولیعمر ظفر اقبال کھوکھر رہا ہو گئے ہیں۔ کہانیوں میں مسافر اس وقت بیٹ جا رہی ہے میڈیم اور شہر یار کی اسٹوری بالکل اکیسویں صدی کے ہیرو رائف کی طرح ہے۔ کشکول میں لیاقت حسین کا کردار کرشماتی معجزوں کی بنا پر خاص الخالص بنا ہوا ہے جبکہ اورنگ زیب کا کردار انجیل میں۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔"

✽ اور یس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں۔ ”سپیس اس مرتبہ تاخیر سے ملا۔ سب سے پہلے انشائیے سے مستفید ہوئے اور آگے کے موتی جے، پھر اپنی محفل میں وارد ہوئے۔ اس کے بعد مسافر کے ہم قدم ہوئے، جہاں کہانی در کہانی کا سلسلہ چل رہا ہے اور شاید اختتامی



مرحل میں ہے، کھنکھول بھی کامیابی سے چل رہی ہے۔ پھر تاریخ کے جھروکوں سے غلیبوں کی تباہی پڑی۔ غلیب خانہ ان کے عروج اور زوال کی کہانی۔ جہاں انہوں کی بیگانگی اور غیروں کی دیوانگی پر مشتمل داستان صفحات پر بکھری ہوئی تھی۔ خون کا رشتہ نے بھی اچھا سبق دیا۔ انکشاف بھی بہتر تھی۔ انوکھا انتقام بھی اچھا تاثر دینے میں کامیاب رہی۔ محفل شعرو سخن نے بھی مزہ دیا۔ کترنیں بھی معلومات کا ذریعہ بنیں۔ مقابلہ بھی اپنی انفرادیت کی وجہ سے پسند آئی۔ شیر شاہ سید صاحب کی کہانی ایک یوری کجور ایک مشرقی کہانی تھی ان کی ہر کہانی مقصد سے معمور ہوتی ہے اور جس سے ایک سبق ملتا ہے۔ اشرف الاولیاء نے اولیاءوں کے حالات و واقعات کا دروا کیا جس سے ذہن اور دل روشنی سے منور ہوئے۔ بزدل میں ایک بزدل نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کیا اور اپنی دیرینہ دشمن یوری اور جرم ماندہ ذہن رکھنے والے سالے سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ تکمیل خواہش آخری صفحات کی اچھی کہانی تھی، مگر اس میں کوئی نیا پیمانہ نہیں تھا اور روایتی کہانیوں کی طرح تھی۔

❖ ملک رحمت، ملک سجاد، میانوالی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ لیجئے ایک اور خاموش قاری نے قسم توڑ دی وہ بھی چودہ سال بعد۔ میرے رسالہ لینے اور پڑھنے میں جتنی مشکلات ظالم سانچ نے پیدا کیں وہ الگ داستان ہے۔ مگر ہم وہ نہیں جھوڑے مرنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں منع کرنے والے ہم سے رسالہ لے کر خود پڑھتے ہیں، بعد میں ہمیں اس شرط پر اجازت ملی کہ ایک کے سوا باقی سب رسالے پڑھ سکتا ہوں۔ اس رسالے کا یہاں نام لینا مناسب نہ ہوگا۔ سنس اشعارہ تاریخ کوٹلا۔ سرورق پسند آیا۔ اس میں نمایاں چیز قتالہ عالم کی آنکھیں ہیں۔ بقول شاعر۔

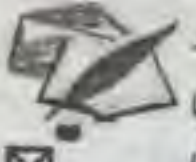
جھیل اچھی ہے کنول اچھا کہ جام اچھا ہے
تیری آنکھوں کے لیے کون سا نام اچھا ہے

اب چھوٹی کہانیوں کی طرف۔ انکشاف کیا بات ہے، ونڈ رفل۔ اس کو فرسٹ پرائز دیا جاتا ہے۔ دوسرا انعام انوکھا انتقام۔ تیسرا بزدل اور چوتھا ایک یوری کجور۔ کو۔ مسافر اچھی جا رہی ہے۔ آخری صفحات متاثر نہ کر سکے۔ سنس کا بھی خاص غور نکالیں۔ لوک جھونک سے پرہیز کیونکہ پہلا خط ہے۔ (خوش آمدید)

❖ محمد ہمایوں سعید، بنوں سے چلے آ رہے ہیں۔ "سرورق" بھی عید والی لڑکی کافی پیاری تھی۔ انکل جی اپنے تبصرے میں نئی حکومت سے بھی شکوہ کناں نظر آئے۔ محمد خواجہ صاحب! محفل پر پورا رمضان مہنگائی مہنگائی کے دواولیوں نے کان پکا دیے۔ کیا ایسا کرنے سے مہنگائی ختم ہو جائے گی؟ مہنگائی سے اور غربت سے نشتے کے لیے ہمارے نچانے بہترین فارمولہ بتایا ہے کہ میانہ روی اختیار کرو۔ تم بھی غریب نہیں ہو گے۔ بار صاحب آپ ستر سال کے ہو گئے خیر؟ ہم تو 65، 60 کے ہی سمجھتے رہے تھے اب تک۔ ہارون برادر اور توصیف کی بات چھوڑو۔ اگر آپ کو بھی ملازمت چاہیے تو آپ بھی آجائیں۔ سعید صاحب! یہ ہر نام کے ساتھ انکل آپ نے احتراماً توقیتاً نہیں لگا یا ہوگا؟ 1948ء کے علاوہ پاکستان کی تمام جنگوں کی آپ چشم دید گواہ ہیں اور یہ بات میں شوش ثبوتوں اور مستند گواہوں کی مدد سے ہمہ وقت ثابت کرنے کو تیار ہوں۔ بشری صاحب! پرانے ڈائجسٹوں میں آپ کے شاندار تبصرے آج بھی ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں، لہذا آپ سے پر زور اپیل ہے کہ اگر حواس غصہ میں سے کسی نے دغا نہ دی ہو تو بار بار آتی رہے گا۔ فشی حماد اور قیسر گل! ہم جلد ہی ساجو وال کو روٹ بخشنے والے ہیں تو آپ کو بھی شرف ملاقات عطا کر دیں گے۔ قدرت اللہ برادر! آپ نے بھی کافی مفصل روشنی ڈالی زویا اعجاز کی عمر پر۔ مرزا صاحب ایک اور کہانی لیے حاضر تھے۔ کیونکہ اب ان کی کہانیوں کو کس کہنا غلط ہوگا کیونکہ 75 فیصد تو وہ گمراہ کہانی ہی ہو چکی ہے۔ سلیم انور کی انوکھا انتقام واقعی زبردست رہی۔ تانیا کے کاری دار نے سچ سچ میں جی خوش کر دیا۔ روبینہ رشید کی سنس گلشن کہانی مقابلہ کافی تیز رفتار اور دلچسپ رہی۔ بلاشبہ دو انتہائی جینس لوگوں کا ایک ساتھ رہنا ایک نیا م میں دو تلواریں جیسا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی دل کو چھوٹی کہانی ایک یوری کجور حد سے زیادہ پسند آئی۔ ڈاکٹر صاحب کی کہانی میں انسان دوستی، اخوت، محبت، ہمدردی کا انوکھا تاثر ہمیشہ سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مریم کے خان کی کہانی بزدل اپنے ہر مزاج انداز کی وجہ سے بہت پسند آئی۔

❖ پرنس راجا ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادن خان سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ "تمبرہ کے سنس ڈائجسٹ کے ٹائٹل نے ہمارا دل جیت لیا۔ ٹائٹل کی حیرت بڑے غور سے اس فقیر کو دیکھ رہی ہے جو کھنکھول ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے۔ عید کی مناسبت سے بہت شاندار ٹائٹل تھا۔ جون ایلیا نے معاشرے میں پھیلی ہوئی بیگانگی کے زہر کو اپنے قلم سے خوب لٹاڑا۔ الیاس بیٹا پوری نے غلیبوں کی تباہی لکھ کر تاریخ کا حق ادا کر دیا۔ غلیبوں کی تباہی کے اسباب سے آگاہی ہوئی۔ کاشف زبیر کی کہانی خون کا رشتہ میں خون کے رشتے نے ہر رشتے کو مات دے دی۔ کھنکھول کی چھبیسویں قسط بہت زبردست رہی۔ باقی کہانیوں میں نئی زندگی، سسی حاصل اور انوکھا انتقام معیار کی اعلیٰ بلندیوں پر فائز تھیں۔ اولیاء کرام کا سبق آموز سلسلہ اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ایک یوری کجور دل کی کہانیوں میں اتر گئی۔ محفل شعرو سخن کے تمام اشعار ہمارا دل جیتنے میں کامیاب رہے۔"

❖ اے ایم چودھری اینڈ کمرن، احمد پور شرقیہ سے محفل میں شریک ہیں۔ "بچہ زکی مصروفیت کی وجہ سے کچھ عرصہ محفل یاراں سے دور رہی۔ رمضان میں بہت مزہ آیا۔ اس لیے اچھا گزرا کہ ماہ جنم بھی رمضان میں آیا، 29 رمضان یعنی 8 اگست کو میرا جنم دن تھا (بہت مبارک)۔ تمبرہ کا شمار ہمیں 19 اگست کوٹلا۔ سرورق دیدہ زیب، بے نظیر اور انتہائی متاثر کن تھا، دوشیزہ سرورق کے دلکش روپ کی سنہری دھوپ نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ جون ایلیا کا انتہائی حسب روایت معاشرتی مسائل سے نقاب کشائی کر رہا تھا لیکن ہم نہ تب سمجھے اور نہ اب سمجھیں گے۔ منہ صدارت پر کراچی کے خواجہ محمد شریف فرما تھے، خواجہ بھائی پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر ہماری طرف سے مبارک باد۔ ماہ ایمان سسز کیسی ہیں، آپ کہاں غائب ہیں آج کل طاہرہ گلزار اور تصویر الحسن کی غیر حاضری کچھ پسند نہیں آئی۔ ابتدائی صفحات پڑا اکثر ساجد احمد کے قلم سے تاریخی سلسلہ بہت پسند آیا۔ ماضی کا آئینہ عہد حاضر کے۔۔۔ درباب اختیار کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ کاشف زبیر کے قلم سے نقلی خون کا رشتہ نہایت زبردست اور شاندار تھی۔ مریم کے خان کی بزدل بہت



زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ ناصر ملک کی مسافر دل گداڑ تھی، محبت، نفرت، وحشت، انتقام۔ چند وہابی سے میڈم تکلیف کا سفر..... شہر یار جذبوں، دلولوں اور گن سے بھر پور کردار یعنی ہر لحاظ سے مکمل اور پرفیکٹ..... کھنکھول پر اسراریت سے زیادہ جراثیم پیشہ افراد کی اور قانون کی آنکھ چھوٹی، ایسی پولیس صرف کہانیوں کی حد تک ہی محدود ہے..... مرزا امجد بھائی کی سسی حاصل..... عورت ایک معما کی محلی تفسیر بنی ہوئی دکھائی دی۔ آخری تحریر ملاحظہ کی جس میں محبت کے لیے قربانیاں تھیں۔ آخر میں تمام دوستوں سے گزارش ہے جو کہ محفل سے غائب ہیں وہ شرافت سے محفل میں حاضر ہو جائیں اور سب اہل محفل سے چھوٹی سی عرض کرنی تھی کہ وہ اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھیں اور دعا کریں کہ ہمارا زلزلہ اچھا آجائے (اللہ آپ کو بہت اچھے غیروں سے کامیاب کرے، آمین) اور میرا نام اے ایم چودھری یعنی آسیر چودھری ہے کیونکہ بعض دوستوں نے کہا تھا کہ اپنے اصل نام کے ساتھ شرکت کرو اس لیے اصل نام بتا دیا لیکن کجوری کی وجہ سے اے ایم چودھری کے نام سے ہی لیٹر لکھا کروں گی۔"

❖ توصیف احمد، پٹان کالونی، کراچی سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ "تمبرہ کا شمارہ خلاف معمول تین دن لیٹ ملا۔ سرورق بس ابویں سا تھا۔ انتہائی میں جون ایلیا صاحب نے ہمارے معاشرے کی ایک واضح تصویر کھینچی ہے۔ اس کے بعد "آؤ دیکھنا تہاؤ" سیدھے دوستوں کے ساتھ دنگل میں اتر گئے جہاں اس ماہ کے چیمپئن پہلوان محمد خواجہ صاحب ٹمبرہ تھے۔ خواجہ صاحب آپ کو وہ کرسی مبارک ہو جس کو ٹھیک ایک ماہ بعد دیکھ گئے والی ہے۔ بار عباس صاحب 70 ویں سالگرہ..... تو بہ..... مہنگائی بڑھی تو ہے لیکن یہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ صہیب احمد اور ہمایوں سعید آپ صرف رمضان میں نا محرم خواہن کو نہیں دیکھتے جبکہ غیر رمضان میں جی بھر کے دیکھتے ہیں بری بات ہے جی..... کچھ صاحب صرف راحل صاحب ہی نہیں محفل کے تمام دوست دوستی کے قابل ہیں۔ نیازی صاحب آپ نے بتا دیا کہ آپ نے 1995ء میں میٹرک کیا ہے۔ اب تمام دوستوں نے آپ کی عمر شریف کا اندازہ لگا یا ہوگا، میری طرح..... اب اگر کل کلاں کسی نے آپ کو چاچا یا ماما کہہ دیا تو پھر نصیر مجھ پر مت نکالنا۔ ماہ ایمان اور سعید یہ بخاری صاحب تو پھر بھی کبھی بھی محفل میں حاضری لگا لیتی ہیں، لیکن طاہرہ گلزار، طاہرہ یاسمین اور حافظ محمد عرفان کافی عرصے سے غیر حاضر ہیں اور شیر علی خان کی تو خیر نئی شادی ہوئی ہے اور نئی ٹوپی وہن کو لے کر موصوف بنی مون منانے انارکلی کا سدھارے ہیں۔ اس لیے شکوہ نہیں کر سکتے۔ اس بار تاریخی کہانی قطب الدین مبارک شاہ غلیب کی واپس بات قسم کے مشغلے کے گرد گھومتی رہی، اس لیے کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ مرزا صاحب کی سسی حاصل میں فیصل کے تجویز نہ فیصلے پر دل نے بے اختیار داد دی۔ بزدل میں دل جیسے جراثیم سے خائف شخص نے جب تہرپ کا آخری پتا پھینکا تو پڑھنے والے دم بخود رہ گئے۔"

❖ رمضان یا شاہ گلشن اقبال، کراچی سے شریک محفل ہیں۔ "تمبرہ 2013ء کے سنس کا گیت اب بہت عمدہ تھا، عنوانات کی ترتیب و ترتیب کاری بھی جلی لگی۔ انتہائی چلی حسب معمول ترش و تند تھا۔ لیجئے جناب لائٹ گئی، لائٹ چلی گئی تو کیا ہوا، کینڈل لائٹ زندہ ہوا، یہ خط کینڈل لائٹ میں لکھ رہا ہوں (اس محبت کا شکر یہ) خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے محمد خواجہ صاحب کچھ نئے لگ رہے ہیں، کم از کم اس محفل میں ان سے واقفیت نہیں ہوئی، پھر بھی موصوف کو مبارک باد دے ہی دیتا ہوں۔ بار عباس میں صرف آپ کی باتوں کا جواب دیا کرتا ہوں، پیچھے پڑنا بری بات کے زمرے میں آتا ہے۔ محترم ہارون رشید صاحب میں ترک تعلق کر رہا تھا، اب بات پرانی ہو گئی معافی تلافی بھی ہو گئی۔ صہیب احمد بھائی آپ کے انوش عید مبارک کا بہت بہت شکریہ۔ غلیبوں کی یہ تاریخ تو پڑھی ہوئی ہے۔ دوبارہ لطف اندوز ہوا، خاص کر خواجہ سراؤں کے معاملات پڑھ کر۔ خون کا رشتہ نے کافی لطف پہنچایا، یہ پڑھ کر پیچھے پڑتی کہانی کافی عرصہ یاد رہے گی۔ کھنکھول اب دلربا پر کچھ آفات نازل ہونے والی ہیں۔ نئی زندگی بس گوارا ہی تھی۔ سسی حاصل حُسام بٹ صاحب کی کہانی نے کوئی خاص لطف فراہم نہیں کیا۔ انکشاف بالکل اچھی نہیں لگی۔ انوکھا انتقام پسند نہیں آئی۔ مقابلہ حالات و واقعات میں جدت ہونے کی وجہ سے یہ کہانی پسند آئی۔ مسافر کی یہ قسط بہت ہی دلچسپ تھی۔ ایک یوری کجور یہ ایک پراثر کہانی تھی، انتقام میں آنکھیں نم ہو گئیں۔ بزدل اور خون کا رشتہ بھی تحریف میں آتی ہیں۔ تکمیل خواہش ایک زبردست طوفانی کہانی تھی، مزہ آیا۔ اشعار کی محفل میں جنید احمد ملک کا انتخاب لا جواب تھا۔"

❖ تصویر الحسن، اوکاڑہ سٹی سے محفل کی زینت بنی ہیں۔ "تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد اب میں حاضر ہوں۔ امید ہے کہ تمام دوست خیریت سے اور خوش باش ہوں گے۔ ڈاکٹر انکل نے ایک بار پھر سے خوب صورت و دھیرہ کی تصویر بنا کر سنس کے سرورق کو عید کے رنگوں سے سجا دیا، نیچے ہمایوں سعید جوگی بے سکر سمجھ رہے تھے اور سب کو عید مبارک کہہ رہے تھے۔ پاکستان میں اتنے سیلاب بارشوں کی وجہ سے نہیں آتے، جتنے جب آتے ہیں جب ہمارا پڑوسی ملک پانی چھوڑتا ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ بادشاہی کرسی پر محمد خواجہ شہنشاہ بنے بیٹھے تھے۔ تمبرہ واقعی اچھا تھا۔ زویا اعجاز آپ کو بھی جشن آزادی مبارک۔ محمد صفدر آپ نے کون سے والے قیصر بھائی کی بات کی ہے، قیصر اعوان یا قیصر اقبال کچھ، قیصر اعوان بھائی بہت شکر یہ لیکن آپ کو پتا ہے جو جتنا ہنستا ہے اسے اتنا ہی رونا بھی پڑتا ہے اور یہ واقعی سچ ہے۔ محمد ہمایوں سعید میں کم گو ہوں یا باتونی یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ آپ کا واسطہ صرف باتونی لڑکیوں سے ہی پڑا ہوگا دیے بھی میں نے بعض مرد حضرات ایسے بھی دیکھے ہیں جو بولنے میں عورتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ سعید یہ بخاری کا ٹکنا میٹھا تمبرہ بہت اچھا لگا۔ رانا منشی ہمدان فرہاد اینڈ قیصر گل سب سے پہلے تو آپ کے لیے کہ مجھے اس دنیا میں ہی ہوتے ہیں۔ انشا اللہ کیا تاجر ہو جائے اور آپ سزائے موت سے بچ جائیں تو پھر آزاد ہو کر ہم سے مل لیں۔ مسافر کی قسط زبردست تھی اس بار آئی تھیک کہ شہر یار نے جس لڑکی کو دیکھا ہے وہ یا تو غزالہ ہے یا اس کی خودی بہن۔ کھنکھول کی قسط بھی اچھی تھی۔ نشور ہادی کی تکمیل خواہش پڑھنے میں اچھی کہانی تھی لیکن کچھ خاص نہیں لگی۔ مریم کے خان کی بزدل واقعی زبردست تھی۔ طاہرہ جاوید مغل کی انکشاف پڑھ کر تھیں نہیں آیا کہ کوئی فقیر کے چند فقرہ کو اپنی زندگی پر حاوی کر سکتا ہے۔ ایسا بھلا کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی کے دل میں جھانک لے۔ باقی کہانیاں ابھی نہیں پڑھیں۔ محفل شعرو سخن میں قیصر اعوان، قیصر اقبال کچھ، محمد بھان اور نور اللہ کی چوٹ اچھی لگی۔ کترنیں میں طالب حسین طلحہ کی مہنگی کلیاں احسان سحر کی کائنات، رحیمہ سرور کی دست شامی اور رانا فیصل جاوید کی علامت امن اور انداز میں پسند آئی۔"



✽ جاوید شمیم بربرہ، علی پور مظفر گڑھ سے تشریف لائے ہیں۔ "تبر کا شمار کافی انتشار کے بعد ملا۔ سرورق بہت پیارا تھا۔ جون ایلیا کی بیگم کی تحریر پڑھی، طبیعت پوچھ لی ہوگی۔ آپ کا ادارہ پڑھا، حکمرانوں کے کیا کہنے۔ آج کل پورا ملک سیلاب کی زد میں ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے جنوبی پنجاب میں فلوڈ ایریا میں ہمارے CM کے جانے کے فوراً بعد انتظامیہ سامان سمیت اڑن چھو ہوگی۔ سیلاب زدگان مسند دیکھتے رہ گئے۔ ایسی فیملیاں در بدر ہیں جن کی عورتوں نے بھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اور نہ ہی کسی غیر محرم کی نگاہ ان تک گئی۔ آج سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ ہمارے شہر کے آس پاس تمام بستیاں سیلاب کا شکار ہو گئی ہیں ہم نے ایک ٹیم بنا رکھی ہے جتنا ہم سے ہو سکتا ہے ہم کر رہے ہیں۔ سیلاب زدگان لوگوں کی بد نصیبی دیکھیں اس جدید دور میں بھی اپنے بچوں کو درختوں کے پتے ابال ابال کر کھلا رہے ہیں۔ دعا کریں کہ یہ لوگ ان مشکلات سے جلد نجات حاصل کریں (آمین، اللہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کو جزائے خیر دے) شمارہ کی کہانیاں ابھی تک سیلاب زدہ علاقے کی بھاگ دوڑ میں نہیں پڑھیں۔"

✽ شبانہ، لاہور کینٹ سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ "ٹائل بہت اچھا لگا۔ ایک ماڈل کالینگر کا دوپٹا جو کہ ہمارا پسندیدہ کالر ہے۔ مون سون کا موسم ہے اور یہ خط ہم بارش انجوائے کرتے ہوئے اپنے گھر کے پورچ میں بیٹھ کر لکھ رہے ہیں (واہ! کیا بات ہے، موجاں ہی موجاں) ہمیں سردیاں اور بارش بہت پسند ہیں لیکن بارش کے ساتھ ان لوگوں کا خیال آجاتا ہے جو ان بارشوں کی وجہ سے اپنے گھروں سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ دعا ہے یا اللہ پاکستان کے حکمرانوں کے دلوں میں رحم پیدا کر دے جو ان لوگوں کو آئندہ سال سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچانے کا مکمل سدباب کریں (آمین) جون ایلیا کے انشائیہ پڑھ کر دل کو لگتا ہے کہ وہ آج بھی ہم میں زندہ ہیں، اپنی تحریروں کے ذریعے۔ محمد خواجہ صاحب کو کرسی صدارت مبارک، صرف ڈائجسٹ میں۔ زویا اعجاز اب تک کہاں تھیں؟ آتی رہا کریں۔ محمد صفدر صاحب آپ اپنی سوچ کے گھوڑے نہ دوڑائیں۔ قیصر اقبال بھائی آس پاس کے مناظر کو خوب صورت لفظوں میں موتیوں کی طرح پرو دیتے ہیں۔ انکل باہر آپ اب تو آنٹی کو خط لکھنے دیں۔ ہمایوں سعید جھوٹا بتا بولو کہ ہضم ہو جائے۔ اعجاز راجیل صاحب بقول سب کے آپ شاعر ہیں تو آپ کا کوئی دیوان خاص نظر سے نہیں گزرا۔ تابی اور بالو یہ نام پڑھ کر جاسوسی کا تابش اور اس کا بیٹا بالو یاد آگئے۔ قیصر اعوان، رانا خشی حاد فرہاد اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام لوگوں کو جو کردہ اور نا کردہ آزمائشوں کی وجہ سے اسیری کی زندگی گزار رہے ہیں، باعزت آزادی نصیب فرمائے اور عمران حیدر کو تندرستی عطا کرے (آمین) کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑھی جو کہ زبردست جاری ہے۔ اتفاق کی بات شہر یار اور میڈم ٹیکلہ کے دشمن ایک ہی ہیں۔ کنگول لیاقت حسین سے شروع ہوئی لیکن اب ایس بی اور تک زیب کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ کاشف زبیر کی کہانی خون کا رشتہ، واقعی خون کی اپنی ایک الگ ہی شمش ہوئی ہے۔ ایڈ نے خود کشی کر کے اپنی بہن جیسکا کی زندگی محفوظ کر دی۔ تنویر ریاض کی نئی زندگی ایک اچھوتی کہانی تھی کرشمین نے جب اپنے بھائی کا انتقام لینے کا سوچا تو اپنا بھی آخری وقت نظر آگیا۔ طاہر جاوید مغل کی انکشاف پڑھ کر یہ دل کو تسلی ہوئی کہ یہ صرف ایک کہانی ہے اگر یہ سچ ہوتا تو کسی کی پہلی محبت راز نہ رہتی (اور پھر کیا ہوتا۔۔۔۔۔) روبینہ رشید کی مقابلہ محبت میں مقابلے بازی نہیں ہوتی، لیزلی اور آرتھر کی محبت کا یہ انوکھا انداز تھا جس نے دونوں کی جان لے لی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ایک بوری جھوڑی۔ اگر ہم سب ڈاکٹر کی طرح سوچ لیں کہ دنیا میں محبت و خلوص سے بڑھ کر کچھ نہیں تو پھر دولت کی اہمیت نہیں رہتی۔ مریم کے خان کی بزدل دلچسپ کہانی تھی۔ بزدل دماغ کا بہادر اور محفل مند تھا۔ اشرف الاولیاء، اللہ کے ولی اپنی مملکت کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ تکمیل خواہش آخری صفحات میں سچی نشور ہادی کی تحریر کہ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل میں جائز ناجائز سب بھول جاتا ہے۔"

✽ تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ سے تشریف لائے ہیں۔ "ماضی کے آئینے میں غلیبوں کی تباہی نے روکنے کھڑے کر دیے۔ یہی قدرت کے اٹل قانون کا نظام ہے کمال کو زوال۔۔۔۔۔ عمل کے بعد مکافات۔۔۔۔۔ اور قلم کے بعد احتساب لازم ہے۔ یہ کیسا کڑا وقت ہے۔۔۔۔۔ جو وطن عزیز کی معیشت، سالمیت، تباہی، مستقبل۔۔۔۔۔ اور خوشحالی کے راستے میں۔۔۔۔۔ دیوار چین کے مانند حائل ہو گیا ہے۔ نا صر ملک کے بے سمت مسافر کی طویل و تلخ مسافت، چند و ماہی کی آبلہ پانی۔ شہر یار کے مصائب و آلام۔۔۔۔۔ چٹک کر۔۔۔۔۔ عبرت سرائے دہر ہے۔ جرائم قانون کے تناظر میں کنگول انوار صدیقی کا سلسلہ اصول، ایک اصلاحی و تعمیری تحریر۔۔۔۔۔ آنکھیں شیطان کی آنت اور کتے کی دم کے عین مطابق ثابت ہو رہا ہے۔ کاشف زبیر کی زبردست تحریر و تخیل، خون کا رشتہ ایک دلخراش ماجرا ہے عبرت، انجام نے مطمئن بھی کیا اور افسردہ بھی، لیکن رشتے خون کے نہیں، احساس خلوص اور درد کے ہوتے ہیں۔ تنویر ریاض کی بہترین تحریر نئی زندگی، ایڈیٹر نے کیا خوب صورت تاریخی جملہ رقم کیا کہ جانے کیوں تقدیر کو انسان کی چاہتوں سے بیر ہے۔ مرزا امجد بیگ کی ڈائری سے ایک اور دلچسپ کیس سچی حاصل۔ سفینہ نے اپنے ناقص اعقل ہونے کا کیا خوب مظاہرہ کیا کہ جس شاخ پر بیٹھی تھی اسی کو کاٹ دیا۔ کہانیوں کے محفل اعظم طاہر جاوید مغل کی دلگداز تحریر انکشاف نے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا۔ محبت ہر عہد میں قربانیوں کا تقاضا کرتی ہے اور محبت کی طبیعت میں زبردستی نہیں ہوتی۔ روحی نے تقاضائے وقت کے عین مطابق درست فیصلہ کیا۔ تلخ لہجے کے منفرد مصنف ڈاکٹر شیر شاہ سید کی بھجور کی ایک بوری مقصد تخلیق کائنات اوروں کے کام آتا اور اوروں کے لیے جیتا ہے۔ مریم کے خان کی اثر انگیز کہانی، بزدل نے از حد متاثر کیا۔ حصول رزق حرام کے لیے ہوس کاروں نے کیا کچھ کیا لیکن تقدیر کے ارادوں سے حضرت انسان کی بے خبری کیا کیجیے۔ آخری صفحات کا تو شیر خاص نشور ہادی کی دل و نگار تحریر تکمیل خواہش، اس نفسا نفسی کے دور میں اوروں کے لیے جینے کا جذبہ نایاب و ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔ شہت بیگ کے جذبہ انسانیت نے از حد متاثر کیا۔ فضا نسیم بلگرامی کی ایمان افروز تحریر و تحقیق اشرف الاولیاء روح کی تازگی کا باعث بنی۔ جون ایلیا کی بیگم نے لہور لا دیا۔ آپ کے خط میں آپ کی اثر انگیز گفت و شنید حالات حاضرہ کی بھرپور عکاسی۔ کھاریاں سے باہر عباس آپ کی 70 ویں سالگرہ کا شوشہ، ناقابل قبول و ناقابل برداشت ہے۔ بنوں سے ہمایوں سعید کا اعتراض برائے اعتراض۔ انک سے سعد یہ بخاری، ماہا ایمان کی توالی کے پیچھے۔۔۔۔۔ جلد اور تابی بچانے میں مصروف نظر آئیں، ہندوق چلانے کے لیے اپنا کندھا استعمال کر دو کامیابی کا امکان ہے۔ اعجاز احمد راجیل واقعی بہت پیارا بندہ ہے۔"

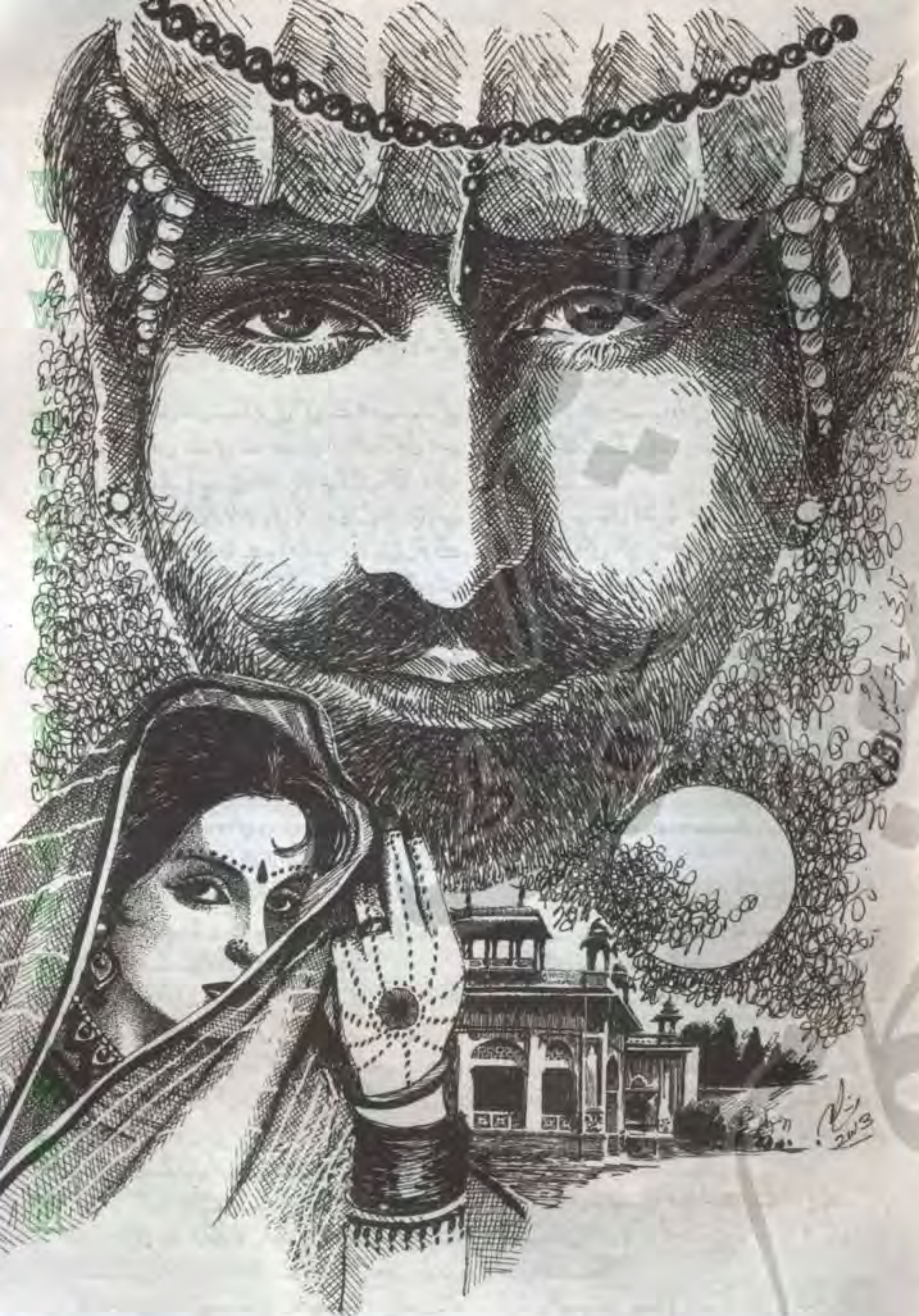


✽ سعد یہ بخاری، ضلع انک سے چلی آ رہی ہیں۔ "تبر کا سہنس 19 اگست کی شام جب ملا تو جاتی گرمیاں پھر سے واپس آ رہی تھیں۔ حید کے حوالے سے سرورق کچھ خاص نہیں لگا۔ بہت ہی سنسن اور قابل انکیز قریش پوری کی وفات کا بہت افسوس ہوا۔ خطوط میں اس ماہ اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ محمد خواجہ صاحب صدمہ متھ ہوئے ان کی معاونت میں زویا اعجاز بھی کہانیوں پر بہترین تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ قیصر اعوان بھیا خوب، آپ نے بھی زبردست نوک جھونک کی۔ ہمایوں سعید سوشل ویب سائٹس پر ہم ذوق و ہم خیال لوگ کیا کھل کھلا رہے ہیں؟ آپ بھی تشریف لے آئیں، نگوں میں اضافہ ہی ہو جائے۔ باہر عباس انکل آپ 70 سال کے ہو گئے؟ چھین نہیں آ رہا۔ بشری افضل ڈیڑھ ویکل بیگ۔ سید اکبر ویکل میر فیس بک سے جب کر کے محفل سہنس میں آ گئے۔ اس بار خطوط کی تعداد اور منف نازک کے خطوط کی تعداد بہت کم رہی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے پڑھی مرزا امجد بیگ کی سچی حاصل، عام نوعیت کا گھریلو ناچاقی کا لیکن قانونی پیچیدگیوں کا حامل کیس بیگ صاحب کے ہاتھوں میں آتے ہی حل ہوتا چلا گیا۔ آخری صفحات پر تکمیل خواہش نشور ہادی کی تحریر عام کی تحریر ثابت ہوئی۔ کچھ سہنس، ایڈ و نچر نہ تھا۔ سلسلہ وار کہانیوں میں مسافر اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ گلیے کی انٹری سے کہانی مزید دلچسپ ہو گئی ہے، شہر یار کے انتقام کا ایک حصہ پورا ہوا لیکن ابھی اصل قاتل زندہ ہے۔ کنگول میں حیران کن بات یہ ہے کہ ایک شخص سیٹھ حامد جو کہ مفرد مجرم ہے اکیلا اتنا طاقتور ہے کہ بڑے بڑے لوگ اس کے انتقام کا نشانہ بننے جا رہے ہیں اور اس کے کارندے اس قدر وقار۔۔۔۔۔؟ غلیبوں کی تباہی حسب معمول وہی بادشاہوں بلکہ مسلمان بادشاہوں کی ہمیش پرستی، سازشیں۔ اسلامی تاریخ میں فضا نسیم بلگرامی اس ماہ حاکم خاندان کے فرد دو جانشین سید اشرف کے دلچسپ واقعات لے کر آئیں۔ اس ماہ سلیم انور یازی لے گئے بہت مختصر اسٹوری انوکھا انتقام میں تابی لہور نے رینگلن سے بہت ہی مزے کا بدلہ لیا۔ دوسرے نمبر پر رہی مریم کے خان کی بزدل، ول نے شادی کے پہلے تلخ تجربے کے بعد ایسلی سے جو کیا ٹھیک کیا۔ انکشاف طاہر جاوید مغل کی بس ایوریج رہی۔ محبت کے بارے میں فلڈ تو 100 فیصد درست ہے۔ نئی زندگی اچھی تحریر تھی۔ سندھ کے صحرائے ڈاکٹر شیر شاہ سید ہمیشہ کی طرح ایک پراثر اور بہترین کہانی لائے۔ ڈاکٹر کے انسانی ہمدردی کے عجیب جذبے کو سلام۔ خون کا رشتہ کاشف زبیر کی حسب معمول اسے ون بھی۔ محفل شعرو سخن میں جنید احمد ملک، رشید سیال، اور مسز یار عباس کے اشعار پسند آئے۔"

✽ احمد خان توحیدی، اسٹیل ٹاؤن سے تشریف لائے ہیں۔ "شمارہ 17 اگست، ناور سے پہلا خیر باد تمہارا۔ حسینہ ٹائل کے سامنے گداگر، کنگول پھیلائے جیسے حکومت ایم آئی ایف کے سامنے کھڑی ہے۔ انشائیہ جون ایلیا، بیگم کی، واقعی ہم اپنے وجود سے بھی بیگانہ ہیں۔ جون ایلیا و محراج رسول کی ٹیم سے بار بار نظر انداز کرنے سے قلبی وکھ ضرور (آپ کا انداز تحریر مشکل اور غیر دلچسپ ہے اسے بہتر بنائیں۔ بات پوری لکھا کریں) محمد خواجہ کرسی صدارت مبارک۔ زویا اعجاز آپ کے بارے میں غلط اندازے لگانے والے چھڑے چھانٹ شادی دفاتر سے لٹ کر کسی اور امید میں ہیں۔ بھائی قیصر اعوان اللہ آزادی نصیب فرمائیں، تبصرہ اچھا۔ باہر عباس کھاریاں، 70 ویں سالگرہ مبارک ہو۔ مجھ سے دس سال بڑے مجھے عیدی ارسال کریں۔ مسٹر ماہا ایمان بھی اوکاڑہ بھی سیالکوٹ، حافظ آباد، پنجاب کس کی تلاش ہے؟ سعد یہ بخاری انک، انک میں سیلاب آتا تو چوہے ڈوب جاتے۔ بشری افضل بہادر پور، محمد صد ویکل محفل میں جگہ کم تھی زیادہ دل برداشتہ ہوں۔ ایک آپ ہی نہیں، اس محفل دکھ درد کے مارے ہم بھی ہیں۔ قیصر اقبال کچھ، بیکر الٹا نک واقعات اللہ اپنی امان میں رکھیں۔ سہنس و سرگزشت رابطہ میں واقعی لا جواب۔ کنگول صفحات کم ہیں۔ لیاقت کا کارنامہ آنکھیں کدھر؟ دربار کی تصاویر لینے والا کون اور کیا کرتا ہے؟ سچی حاصل فیصل بہت عظیم انسان، کاش سفینہ ماں کی باتوں میں آکر اپنا گھر برباد نہ کرتی۔ انکشاف اچھی تحریر، قلم ایسا واقعہ پڑھا۔ شبانہ، مدحت، رشید سیال، کامران خالد، حسب چنائے اچھے اشعار۔ مسافر، دلچسپ مرحلہ میں داخل۔ رنگو سے شہر یار کا انتقام، بھی خاندان سے گلیے کا بدلہ، سردار حیدر خان سے کب دو دو ہاتھ کرتا ہے؟ ایک بوری کھجور، صحرائیں سانپ کے تو بہت واقعات۔ ڈاکٹر بہت عظیم انسان لندن کی شاہانہ زندگی چھوڑ کر غریب وکھی لوگوں کا علاج اللہ نیک اجر دیں گے۔ بزدل، واہ مریم کے خان، گلیے بزدل کی کہانی لائی ہو۔ سینا، موری، ایسلی سب کو بے وقوف بنا کر اب اچھی لڑکی سے شادی کر کے زندہ دل بن جائے۔ تکمیل خواہش، شہت بیگ بہت عظیم انسان، فیروز نے غلط روش چھوڑ کر اچھا کیا۔ بیتی کو دیکھنے کی خواہش پوری کر لی۔ اب راشد و صوبہ کی شادی کے ساتھ شہرت کی غلط فہمی دور ہو جانے سے شہت صاحب کو خاتم سے ضرور نکاح کر لینا چاہیے۔ مطلقہ سے نکاح ثواب کا کام ہے۔"

✽ تابی اور بالو، صفدر آباد سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ "اپنے پیارے سہنس 21 اگست کو چار پانچ پکر لگانے کے بعد بالآخر مل گیا۔ تجربوں نے میرا خط شائع ہونے کی خبر سنائی تھی مگر اپنا خط دیکھ کر نہ لگ گیا۔ آپ کی قیمتی ایک طرف اور دوسری لوڈ شیڈنگ، پورے ملک کو تنگ کر رکھا ہے۔ پچھلے ماہ مسافر نہیں پڑھی تھی سو اس دفعہ دونوں اقساط اکٹھی پڑھیں۔ میڈم ٹیکلہ کی دردناک داستان اختتام پر پہنچی اور دوبارہ مسافر کا سفر جاری ہو گیا۔ اس دفعہ کی قطع بھی زبردست رہی۔ پھر طاہر جاوید مغل کی انکشاف میں انکشاف کی تلاش کرنے لگا۔ بہت خوب صورت تحریر تھی اور سچ ہے کہ ہر کسی کے دل میں پہلی محبت کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ آخری صفحات میں نشور ہادی، تکمیل خواہش لیے حاضر تھے۔ کھودا پہاڑ لکھا چوہا۔ برے کا انجام برائی ہوتا ہے۔ محفل میں ایک دوسرے کی ناگہان بھی پہنچی جاری تھیں مگر کچھ دوست محبت اور خلوص کا ذکر بھی کر رہے ہیں اور یہ سچ ہے کہ ہم محفل میں سادگی خطوط میں جتنی مرضی ایک دوسرے پر تنقید یا مذاق اڑائیں، ویسے آپس میں بہت محبت اور خلوص سے ملتے ہیں، بات کرتے ہیں۔" (بے شک۔۔۔۔۔ آپ نے درست فرمایا)

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
حسین عباس بلوچ، سرگودھا۔ عظیم خان، سلامت پورہ، لاہور۔ سیدی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ۔ افتار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، کریم یارک، لاہور۔ اعجاز احمد راجیل، ساہیوال۔ قیصر اقبال کچھ، بیکر۔ ڈیشان بدر شیر، نیو شہر ٹاؤن، دہشت۔ ابراہ وارث، سندھ، طلیا توالی، محمد جاوید، علی پور۔ ساجدہ راجا، ہندواں، ضلع سرگودھا۔ محمد جاوید گل، چندا، چوہدری والا، فضل آباد۔ حبیب احمد چنائے، الکڑی، کرک۔ محمد صفدر سخاویہ، خانوال



یار وفادر

ایسا سیتا پوری

ہر دن آسمان پر سورج طلوع ہوتا ہے اور ہر رات چاند ستاروں کے جھرمٹ میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے مگر... جانے کیوں ہر آنے والا دن جانے والے کل سے مختلف گزرتا ہے... کچھ بھی تو پہلے جیسا نہیں ہوتا، پل پل گزرتا وقت جب تاریخ میں ڈھلتا ہے تو دھیرے دھیرے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کہانی رقم ہو رہی ہوتی ہے... ایسے ہی محلاتی سازشوں اور عیار احباب کے درمیان فرخ سیر کی سلطنت میں بھی کتنے ہی یادگار واقعات رونما ہوئے، کتنے خطرناک فیصلے اور انجام سامنے آئے... کتنے رشتے غرض کی بھینت چڑھے... اس وقت کی زندہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا... فعال دماغ جس طرح یادوں کو محفوظ کر سکے... آج ہماری آگاہی انہی کی مرہون منت ہے... انتقام کی آگ میں جلنے والے لوگ جب گل و گلزار کا منظر دیکھتے ہیں تو ایک ٹھنڈی پھوار تمام بھڑکتے شعلے بجھا دیتی ہے... فرخ سیر بھی اپنی کم عقلی کے طفیل دشمنوں کی بھینت چڑھنے کے باوجود اس حسیں جاں سوز کے ایک جلوے کو کبھی قراموش نہ کر سکا... جسے پانا مشکل تھا اور کھونا بھی ناممکن... مگر ایک احساس تھا جو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہا۔ بادشاہوں کی نفرت بھی عجب اور محبت بھی نرالی... ان کے عشق کی کتاب میں انتساب بھی غضب اور انجام بھی غضب ہوتا ہے۔ ان کی کتاب میں لفظ نہیں کہیں نہیں ہوتا اگرچہ مقدر میں کتنی ہی ناکامیاں کاتب نے لکھ ڈالی ہوں۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں

کے عبرت اثر واقعات

ذوالفقار خاں کو اپنے بوڑھے باپ اسد خاں کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہ تھا کہ جہاں دارشاہ کو فرخ سیر کے حوالے کر کے خود نئے بادشاہ کے وفاداروں میں شامل ہو جائے کیونکہ اسے یقین تھا کہ فرخ سیر اسے معاف نہیں کرے گا لیکن اس کے بوڑھے باپ اسد خاں نے بیٹے کو جھڑک دیا اور کہا۔ ”کیا تو نہیں جانتا کہ ہم خاندان مظہر کے نمک خوار ہی نہیں، رشتے دار بھی ہیں۔ میں شاہجہاں کا ہم زلف اور اورنگ زیب کا حقیقی خالو بھی ہوں تو اورنگ زیب کا سگا خالہ زاد بھائی ہے کیا فرخ سیر ان رشتوں کا خیال بھی نہیں کرے گا؟“

ذوالفقار خاں نے زہریلی ہنسی سے جواب دیا۔ ”یہ آپ ان لوگوں سے مروت، ہمدردی اور عنف و ترحم کی امید کر رہے ہیں جو باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو نہیں بخشتا، بھائی، بھائی کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھر دیتا ہے اور بیٹا باپ کو قید خانے میں سزا دیتا ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے جہاں دارشاہ کے ساتھ ملتان یا کابل چلے جانے دیجیے، میں وہاں تیاری کر کے ایک بار پھر فرخ سیر کے خلاف نبرد آزما ہو سکتا ہوں، اگر ہم جہاں دارشاہ کو فرخ سیر کے حوالے کر دیں گے تو یہ نمک حرامی ہوگی، غداری ہوگی اور ہم فرخ سیر کی نظر میں کوئی خاص مرتبہ نہیں حاصل کر سکیں گے۔“

بوڑھے باپ کو غصہ آگیا، مستحکم ہو کر ٹھٹھلے لگا، بولا۔ ”تیرے سر میں اختیار اور اقتدار کا سودا سا گیا ہے جو تیری جان لے کر رہے گا۔ تو اس بادشاہ کی حمایت میں فرخ سیر سے جنگ کرنا چاہتا ہے جسے لال کور نے کہیں کا بھی نہیں رکھا اور جو میدان جنگ سے لڑے بغیر ہی لال کور کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ میں تجھے یہ رائے ہرگز نہ دوں گا کہ تو کسی سفلے بادشاہ کے لیے خود کو ہلاکت میں ڈالے۔“

ان دونوں باپ بیٹے میں رات بھر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ ان دونوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ صبح فجر کی اذان سن کر دونوں نے وضو کیا اور مسجد چلے گئے، جب یہ دونوں نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے تو ایک شخص نمازیوں کو چرتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھا۔ ذوالفقار خاں کو شبہ گزرا، اس نے اپنی کمر سے خنجر نکال لیا اور اجنبی کو حکم دیا۔

”خبردار جو قریب آئے، کیا بات ہے؟“

اجنبی نے بھی خنجر نکال لیا لیکن حملہ کرنے کے بجائے اسے زمین پر گرادیا اور دور ہی سے کہا۔ ”میں دونوں سیدوں کا قاصد ہوں اور آپ کے نام ان کا ایک پیغام لایا ہوں۔“

اسد خاں نے اپنے قریب بلا لیا، پوچھا۔ ”ہاں تو کیا

پیغام ہے؟“

اس شخص نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ”دونوں بھائیوں نے متفقہ طور پر کہلوایا ہے کہ اگر آپ دونوں ان کے توسط سے بادشاہ کے پاس جائیں گے تو معاف کر دیے جائیں گے ورنہ آپ دونوں کی جانوں کو سخت خطرہ ہے۔“

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے پھر اسد خاں نے اس اجنبی کو جواب دیا۔ ”جاؤ اور دونوں سیدوں کو مطلع کر دو کہ ہم دونوں آپ ہی کی شفاعت سے بادشاہ تک جائیں گے۔“

اجنبی نے اپنا خنجر زمین سے اٹھایا اور یہ جاوہ جا، کہیں غائب ہو گیا لیکن جب یہ دونوں اپنے گھر پہنچے تو وہاں ایک شخص کو انتظار کرتے دیکھا۔ اسد خاں نے کہا۔ ”کہو تقریب خاں تم کیسے آئے؟“

تقریب خاں احتراماً کھڑا ہو گیا، بڑی چالوسی سے بولا۔ ”مجھے ابھی ابھی یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ دونوں کے پاس سیدزادوں کا کوئی آدمی آیا تھا؟“

اسد خاں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”لیکن اس طرح تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ مجھے بھی تو معلوم ہو۔“

تقریب خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے شریعت اللہ خان خاناں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مسجد ہی میں آپ سے بات کر سکتا تھا لیکن وہاں سیدزادوں کا آدمی دیکھ کر مجھے یہاں آنا پڑا۔“

ذوالفقار خاں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ”آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

تقریب خاں نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک جائزہ لیا پھر اسد خاں سے سرگوشی میں کہا۔ ”جناب والا! شاید آپ دونوں نہیں جانتے کہ بادشاہ سیدزادوں سے بہت ناراض ہے اور وہ ان دونوں سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں ہے چنانچہ اگر آپ دونوں سیدزادوں کے توسط سے بادشاہ کے پاس گئے تو آپ کا خدا ہی حافظ لیکن اگر آپ ہمارے آقا شریعت اللہ کے ذریعے بادشاہ تک جائیں گے تو اس کی ذمہ داری میں لینے کو تیار ہوں کہ آپ دونوں کا کوئی ہال بھی بیکار نہیں کر سکے گا۔“

دونوں باپ بیٹے سوچ میں پڑ گئے پھر پوچھا۔ ”اور تقریب خاں! اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارا آقا ہمیں واقعی معافی دلوا دے گا؟“

تقریب خاں نے پوچھا۔ ”قرآن پاک تو ہوگا گھر میں، ذرا اسے منگو دیجیے۔“

اسد خاں نے دریافت کیا۔ ”قرآن پاک کس مسلمان کے گھر میں نہیں ہوگا۔“

تقریب خاں نے کہا۔ ”اسے ذرا منگو دیجیے۔“

تھوڑی دیر بعد قرآن پاک آگیا، تقریب خاں نے اسے سر پر رکھ لیا اور قسم کھاتا ہوا ٹھٹھلے لگا، وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر میں غداری کروں یا پھر اپنے آقا شریعت اللہ سے مل کر فریب کروں تو قرآن پاک کا عتاب مجھے ہلاک کر دے۔“

اسد خاں نے پوچھا۔ ”یہ بادشاہ دونوں سیدزادوں سے ناراض کیوں ہے آخر؟“

تقریب خاں نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کا خیال ہے کہ دونوں سیدزادے اس زعم میں ہیں کہ ان کی کوششوں سے فرخ سیر کو حکومت ملی ہے۔ کاروبار سلطنت میں بہت زیادہ دخل دینے لگیں گے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کوئی بڑا آدمی ان سیدزادوں کی بے رحمی اور خود غرضی کی بھیئت چڑھ جائے۔“

تقریب خاں قرآن پاک کو سر پر رکھ کر دوبارہ تین بار چلا اور یہی قسم کھاتا رہا۔ اسد خاں نے کہا۔ ”تقریب خاں، تم اپنے آقا شریعت اللہ کو مطلع کر دو کہ ہم دونوں اس کے توسط سے فرخ سیر کی بارگاہ میں پہنچیں گے لیکن اب قرآن پاک کی قسم کے بعد تم دونوں پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ہماری حفاظت کرو۔“

تقریب خاں نے قرآن پاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس سے بھی بڑی کوئی چیز ہے اس دنیا میں؟“

اسد خاں کے فیصلوں سے ذوالفقار خاں قطعی مطمئن نہیں تھا لیکن باپ کا حکم ماننا ہی پڑا۔ تقریب خاں چلا گیا اور دونوں باپ بیٹے فرخ سیر کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگے۔

بادشاہ فرخ سیر شاہجہاں سے متصل بارہیلے پر خیمہ زن ہوا، یہاں عہدے، مناصب اور خطابات کی تقسیم شروع ہوئی۔ سادات بارہیلے کے دونوں بھائیوں میں بڑے بھائی سید عبداللہ خاں کو قطب الملک، عین الدولہ، ظفر جنگ سپہ سالار، یار وفادار کے خطابات سے نوازا کر اپنا وزیر اعظم بنالیا۔ چھوٹے بھائی سید حسین علی خاں کو عمدۃ الملک امیر الامرا فیروز جنگ سپہ سالار کے خطابات ملے اور میر بخش کا عہدہ عطا ہوا۔ شریعت اللہ خاں کو محمد الملک میر جملہ معظم خاں خانخاناں بہادر مظفر جنگ کے خطابات اور داروغہ دیوان خاص، داروغہ قسمل خانہ و ڈاک چوکی کا عہدہ دیا گیا۔ شریعت اللہ خاں جو بعد میں میر جملہ کے نام سے مشہور ہوا، اس اعتبار سے اہم شخص تھا کہ شاہی مہر اس کے پاس رقتی تھی اور بادشاہ کے سامنے فرامین اور احکام پیش کر کے

دستخط لینا میر جملہ کا فریضہ تھا۔

میر جملہ نے جب تقریب خاں سے یہ سنا کہ اسد خاں اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کے ساتھ حاضری دینے پر آمادہ ہو گیا تو بہت خوش ہوا۔ اس نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ شکار قابو میں آچکا ہے۔ بادشاہ کو اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو سزا دینے میں تامل تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا تقریب خاں نے ان دونوں کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ خود سے میرے روبرو حاضر ہو جائیں تو ان کی جان بخشی کر دی جائے گی؟“

”جی جہاں پناہ۔“ میر جملہ نے جواب دیا۔

”تقریب خاں کو بہر صورت ان دونوں کو یہ یقین دلانا تھا کہ حضور انہیں معاف فرمادیں گے۔ اس لیے تقریب خاں کو یہ یقین دلانے کے لیے کلام اللہ کو سر پر رکھ کر قسم کھانی پڑی۔ اگر درمیان میں کلام اللہ نہ لایا جاتا تو اسد خاں ہماری کسی بات پر بھی یقین نہ کرتا لیکن اب شکر ہے کہ آخر کار وہ دونوں ہمارے قابو میں آچکے ہیں۔“

بادشاہ نے متامل لہجے میں کہا۔ ”اگر ان دونوں کو معاف ہی کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟“

میر جملہ اس طرح اچھلا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، بولا۔ ”جہاں پناہ! کہیں ایسا کیجیے گا بھی نہیں۔ اگر آپ میرا مشورہ قبول فرمائیں تو بس ایک ہی وار میں ان دونوں کا کام تمام کروادیں، کیونکہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ پرانی عمارتوں کو زمیں بوس کر دیا جائے اور ان کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر کی جائیں اس طرح پرانے امرا کو ذلیل و خوار کر دیا جائے اور ان کی جگہ نئے امرا کو موقع دیے جائیں۔ پرانے امرا سازشیں کر سکتے ہیں، باتیں کر سکتے ہیں اور حضور کو ان فتنوں سے بچتا ہے۔“

لیکن سیدزادوں کو میر جملہ سے اختلاف تھا۔ یار وفادار عبداللہ خاں نے بادشاہ کو سمجھایا۔ ”اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار خاں کے معاملے میں ہوش مندی اور سمجھ داری سے کام لیا جائے تو بہتر ہے۔“

مگر فرخ سیر پر میر جملہ کا جادو چل چکا تھا۔ اس نے اپنے فیصلے کا اظہار تو نہیں کیا لیکن وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ میر جملہ ہی کے فیصلے پر عمل کرنا ہے۔

عبداللہ خاں نے باہر نکل کر میر جملہ کو ڈانٹا۔ ”میر جملہ! تم جو کچھ کر رہے ہو اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

میر جملہ نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”عبداللہ خاں! اپنے ہوش و حواس درست رکھو اور آئندہ اس بات کا خیال رکھو کہ تمہارا مجھ سے تصادم نہ ہو تو بہتر ہے۔“

اسد خاں نے سر آہ بھری، بولا۔ ”آہ میر جملہ! اب تو اس دل میں جینے تک کی خواہش نہیں۔“

زہرہ نے اسد خاں کو آب دیدہ دیکھا تو خود بھی بے چین ہو گئی، بولی۔ ”آپ ملول نہ ہوں، گوکہ یہ زخم ایسا نہیں ہے جسے آپ ہی خوشی جھیل لیں۔“

زہرہ کی کانوں میں رس گھولتی ہوئی آواز میر جملہ کے دل میں اتر گئی اور وہ دل موس کر رہ گیا۔ دوسری طرف تقریب خاں الگ بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے معلوم نہیں کس طرح زہرہ کی ایک جھلک بھی دیکھ لی اور اسی لمحے اسے اپنا دل دے بیٹھا۔ میر جملہ کو اس کی موجودگی بری طرح کھل رہی تھی۔ اس نے تقریب خاں کو حکم دیا۔

”تقریب خاں! اب تم واپس جاؤ کیونکہ اس جلوس میں تمہاری ضرورت باقی نہیں رہی۔“

تقریب خاں نے سرکشی اختیار کی، بولا۔ ”ایک ایسا جلوس جس کے ساتھ ہم چل رہے ہیں زندگی میں بار بار دیکھنے کو نہیں ملتا اس لیے میں آپ کا حکم نہ ماننے پر مجبور ہوں۔“

میر جملہ غصے میں پاگل ہو گیا، بولا۔ ”میں تجھے معزول کر سکتا ہوں، تجھ سے بھیک منگواسکتا ہوں، تجھے اپنی اس سرتابی کی سزا بھگتنا ہوگی۔“

تقریب خاں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ اس وقت میں یہاں سے چلا جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔“

میر جملہ غصے میں کپکپانے لگا۔ اب اس جلوس میں فرخ سیر کا شاہی جلوس بھی شامل ہو چکا تھا۔ بادشاہ کی سواری آگے آگے تھی۔ اس کے پیچھے اس کے امرا اور دوسرے عہدے دار تھے۔ ان کے پیچھے اس شخص کی لاش تھی جو چند دن پہلے یہاں کا بادشاہ تھا۔ میر جملہ اور تقریب خاں بھی شاہی جلوس میں شامل ہو گئے۔ سڑکوں کے کنارے اور چھتوں پر ٹھٹ کا ٹھٹ لگا تھا جو ایک ایسے جلوس کا نظارہ کر رہا تھا جس کا آغاز شان اور اقبال سے ہوتا تھا اور اس کا انجام زوال اور عبرت تھا۔ فرخ سیر کی شان و شوکت نے جہوم کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں کی لاشوں کے منظر نے۔ انہوں نے اس بوڑھے کی پاکی بھی دیکھی جس کا ایک شاندار ماضی تھا اور اس کی نیک نفسی اور شرافت کا ایک زمانہ گواہ تھا۔

اس کے بعد اسد خاں کو خان جہاں بہادر کوکلتاش کے محل میں قید کر دیا گیا۔ زہرہ نے روتے ہوئے اسد خاں کو الوداع کیا۔ تقریب خاں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اسد خاں کی

آپ میری باتیں سن رہے ہیں؟“

اسد خاں نے پوچھا۔ ”تقریب خاں کہاں ہے؟ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

تقریب خاں نے اپنا گھوڑا پاکی کی طرف لے جانے کی کوشش کی لیکن میر جملہ نے اسے روک دیا، بولا۔ ”تم میری جگہ پر آ جاؤ۔“

تقریب خاں نے عرض کیا۔ ”جناب والا! میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں، کوئی حکم ہے تو دیجیے۔“

اسد خاں نے پوچھا۔ ”کیا تجھے اپنا وہ عہد یاد ہے جو تو نے قرآن پاک سر پر رکھ کر ہم سے کیا تھا؟“

تقریب خاں ذرا بھی نہ شرمایا، بولا۔ ”لیکن میں نے وہ قسم جن لوگوں کی ایما اور خواہش پر کھائی تھی اس کا عذاب بھی انہی کی گردن پر پڑے گا۔“

میر جملہ نے تقریب خاں کو ڈانٹا، بولا۔ ”تقریب خاں! اپنی کھال میں رہ، میری موجودگی میں اسد خاں سے تو بات نہیں کرے گا۔“

تقریب خاں چپ ہو رہا۔ میر جملہ کی نظریں بار بار پاکی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسد خاں بھی ان کی نیتوں کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اس نے آہستہ سے زہرہ سے کہا۔ ”بہنی زہرہ! بھیڑیے تیری بوسوگھ کر پاکی کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔“

زہرہ نے آواز کی کپکپاہٹ اور لہجے کی کمزوری سے خوب اچھی طرح یہ اندازہ لگایا کہ اسد خاں کا غم سے بہت برا حال ہے۔

میر جملہ نے پوچھا۔ ”قبلہ اسد خاں! یہ لڑکی کون ہے؟“

اسد خاں نے جواب دیا۔ ”میں اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کی امانت کو اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔“

میر جملہ نے پوچھا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ اس طرح آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

اسد خاں نے جواب دیا۔ ”اس طرح میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ زہرہ میری بہو ہے اور اب میں اسے اپنی ناموس سمجھ رہا ہوں۔“

”خوب۔“ میر جملہ ہنسا۔ ”قبلہ! بد قسمتی سے یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے آپ کو۔ اب تو تلخ کلامی سے باز آ جائے ورنہ بالکل ممکن ہے کہ آپ کے مخالفین آپ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیں گے۔ آپ کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ دربار کے ان امرا کو خوش رکھیں جن کی بادشاہ کے دل میں خاص عزت و وقعت ہے۔“

کے گلے میں تسمہ ڈال کر کننا شروع کر دیا۔ اس نے آزادی کی جدوجہد کی لیکن ناکام رہا۔ دم گھٹتا چلا گیا۔ ذوالفقار خاں کو چند طاقتور آدمیوں نے دیوبچ کر بے بس کر دیا تھا اور اسے اس وقت چھوڑا جب وہ تھر تھر کپکپا کر ساکت ہو گیا۔

دوسری طرف سابق بادشاہ جہاں دار شاہ کو اسی طرح تسمہ ڈال کر ہلاک کر دیا گیا۔ تسمہ ڈال کر ہلاک کرنا فرخ سیر کی اپنی ایجاد تھی۔ پھر فرخ سیر کے حکم سے جہاں دار شاہ کا سر ایک ہاتھی پر رکھا گیا اور دوسرے ہاتھی پر اس کی لاش رکھی گئی اور اسی طرح ایک دوسرے ہاتھی پر ذوالفقار خاں کی لاش رکھ دی گئی۔ اس ہاتھی کے پیچھے بوڑھے اسد خاں کی پاکی تھی اور اسے یہ سزا ملی تھی کہ وہ اس جلوس کے ساتھ ساتھ رہے۔ اس پاکی کے پیچھے اسد خاں کی خواتین کی سواریاں تھیں اور وہ بھی ذوالفقار خاں کی وجہ سے جلوس کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور تھیں۔

میر جملہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں کے اس حشر سے بہت خوش تھا۔ وہ اپنے گھوڑے پر نہایت شان اور حمکت سے جلوس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، ذرا پیچھے پیچھے تقریب خاں اپنے گھوڑے پر سوار اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک ان دونوں کی نظریں ایک

خوبرو جوان لڑکی پر پڑیں جو معلوم نہیں کس طرف سے آ کر اسد خاں کی پاکی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اسد خاں نے اس لڑکی سے کس قسم کی باتیں کیں، میر جملہ یا تقریب خاں کو کچھ پتا نہ تھا لیکن جب ان دونوں نے اس لڑکی کو اسد خاں کی پاکی میں بیٹھتے دیکھا تو بڑی تشویش ہوئی کہ لڑکی کو جس حد تک دیکھا تھا اس سے ان دونوں نے بخوبی یہ اندازہ لگایا

تھا کہ وہ بہت حسین ہے لیکن یہ ہے کون، اس کا ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی علم نہ تھا۔ وہ دونوں جلوس کے ساتھ ساتھ چل تو ضرور رہے تھے لیکن اب ان کا دل نہیں لگ رہا تھا اور ان دونوں کے دلوں میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کس طرح اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں یا اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کیا جائے۔

میر جملہ نے اپنا گھوڑا اسد خاں کی پاکی کی طرف بڑھایا اور قریب پہنچ کر اسد خاں کو مخاطب کیا۔ ”جناب والا! میں آپ کا خیر خواہ میر جملہ آپ کی پاکی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں، اس طرح میں یہ کوشش کر رہا ہوں کہ اس وقت آپ جن مصیبتوں کے شکار ہیں ان کی اذیتوں کو کم کیا جائے۔“ اسد خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میر جملہ نے اسد خاں کو دوبارہ مخاطب کیا۔ ”قبلہ! کیا

عبداللہ خاں نے غصے میں کہا۔ ”میر جملہ! میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم دونوں کا تصادم نہ ہو لیکن تصادم ناگزیر ہے۔ تم ایک کم ظرف اور کمینے انسان ہو اور مجھے ایک نہ ایک دن تمہیں یہ سبق دینا پڑے گا کہ شرفا جب برائی پر آمادہ ہوتے ہیں تو پھر وہ کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔“

میر جملہ نے کوئی جواب دینے کے بجائے اندر کا رخ کیا۔ وہ فی الحال عبداللہ خاں سے بالکل الجھٹا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دیر بعد اسد خاں اپنے بیٹے ذوالفقار خاں کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ ان دونوں سے عزت و احترام سے پیش آیا۔ کچھ دیر تک اسد خاں اور بادشاہ میں گلے شکوے ہوتے رہے۔ بادشاہ نے یہ ظاہر ان دونوں کو معاف کر دیا لیکن اندر ہی اندر انتقام کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسد خاں نے رخصت کی اجازت چاہی، بادشاہ نے دے دی لیکن ساتھ ہی اسد خاں سے کہا۔ ”ذوالفقار خاں ابھی یہیں رہے گا کیونکہ مجھے اس سے ضروری مشورے کرنے ہیں۔“

بوڑھے اسد خاں کا ماتھا ٹھنکا لیکن شاہی فرمان کی بجا آوری کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا وہ چلا گیا۔

☆☆☆

بادشاہ نے پہلے تو ذوالفقار خاں سے اپنے باپ اور بھائی کے قتل کا قصاص طلب کیا۔ ذوالفقار خاں نے نقشے کو بدلا ہوا دیکھ کر خود کو بدل دیا اور بادشاہ سے تلخ کلامی کرنے لگا۔

بادشاہ نے کہا۔ ”ذوالفقار خاں تو نے نمک حرامی کی ہے۔“

ذوالفقار خاں نے جواب دیا۔ ”نمک حرامی تو اس وقت ہوتی جب میں اپنے بادشاہ جہاں دار شاہ کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا۔ میں آخر وقت تک اپنے بادشاہ کا وفادار اور نمک خوار رہا ہوں اور اس وقت بھی اگر جہاں دار شاہ قیدی کی حیثیت سے تمہارا مہمان ہے تو اس میں میرے باپ اسد خاں کا ہاتھ شامل ہے ورنہ میں اس طرح تمہارے سامنے کھڑا سوال جواب نہ کر رہا ہوتا۔“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”ذوالفقار خاں! واللہ میں تجھے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔“

ذوالفقار خاں ہنسا، بولا۔ ”حالانکہ تقریب خاں نے قرآن پاک کو گواہ بنا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ ہماری جان بخشی کی جائے گی۔“

فرخ سیر نے جواب دیا۔ ”اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

اس کے بعد بادشاہ نے تالی بجائی، ذوالفقار خاں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ ان لوگوں نے ذوالفقار خاں

خواتین، زہرہ کو اپنے گھر میں جگہ دے سکتی تھیں لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ تقرب خاں آگے بڑھا اور اس نے زہرہ کو پیشکش کی۔

”لڑکی! میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا کہ تو ساٹھ سالہ ذوالفقار خاں سے محبت کرتی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں حاضر ہوں، میرا نام تقرب خاں ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مجھے نئے بادشاہ کا قرب حاصل ہے۔ اگر میں تیرا سہارا بننا چاہوں تو کیا تو یہ پسند کرے گی؟“

زہرہ نے بڑی بے بسی سے تقرب خاں کی طرف دیکھا۔ تقرب خاں نے اس کی آنکھوں میں ایک خشک محرا سا محسوس کیا۔ بادام جیسی مخمور آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب نے ایک ایسی خشکی چھوڑ دی تھی جو عموماً ان حصوں میں پائی جاتی ہے جہاں سے سیلاب اپنا اثر چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ زہرہ کی خاموشی سے تقرب خاں نے یہ اندازہ لگایا کہ شاید وہ کچھ کچھ رضامند ہوگئی ہے۔ وہ امید افزا لہجے میں کہتا رہا۔

”اور رہا یہ سوال کہ میں تمہیں کتنا خوش رکھوں گا، تو اس کے لیے اتنا ہی جتنا دینا کافی ہے کہ میں جوان آدمی، ساٹھ سالہ بوڑھے ذوالفقار خاں سے زیادہ ہی خوش رکھ سکوں گا۔“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! جب میں تجھے جانتی ہی نہیں تو، تو مجھے کیوں تنگ کر رہا ہے اور رہا یہ امر کہ میں ایک ساٹھ سالہ مقتول کے مقابلے میں تجھے جوان کو قبول کر لوں تو دونوں کے معاملے کہنے سننے سے نہ تو طے پاتے ہیں، نہ ٹوٹتے ہیں۔ میں نے ذوالفقار خاں کو کسی اور ہی حیثیت میں قبول کیا تھا اور اسے آج بھی دل سے چاہتی ہوں۔“

تقرب خاں نے ذرا ناگواری سے کہا۔ ”اگر تمہاری یہ باتیں بادشاہ کے کانوں تک پہنچ جائیں تو وہ معلوم نہیں تمہارا کیا حشر کر دے۔“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”اب مجھے اپنے کسی حشر و شرکی نہ تو کوئی فکر ہے اور نہ ہی خوف۔ ذوالفقار خاں کے قتل کے بعد اس سے بڑی کوئی مصیبت میرے لیے نہیں ہوگی۔“

تقرب خاں نے دھمکی دی۔ ”اے لڑکی! میرے بعد تیرا ایک اور امیدوار تجھ سے ملے گا۔ اگر تو اس پر ملتفت ہوئی تو اس کا برا انجام ہوگا۔“

زہرہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ زہرہ کے گھر

والے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ آخر انہوں نے زہرہ کو اس گلی میں پالیا جہاں گل فروشوں کی دکانیں ایک قطار میں دور تک چلی گئی تھیں۔ زہرہ کا استاد، جسے وہ اپنا باپ سمجھتی تھی، زہرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”زہرہ! ذوالفقار خاں کے سوگ میں تو نے جو روش اختیار کر رکھی ہے، ویسی روش تو ہندوستان کی بیابان عورتیں بھی نہیں اختیار کرتیں حالانکہ وہ اپنے شوہروں کی بیویاں ہوتی ہیں اور تو تو ذوالفقار خاں کی بیوی بھی نہیں تھی۔“

زہرہ اپنے سامنے اپنے استاد کو دیکھ کر پریشان ضرور ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی پریشانی پر جلد ہی قابو پالیا۔ اس نے سوگوار مسکراہٹ سے جواب دیا۔

”چاچا جی! ہٹا دیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک شادی تو وہ ہوتی جو والدین کر دیتے ہیں، قاضی نکاح پڑھاتے ہیں اور دو آدمی اس کے گواہ بن جاتے ہیں..... اور دوسری شادی وہ ہوتی ہے جس کا نہ تو کوئی گواہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی قاضی اس کا نکاح پڑھاتا ہے۔ جن لڑکیوں یا عورتوں کے بزرگ شادیاں کرتے ہیں، ان کے شوہر عموماً ان کے والدین کے شوہر ہوتے ہیں۔ اس لیے قدرتی طور پر ایسے شوہروں کی موت کا غم بھی ان کی بیویوں کے بجائے ان کے والدین کو ہونا چاہیے لیکن میں، جس نے ذوالفقار خاں سے کسی قاضی اور گواہ کے بغیر ہی شادی کر لی تھی، اس لیے اس نقصان پر ملول بھی مجھ ہی کو ہونا چاہیے۔“

زہرہ کے استاد نے سوچا۔ لڑکی کا شاید دماغی توازن جاتا رہا ہے جو ایسی بہکی بہکی، ناقابل فہم باتیں کرتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”زہرہ! میں یہ نہیں کہتا کہ تو ذوالفقار خاں کا سوگ نہ مٹا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آج تک کسی آدمی کا بھی ایسا سوگ نہیں منایا گیا کہ اسے زندگی بھر کے لیے اپنے دل و دماغ پر طاری کر لیا گیا ہو۔ تو میرے ساتھ گھر چل، شہر کے حالات بہت ہی خراب ہیں، جب یہ حالات اعتدال پر آجائیں تو جو سمجھ میں آئے کرتا۔ میں تیرے معاملے میں کوئی دخل نہیں دوں گا۔“

زہرہ نے اپنے استاد کی بات مان لی اور اس کے ساتھ گھر چلی گئی۔ گھر پر استاد نے اسے مزید سمجھایا۔ ”زہرہ! تو جوان بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ اس کے ساتھ ہی تو کلا کار بھی ہے۔ ناپتے گانے کے فن سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ تیرا شمار کلاوتوں میں ہوتا ہے، تیری یہ خصوصیات تیرے لیے بلائے بے درماں ثابت ہو سکتی ہیں اور اس انتشار کے دور میں اگر کسی امیر یا منصب دار کی تجھ

پر نظر پڑ گئی تو تیرا سارا عشق اور پندار دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔“ یہ بات زہرہ کی سمجھ میں بھی آگئی اور وہ خاموشی سے گھر میں بیٹھ گئی۔

دوسری طرف میر جملہ زہرہ کی تلاش میں تھا، درباری مصروفیات اسے اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتی تھیں۔ اسے سب سے زیادہ ڈردو لوں سیدزادوں سے لگتا تھا۔ ان کا اثر و رسوخ، ان کی بہادری، ان کی ہوشیاری، یہ ساری باتیں میر جملہ کے لیے مستقبل خطرہ تھیں۔ میر جملہ کو بادشاہ فرخ سیر پسند کرتا تھا اور اس نے اسے داروغہ دیوان و ڈاک کا منصب بخشا تھا لیکن سید عبداللہ خاں و سید حسین علی خاں اپنی محنت اور کوشش سے یہاں تک پہنچے تھے۔ عبداللہ خاں وزیر تھا تو اس کا چھوٹا بھائی سید حسین میر بخشی گویا وزارت اور فوج، دونوں اہم جگہوں پر یہ دونوں بھائی قابض تھے۔ دوسری طرف یہ دونوں بھائی بھی میر جملہ سے چوکنار رہتے تھے کیونکہ میر جملہ جس منصب پر فائز تھا، اس کی وجہ سے وہ بادشاہ کی خلوت و جلوت میں موجود رہتا تھا اور اسے لگائی بجھائی کا بڑا وقت ملتا تھا۔ میر جملہ زہرہ کو تلاش کرتا لیکن اس کو اس کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ یہ کام تقرب خاں کے سپرد بھی کر سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ تقرب خاں اس معاملے میں اس کا پہلے دن سے ہی رقیب بن چکا ہے۔

جب فرخ سیر کو قلعے اور محل میں ذرا اطمینان ہوا تو اس نے میر جملہ کی سفارش پر دیوان خالصہ (آراشی انتظام) کا عہدہ چھیلے رام ناگر کو اور صدر الصدور (مذہبی امور) کا منصب افضل خاں استاد کو دیا۔ عبداللہ خاں صدارت اور دیوانی پر اپنے آدمی مقرر کرنا چاہتا تھا۔ اس کو ان تقرریوں پر اعتراض ہوا۔ عبداللہ خاں نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ ان تقرریوں کو برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اس نے صاف صاف کہہ دیا۔

”حضور والا! اگر آغاز کا رہی میں میری باتوں کو اہمیت نہ دی گئی تو پھر میری وزارت کا اعتبار ہی کیا ہوگا اور میں امور سلطنت کو بحسن و خوبی کس طرح انجام دے سکوں گا۔“

میر جملہ سامنے ہی موجود تھا، اس نے عبداللہ خاں سے نظریں چراتے ہوئے عرض کیا۔ ”ہر چند کہ بادشاہ، بندگان درگاہ کو صاحب اختیار بنادیتے ہیں لیکن ملازمین کو بھی اپنی حد پہنچانی چاہیے اور انہیں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جو بادشاہ کے شایان شان نہ ہو یعنی انہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بادشاہ کی رضامندی ضرور

حاصل کر لینی چاہیے۔“

عبداللہ خاں نے میر جملہ کو ڈانٹ دیا۔ ”بادشاہ بذات خود اچھے ہوتے ہیں لیکن انہیں میر جملہ جیسے لوگ خراب کر دیتے ہیں۔“

میر جملہ نے بادشاہ سے دہائی کی۔ ”حضور والا! ملاحظہ ہو، اب یہ سیدزادہ مجھ پر طنز کر رہا ہے۔“

بادشاہ نے عبداللہ خاں سے کہا۔ ”عبداللہ خاں! میں تمہاری عزت کرتا ہوں، تم بھی ان آدمیوں کی عزت کرو جن کی میں عزت کرتا ہوں۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”آدمی اپنی عزت خود کرواتا ہے۔ بادشاہ سلامت کو مردم شناس ہونا چاہیے۔ میں ایک پست فطرت کینے کی عزت نہیں کر سکتا۔“

میر جملہ کو شاہی آداب کا خیال نہ ہوتا تو عبداللہ خاں کے اس نشتر کا چنچ چنچ کر جواب دیتا لیکن وہ بس اتنا ہی کہہ سکا کہ۔ ”میں اس سیدزادے کی جتنی عزت کر رہا ہوں، یہ مجھے اتنا ہی خوار کر رہا ہے۔ اب تو یہ شخص ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔“

بادشاہ نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے چھیلے رام ناگر کی جگہ لطف اللہ خاں کو دیوان خالصہ مقرر کر دیا اور صدر الصدور بہ دستور افضل خاں استاد کو ہی رہنے دیا۔ یہ ظاہر تو یہ تعفیہ ہو گیا مگر دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف کدورت بیٹھ گئی۔ عبداللہ خاں، بادشاہ کے خلاف سوچنے لگا اور بادشاہ، عبداللہ خاں کو تباہ و برباد کر دینے کی فکر میں لگ گیا، رہا میر جملہ، تو اس کی حیثیت غمینی اور ذیلی شخص کی تھی۔

میر جملہ کو سراٹھانے کی ذرا سی فرصت جو ملی تو وہ زہرہ کی جستجو میں لگ گیا۔ اس نے ان آدمیوں سے جو اسد خان کی پاکی اٹھائے ہوئے تھے، زہرہ کی بابت دریافت کیا۔ یہ لوگ زہرہ سے واقف تھے اور انہوں نے وہ سارا قصہ میر جملہ کے گوش گزار کر دیا جو زہرہ اور ذوالفقار خاں کے درمیان مشہور تھا۔ ان میں کا ایک زہرہ کا گھر بھی جانتا تھا۔ میر جملہ نے ان لوگوں کو انعام اکرام سے نوازا دیا اور کہا۔

”کیا تم میں سے کوئی مجھے زہرہ کے گھر تک پہنچا سکتا ہے؟“

پاکی اٹھانے والوں میں سے ایک نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہاں آپ تشریف لے جائیں گے؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ کیا میں وہاں نہیں جاسکتا؟“

کہا نے کہا۔ ”کیوں، جا کیوں نہیں سکتے آپ وہاں

لیکن آپ میر جملہ ہیں، خانِ خاناں ہیں۔ آپ کو اپنے ان خطابات کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”میں وہاں رات کے اندھیرے میں جاؤں گا اور تم سب کو یہ بات راز میں رکھنا ہوگی۔“

چنانچہ اسی دن، رات کو میر جملہ عام آدمی کے لباس میں ایک کھار کے ساتھ زہرہ کے پاس روانہ ہو گیا۔ یہ زری کار چوٹی والوں کا محلہ تھا۔ میر جملہ اپنے گھوڑے پر سوار کھار کو پیدل چلا کر زہرہ کے دروازے تک پہنچ گیا۔ زہرہ کے گھر کا دروازہ بند تھا اور اس کی تنگ گلی میں میر جملہ کا گھوڑا جب اس کے دروازے پر کھڑا ہوا تو پڑوس کے ایک آدمی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

کھار شپٹایا، اس نے میر جملہ کی طرف دیکھا کیونکہ کھار ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے کسی مرد کے بجائے زہرہ کا نام لیا تو وہاں کے لوگ اس کے ساتھ معلوم نہیں کیسا سلوک کریں لیکن میر جملہ نے دلیری سے جواب دیا۔ ”اس مکان میں کون رہتا ہے؟“

پڑوسی نے بڑی بے مروتی سے پوچھا۔ ”تمہیں ملنا کس سے ہے، کوئی بھی رہتا ہو اس مکان میں۔ تم جس کے پاس آئے ہو اس کا نام بتاؤ ورنہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”مجھے زہرہ سے ملنا ہے۔“

پڑوسی نے ہنس کر کہا۔ ”میں تم سے یہی سنتا چاہتا تھا کیونکہ جب سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں، ان کے کاروبار کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ کچھ لوگوں نے یہ بتایا تھا کہ بڑے میاں کی بیٹی پیشہ کرتی ہے اور بڑے میاں اس کے باپ نہیں، استاد ہیں۔ آج تم نے ہمارے اس شک کی تصدیق کر دی۔ تم واقعی اس لڑکی زہرہ سے ملنے آئے ہو گے۔“

میر جملہ نے اس کی باتوں کی پروا کیے بغیر کھار کو حکم دیا۔ ”تم دروازے پر دستک دو۔“

پڑوسی نے بگڑ کر دھمکی دی۔ ”اے میاں! یہ شرفا کا محلہ ہے، یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ میں اسی وقت آدازیں دے کر پورے محلے کو جمع کر لوں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ یہ پیشہ ور لوگ ہم شرفا کے محلے میں چوری سے کس آئے ہیں۔ انہیں اسی وقت یہاں سے نکال دیا جائے۔ ورنہ یہ پوری آبادی کو گندہ کر دیں گے۔“

میر جملہ گھبرایا کہ اگر اس شخص نے واقعی جو کچھ کہا ہے، کر دیا تو بڑی مشکل پیش آئے گی اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس دوران کھار دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور زہرہ کے

استاد نے گردن باہر نکال کر پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“

میر جملہ نے ہوشیاری سے کام لیا، فوراً جواب دیا۔ ”میں بادشاہ کا آدمی ہوں، کل صبح تم لوگوں کو بادشاہ کی مقرر کردہ عدالت میں حاضری دینا ہے۔“

استاد گھبرا گیا، پوچھا۔ ”جرم عدالت بتائے گی؟“

استاد پورا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور میر جملہ کو گھوڑے پر دیکھ کر بری طرح گھبرایا گیا، بولا۔ ”جناب! ہم غریب لوگ ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم پر کیا الزام عائد کیا گیا ہوگا لیکن آپ یقین کریں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے، زہرہ کی نادانی سے ہوا ورنہ وہ مقتول وزیر اعظم ذوالفقار خاں کی نہ تو بیوی رہی ہے نہ کچھ اور بس ذوالفقار خاں ہی نے میری بیٹی زہرہ کو زبردستی اٹھوایا تھا۔“

میر جملہ نے حالات سازگار دیکھے تو بہت خوش ہوا، بولا۔ ”یہ فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ تم یا تمہاری بیٹی دونوں میں کون مجرم ہے اور کون بے گناہ لیکن اس کا خیال رہے کہ تمہیں فرار نہیں ہونا ہے، اگر ایسا کیا تو سچے مجرم قرار دے دیے جاؤ گے۔“

دروازے کے پیچھے زہرہ بھی موجود تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میر جملہ کے واپس جاتے ہی استاد زہرہ پر برس پڑا، اس نے کہا۔ ”زہرہ! تمہیں کیا معلوم کہ شاہی معیتوں سے تعلق یا محبت کا دم بھرتا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ فرخ سیر بڑا ظالم بادشاہ معلوم ہوتا ہے، بتاؤ اب کیا ہوگا؟ کل ہمیں بادشاہ کی مقرر کردہ عدالت میں کھڑا کر دیا جائے گا۔“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”آپ بالکل نہ گھبرائیں، میں خود سوال جواب کر لوں گی۔“

میر جملہ کا عیار دماغ رات بھر منصوبہ بندی کرتا رہا۔ اس نے زہرہ کو قابو میں لانے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس نے علی الصباح اسے اعتماد کے چند آدمی زہرہ کے گھر روانہ کر دیے اور انہیں حکم دیا کہ زہرہ اور اس کے استاد کو ایک بند گاڑی میں قیدیوں کی طرح لایا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ آخر تک اس سے لاعلم رہیں کہ وہ قیدی نہیں ہیں اور وہ کس راستے سے کہاں لائے گئے ہیں۔

اس کے بعد کام خود میر جملہ کو انجام دینا تھا۔ میر جملہ نے اس کام کے لیے علیحدہ مکان کا انتظام کر دیا تھا۔ گویا یہ میر جملہ کا عیش گھر تھا، جہاں زہرہ کی طرح دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو جمع کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ میر جملہ اب سلطنت مغلیہ کا ایک اہم رکن تھا اور وہ اپنے اختیار اور

وسائل کو کام میں لا کر ایسی محفل جمانا چاہتا تھا جیسی کہ محفل فرماں روا جاتے سجاتے رہے تھے۔ اس نے اس محفل طرب اور جشن گاہ کا ذکر ضرور سن رکھا تھا لیکن آنکھوں سے دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب وہ اپنی قوتِ مخیلہ کے سہارے اس روایاتی مجلس طرب کا اہتمام و انصرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ جب اس طرب گاہ کا علم سیدزادوں کو ہوگا تو وہ حسد میں اس کے خلاف نہ معلوم کیا کچھ کرنا چاہیں گے لیکن اس وقت فرخ سیر اس کے قابو میں تھا اور وہ یقین رکھتا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ان دونوں بھائیوں کو اکھاڑ پھینکے گا اور سلطنت مغلیہ میں اس کی حیثیت سب سے اعلیٰ وارفع ہوگی۔

دوسرے دن علی الصباح میر جملہ کے آدمیوں نے زہرہ اور استاد کو حراست میں لے لیا۔ سارے پڑوسیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ زہرہ اور اس کا نام نہاد باپ حکومت کے معتب اور مفروز ہیں اس لیے کسی نے بھی ان دونوں کو نہیں چھیڑا اور حتی الامکان ان دونوں سے دور دور رہے۔ زہرہ اور اس کے استاد کو جس مکان میں اتارا گیا تھا وہ مکان سے زیادہ حویلی تھی اور اسے میر جملہ نے خرید لیا تھا۔ اس حویلی کے آس پاس اور مکان بھی تھے لیکن وہ ذرا فاصلوں سے تھے۔ حویلی کی پشت پر ایک باغیچہ تھا جس کے گرد اونچی اونچی پختہ دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ اس باغیچے میں کئی جگہ بے ترتیبی سے چھوٹے چھوٹے درختوں کی جھاڑیاں لگائی گئی تھیں۔ ان جھاڑیوں سے ملتی اور متصل کمرے تعمیر کیے گئے تھے اور ان کمروں کو سامانِ عیش سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ میر جملہ نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم دے دیا تھا کہ اس حویلی میں زہرہ اور اس کے استاد کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ یہاں ان کے لیے ضروریات زندگی کی تمام چیزیں فراہم کر دی گئی تھیں اور چند خدمت گار بھی متعین کر دیے گئے۔ ان دونوں نے اس قید خانے کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ان دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ یہاں ان کی تحقیر و تذلیل کے بجائے توقیر اور پذیرائی ہو رہی ہے۔ خدمت گار ان کی خدمت کر رہے تھے اور ان کا حکم ماننے کو تیار اور مستعد نظر آتے تھے۔

انہیں اس حویلی میں آئے چار دن گزر چکے تھے لیکن ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی گئی تھی۔ میر جملہ ایک دوسری ہی منصوبہ بندی میں مشغول تھا۔ وہ زہرہ کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہتا تھا جس میں ناکامی کا کم سے کم امکان ہو۔ بڑے غور و فکر کے بعد اس نے زہرہ

کے استاد کو ایک دوسری جگہ طلب کر لیا۔ استاد میر جملہ کو دیکھ کر سہم گیا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”جناب! ہم دونوں کا قصور کیا ہے جو اس حویلی میں قید کر دیا گیا ہے؟“

میر جملہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ حویلی تمہیں قید خانہ نظر آتی ہے، قیدیوں کو اسی طرح رکھا جاتا ہے؟“

استاد چکر اگیا، پوچھا۔ ”کیا ہم قیدی نہیں ہیں؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”میں یہ کیوں کہوں گا کہ تم دونوں قیدی نہیں ہو، تم دونوں قیدی ہو لیکن باعزت قیدی۔ تم دونوں بادشاہ کے نہیں، اس کے میر جملہ، میرے قیدی ہو۔“ پھر پوچھا۔ ”تمہیں ذوالفقار خاں سے کیا ملتا تھا؟“

استاد نے کہا۔ ”مجھے ذوالفقار خاں سے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ میری بیٹی زہرہ اس پر عاشق ہو گئی تھی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عشق میں ملتا ملاتا خاک نہیں، اپنے پلے سے البتہ چلا جاتا ہے چنانچہ زہرہ بھی اپنا سب کچھ دے دلا کر میرے پاس واپس آ گئی۔“

میر جملہ کو ہنسی آ گئی، بولا۔ ”لیکن میں ذوالفقار خاں نہیں، عبداللہ ہوں۔ میں تو ران کا رہنے والا ہوں، بادشاہ نے مجھے میر جملہ خانِ خاناں جیسے خطابات سے نوازا کر اپنا دست و بازو بنالیا ہے۔ میں تمہیں اور تمہاری بیٹی زہرہ کو اس قدر نواز دوں گا کہ تمہاری کئی پشتیں مزے کریں گی۔“

استاد نے پوچھا۔ ”اور وہ مقدمے والی کیا بات ہے؟“

میر جملہ پھر ہنس دیا، بولا۔ ”تم چاہو تو زہرہ کو اسی وہم میں مبتلا رہنے دو کیونکہ اس کے وہم سے تم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اور میں بھی شاد کام ہو سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم زہرہ کو میری ملازمت میں دے دو۔ میں اس کا ماہانہ مقرر کیے دیتا ہوں۔ انعام و اکرام اور تحفے تحائف اس کے علاوہ ہوں گے۔ اگر وہ کن من کرے تو میں یہ حویلی بھی اس کے حوالے کر دوں گا۔“

استاد کے منہ میں پانی بھرا آیا، کہا۔ ”جناب! پہلے معاملہ پوری طرح سمجھا دیں اس کے بعد میں ہاں یا نہ کروں گا۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”بات صرف اتنی سی ہے کہ مجھے زہرہ پسند آ گئی ہے اور اس پسند میں یہ وجہ بھی شامل ہے کہ زہرہ، ذوالفقار خاں کی محبوبہ ہے۔ ذوالفقار خاں کیا تھا؟ اس سے بحث نہیں لیکن وہ اپنے عہد کا ایک بڑا آدمی ضرور تھا اور اس بڑے آدمی کی محبوبہ کو اپنے پاس رکھنے میں، میں بڑی خوشی محسوس کروں گا۔“

”اور یہ مقدمے وغیرہ کا کیا چکر تھا؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں تم دونوں کو زری اور کار چوٹی والوں کی بستی سے یوں ہی لانا چاہتا تو بڑی دشواری پیش آتی لیکن جس طرح تم دونوں اس حویلی میں لائے گئے ہو، اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زہرہ میری طرف آسانی سے راغب نہیں ہوگی۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم زہرہ پر یہی ظاہر کرتے رہو کہ تم دونوں بادشاہ کی قیدی ہو اور تمہیں میر جملہ بادشاہ کے عتاب سے اس طرح بچا سکتا ہے کہ تم میر جملہ کی ملازمت میں چلی جاؤ۔“

استاد نے کہا۔ ”آپ نے ترکیب اچھی سوچی ہے لیکن یہ ظاہر یہ دشواری اپنی جگہ موجود ہے کہ اس پر زہرہ نہیں تیار ہوگی۔“

میر جملہ نے سختی سے پوچھا۔ ”کیوں تیار نہیں ہوگی؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ ذوالفقار خاں کے قتل کا واقعہ اس کے دل سے اس کی محبت نہیں دور کر سکا۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ لڑکی بے وقوف ہے ورنہ ساٹھ سالہ بوڑھے سے محبت اور اس کے قتل کا اتنا شدید سوگ، ایسا کسی احسن لڑکی سے ہی سرزد ہو سکتا ہے۔“

تھوڑی دیر کے لیے دونوں ہی سوچ میں پڑ گئے۔ آخر استاد نے سکوت توڑ دیا، پوچھا۔ ”پھر بولے، کیا کیا جائے؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”تم زہرہ کو بتادو کہ یا تو وہ میری ملازمت قبول کر لے ورنہ اس رسوائی کے لیے تیار ہو جائے جس سے وہ میری دشمنی کے بعد دوچار ہوگی۔“

استاد نے آہستہ سے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ وہ مان جائے، لڑکی بہت ضدی ہے۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”اگر نہیں مانے گی تو اس کا بھی میرے پاس علاج ہے۔“

☆ ☆ ☆

تقرب خاں، زہرہ کی تلاش میں آوارہ سرگرداں تھا۔ آخر اسے بھی پتا چل گیا کہ میر جملہ کیا کھیل کھیل رہا ہے؟

تقرب خاں چوری سے عبد اللہ خاں کے پاس پہنچا اور اسے مطلع کیا کہ ”میر جملہ خود تو عیش کرنا چاہتا ہے لیکن دوسروں کو اس سے دور رکھنا چاہتا ہے اور شب و روز اس کوشش میں ہے

یاد وفادار

کہ کسی طرح آپ دونوں بھائیوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ آپ دونوں بادشاہ کو یہ بتادیں کہ اسے جو کچھ ملا ہے، آپ ہی کی کوششوں سے ملا ہے اور آپ اگر فرخ سیر کو بادشاہ بنا سکتے ہیں تو اسے معزول کر کے کسی دوسرے کو بھی بادشاہ بنا سکتے ہیں۔“

عبد اللہ خاں کو تقرب خاں کی باتوں پر کچھ یقین نہیں آیا کیونکہ تقرب خاں، میر جملہ کا آدمی تھا اور بالکل ممکن تھا کہ تقرب خاں اس کے پاس جاسوسی کرنے کی نیت سے آیا ہو۔ عبد اللہ خاں نے غی سے کہا۔ ”تقرب خاں! تم ہمارے پاس اس وقت کیوں نہیں آئے تھے جب بادشاہ تمہارے آقا میر جملہ کی خواہش پر شرفا کی پگڑیاں اچھال رہا تھا اور انہیں قتل کروا رہا تھا۔“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”پگڑیاں میں نہیں بادشاہ اچھال رہا تھا۔ اسی طرح امرا کو قتل میں نہیں، بادشاہ کردار رہا تھا۔“

عبد اللہ خاں نے پوچھا۔ ”ہاں، ایک بات بتاؤ۔ ذوالفقار خاں کے پاس تم گئے تھے؟ تمہیں کس نے بھیجا تھا اور کیا باتیں ہوئی تھیں؟“

تقرب خاں نے ہر بات سچ سچ بتادی اور کہا۔ ”میرا ضمیر آج تک اس پر ملامت کرتا رہتا ہے کہ میں نے ذوالفقار خاں کی جان بخشی کا وعدہ کلام اللہ کو سچ میں ڈال کر کیا تھا لیکن ذوالفقار خاں کو قتل کر دیا گیا۔“

عبد اللہ خاں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ”بادشاہ نے ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کے خلاف جو کچھ کیا، کیا اس میں کسی اور کی مرضی شامل تھی؟“

تقرب خاں بہت اداس ہو رہا تھا، بولا۔ ”یہ سب کچھ میر جملہ کی ایما پر ہوا ہے کیونکہ میں نے خود اپنے کانوں سے یہ سنا ہے کہ پرانی عظیم عمارتوں کو اس لیے گرا دینا چاہیے کہ ان کی عدم موجودگی میں اپنی کمتر درجے کی عمارتیں بھی عرصے تک لوگوں کو یاد رہیں گی، وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ پرانے امرا کو قتل یا ذلیل و خوار کر کے گوشہ نشین کر دینا چاہیے تاکہ نئے امرا کچھ کر سکیں اور ان کا نام روشن رہے۔ میر جملہ اعلیٰ کو ادنیٰ اور ادنیٰ کو اعلیٰ کر دینے کے منصوبے پر عمل کر رہا ہے۔“

عبد اللہ خاں نے دل میں اتر جانے والی نظروں سے تقرب خاں کو گھورا، کہا۔ ”اچھا تقرب خاں! اب تم ایک بات اور بتادو۔“

”پوچھیے، ضرور بتاؤں گا۔“

عبد اللہ خاں نے کہا۔ ”کیا تم اب بھی میر جملہ کے وفادار ہو؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”فی الحال میں کسی کا وفادار نہیں۔“

عبد اللہ خاں نے کہا۔ ”اگر تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے تو میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن اس میں شرط یہی ہے تم حق و صداقت کے وفادار رہو۔ میر جملہ کے حالات اور واقعات سے مجھے مطلع کرتے رہو۔ میں اس شخص یا ان دونوں کو بہت جلد ٹھیک کر دوں گا۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے یا نہیں؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”سمجھ گیا، خوب سمجھ گیا۔“

عبد اللہ خاں نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ”اور ہاں، تم اس لڑکی کا کیا کرو گے؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”تلاش کروں گا۔“

”جاؤ تلاش کرو اسے، جب مل جائے تو مجھے مطلع کر دینا۔ آگے کا کام میں خود کر لوں گا۔“

تقرب خاں چلا گیا لیکن عبد اللہ خاں پر اس کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے دربار کا آنا جانا بھی موقوف کر دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی حسن علی خاں بھی بادشاہ سے منہج گیا اور وہ بھی اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گیا۔ ان دونوں کی عدم موجودگی بادشاہ کے لیے پریشانی اور تشویش کا باعث بن گئی۔ وہ ان دونوں کی طاقت اور اثرات سے واقف تھا لیکن بادشاہ کی بغل میں بیٹھے میر جملہ اور اسی طرح کے دوسرے لوگ بادشاہ کو ورقلانے میں مشغول رہے۔

میر جملہ نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”بادشاہ کے اثرات سے زیادہ کس کے اثرات ہو سکتے ہیں۔ حضور والا کو ذرا سختی اختیار کرنی چاہیے تاکہ حضور کی نرمی سے فائدہ اٹھانے والے ہوش میں آجائیں۔“

ادھر یہ مشورے دیے جا رہے تھے، دوسری طرف بادشاہ کے دل میں دونوں بھائیوں کے خلاف سخت نفرت اور فساد پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں بھائیوں کی غیر حاضری نے چنل خوروں کا اور زیادہ موقع دے دیا۔ وہ ہر وقت بادشاہ کے کان بھرتے رہتے تھے۔ فرخ سیر نے میر جملہ سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ یہ دونوں بھائی میری حکومت کے لیے مستقل خطرہ ہیں لیکن ان سے نجات حاصل کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”بندہ پرور! آپ کا فرمانا بجا لیکن اس مشکل پر قابو پائے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اس مسئلے پر میں بھی سوچتا ہوں اور تم سب بھی سوچو کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔“

میر جملہ کے پاس نہ تو اتنا دماغ تھا کہ دونوں بھائیوں کے خلاف کوئی جامع منصوبہ بنا سکتا اور نہ اتنا وقت کہ سوچنے میں زیادہ خرچ کرتا۔ میر جملہ بادشاہ کے پاس سے اٹھا تو سیدھا اس حویلی میں پہنچا جہاں زہرہ اور استاد ٹھہرے ہوئے تھے۔ میر جملہ نے استاد کو بلا کر در یافت کیا۔

”تم نے بات کی تھی، کیا ہوا؟ زہرہ نے کیا کہا؟“

استاد نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانتی، کہتی ہے مجھ پر مقدمہ چلاؤ، میں سوال جواب کروں گی۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”اچھا یہ بات ہے تو اس سے میں خود بات کروں گا لیکن تم خاموش رہنا، اس کی تائید نہ کرنا۔“

استاد نے جواب دیا۔ ”میں کیوں بولوں گا، میں تو اسے راہ راست پر لانا چاہتا ہوں۔“

استاد نے اندر جا کر زہرہ کو مطلع کر دیا کہ ”بادشاہ کا آدمی مقدمے کی کارروائی سے پہلے سوال و جواب کے لیے حاضر ہوا ہے۔ وہ تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

زہرہ تیار تھی، جواب دیا۔ ”میں تو اس کا انتظار ہی کر رہی تھی کیونکہ شاہی عتاب کی جو کموار سر پر لٹک رہی ہے میں اس سے جلد از جلد نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

میر جملہ زہرہ اور استاد کے ساتھ حویلی کے عقبی باغچے میں چلا گیا۔ وہاں وہ بڑی بے تکلفی سے گھاس پر لیٹ گیا۔ اس کے سامنے زہرہ اور استاد بھی گھاس پر ہی بیٹھ گئے۔ میر جملہ نے اس قیامت کو پہلی بار اچھی طرح دیکھا تھا۔ ذوالفقار خاں نے اسے کیوں اپنے دل میں بسا رکھا تھا، اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ میر جملہ نے زہرہ کے جسم کا کسی خریداری کی طرح جائزہ لیا۔ اس کی پتلی کمر کے اوپر میر جملہ کو

اپنے خوابوں کے دو مینار نظر آئے اور گھنی سیاہ زلفوں میں سے ایک چاند طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ میر جملہ کی تیز نظروں کی تاب نہ لا کر زہرہ نے سر جھکا لیا۔

میر جملہ نے بے ساختہ کہا۔ ”سبحان اللہ، کیا صورت پائی ہے تم نے۔ میں نے تو جیسے ہی یہ سنا کہ بادشاہ اس جرم میں کہ تم ذوالفقار خاں کی معاون و مددگار تھیں، مقدمہ چلانا چاہتا ہے، یہ سوچا کہ پہلے تمہیں میں دیکھ تولوں۔ اب تمہیں دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم پر کسی قسم کا مقدمہ چلانا بے کار ہے۔ میرے جائزے اور تبصرے پر ہی تمہارے مقدمے کی کارروائی کا انحصار ہے۔ اب میں بادشاہ کو پورے وثوق سے مطلع کر سکوں گا کہ یہ لڑکی ایسی نہیں ہے جس پر مقدمہ چلا کر وقت ضائع کیا جائے بلکہ یہ اس لائق ہے کہ اسے حرم میں داخل کر لیا جائے۔“

اس آخری فقرے نے زہرہ کو چونکا دیا، گھبرا کر جواب دیا۔ ”لیکن میں حرم سرا میں داخل ہونا پسند نہیں کروں گی۔“

میر جملہ نے پوچھا۔ ”وہ کیوں، اس میں کیا قباحت ہے؟“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”اس میں قباحت یہ ہے کہ مجھے حرم سرا کے نام سے وحشت ہوتی ہے۔“

میر جملہ نے ہنس کر کہا۔ ”بادشاہ اپنی خواہش جانتے ہیں، انہیں کسی اور کی پسند یا ناپسند کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔“

استاد نے سفارش کی۔ ”لیکن جناب آپ کو اسے حرم سرا میں داخل ہونے سے بچانا ہے۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”میں اس بارے میں کوشش تو کر سکتا ہوں لیکن یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاؤں گا۔“

زہرہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ”میں حرم سرانامی عورتوں کے قبرستان پر موت کو ترجیح دوں گی۔“

میر جملہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا، پھرتی سے زہرہ کا دامن پکڑ لیا، بولا۔ ”زہرہ! تو ناراض کیوں ہوتی ہے؟ کیا تو اسی وقت شاہی حرم سرا میں داخل کی جا رہی ہے جو یوں گھبرا کر بھاگ رہی ہے۔“

زہرہ نے دامن چھڑانے کی کوشش کی لیکن میر جملہ نے نہیں چھوڑا، بولا۔ ”اچھا اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تو بڑا اچھا رقص کرتی ہے میں تجھے حکم نہیں دیتا، درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اپنا رقص دکھا۔ شاید میں بھی تیرے کسی کام آسکوں۔“

استاد نے بھی سفارش کر دی۔ ”زہرہ! یہ صاحب تیرے بہت کام آ رہے ہیں اور اس حویلی میں جو ہم دونوں قیدیوں کے بجائے معزز مہمانوں کی طرح رہ رہے ہیں یہ بھی انہی کے طفیل ہے ورنہ ہمارا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔“

زہرہ بھی پیچ گئی، بولی۔ ”اچھا جناب میرا دامن تو چھوڑیں، رقص بھی دکھا دوں گی۔“

میر جملہ نے دامن چھوڑتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ”دل تو نہیں چاہتا لیکن تیری دل جوئی بھی مطلوب ہے۔“

زہرہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن سازندے تو ہیں نہیں، خالی خولی رقص کیا مزہ دے گا۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”سازندوں کا انتظام بھی کر دوں گا اس وقت ہا زندوں کے بغیر ہی سہی۔“

استاد نے عرض کیا۔ ”میرے خیال میں رقص کے ساتھ اگر کوئی غزل بھی ہو جائے تو آواز اور اشعار کا کیف سازوں کی کمی کی کسی حد تک تلافی کر دے گا۔“

زہرہ میر جملہ کے سامنے ہی بیٹھ گئی۔ خوش اخلاقی سے بولی۔ ”جناب! میں پہلے آپ سے متعارف ہونا چاہتی ہوں اس کے بعد آپ کی خواہش پوری کروں گی۔“

زہرہ کو بٹاش دیکھ کر میر جملہ بہت خوش ہوا، کہنے لگا۔ ”زہرہ! مجھے خوشی ہوئی کہ تو نے مجھ سے متعارف ہونے کی خواہش کی۔ میں تو ران کا رہنے والا ہوں۔ میرا اصل نام عبداللہ ہے لیکن شریعت اللہ خاں کے نام سے بھی مشہور ہوں۔ میں حضرت عالم گیر کے عہد میں یہاں آیا تھا۔ یہاں پہلے پہل مجھے جہانگیر نگر (ڈھاکا) کا قاضی مقرر کیا گیا پھر عظیم آباد (پٹنہ) کا قاضی ہوا۔ انہی دنوں موجودہ بادشاہ فرخ سیر نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا تو میں نے ان کا ساتھ دیا اور آج میں داروغگی دیوان خاص اور ڈاک پرفائر ہوں اور بادشاہ کی مہر میرے پاس رہتی ہے۔ مجھے بادشاہ نے ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزاری سوار کا منصب دے کر میر جملہ خانخاناں، معظم خاں بہادر مظفر جنگ اور اعتقاد خاں جیسے خطابات سے نوازا رکھا ہے اور اپنے اس اعزاز اور مرتبے کے بل بوتے پر میں یقین رکھتا ہوں کہ میں تیرا مقدمہ ختم کروادوں گا لیکن اس کی شرط یہی ہے کہ تو بھی مجھ پر نگاہ کرم رکھ کیونکہ تالیاں دونوں ہاتھوں سے بچتی ہیں ایک ہاتھ سے نہیں۔“

زہرہ میر جملہ کا تعارف بڑے غور سے سنتی رہی، پلکیں جھپکائے بغیر پھر پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مذہبی علوم میں خاصے ماہر ہوں گے؟“

زہرہ میر جملہ کا تعارف بڑے غور سے سنتی رہی، پلکیں جھپکائے بغیر پھر پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مذہبی علوم میں خاصے ماہر ہوں گے؟“

زہرہ میر جملہ کا تعارف بڑے غور سے سنتی رہی، پلکیں جھپکائے بغیر پھر پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مذہبی علوم میں خاصے ماہر ہوں گے؟“

زہرہ میر جملہ کا تعارف بڑے غور سے سنتی رہی، پلکیں جھپکائے بغیر پھر پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مذہبی علوم میں خاصے ماہر ہوں گے؟“

”خاصے ماہر ہونا کیا معنی، حضرت عالم گیر، جہانگیر کا قاضی کسی معمولی آدمی کو تو نہیں بنا سکتے تھے۔“
زہرہ مسکرائی، کہنے لگی۔ ”مذہبی علوم کا ماہر اور رقص و موسیقی کا دلدادہ، کمال کا اشتراک ہے طبیعت میں۔“
میر جملہ کھیانی ہنسی ہنسنے لگا، بولا۔ ”اس قسم کی نوک جھونک تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے اس وقت تو رقص و موسیقی پر طبیعت مائل ہے اور یہ فضول باتیں طبیعت میں بد مزگی پیدا کر رہی ہیں۔“

زہرہ نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”ایک سوال اور..... آپ سنا کیا ہیں، مغل یا کچھ اور؟“
میر جملہ نے جواب دیا۔ ”میں سنا مغل ہوں۔“
اس کے بعد اس نے اپنی موچیں کھڑی کر لیں، گھنٹی بھری مگر مختصر ڈانچہ پر پچھوؤں کے ڈنک کی طرح اٹھی، بل کھاتی موچیں بڑی خوف ناک لگ رہی تھیں۔ زہرہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب میں آپ کو حافظ شیرازی کی ایک حسب حال غزل سناؤں گی، سنیے اور لطف لیجیے۔“
میر جملہ نے بے ساختہ کہا۔ ”شروع کیجیے۔“

زہرہ جن کپڑوں میں تھی انہی میں رقص شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ اعضا کے زیر و بم سے ماحول پر کیفیت طاری کرتی رہی۔ اس کے پاؤں کی جنبش سے میر جملہ کا برا حال تھا اور جب وہ بل کھاتی لہرائی میر جملہ کے قریب آ جاتی تو اس کا دل بری طرح دھک دھک کرنے لگتا۔ کبھی وہ سانپ کی طرح جھومنے لگتی اور کبھی اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں جنبش دیتی گویا فضا میں پرواز کر رہی ہے اور کبھی وہ تاپتے تپتے بیٹھ جاتی اور کسی ناگن کی طرح جھومتے ہوئے بھی آگے کی طرف جھک جاتی اور کبھی جھومتی ہوئی پشت کی طرف لہرائے لگتی پھر ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو جاتی اور ادھر ادھر مضطربانہ انداز میں یوں بھاگنے لگتی، گویا کسی کو تلاش کر رہی ہے۔ رقص کے دوران اس کا ایک ایک عضو پھڑک رہا تھا۔ پورا جسم تھرک رہا تھا، جسم کی ہر چیز حرکت میں تھی۔ میر جملہ کا بہت برا حال تھا۔ آج اسے اندازہ ہوا کہ مغل بادشاہ فردوس کو زمین پر کس طرح اتار لیتے ہیں۔

اسے مغل بادشاہوں پر رشک آنے لگا، پہلے تو محض ایک خیال تھا کہ حویلی کو طرب گاہ بنادیا جائے۔ اب ایک جتنی ارادہ ہو گیا۔ اس نے تصور کی آنکھوں میں اس باغیچے میں زہرہ جمالوں کے ایک پرے کو محور رقص دیکھا اور اس سے وہ سرور و کیف حاصل ہوا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول گیا کہ وہ کیا ہے؟ اسے اس وقت ہوش آیا جب زہرہ

حافظ کی غزل شروع کر چکی تھی۔

زہرہ حافظ کی مشہور غزل گارہی تھی، جس کا پہلا شعر ہے
واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبری کنند
چوں خلوت می روند آن کار و دیگری کنند
(یہ واعظ جو محراب و منبر پر جلوہ فرماتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں تو کوئی اور ہی کام کرتے ہیں)
(میں ایک عجیب سی مشکل میں پھنس گیا ہوں، ذرا مجلس کے سب سے زیادہ دانشمند سے یہ تو پوچھ کہ تو بہ کی ہدایت کرنے والے خود تو یہ کیوں نہیں کرتے؟)

(شاید وہ لوگ قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے ورنہ خدا کے کام میں اس قدر دھوکے اور فریب سے کام نہ لیں)
(خدایا! ان نو دولتوں کو ان کے اپنے گدھوں پر بٹھا دے کیونکہ ان کا ماضی اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اپنے غلاموں کے ساتھ خجروں کی سواری کرتے رہے ہیں۔ گھوڑے ان کے شایان شان نہیں ہیں)
(اے دل! گھر خالی رکھ تا کہ محبوب سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے کیونکہ میں خوف زدہ ہوں کہ کہیں ہوسناک لوگ میرے دل و جان میں اپنے لیے جگہ نہ بنالیں)
(میں گو ہر شناس ہوں لیکن یہ ہوسکار ہمیشہ موتی کو کوڑی کے برابر کر دیتے ہیں)

(اے فرشتو! آؤ اور عشق کے دروازے پر پہنچ پڑھو کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں آدم کی مٹی میں خیر عشق شامل کیا جاتا ہے)
جہاں زہرہ کی آواز نے میر جملہ کے ہوش و حواس میں ایک آگ سی لگا دی، وہیں اشعار کے معانی و مطالب نے طبیعت کندر کر دی۔ اس نے ہنسنے ہوئے شکایتاً کہا۔ ”زہرہ! میں تیرے رقص اور آواز سے بہت لطف اندوز ہوا لیکن افسوس کہ تو نے سنانے کے لیے جس غزل کا انتخاب کیا تھا اس کے معانی و مطالب سے میری بڑی دل آزاری ہوئی۔“

استاد نے خوشامد کی، کہا۔ ”جناب والا! یہ ایک اتفاقی امر ہے ورنہ حافظ نے یہ غزل آپ کو سامنے بٹھا کر تو نہیں کہی تھی۔ براہ کرم اس اتفاق کو درگزر فرمائیں۔“
زہرہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تو پہلے ہی جناب سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں آپ کو حافظ کی ایک حسب حال غزل سناؤں گی۔“

میر جملہ نے زہرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، بولا۔ ”اگر تو میری ہو جائے تو مجھے تیری یہ دل آزاری

بھی گوارا ہے۔“
زہرہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں آپ کی کس طرح ہو سکتی ہوں؟“

میر جملہ نے نظریں تو زہرہ کے چہرے پر گاڑ دیں اور ذہن کہیں اور پہنچ گیا، کچھ دیر بعد کہا۔ ”اب تم دونوں اس حویلی میں بے خوف و خطر رہو، تم سے کوئی بھی کچھ نہ پوچھے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی تم کا ہارا یہاں آؤں تو زہرہ میری دل بستگی ضرور کرے۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”یہ دل بستگی کی صورت کیا ہوگی آخر؟“
میر جملہ نے جواب دیا۔ ”ارے اس کی ابھی سے کیا فکر، میں بتا دوں گا، اس میں گھبراہٹ کس بات کی؟“
میر جملہ جب اس حویلی سے نکل رہا تھا تو خوشی کے اس احساس کے ساتھ کہ بالآخر اس نے زہرہ کا دل منہی میں لے لیا ہے۔ میر جملہ سیدھا گھر پہنچا۔ اس کے خیال میں قسمت اس پر بہت مہربان تھی اور اسے یقین تھا کہ اگر اس کی قسمت اسی طرح اس کا ساتھ دیتی رہی تو وہ دن دور نہیں جب پورے ہندوستان پر بادشاہ کے بعد اسی کا اقتدار ہوگا اور عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں خواب و خیال بن چکے ہوں گے، مغلیہ حکومت میں ہر طرف ایک ہی نام مشہور ہوگا اور وہ نام ہوگا میر جملہ کا۔

میر جملہ کے جاتے ہی استاد نے زہرہ کو سمجھانا شروع کیا کہ اب ذوالفقار خاں کو بھول جا اور میر جملہ سے معاملہ کر لے کیونکہ ایسا عقل کا اندھا اور گناہ کا پورا دوسرا نہیں ملے گا لیکن زہرہ کو میر جملہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ وہ اسے بلا کا مطلب پرست سمجھ رہی تھی۔ میر جملہ نے اپنی حویلی کو چند ماہ کے اندر ہی اندر ایک شاندار طرب گاہ بنادیا۔ پتھر و رنات پتے گانے والیوں کو اس حویلی میں آباد کر دیا گیا۔ ان کی تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ زہرہ پریشان تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ استاد کا کہنا یہ تھا کہ یہ امیر امرا ایسے ہی مشغول ہیں جتلا رہے ہیں۔ اس لیے زہرہ کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ بقیہ یہ کہ میر جملہ کیا کر رہا ہے؟ یہ سوچنا زہرہ یا استاد کا کام نہیں ہے، جس کا ہے اسے سوچنے دیا جائے لیکن زہرہ کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو پھر میر جملہ پر ہی اکتفا کیوں کیا جائے۔ عبداللہ خاں بھی موجود ہے جو میر جملہ سے زیادہ مضبوط اور شوقین آدمی ہے۔ تقریب خاں ہے جو دوبارہ ملا تو نہیں لیکن عاشق اور قدردان ضرور ہے اور خود بادشاہ فرخ میر بھی جو ان سب سے کم عمر بھی ہے اور اپنے عہد کا خوب صورت ترین نوجوان بھی۔ اور ان خصوصیات کے ساتھ ہی

وہ حکمران بھی ہے اور بلا کا حسن پرست بھی۔ استاد نے سوچا اس لڑکی کو سمجھانا آسان نہیں ہے۔ اس نے زہرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

اب میر جملہ کو بیک وقت کئی فکریں لگ گئی تھیں۔ زہرہ، طرب گاہ کا بے پایاں خرچ، سیدزادوں کا خوف اور بادشاہ کی تلون مزاجی اور کم عقلی کا دھڑکا۔ یہ تمام باتیں میر جملہ کے لیے بڑی ہی پریشان کن تھیں۔ اسے یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ تقریب خاں زہرہ کو تلاش کر رہا ہے اور وہ سیدزادوں سے بھی ساز باز کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ان سیدزادوں کو اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔

دوسری طرف بادشاہ کے کانوں میں یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ سادات بار کے دونوں بھائی اس کے خلاف واقعی سازشوں میں مشغول ہیں۔ اب ان دونوں نے چونکہ دربار میں آنا جانا بھی بند کر دیا تھا اس لیے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ واقعی کیا کر رہے ہیں؟ اس دوران عبداللہ خاں نے رتن چند نامی ایک ہندو کو اپنا دیوان (وزیر مالیات) مقرر کر دیا اور اپنا سارا کام رتن چند کے سپرد کر کے خود عیاشی میں مشغول ہو گیا۔ دو دو تین تین مہینے گزر جاتے عبداللہ خاں اپنے دفتر کی شکل تک نہ دیکھتا۔ رتن چند اپنی من مانی کرنے لگا۔ میر جملہ بادشاہ کو عبداللہ خاں کی رتی رتی خبریں پہنچا رہا تھا۔

بادشاہ خلوت گاہ میں چند ایسی درخواستوں پر غور کر رہا تھا جن میں عبداللہ خاں کے دیوان رتن چند کی شکایتیں کی گئی تھیں۔ ان میں ایک ہی شکایت کی گئی تھی۔

”رتن چند من مانی کر رہا ہے اور غیر مسلموں سے جو جزیے کی رقم وصول کی جاتی تھی رتن چند نے اپنے ذاتی اختیار سے کام لے کر اسے معاف کر دیا ہے۔“

بادشاہ نے یہ درخواستیں میر جملہ کے سامنے رکھ دیں اور کہا۔ ”انہیں پڑھو اور بتاؤ کہ ان میں کتنی صداقت پائی جاتی ہے؟“

میر جملہ نے انہیں بغور پڑھا اور عرض کیا۔ ”یہ ناجیز تو پہلے ہی حضور والا کو رتن چند کی دھاندلیوں سے مطلع کر دیتا لیکن جب میں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ حضور کی سمع مبارک پر میری حق گوئی گراں گزرتی ہے تو اس عاجز نے بھی سکوت اختیار کیا۔ کیا میں نے اول دن ہی عبداللہ خاں کے منہ پر یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ ہر چند کہ بادشاہ ہند گان درگاہ کو صاحب اختیار کر دیتے ہیں لیکن ہم ملازمین کو بھی اپنی حد پہنچانا

چاہیے اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے جو بادشاہ کے شایان شان نہ ہو۔ مطلب یہ کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے بادشاہ کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے چنانچہ عبداللہ خاں نے اپنی خودمیری سے رتن چند کو دیوان بنادیا اور اس بارے میں حضور سے کوئی مشورہ تک نہیں لیا۔

فرخ سیر نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”میر جملہ تم سچ کہتے ہو۔ ادھر کچھ عرصے سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ سید بردران کی طبیعت سرکشی اور فتنہ و فساد پر مائل ہے۔ سننے میں آیا ہے عبداللہ خاں تین تین چار چار ماہ دفتر کی شکل تک نہیں دیکھا اور اس کا سارا کام یہی مردود رتن چند کرتا رہتا ہے۔“

”حضور نے بجا ارشاد فرمایا۔ اب یہ ناچیز کیا عرض کرے، سننے میں آیا ہے یہ عبداللہ خاں دن دن رات فضولیات میں مشغول رہتا ہے۔ عورتیں اسے چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہیں اور بیچ میں عبداللہ خاں داد عیش دیتا رہتا ہے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”عورتوں میں داد عیش دینا تو امر کی روایات سلف میں شامل ہے لیکن میں تو یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس نے میری مرضی اور مشورے کے بغیر رتن چند کو اپنا دیوان کیوں بنالیا؟“

میر جملہ نے کہا۔ ”حضور والا! زیادہ مت سوچئے کیونکہ زیادہ سوچنے سے بال سفید ہو جاتے ہیں اور انسان وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ کو زیادہ سوچنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ زیادہ سوچنے کا کام تو اپنے بندگان عالی پر چھوڑ دیجیے۔“

بادشاہ میر جملہ کی چرب زبانی سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ ”اب یہ کام تم لوگوں کا ہے کہ مجھے ان دونوں بھائیوں کے چنگل سے نجات دلاؤ۔“ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میر جملہ! تم ایک بات اور بتاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے بھی ایک طرب گاہ قائم کی ہے اور وہاں غم غلط کرنے جایا کرتے ہو۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”حضور نے بالکل صحیح سنا ہے لیکن ابھی میں وہاں غم غلط کرنے کی نیت سے ایک بار بھی نہیں گیا۔“

فرخ سیر نے پوچھا۔ ”کیا اس طرب گاہ میں حسین لڑکیاں بھی ہیں؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”حضور والا! حسین لڑکیوں، سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ورنہ یوں تو اس میں ساری لڑکیاں اور عورتیں حسین ہیں۔ حضور کو میں وہاں لے

نہیں جاسکوں گا لیکن اس طائفتے کا حسین ترین چہرہ حضور کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کہتے ہیں ان میں وہ لڑکی بھی موجود ہے جو نہ صرف مقتول وزیر ذوالفقار خاں کی محبوبہ رہ چکی ہے بلکہ یہ کہ وہ ذوالفقار خاں سے بے حد محبت کرتی ہے اور آج بھی اسی کے عشق کا دم بھرتی ہے؟“

میر جملہ کی جان لگی جا رہی تھی، وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں بادشاہ اس سے زہرہ کا مطالبہ نہ کر بیٹھے کیونکہ بادشاہ کی باتوں میں ہوس اور طمع کی بو پائی جاتی تھی۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگے میر جملہ؟ کس فکر میں ڈوب گئے تم؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”حضور کی پریشانیوں سے پریشان ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ اس وقت تم اپنی طرب گاہ میں پہنچے ہوئے تھے۔“

میر جملہ نے بڑی عاجزی سے جواب دیا۔ ”بندے کی مجال نہیں کہ حضور کو جھٹلانے کی کوشش کرے ورنہ یہ حقیقت ہے کہ میں اس وقت عبداللہ خاں اور رتن چند کی بابت سوچ رہا تھا۔“

فرخ سیر نے بے پروائی سے کہا۔ ”سید زادوں کے اقبال کا سورج بہت جلد ڈوب جائے گا تم فکر مت کرو۔“

میر جملہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”حضور والا! وہ کس طرح؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”کس طرح وہ طرح تو میں جانتا نہیں، بس یہ سمجھ لو کہ میرا دل کہہ رہا ہے۔“

میر جملہ کی ساری خوشی کا فور ہو گئی۔ احمقوں کی طرح بادشاہ کو داد و تحسین کی نظر سے دیکھنے لگا۔

بادشاہ نے کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو لیکن یہ یاد رہے کہ اگر تمہاری طرب گاہ میں مقتول ذوالفقار خاں کی محبوبہ واقعی موجود ہے تو اسے میرے پاس تک ضرور آنا چاہیے، میں اس کا انتظار کروں گا۔“

میر جملہ بادشاہ کے پاس سے چلا لیکن یہ فکر لے کر کہ وہ زہرہ کو بادشاہ کے پاس لے جائے یا نہ لائے۔ وہ سیدھا اپنی طرب گاہ میں چلا گیا۔ اس وقت حویلی کے صدر دروازے پر تقریب خاں پہرے داروں سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

میر جملہ نے تقریب خاں کو قہر کی نظروں سے دیکھا اور سوال کیا۔

”تقریب خاں! یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

تقریب خاں نے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔ ”میں یہاں کچھ لینے نہیں، معلوم کرنے آیا ہوں۔ کیا یہی وہ آپ کی طرب گاہ ہے جس میں مقتول وزیر ذوالفقار خاں کی محبوبہ لاکر بسائی گئی ہے؟“

میر جملہ نے نفرت سے کہا۔ ”یہ ضروری نہیں ہے کہ میں تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔“

تقریب خاں نے کہا۔ ”اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ میری وفاداریاں ہمیشہ آپ ہی کی ذات سے وابستہ اور محدود رہیں، اب میں عبداللہ خاں کی پناہ میں چلا گیا ہوں۔“

میر جملہ کے جسم میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی، پوچھا۔ ”اس طرح تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہ کہ ذوالفقار خاں کی محبوبہ زہرہ ایک ناپچے گانے والی لڑکی ہے، اس کے جملہ حقوق آپ اپنے حق میں نہیں محفوظ کر سکتے۔ میں چاہتا ہوں ہم دونوں اس معاملے میں مفاہمت کر لیں۔ اس سے آپ بھی لطف اندوز ہوں اور میں بھی لطف و لذت حاصل کروں۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”اور اگر میں انکار کر دوں تو؟“

”تو کچھ نہیں، اگر میں ناکام اور مایوس رہوں گا تو اس کے لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے کسی اور کو بھی لطف اندوز نہیں ہونے دوں گا اور پھر زہرہ کو شاہی حرم سرا میں داخل ہو جانا پڑے گا۔“

میر جملہ کو بادشاہ کی گفتگو یاد آئی، اسے کچھ کچھ شبہ ہوا، پوچھا۔ ”کیا تم اس دوران بادشاہ سے مل چکے ہو؟“

”نہیں، لیکن اس قسم کی خبریں بادشاہ تک پہنچانا کچھ مشکل کام بھی نہیں۔“

میر جملہ نے دانتوں سے نچلے ہونٹ کو دبایا اور کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”تو وہ تم ہو جس نے میری طرب گاہ کی خبر بادشاہ تک پہنچائی ہے اور بادشاہ مصر ہو رہا ہے کہ زہرہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔“

تقریب خاں اس طاقت و حریف کو چت کر چکا تھا۔ میر جملہ کی کمزوری سے لطف اٹھا رہا تھا، بولا۔ ”ظاہر ہے کہ زہرہ اگر میرے تصرف میں نہیں آئے گی تو اسے کوئی اور بھی نہیں رکھ سکے گا ورنہ اگر آپ چاہیں تو زہرہ میں مجھے اپنا شریک بنا کر اسے حرم سرا کے شاہی میں داخلے سے روک سکتے ہیں۔“

”لیکن اب یہ کس طرح ممکن ہے؟“

”یہ سب مجھ پر چھوڑیے کہ یہ کس طرح ممکن ہے“

”ہاں، اس میں کیا شک۔“

”اب تم یہ کرو کہ اپنے اس اعتماد کو اور زیادہ

یا ممکن نہیں ہے۔ یہ میرا کام ہے، میری ذمہ داری ہے۔“

میر جملہ نے حویلی کے صدر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم حویلی کے اندر گئے تھے؟“

تقریب خاں نے جواب دیا۔ ”حویلی میں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔“

”تب پھر آؤ میرے ساتھ، ہم دونوں اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

تقریب خاں اور میر جملہ حویلی میں داخل ہو گئے۔ میر جملہ اسے ایک وسیع و عریض ہال میں لے گیا جہاں چھت سے فانوسوں کی جھاڑیں لٹک رہی تھیں اور دیواروں پر رنگ برنگ خوب صورت عیالیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک گوشے میں ایک بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور سرہانے گاؤں کی رکھی تھیں۔ میر جملہ تخت پر گاؤں کے سہارے بیٹھ کر سیان رکھی تھیں۔ میر جملہ تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میر جملہ نے تالی بجائی، ایک خدمت گار حاضر ہو گیا۔ میر جملہ نے حکم دیا۔ ”حویلی کے مہتمم کو بلاؤ۔“

ڈرا دیر بعد حویلی کا مہتمم بھی حاضر ہو گیا۔ میر جملہ نے حکم دیا۔ ”ان رقاصاؤں کو اور مغنیوں کو پیش کیا جائے جو ابھی چند دن کے اندر داخل حویلی کی گئی ہیں۔“

مہتمم کے چلے جانے کے بعد میر جملہ نے تقریب خاں سے کہا۔ ”میں تمہیں اپنا شریک بنا سکتا ہوں لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔“

تقریب خاں نے جواب دیا۔ ”جناب! میں نے ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا ہے یہاں تک کہ اسد خاں جیسے گھاگ بوڑھے کو میں نے اپنی باتوں سے شیشے میں اتارا اور آپ لوگ اس کے بیٹے ذوالفقار خاں کا کام تمام کرنے میں کامیاب ہوئے لیکن جب کوئی انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کی مفتیں اور وفاداریاں رانگاں جا رہی ہیں تو وہ دل برداشتہ ہو کر منفی راہ اختیار کر لے گا، میں نے بھی یہی کیا۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”اچھا اب وہ باتیں بھول جاؤ اور مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

تقریب خاں نے جواب دیا۔ ”بتائیے تو کیسا وعدہ؟“

”آپ چاہتے کیا ہیں؟“

میر جملہ نے کہا۔ ”تم عبداللہ خاں یا وفادار کا اعتماد تو حاصل کر ہی چکے ہو۔“

”ہاں، اس میں کیا شک۔“

”اب تم یہ کرو کہ اپنے اس اعتماد کو اور زیادہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اکتوبر 2013ء

33

سپنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2013ء

32

سپنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2013ء

راخ کرو اور اپنی جرب زبانی سے عبداللہ خاں کو کریدتے ادھیڑتے رہو۔ میں اس کے عزائم سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔“

تقرب خاں نے پوچھا۔ ”اور مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”وہی ملے گا جس کے تم طلب گار ہو۔“

تقرب خاں نے بڑی معنی خیز ادا سے کہا۔ ”تب پھر مجھے اس بات کی اجازت حاصل ہونی چاہیے کہ اس حویلی میں جب چاہوں آؤں اور جب چاہوں چلا جاؤں۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”اس قسم کی اجازت تو نہیں دی جاسکتی لیکن یہ ممکن ہے کہ تم یہاں ہفتے میں دو دن تین تین چار چار گھنٹے کے لیے قیام کر سکتے ہو اور میرا خیال ہے صحت کے لیے یہاں اتنے اتنے وقفے سے اتنی اتنی دیر رک جانا نقصان دہ نہیں ہوگا۔“

تقرب خاں نے کہا۔ ”مجھے منظور ہے۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”اور دوسری بات یہ کہ تم اس حویلی کی ہر عورت اور ہر لڑکی سے مل سکتے ہو لیکن زہرہ کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لانا۔ اسے میرے لیے رہنے دو۔“

تقرب خاں نے مایوسی سے کہا۔ ”جس کے لیے میں یہ سب کر رہا ہوں، اگر اسی کو نہ پاس کا تو سب بیکار ہے۔“

میر جملہ نے کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے، میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زہرہ کا مطالبہ بادشاہ نے بھی کیا ہے، اس لیے وقتی طور پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زہرہ کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے ذہن سے اس کا خیال تک نکل جائے۔“

اس وقت پانچ ٹاپے گانے والیاں میر جملہ کے روبرو حاضر ہو چکی تھیں۔ ان کے پیچھے آلات موسیقی لیے سازندے ہال میں داخل ہوئے۔ میر جملہ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے جسے چاہو پسند کر لو اور اس کے ساتھ عیش کر لو۔ زہرہ کی بابت اس دن سوچنا جب تم کسی بھی طرح بادشاہ کے دل سے اس کا خیال نکالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”چلیے آپ کی یہ بات بھی منظور لیکن زہرہ سے ملنے اور اس سے بات کرنے کی اجازت تو حاصل ہوگی؟“

”ہاں، اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس کے بعد اس نے حویلی کے بہیم کو حکم دیا۔ ”ان کا ہلکا پھلکا رقص

دکھایا جائے۔“

بہیم نے رقصاؤں اور مغنیاؤں کو حکم دیا۔ ”حضرت میر جملہ خان خاناں کو اپنے فن سے محفوظ کرنے کی کوشش کرو۔“

سازندوں نے ساز سنبھالے اور رقصاؤں نے رقص شروع کر دیا۔ ایک نے سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر گانا شروع کر دیا۔ بقیہ چار اس کے گانے پر رقص کرنے لگیں۔ اس رقص و غنا کے دوران استاد آگیا اور میر جملہ کے کان میں ادب سے عرض کیا۔ ”جناب والا! جب سے یہ ٹاپے گانے والیاں اس حویلی میں آئی ہیں، زہرہ چڑچڑی ہو گئی ہے۔ آخر یہ آپ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟“

میر جملہ نے سرگوشی ہی میں جواب دیا۔ ”میں نے اپنی اس حویلی کو طرب گاہ بنا دیا ہے اگر زہرہ پسند کرے تو وہ بھی ان سبھوں کے ساتھ عزت و آبرو سے رہ سکتی ہے۔“

استاد نے کہا۔ ”زہرہ بڑی ضدی اور کسی حد تک حاسد لڑکی ہے۔ وہ ان لوگوں کو برداشت نہ کر سکے گی۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”اچھا میں خود بات کر لوں گا زہرہ سے۔ پہلے میں یہ رقص دیکھ لوں۔“

میر جملہ اور تقرب خاں بڑی دیر تک ان کے کمالات کا مشاہدہ کرتے رہے اور خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ آخر میں تقرب خاں نے اس رقص کو پسند کر لیا جس کی آنکھیں نیلی نیلی تھیں اور سر کے بال سنہری مائل تھے۔ میر جملہ نے حویلی کے بہیم کو ہدایت کر دی کہ تقرب خاں ہفتے میں دوبار اس حویلی میں تین چار گھنٹوں کے لیے آسکتا ہے اور تقرب خاں سے ایک بار پھر یہ وعدہ لیا کہ وہ میر جملہ کے لیے عبداللہ خاں کی جاسوسی کرے گا اور کسی بھی طرح بادشاہ کے دل سے زہرہ کا خیال نکالنے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

میر جملہ، تقرب خاں کو اسی ہال میں چھوڑ کر زہرہ کے پاس چلا گیا۔ استاد وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ میر جملہ نے منہ لٹکا کر زہرہ سے کہا۔ ”زہرہ! میں تو برابر اسی کوشش میں ہوں کہ تجھے شاہی حرم سرا میں نہ جانے دیا جائے لیکن میں نے آج بادشاہ سے بات چیت کر کے یہ محسوس کیا کہ بادشاہ کے دل میں تیرا خیال پتھر کی لکیر بن گیا ہے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“

زہرہ نے آزر دگی سے کہا۔ ”آپ اگر ہمیں یہاں سے کسی دور دراز علاقے میں چلا جانے دیں تو آپ کی یہ بڑی مہربانی ہوگی۔“

استاد نے مداخلت کی، بولا۔ ”تو جب سوچے گی تو ایسی مہمل باتیں سوچے گی۔“

میر جملہ نے استاد سے کہا۔ ”ذرا دیر کے لیے تم باہر چلے جاؤ۔ میں زہرہ سے چند کام کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

استاد اسی وقت باہر چلا گیا۔ میر جملہ نے زہرہ کو بڑی لچائی نظروں سے دیکھا، بولا۔ ”زہرہ! بھدا تیری بات ہی کچھ اور ہے۔ جس طرح علم نجوم میں زہرہ فلک کی رقصہ مشہور ہے اسی طرح تو اس زمین کی رقصہ ہے۔ بے مثل و بے عدیل۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”زہرہ! میں تم سے بڑی سیدھی اور صاف بات کروں گا۔ اگر تو اسے مان لے گی تو فائدے میں رہے گی ورنہ بڑی پریشانیوں میں کھر جائے گی۔“

زہرہ نے بے رخی سے کہا۔ ”طوفانی تمہید کے بجائے مدعا بیان کیجیے۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کا اصرار ہے کہ تجھے اس کی محل سرا میں پہنچا دیا جائے۔ میں اس فکر میں ہوں کہ تجھے اس جہنم میں جانے سے روک لیا جائے۔ اب پتا نہیں، میں جیتوں گا یا بادشاہ لیکن اس ہارجیت سے پہلے میں تجھ سے ایک معاملہ کرنا چاہتا ہوں۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”کیسا معاملہ؟ اس کی تفصیل بیان کیجیے؟“

میر جملہ نے صاف صاف بیان کر دیا۔ ”زہرہ! یہ مسئلہ امر ہے کہ میں تجھ سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ بادشاہ کی رقابت آڑے آرہی ہے اور یہ بھی ہے کہ میں تشنہ کام نہیں رہنا چاہتا۔ میں تجھ سے جو کچھ لوں گا اس کے عوض اتنا کچھ دے دوں گا کہ اسے تیری کئی پشتیں کھائیں گی۔“

زہرہ ہنسی، ایسی ہنسی جس میں زہریلا پن شامل تھا، بولی۔ ”تشنہ کامی تو آپ کا مقدر ہے۔ آپ کی طرب گاہ میں کئی کنویں موجود ہیں جن سے آپ اپنے حلقہ یاراں سمیت تشنگی دور کر سکتے ہیں، افسوس کہ میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔“

میر جملہ نے دھمکی دی۔ ”اگر یہ بات ہے تو تیری اس حویلی میں موجودگی سے فائدہ؟ تجھے بادشاہ کے حوالے کر کے اس کی خوشنودی کیوں نہ حاصل کر لی جائے۔“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں بادشاہ کے پاس بھی جاسکتی ہوں اور اس سے کس طرح پوچھا

چھڑاؤں گی یہ میرا مسئلہ ہے۔ اس کی فکر آپ کیوں کریں؟“

میر جملہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زہرہ کو چڑ کر اپنے اوپر گرالیا، بڑے خوشخوار لہجے میں بولا۔ ”کمال ہے، میری نرمی اور خوش اخلاقی کا تجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔“

زہرہ نے اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن میر جملہ نے اسے نہیں چھوڑا، بولا۔ ”میں نے خوشامد در آمد کی راہ چھوڑ دی ہے۔“ زہرہ نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا، میر جملہ نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا اور وہ اپنے کمرے کو اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی۔

میر جملہ کھیا کر رہ گیا، واپس جاتے ہوئے بولا۔ ”زہرہ! میں جاتو رہا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ میں اپنی کامیابی کی خاطر ایک عرصے تک خاموش تماشائی بن رہا ہوں گا۔“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”میں کچھ نہیں جانتی، بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ یہاں سے چلیں جائیں اور آئندہ ایسی درخواست پیش نہ کریں۔“

میر جملہ چلا تو گیا لیکن اپنے دل میں زہرہ کے خلاف ایک زبردست عناد لے کر گیا تھا۔

اس کی عدم موجودگی میں تقرب خاں نے بھی زہرہ سے ملاقات کی۔ زہرہ نے اسے ایک نظر میں پہچان لیا، مسکرا کر پوچھا۔ ”آپ یہاں بھی آگئے؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”ہاں میں آگیا ہوں، پہچان لینے کا بہت بہت شکر یہ۔“

زہرہ نے بے تکلفی کا اظہار کیا۔ تقرب خاں نے کہا۔ ”زہرہ! اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہے تو تمہیں میر جملہ کی بات مان لینا چاہیے ورنہ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ تمہیں شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا جائے گا۔“

زہرہ نے کہا۔ ”تم سب بھیڑیے کیوں بن رہے ہو، کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ شاہی حرم سرا کی ہوا مجھے موم کی مریم بنادے گی؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”زہرہ! تم ماحول اور بات نہیں سمجھ رہی ہو، ہم سب جس خاص ماحول کے پروردہ ہیں، اس میں سازشوں کا جال سا بچھا ہوا ہے، ہر طرف سازشیں ہو رہی ہیں۔ محبت، خلوص، وفاداری اور ایثار کا کہیں شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس ماحول میں تم ایک ایسے شخص کی محبت کی مدعو ہو جو قتل کیا جا چکا ہے، مر چکا ہے اور جواب بھی تمہیں نہیں مل سکے گا۔ ذوالفقار خاں کے بعد تمہیں میر جملہ مل گیا جو اختیارات اور مرتبے میں کسی

طرح ذوالفقار خاں سے کم نہیں ہے۔ تمہیں اس شخص کو قبول کر لینا چاہیے۔“

زہرہ بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی رہی پھر پوچھا۔
”تمہارے بقول ہم سب جس ماحول کے پروردہ ہیں اس میں محبت، خلوص، ایثار اور وفاداری کا کہیں شائبہ تک نہیں ملتا پھر یہ تم میرے جملہ کی وکالت کیوں کر رہے ہو، اس کی وکالت سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

تقرب خاں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”زہرہ! تمہیں یاد ہوگا میں نے اپنی پہلی ملاقات میں تم سے کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ اگر تم مجھ پر ملتفت نہیں ہو تو اس شخص کو بھی کوئی موقع نہیں دوں گا جو میرے بعد تمہارے دل میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور وقت اور ماحول کی ستم ظریفی دیکھو کہ آج میں خود اس شخص کے حق میں وکالت کر رہا ہوں، تم پوچھو گی کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو یہ بھی سن لو، آج اس شخص نے تمہیں کسی حد تک حاصل کر لیا ہے اور میں اس کے رحم و کرم کے سہارے یہاں تک آسکا ہوں۔ بادشاہ کی ہم نشینی اس شخص کو حاصل ہے، اگر یہ چاہے تو تمہیں یہیں اسی حویلی میں رہنے دے اور اگر خفا ہو جائے تو شاہی حرم سرا میں شامل کروادے۔“

زہرہ نے کہا۔ ”اس شخص کے اختیارات کی حدود نہیں جاننا چاہتی۔ میں تو یہ معلوم کر رہی ہوں کہ اس سازشی ماحول اور ریاکاری کے معاشرے میں میرے جملہ کے حق میں خلوص اور ایثار کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”تم نے میری پوری بات تو سنی نہیں، ورنہ یہ سوال نہ کرتیں۔ میں میرے جملہ کی وکالت کے پردے میں خود اپنی وکالت کر رہا ہوں۔ اس ماحول میں تم عورتوں کو اپنا صحیح مقام معلوم ہے کیا؟ شاید نہیں۔ آؤ، میں تمہیں تمہارا مقام بتا دوں۔ تمہارا مقام ہے شاہی حرم سرا یا امرا کی آغوش۔ کسی ایک امیر کی نہیں، قسمت اور تقدیر جس کی آغوش میں بھی ڈال دے۔ میرے جملہ، میں یا کوئی اور تمہیں ان کی آغوش کو ہنسی خوشی، خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہیے۔ اسی میں تمہاری بقا ہے، اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔“

زہرہ نے کہا۔ ”لیکن میرا سوال اپنی جگہ، اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟ چلو، میں میرے جملہ کو قبول کیے لیتی ہوں مگر میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”اپنا فائدہ بھی

بتائے دیتا ہوں۔ میرے جملہ کو جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ تمہیں بادشاہ اپنی حرم سرا میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ خواہش کی ہے کہ میں کسی بھی طرح ایسا نہ ہونے دوں۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”لیکن بادشاہ کے مزاج میں تمہیں کس طرح اثر و رسوخ حاصل ہے؟ کیا تمہیں بادشاہ کی ہم نشینی اور مصاحبت کا موقع ملتا ہے؟ یا تم کوئی ایسا منصب رکھتے ہو جس سے بادشاہ کی رائے اور خواہش پر اثر انداز ہو سکو؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن خدا نے مجھے ایسا دل و دماغ ضرور دیا ہے کہ میں بادشاہ سے دور رہ کر بھی یہ کام انجام دے سکتا ہوں۔ میرے جملہ کو میری ان صلاحیتوں پر اعتماد اور یقین ہے اس لیے اس نے مجھ سے یہ سمجھوتا کر لیا ہے کہ میں تمہیں شاہی حرم سرا میں داخلے سے روکوں۔ اس کے صلے میں میرے جملہ مجھے عیش کروائے گا چنانچہ میں اس حویلی میں ہفتے میں دو بار آسکتا ہوں۔ اگر تم میرے جملہ کو قبول کر لو گی تو اس سے مجھے یہ فائدہ پہنچے گا کہ تم میرے تصرف میں بھی رہو گی۔“

زہرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا مطلب؟ یعنی یہ کہ میں تم دونوں کے تصرف اور اختیار میں رہوں گی؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”نہیں، اختیار میرے جملہ کا رہے گا، تصرف میں ہم دونوں کے رہو گی۔“

زہرہ نے بڑی نفرت اور بے زاری سے کہا۔ ”تب پھر تو یہ میرے جملہ بڑا ہی بے غیرت اور بے حیا شخص ہے۔“

تقرب خاں نے طنزیہ قہقہہ لگایا، بولا۔ ”تم ایک میرے جملہ کو بے غیرت اور بے حیا قرار دے رہی ہو حالانکہ اس ماحول اور معاشرے کا ہر فرد بے غیرت اور بے حیا ہے۔ جو غیرت مند یا حیا دار ہیں وہ حکومت اور دربار سے دور کہیں گوشہ نشین ہوں گے۔ بادشاہ، امرا اور دوسرے صاحب اختیار اور با اثر حضرات کی دربار داری، مصاحبت اور مطلب برآری کی خاطر غیرت اور حیا کو دن میں کئی کئی بار یوں دور کرنا پڑتا ہے جس طرح ہمیں بار بار اپنا لباس بدلنا پڑتا ہے۔“

زہرہ نے بہ دستور نفرت سے کہا۔ ”اچھا اب تم یہاں سے چلے جاؤ، میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”تم کو میری باتیں نہ صرف سننا پڑیں گی بلکہ ان کے جواب بھی دینا ہوں گے۔“

اس وقت میں آیا ہی اسی مقصد سے ہوں۔“

زہرہ نے سختی سے جواب دیا۔ ”میں نے ایک بار کہہ
 جو دیا کہ میں مزید بکواس نہیں سنوں گی۔“
 تقرب خاں یہ دستور اڑا ہوا تھا۔ ”یعنی تم میرا کہنا
 نہیں مانو گی؟“
 ”نہیں، نہیں نہیں، سو بار نہیں، ہزار بار نہیں بلکہ بار
 بار نہیں۔“
 ”تو کو یا تم شاہی حرم سرا میں جانے کے لیے
 تیار ہو؟“
 ”نہیں، وہاں بھی نہیں جاؤں گی۔“
 ”پھر ایک ٹھکانا اور ہے تمہارا۔ اگر تم پسند کرو تو تمہارا
 عبداللہ خاں سے تعارف کروادیا جائے۔ عبداللہ کو بادشاہ
 نے کئی شاندار خطابوں کے ساتھ ہی یاروقادار کا خطاب بھی
 دیا ہے۔“
 زہرہ تقرب خاں کے سامنے سے اٹھ کر چلی گئی اور
 کہتی گئی۔ ”میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا کوئی
 جواب نہیں۔“
 تقرب خاں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اس نے میر جملہ کو
 صاف صاف بتا دیا۔ ”جناب والا! یہ لڑکی بہت ہی خطرناک
 ثابت ہو سکتی ہے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ بھی
 چند دن عیش کر لوں گا لیکن اب یہ ڈر پیدا ہو گیا ہے کہ یہ لڑکی
 بھی نہ بھی ہمارے حق میں مصیبت ثابت ہو سکتی ہے۔ اس
 لیے اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اسے بادشاہ کے سپرد کر دیا
 جائے۔“
 میر جملہ نے حیرت سے کہا۔ ”یعنی وہاں تمہاری
 چب زبانی بھی بے اثر ثابت ہوئی، مجھے اس پر یقین نہیں
 آ رہا۔“
 تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”آپ کو میری باتوں
 پر یقین آنا چاہیے، زہرہ پر کام کرنا فضول ہے۔“
 میر جملہ نے پوچھا۔ ”تو تمہارے خیال میں اسے
 بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے اس کی خوشنودی حاصل
 کر لینی چاہیے؟“
 ”بے شک، میری اپنی رائے یہی ہے کہ ہمیں آگ
 سے نہیں کھیلنا چاہیے۔“
 میر جملہ نے جواب دیا۔ ”ابھی میں اس پر غور کروں
 گا، سوچوں گا پھر کوئی قدم اٹھاؤں گا۔“
 تقرب خاں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک پیدا
 ہو گئی۔ اس کا چہرہ مسرت و شادمانی سے کھل اٹھا، بولا۔ ”اگر
 آپ پسند کریں تو زہرہ کے سلسلے میں ایک شاندار ترکیب

آئی ہے میرے ذہن میں لیکن اس میں رازداری اولین
 شرط ہے۔“
 میر جملہ نے کہا۔ ”تقرب خاں! تم اس معاملے میں
 مجھے ہمیشہ اپنا ہمدرد پاؤ گے۔ تم کو جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو، اس
 میں تکلف کس بات کا؟“
 تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”جناب والا! آپ
 عبداللہ خاں یاروقادار اور اس کے چھوٹے بھائی حسین علی
 خاں میر بخشی سے تو واقف ہی ہیں اور انہیں پھنسا دینے میں
 بھی آپ ضرور دلچسپی رکھتے ہوں گے؟“
 میر جملہ نے کہا۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، درست ہے
 لیکن عبداللہ خاں یا کوئی اور کس طرح ہمارے دام میں پھنس
 جائے گا؟“
 تقرب خاں نے کہا۔ ”میں عبداللہ خاں سے ملنے
 جاؤں گا اور اس سے کہوں گا کہ وہ ذوالفقار خاں کی محبوبہ
 زہرہ کو اپنے پاس رکھ لے اور خوب عیش کر لے۔“
 میر جملہ نے کہا۔ ”یہ تو سرے سے اپنی سمجھ میں بات
 نہیں آرہی ہے کہ تم سیدزادوں کو کس طرح کسی پھندے میں
 پھنسا دو گے جبکہ یہ دونوں بہت ہی چالاک اور ہوشیار ہیں۔“
 تقرب خاں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ باتیں
 آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ جو شخص اسد خاں جیسے زمانہ دیدہ اور
 عقل مند انسان کو اپنی باتوں میں لاسکتا ہے اس کے لیے یہ
 عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کیا چیز ہیں۔“
 میر جملہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”تقرب خاں!
 اگر یہ دونوں سیدزادے کسی طرح قابو میں آجائیں
 تو میرے لیے میدان بالکل صاف اور ہموار ہو جائے گا
 لیکن ان کم بختوں پر قابو پانا بہت مشکل ہے، تمہاری
 کوششوں سے شاید یہ کام ممکن ہو جائے۔“
 تقرب خاں نے بڑی بے حیائی سے ہنستے ہوئے
 جواب دیا۔ ”سیدزادے جس طرح آپ کے دشمن ہیں اسی
 طرح میرے بھی ہیں۔ اگر میں کسی طرح ان دونوں پر قابو
 پا گیا تو اس سے جتنا فائدہ آپ کو پہنچے گا اتنا ہی مجھے بھی، اس
 لیے میں کچھ عرصے سے ان دونوں پر کام کر رہا ہوں۔“
 میر جملہ نے کہا۔ ”جب میں نے یہ سنا کہ تم عبداللہ
 خاں سے ربط ضبط بڑھا رہے ہو تو میں پریشان ہو گیا تھا لیکن
 اس وقت کی باتوں نے مجھے بڑا سکون پہنچایا، بڑا اطمینان
 ہوا۔ خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔“
 تقرب خاں مسکراتا رہا۔ اگر میر جملہ اس مسکراہٹ کو
 عمیق نظروں سے دیکھتا تو اس شرارت کو ضرور محسوس کر لیتا جو

اس میں ملی ہوئی تھی۔ تقرب خاں نے کہا۔ ”میں نے زہرہ
 کے سلسلے میں ایک بات سوچی ہے، وہ یہ کہ اب نرمی اور
 شرافت دکھانے کا وقت نہیں رہا۔ اب ہمیں زبردستی کرنا
 ہوگی۔ ہم دونوں جبر اور زبردستی سے جتنے دن بھی کام
 چلا سکیں، چلائیں۔ اس کے بعد کچھ بتائے بغیر زہرہ کو
 عبداللہ خاں کے حوالے کر دیں۔ ہاں، اسے یہ ضرور بتانا
 ہوگا کہ زہرہ ذوالفقار خاں کی محبوبہ ہے۔ عبداللہ خاں
 عورتوں کا عاشق اور دلدادہ ہے۔ زہرہ کو دیکھتے ہی دام میں
 آجائے گا۔ جب زہرہ، عبداللہ خاں کے قابو میں چلی
 جائے گی تو ہمیں بادشاہ کو مطلع کرنا ہوگا کہ زہرہ کو عبداللہ
 خاں لے اڑا اور یہ جاننے کے باوجود کہ زہرہ بادشاہ کی
 امانت ہے، خود سری اور ڈھٹائی سے اس کے ساتھ داغ و پیش
 دے رہا ہے اور اس نشے میں ہے کہ بادشاہ کیا ہے، وہ خود کو
 بادشاہ کا محسن اور مربی سمجھتا ہے اور بادشاہ کو اپنا طفلی اور
 مرہون منت سمجھتا ہے۔“
 میر جملہ کا چہرہ فرط خوشی سے چمکنے لگا، وہ تقرب خاں
 کی ذہانت و فطانت کا قائل ہو گیا۔
 تقرب خاں یہ دستور کہتا رہا۔ ”اس سے ہمیں دو
 خوشیاں حاصل ہوں گی۔ ایک تو یہ کہ عبداللہ خاں اور بادشاہ
 میں نفرت اور عناد کی خلیج زیادہ وسیع ہو جائے گی اور عبداللہ
 خاں کی وزارت خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسری خوشی یہ
 حاصل ہوگی کہ زہرہ کا پندار چکنا چور ہو جائے گا اور اسے اس
 کی بے جا اتنا اور غرور کی بڑی سخت سزا ملے گی۔“
 میر جملہ تقرب خاں کی تجویز سے بالکل مطمئن اور
 خوش تھا۔ انہوں نے زہرہ سے عیش کرنے کے لیے دو ہفتے
 مقرر کیے۔ اس دوران تقرب خاں، عبداللہ خاں کو زہرہ
 کے لیے آمادہ کر لے گا۔

☆☆☆

جب فرخ سیر مشرق میں تھا اور ملک پر جہاندار شاہ
 حکومت کر رہا تھا تو فرخ سیر کی کشمیری النسل ماں نے
 سیدزادوں کی خوشامد کر کے انہیں اپنے بیٹے کی مدد پر بڑی
 مشکل سے آمادہ کر لیا تھا اور اب جو اسے یہ معلوم ہوا کہ
 بادشاہ اور سیدزادوں میں رنجشوں اور مخالفتوں کی خلیج روز
 بروز بڑھ رہی ہے تو اسے افسوس بھی ہوا اور اسے اپنے بیٹے
 کے حق میں خطرہ بھی محسوس ہوا۔ اس نے پہلے تو فرخ سیر کو
 بہت سمجھایا اور کہا۔ ”فرخ میرا اگر تم نے اپنے ان محسنوں
 کے خلاف کچھ کرنا چاہا تو مجھے ڈر ہے کہ یہ دونوں تمہارے
 مقابلے میں کسی اور شہزادے کو امیدوار حکومت بنا کر نہ کھڑا

کر دیں کیونکہ اگر یہ دونوں تمہیں جہاندار شاہ کے مقابلے
 میں لاکھڑا کر سکتے ہیں تو یہ اسی طرح کسی اور مغل شہزادے
 کو تمہارا حریف بنا کر سامنے لاسکتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ
 ایسا ہو گیا تو ان دونوں پر اپنے غدار اور سازشی امرا کی مدد
 سے قابو پانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔“
 بادشاہ نے جواب دیا۔ ”مادر محترم! میں نے ان
 دونوں بھائیوں کے خلاف تو کچھ سوچا ہی نہیں لیکن سنا ہوں
 کہ یہی دونوں غلط سوچ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور خود کو ہمارا
 محسن اور مربی سمجھنے لگے ہیں۔“
 ماں نے کہا۔ ”اگر ایسا سوچتے ہیں تو غلط تو نہیں
 سوچتے۔ وہ دونوں تمہارے محسن بھی ہیں اور مربی بھی۔“
 بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میں کب یہ کہتا ہوں کہ وہ
 میرے محسن یا مربی نہیں ہیں لیکن مادر محترم! اب میں اس
 ملک کا بادشاہ ہوں، صاحب اختیار بادشاہ۔ اب تو ان
 دونوں کو اپنے تئیں اس ریاست کا ملازم سمجھنا چاہیے۔ انہیں
 خود کو مغل تخت و تاج کا خدمت گزار سمجھنا چاہیے لیکن وہ ایسا
 نہیں سمجھتے اور اس کا نتیجہ یوں ظاہر ہو رہا ہے کہ دوسرے امرا
 ان سے نفرت اور مجھ سے شکایت رکھنے لگے ہیں۔ وہ مجھے
 دونوں سیدزادوں کا دست نگر اور کٹھ پتلی سمجھنے لگے ہیں۔ جس
 سے یہ امرا مجھے رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ آنکھیں،
 جن میں شاہی رعب اور دبدبے کی دہشت اور خوف ہوتا
 چاہیے، ان میں میرے لیے ہمدردی ہے، جذبہِ رحم ہے،
 ایک قسم کا طعن اور طنز ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں ان
 اذیتوں کو کس طرح اور کب تک برداشت کر سکتا ہوں؟“
 ماں نے کہا۔ ”نہ یہ صورت حال اچھی ہے اور نہ وہ
 جس میں دونوں سیدزادے تمہارے خلاف نفرت اور بغض
 لیے تم سے دور دور رہیں۔ یہ خطرناک فضا دونوں کے حق میں
 خطرناک اور بری ہے۔ اسے دور ہونا چاہیے اور اسے میں
 دور کروں گی۔“
 فرخ سیر نے عاجزی سے کہا۔ ”مادر محترم! اگر ایسا
 ممکن ہے تو آپ میری مدد ضرور کیجیے۔“
 ماں اسی وقت بیٹے کے پاس سے چلی گئی اور سید
 عبداللہ خاں سے ملنے کی کوشش کرنے لگی۔
 سید عبداللہ خاں کے شب و روز بھی اچھے نہیں گزر
 رہے تھے۔ وہ بھی بہت فکر مند تھا اور بادشاہ کے اس عتاب
 سے خوف زدہ تھا جو کسی دن اور کسی لمحے غیر متوقع طور پر اس
 پر نازل ہو سکتا تھا۔ اس خوف اور تشویش پر اس نے یوں قابو
 پایا تھا کہ خود کو رقص و موسیقی اور حسن و جمال میں مست اور

ضامن میں بنوں گی۔ تم دونوں بھائی جس طرح پسند کرو گے یہ ملاقات اسی طرح ہوگی لیکن ملاقات ہوگی ضرور اور تم دونوں کی ایک دوسرے سے دوری تمہارے دشمنوں کے حوصلے بلند کر رہی ہے اور انہوں نے اپنی سازشوں کا عمل تیز کر دیا ہے۔“

عبداللہ خاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں، آپ جیسا فرمائیں گی ہم دونوں بھائی اس پر عمل کریں گے۔“

بادشاہ کی ماں نے کہا۔ ”اب میں فرخ سیر کے پاس جاؤں گی اور اسے اس ملاقات کا حال بتاؤں گی۔ وہ تم دونوں سے ملنے کے لیے بے چین ہے، جب یہ سنے گا کہ تم دونوں اس سے ملاقات کرنے پر رضامند ہو گئے ہو تو بہت خوش ہوگا۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”لیکن مادر محترم! وہی ایک بات کہ ہمیں زندگیوں کی ضمانت ضرور دینا ہوگی کیونکہ ہمیں بادشاہ سے زیادہ اس کی بچکانا طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔“

بادشاہ کی ماں، عبداللہ خاں سے ملاقات کے عہدو پیمان لے کر چلی گئی۔

حالانکہ بادشاہ کی ماں اور عبداللہ خاں کی ملاقات بہت ہی خفیہ تھی لیکن پھر بھی امرا میں اس ملاقات کی افواہ گرم تھی اور وہ آپس میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور سرکوشیاں کر رہے تھے۔ میر جملہ بھی اس خبر سے پریشان ہو گیا اور اب اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ بادشاہ کی ماں اگر عبداللہ خاں سے ملی ہے تو کوئی بات نہیں مگر بادشاہ کی ملاقات عبداللہ خاں سے نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے اپنی اس تشویش کا اظہار تقریب خاں پر کر دیا۔ تقریب خاں نے مشورہ دیا کہ اس ملاقات کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ بادشاہ کو عبداللہ خاں سے بہت زیادہ متنفر کر دیا جائے اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ بادشاہ سے بار بار ملاقاتیں کر کے دونوں سیدوں کے خلاف بھڑک دیا جائے۔

اس دن بادشاہ خلوت خانے میں مختلف فرامین اور درخواستوں پر دستخط کر رہا تھا۔ ان میں ایک درخواست ایسی بھی تھی جو عبداللہ خاں کے خلاف جاتی تھی۔ اس میں بادشاہ کو مطلع کیا گیا تھا کہ عبداللہ خاں کے دیوان رتن چند نے اس کی زمینیں ایک دوسرے شخص کے نام منتقل کر دی ہیں اور جب اس معاملہ میں دیوان سے عذر داری کی گئی تو اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے نہ صرف یہ کہ اسے زد و کوب کیا بلکہ اس کی مستورات کی بے حرمتی بھی کی گئی۔ اس سلسلے میں وزیر

کردیا گیا اور اسے یقین دلادیا گیا کہ زہرہ کا شور و غل اور ہنگامہ بس چند دنوں کا ہے۔ اس کے بعد خاموش ہو جائے گی اور حالات سے سمجھوتا کر لے گی۔

☆☆☆

بادشاہ کی ماں نہایت پر اسرار انداز میں، چپکے سے سید عبداللہ خاں کے پاس پہنچ گئی۔ عبداللہ خاں عظیم بجالایا اور اس کے سامنے یوں مودبانہ کھڑا ہو گیا جس طرح دربار میں بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ عبداللہ خاں نے ادب سے عرض کیا۔ ”مادر محترم نے کیوں زحمت فرمائی، مجھے حکم دیتیں تو میں خود حاضر ہو جاتا۔“

بادشاہ کی ماں نے رنج اور دکھ سے جواب دیا۔ ”ہم لوگوں کے درمیان شکوک اور شبہات کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں اور ان دیواروں کو پھلانگ کر مخدوش فضا میں تمہارا حسین علی خاں کا داخلہ میرے اپنے خیال میں ناممکن تھا، اس لیے میں خود حاضر ہو گئی۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”مادر محترم! اگر اسے گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ بادشاہ کی ماں ہونے کی ساتھ ہی ہم دونوں کی ماں بھی ہیں۔ میں نے یا میرے چھوٹے بھائی حسین علی خاں نے ہمیشہ آپ کو اپنی ماں سمجھا ہے اور اس رشتے کے پیش نظر ہم دونوں بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ خلوت میں بادشاہ کے پاس جانا تو خطرناک ہو سکتا ہے لیکن آپ کے پاس جانے میں کوئی خطرہ نہیں۔ آپ نے اب تک ہم دونوں بھائیوں پر جو نوازشیں کی ہیں ان کا اثر تادم زیست دل میں موجود رہے گا۔“

بادشاہ کی ماں نے کہا۔ ”عبداللہ خاں! میں نے تم دونوں بھائیوں سے کلام اللہ کو درمیان میں رکھ کر کچھ عہد و پیمان کیے تھے۔ میں جب تک زندہ رہوں اس کا خیال رکھوں گی۔ فرخ سیر غلط اور موقع پرست امرا میں گھرا ہوا ہے، ان حالات میں تم دونوں بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لو گے تو پھر اس کا ساتھ کون دے گا؟ آج میں اس لیے آئی ہوں کہ تم دونوں کو فرخ سیر کے پاس لے جاؤں اور صلح و صفائی کروادوں کیونکہ یہ غلط فہمیاں جو تم لوگوں میں پیدا ہو گئی ہیں، اس وقت تک نہیں دور ہوں گی جب تک تم لوگ مل جل کر بیٹھو گے نہیں اور گلے شکوے کر کے دلوں کی کدورتیں ختم نہ کر دو گے۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن ہماری زندگی کی ضمانت کون دے گا؟“

بادشاہ کی ماں نے کہا۔ ”میں دوں گی، تمہاری

بزدل امرا کی مصاحبت، احمقوں کی ہم نشینی اور دل میں ہم دونوں بھائیوں کا خوف چنانچہ ان حالات میں ہم دونوں بھائیوں کے خلاف کسی کا سوچنا بھی ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنی زندگی سے بے زار، خودکشی پر آمادہ ہو۔“

تقریب خاں نے کھسپائی ہنسی بھینچتے ہوئے کہا۔ ”جناب والا! آپ دونوں بھائی تو سلطنت مغلیہ کے سب سے زیادہ با اختیار اور با اثر امیر ہیں۔ پھر میں آپ کے خلاف کچھ سوچ کر یا عملی قدم اٹھا کر اپنی دنیا اور عاقبت کیوں خراب کروں گا۔“

تقریب خاں، عبداللہ خاں سے رخصت ہو کر میر جملہ کے پاس پہنچ گیا اور اسے مطلع کیا۔ ”جناب! منصوبہ کامیاب ہے، اب ہمیں اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل شروع کر دینا چاہیے۔“

میر جملہ نے ذرا تشویش کا اظہار کیا۔ ”تقریب خاں! ایک خطرہ ابھی باقی رہتا ہے۔ اگر ہم دونوں نے زہرہ کو تصرف میں لانے کے بعد عبداللہ خاں کے حوالے کیا اور زہرہ وہاں سے بادشاہ کے پاس پہنچ گئی اور ہم دونوں کے خلاف داویلا کیا تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوگا؟“

تقریب خاں نے مطمئن اور پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”اول تو یہ ناممکن ہے کہ زہرہ، عبداللہ خاں کے پاس پہنچ کر کسی اور کے پاس جاسکے کیونکہ عبداللہ خاں لڑکیوں اور عورتوں کا اتنا حریف ہے کہ زہرہ کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے گا اور اگر واقعی کسی طرح زہرہ بادشاہ کے پاس پہنچ گئی تو میں، آپ اور عبداللہ خاں تینوں ایک ہی گناہ اور ایک ہی جرم کے مرتکب ٹھہریں گے اور اس وقت آپ اور عبداللہ خاں برسوں کے عناد اور رنجش کو دور کر کے آپس میں گہرے دوست بن سکیں گے اور یہ طے ہے کہ جب آپ دونوں ایک دوسرے کے دوست بن جائیں گے تو بادشاہ کی مجال نہ ہوگی کہ ایک لڑکی کی خاطر آپ دونوں جیسے طاقت ور امرا کی مخالفت اور دشمنی مول لے۔“

میر جملہ کے دل میں جو ذرا سار ہاسبا اندیشہ تھا تو وہ بھی تقریب خاں کی دلیلوں سے جاتا رہا۔

اس کے بعد میر جملہ اور تقریب خاں نے مل جل کر زہرہ کے ساتھ داو عیش دینا شروع کر دی۔ زہرہ چینی چلاتی رہی، دہائیاں دیتی رہی اور خوشامدیں کرتی رہی لیکن ان دونوں پر کسی بات کا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ دونوں زہرہ پر فقرے گتے رہے اور وطن و وطن کرتے رہے اور زہرہ ان پر لعنت ملاست کرتی رہی۔ استاد کو زرو مال دے کر خاموش

غرق کر دیا تھا۔ اس نے تقریب خاں کو مستقبل کے سہانے خواب دکھا کر مصروف کر دیا تھا اور تقریب خاں ہی نے عبداللہ خاں کے سامنے زہرہ کے بے مثال حسن و جمال اور رقص و موسیقی کی بے پناہ تعریفیں کر کے اسے مشتاق بنا دیا تھا اور تقریب خاں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اوہ زہرہ کو میر جملہ کی طرف گاہ سے نکال کر سید عبداللہ خاں کی طرف گاہ میں داخل کر دے گا۔ میر جملہ سے ساز باز کرنے کے بعد تقریب خاں، سید عبداللہ خاں کے پاس پہنچا اور اسے مطلع کیا کہ اس نے اپنا کام کر لیا ہے اور زہرہ عنقریب اس کی طرف گاہ میں داخل ہو جائے گی۔

سید عبداللہ خاں نے کہا۔ ”اگر تو نے یہ کام کر دیا تو میں بھی تجھ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے جب بھی بادشاہ کا قرب حاصل ہوا اور باہمی غلط فہمیاں دور ہوئیں میں تجھے کوئی اعلیٰ منصب دلا دوں گا جس سے خود تجھے بادشاہ کا قرب حاصل رہا کرے گا۔“

تقریب خاں نے عاجزی سے عرض کیا۔ ”جناب والا! میں جس جتن اور کوشش سے زہرہ کو آپ کے پاس لا رہا ہوں، اس میں ایسا بھی ممکن ہے کہ میں میر جملہ کے سامنے آپ کی برائیاں کروں۔ جس سے سننے والا یہ محسوس کرے کہ میں آپ کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہوں کیونکہ میر جملہ کے سامنے جب تک آپ کی برائیاں نہیں کروں گا آپ کے خلاف اس کا اعتماد نہیں حاصل کر سکوں گا۔ اب میں اس میں کامیاب ہو چکا ہوں اور میر جملہ یہ سمجھنے لگا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں میر جملہ کی خاطر رہتا ہوں۔“

سید عبداللہ خاں نے مسکرا کر کہا۔ ”دہرا کھیل، کھیل رہے ہو؟“

تقریب خاں گھبرا گیا، بولا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ میں میر جملہ کے دل سے اس بغض و عناد اور شک و شبہ کو دور کر دینا چاہتا ہوں جو آپ سے میل ملاقات اور تعلقات کے بعد اس کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔“

سید عبداللہ خاں نے کہا۔ ”اچھا تو اپنا کام جاری رکھ

عبداللہ خاں سے بھی رجوع کیا گیا لیکن بعد میں پتا چلا کہ رتن چند جو کچھ کر رہا ہے، عبداللہ خاں کی سرپرستی میں کر رہا ہے۔ اس لیے بادشاہ سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان مظالم کا سدباب کیا جائے۔

بادشاہ نے میر جملہ سے پوچھا۔ ”رتن چند کی بڑی شکایتیں آرہی ہیں، آخر اس کا کیا کیا جائے؟“

میر جملہ نے صاف صاف مشورہ دیا۔ ”قبلہ زندگان! جب تک عبداللہ خاں وزیر ہے اور اس کا چھوٹا بھائی حسین علی خاں میر بخش ہیں۔ اس وقت تک کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ پہلے ان دونوں کو ان کی کلیدی جگہوں سے ہٹائیے اس کے بعد ان مظالم کا سدباب بھی ہو جائے گا۔“

بادشاہ نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”لیکن انہیں ہٹایا کس طرح جائے، فوج حسین علی خاں کے قبضے میں ہے اگر ان دونوں بھائیوں کو یہ شبہ بھی ہو جائے کہ انہیں ان کے منصبوں سے ہٹایا جا رہا ہے تو وہ دونوں مل کر نہ معلوم کیا قیامت ڈھادیں۔“

میر جملہ نے برا سامنہ بنایا اور عرض کیا۔ ”حضور کی مادر محترم عبداللہ خاں سے خفیہ ملاقاتیں فرما رہی ہیں۔ یہ ملاقاتیں کیوں ہو رہی ہیں، حضور والا ہی خوب جانتے ہیں لیکن ان ملاقاتوں کے خلاف حضور کے خدمت گاروں میں جو بے چینی پائی جاتی ہے، وہ کوئی اچھی قال نہیں ہے۔“

سادہ لوح بادشاہ نے جواب دیا۔ ”مادر محترم ان دونوں بھائیوں کی ناراضی سے خوف زدہ ہیں اور یہ کوشش کر رہی ہیں کہ میں ان دونوں بھائیوں سے مل کر صلح صفائی کر لوں اور بہت ممکن ہے کہ ہم تینوں بہت جلد یکجا ہوں اور اپنے اپنے دلوں سے کدورتیں دھو دینے کی کوشش کریں۔“

میر جملہ کا چہرہ مارے خوشی کے تھما گیا، بولا۔ ”حضور والا! اگر میں یہ کہوں کہ وہ مارا تو بے جا نہ ہوگا۔ ان دونوں بھائیوں کو یہیں محل سرا میں طلب فرمائیے اور جب وہ آجائیں تو نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ان دونوں کا کام تمام کر دیا جائے۔ اس سے بہتر موقع کبھی نہ ملے گا۔ اس سے فائدہ اٹھائیے۔“

فرخ سیر نے جواب دیا۔ ”شاید میں ایسا نہیں کر سکوں گا کیونکہ وہ دونوں میری ماں کی ضمانت میں یہاں آئیں گے، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہاری تجویز سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔“

میر جملہ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”یہ حضور والا کی ٹیک نفسی ہے، ورنہ ان آستین کے سانپوں کو معاف کر دینے

کا مطلب یہ ہے آدمی ان سے ڈسوانے پر رضامند ہو گیا ہے۔ آپ کو موقع مل رہا ہے اور آپ انہیں معاف کیے دے رہے ہیں لیکن خدا نہ کرے کہ وہ دن آئے، اگر میر جملہ زندہ رہا تو حضور کو سلام کرنے حاضر ہو جائے گا۔ میں نے تو یہاں تک افواہ سنی ہے کہ یہ دونوں بھائی سلطنت مظلیہ پر خود قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔“

بادشاہ نے گہرا کر پوچھا۔ ”سچ؟ لیکن اس کی خبر تمہیں دی کس نے؟ راوی ثقہ ہے یا غیر معتبر؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”کوئی ایک راوی ہو تو عرض بھی کروں۔ یہاں تو ہر شخص اس خبر یا افواہ کا راوی ہے۔ حضور والا تو باہر نکلے نہیں، یہی ناچیز ادھر ادھر بوسوگھتا پھرتا ہے چنانچہ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ سلطنت مظلیہ بہت جلد دونوں سیدوں کے پاس چلی جائے گی، سخت پریشان ہوں اسے روکیے۔“

بادشاہ بہت زیادہ بدحواس ہو گیا۔ ”تو یہ بات ہے، یہ دونوں اس حد تک غداری پر آمادہ ہیں۔“

میر جملہ نے طنزاً عرض کیا۔ ”اور حضور والا! ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیں کہ عبداللہ خاں کو حضور نے یار و قادر کا خطاب دے رکھا ہے۔“

میر جملہ نے اپنی بات پوری ہی کی تھی کہ بادشاہ کو زہرہ یاد آگئی، پوچھا۔ ”اور میر جملہ! وہ لڑکی، مقتول ذوالفقار خاں کی محبوبہ زہرہ کہاں ہے، تم نے اسے میرے پاس پہنچایا نہیں؟“

میر جملہ نے ماتھا پکڑ لیا، بولا۔ ”حضور والا! وہ تو میں بھول ہی گیا تھا، وہ لڑکی عبداللہ خاں کے حوالے کر دی گئی تھی اور درخواست کی گئی تھی کہ اسے آپ تک پہنچا دیا جائے۔ تقرب خاں اس کا گواہ ہے لیکن اب سننے میں آیا ہے کہ عبداللہ خاں کو وہ لڑکی پسند آگئی ہے اور وہ خیانت شاہی کا مرتکب ہوا ہے۔ حضور والا باز پرس فرما سکتے ہیں۔“

بادشاہ کے چہرے کی رنگت ہی بدل گئی، مارے غصے کے چہرہ انگارہ ہو گیا، کہا۔ ”اس کی یہ جرأت، یہ ہمت۔ واللہ! یہ تو اب ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور اس کا دفعیہ بہت ضروری ہے۔“

میر جملہ بادشاہ کو مشتعل کر کے گھر پہنچا اور تقرب خاں کو ساتھ لے کر اپنی طرف گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں ایک کمرے میں بیٹھ کر اسے بادشاہ کی بات چیت سے آگاہ کیا اور کہا۔ ”اب ان دونوں بھائیوں کے دن پورے ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ میں نے بادشاہ کو آمادہ کر لیا ہے کہ وہ

دونوں ملاقات کے لیے جیسے ہی شاہی محل سرا میں داخل ہوں، ان کا کام تمام کر دیا جائے۔“

تقرب خاں خوش ہونے کے بجائے فکر مند سا ہو گیا، پوچھا۔ ”وہاں اور کیا باتیں ہوئیں؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”میں نے بادشاہ سے کہہ دیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی محبوبہ زہرہ، وزیر کے حوالے کی جا چکی ہے کہ اسے بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے لیکن وزیر نے اسے اپنی طرف گاہ میں داخل کر کے خیانت اور بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ اس واقعے نے بادشاہ کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے اور اب یہ ضروری ہے کہ زہرہ کو آج ہی عبداللہ خاں کے حوالے کر دیا جائے۔“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”مجھے کیا ہے، میں اسے آج ہی وزیر کے حوالے کر دوں گا۔“

اس وقت تک میر جملہ اور تقرب خاں، زہرہ کو اتنا ستا چکے تھے کہ وہ زرد پڑ گئی تھی۔ تقرب خاں نے اسے اسی دن عبداللہ خاں کے حوالے کر دیا۔

عبداللہ خاں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”تقرب خاں! میں نے تیری خواہش پر اسے قبول کیا ہے ورنہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس لڑکی میں رہا کچھ بھی نہیں۔“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”جناب والا! اس کا یہ حال فاقوں نے کر دیا ہے۔ یہ کچھ کھاتی بیٹی ہی نہیں پھر صحت کیسے بنے گی؟“

عبداللہ خاں نے زہرہ کو خوب اچھی طرح جانچا اور اس کے بعد اپنے عشرت کدے میں داخل کر لیا۔

☆ ☆ ☆

بادشاہ کی ماں نے دونوں بھائیوں اور بادشاہ میں خفیہ ملاقات کا انتظام کر دیا۔ میر جملہ اور تقرب خاں سانس روکنے کے انداز میں کوئی نئی خبر سننے کا انتظار کر رہے تھے۔ میر جملہ خوش تھا کہ دونوں بھائی محل سے زندہ واپس نہیں جائیں گے۔ دونوں بھائی فکر اور تشویش لیے محل سرا میں داخل ہو گئے۔ بادشاہ کی ماں اس بات کی نگرانی کر رہی تھی کہ کہیں کوئی ایسا واقعہ نہ پیش آجائے جس سے حالات اور زیادہ بگڑ جائیں۔ بادشاہ نے ان دونوں بھائیوں کا بڑی سردمہری سے استقبال کیا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ طاری ہو گئی جس میں اس کا کینہ، شکایتیں اور یہ تاثر موجود تھا کہ ”بالآخر آگئے تھے نام دونوں، جا بھی کہاں سکتے تھے؟“

بادشاہ کی نظریں ادھر ادھر اٹھ رہی تھیں۔ دونوں

بھائیوں کو شبہ ہوا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ چھوٹے بھائی حسین علی خاں نے خطرے کی بو محسوس کی، کہا۔ ”حضور والا! ہم دونوں بھائی اس امید پر آئے ہیں کہ جلد از جلد باہمی غلط فہمیاں دور کر کے محل سرا سے واپس جائیں۔ ورنہ یہاں زیادہ دیر رکنے میں ایک خطرہ منڈلاتا رہے گا۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیسا خطرہ؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”میں نے اپنی فوج اپنے چچا زاد بھائی غیرت خاں کے حوالے کر دی ہے۔ وہ ہم دونوں کی واپسی کا تین گھنٹے انتظار کرے گا، اس کے بعد یہ یقین کر کے کہ ہماری جانیں خطرے میں ہیں، مناسب کارروائی شروع کر دے گا۔“

بادشاہ کا خون کھول رہا تھا، غصے میں بولا۔ ”تم دونوں بھائیوں نے بہت سرائٹھا رکھا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں مظلیہ سلطنت کی بنیادوں پر اپنی حکومت کی بنیادیں رکھنا چاہتے ہو؟“

عبداللہ خاں نے کان پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ ”ہماری توبہ ہے، ہم زندگان عالی یہ بے ہودہ اور مہلک خیال اگر اپنے دل میں لائیں بھی تو خدا ہمیں ہلاک کرے۔ حضور کے دل و دماغ میں یہ وہم ہمارے دشمنوں نے پیدا کیا ہوگا۔ حضور والا تو خاندان مظلیہ ہی کے چشم و چراغ ہیں اور یک زمانہ واقف ہے کہ حضور استحقاق حکومت رکھنے کے باوجود کتنی مشکلوں اور مصیبتوں سے تاج و تخت حاصل کر سکے ہیں پھر ہمارے جیسے لوگ جن کا ہندوستان کی حکومت میں کوئی حق یا حصہ نہیں ہے، کس طرح حکومت کے مدعی ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے بھی تو یہ بھی تو سوچے کہ ہمیں تائید کس کی حاصل ہوگی اور ہماری پشت پناہی کون کرے گا؟“

بادشاہ نے سختی سے پوچھا۔ ”پھر تم دونوں نے دربار کی حاضری کیوں ترک کر دی ہے؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”صرف اس لیے کہ حضور والا کو یہ بتا سکیں کہ اب ہمارے دل صاف نہیں ہیں اور منافقت کی حاضری سے یہ کہیں بہتر ہے کہ دور دور رہا جائے۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”اور دور دور رہنے کے باوجود ہم دونوں نے اپنے کارِ منصبی پوری دیانت داری سے انجام دیے ہیں۔“

بادشاہ نے اسی ترشی اور ناگواری سے گفتگو جاری

رکھی، کہا۔ ”تیرے مقرر کردہ دیوان اور ناٹھین نے بڑی مگر بڑ پھیلا رکھی ہے۔ ان کی آئے دن شکایتیں آتی رہتی ہیں اور میں اتنا مجبور اور بے بس ہوں کہ ان شکایتوں پر کوئی کارروائی اس لیے نہیں کر سکتا کہ تجھ سے ملاقات ہی نہیں ہوتی جو استفسار کیا جاسکے۔“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”حضور کو یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی کتنا ہی اچھا انتظام کیوں نہ کرے لوگوں کی شکایتیں ہر حال میں باقی رہتی ہیں، سب کو خوش رکھنا ناممکن ہے۔“

ماں نے ان تینوں کی باتوں میں دخل اندازی کی، کہا۔ ”عبداللہ خاں اور حسین علی خاں، تم دونوں بے کاری باتوں میں اپنا وقت کیوں ضائع کر رہے ہو۔“ پھر اپنے بادشاہ بیٹے سے کہا۔ ”اور فرخ سیر! تم بھی فضول قسم کے سوال و جواب مت کرو۔ جو ہوا سو ہوا، ماضی پر خاک ڈالو اور حال اور مستقبل کی بات کرو، ورنہ یہ گلے شکوے اور شکایتیں ساری عمر باقی رہیں گی، کبھی قسم نہ ہوں گی۔“

فرخ سیر نے پوچھا۔ ”مادر محترم! پھر آپ ہی مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”تم ان دونوں کی پچھلی باتیں اپنے حافظے سے نکال دو اور یہ دونوں بھی تمہارے خلاف شکوک و شبہات اپنے دلوں سے دور کر دیں اور آئندہ کے لیے وعدہ کریں کہ ایسی خطرناک صورت حال نہیں پیدا ہونے دیں گے۔“

دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی تلواریں نیام سے نکال لیں۔ بادشاہ گھبرا گیا اور بھاگنے کے لیے کھڑا ہونے لگا۔ بادشاہ کی ماں بھی گھبرا گئی لیکن دونوں بھائیوں نے اپنی تلواریں بادشاہ کے حوالے کر دیں اور نیاز مندی سے سر جھکا کر عرض کیا۔ ”بندہ پرور! اگر ہم دونوں خطا کار اور مجرم ہیں تو ہماری تلواریں آپ کے قبضے میں ہیں، آپ انہیں سنبھالیے اور ہم دونوں کے سر اتار لیجیے۔ ہم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں اور اگر پچھلے گناہوں کی معافی ممکن نہیں تو پھر ہمیں ہمارے عہدوں سے سبکدوش کر دیجیے اور اجازت دیجیے کہ ہم حج بیت اللہ کو روانہ ہو جائیں اور اگر حضور ہمیں اپنی خدمت میں رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن سے شکوک و شبہات کا زہریلا مادہ نکال پھینکیے اور حاسدوں کی فتنہ انگیز باتوں کی طرف کان دھرنا چھوڑ دیجیے۔ یہ حاسد ہماری جانوں کے درپے ہیں۔“

بادشاہ کی ماں نے فرخ سیر سے کہا۔ ”بس اتنا ہی

کافی ہے، اب تم بھی اپنا دل صاف کر لو۔“

حسین علی خاں نے مزید کہا۔ ”حضور کو کم از کم یہ تو یار رکھنا ہی ہوگا کہ ہم دونوں نے سلطنت کی حصولیابی اور پائیداری کے لیے کتنا خون بہایا ہے۔ حضور کی ذات سے ہمیں یقین ہے کہ اپنے ان وقاداروں کی طرف سے اپنا دل دھو ڈالیں گے اور ایسے خیالات کو اپنے دماغ میں نہیں آنے دیں گے جن سے کلام اللہ کی قسم کی توہین ہوتی ہو۔“

دونوں کی اس مختصر سی تقریر نے بادشاہ کو بہت متاثر کیا۔ بادشاہ کی ماں بھی بہت خوش اور متاثر تھی۔ اس نے بیٹے سے کہا۔ ”بولو، اب تم کیا چاہتے ہو؟ یہ دونوں اپنی غلطیوں پر نادم اور شرم سار ہیں۔ اب تم بھی انہیں معاف کر کے شاہانہ فواخ دلی کا ثبوت دو۔“

بادشاہ نے اپنی آخری شکایت کی۔ ”اور عبداللہ خاں تمہاری ایک بات مجھے بہت گراں گزری۔ ڈوالفقار خاں کی محبوبہ زہرہ کہاں ہے؟“

عبداللہ خاں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”حضور کو جو کچھ فرمانا ہے فرمائیے، اس کے بعد میں جواب دوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”وہ میرا جملہ نے امانتاً تمہارے حوالے کی تھی اور تم نے اسے اپنی طرب گاہ میں داخل کر لیا، یہ بہت بڑی جسارت ہے جو تم نے کی ہے۔“

عبداللہ خاں نے پوچھا۔ ”آپ کو جو کچھ فرمانا تھا فرما چکے؟“

”ہاں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”میرا چھوٹا بھائی حسین علی خاں یہیں موجود رہے گا، مجھے باہر جانے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”باہر جا کر کیا کرو گے؟“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”یہ واپس آ کر بتاؤں گا۔“

بادشاہ نے جانے کی اجازت دے دی۔ پورے ماحول پر سناٹا طاری ہو گیا۔ کچھ دیر بعد عبداللہ خاں اس طرح حاضر ہو گیا کہ اس کے پیچھے پیچھے زہرہ چلی آ رہی تھی۔ عبداللہ خاں نے زہرہ سے کہا۔ ”کورنش و تسلیمات بجالاؤ۔“

زہرہ نے کئی بار جھک کر بادشاہ کو سلام کیا۔ عبداللہ خاں نے کہا۔ ”حضور کی امانت، امانت ہی کی طرح محفوظ رہی ہے۔ زہرہ موجود ہے حضور اس سے خود معلوم فرمائیے۔ میں اس کے ساتھ کس طرح ادب و احترام سے پیش آیا ہوں۔ زہرہ خود گواہی دے گی اور ان کے کروت بھی بتائے

گی جو اس وقت حضور کے سب سے زیادہ وقادار اور اہلین ہونے کے مدعی ہیں۔“

بادشاہ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ اس نے زہرہ کو غور سے دیکھا تو تنگ رہ گیا کہ انسان اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے گویا خود سے کہا۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے مغالطے میں رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مجھے دھوکے میں رکھا جا رہا تھا۔ تم دونوں کے خلاف مجھے برگشتہ اور دل برداشتہ کیا جا رہا تھا؟“

حسین علی خاں نے عرض کیا۔ ”حضور والا! ابھی کیا ہے، معلوم ہی نہیں کتنی سازشیں ایسی ہیں جو ہم دونوں بھائیوں کے خلاف عمل میں لائی گئی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو وقت آنے پر اسی طرح ان سب پر سے پردے اٹھتے جائیں گے۔“

بادشاہ نے دونوں بھائیوں کی تلواریں انہیں واپس کر دیں، کہا۔ ”انہیں اپنی اپنی نیام میں رکھ لو، یہ ہمارے دشمنوں کے خلاف کام آئیں گی۔“

حسین علی خاں نے پوچھا۔ ”تو حضور نے ہمیں معاف فرمادیا؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”بالکل، اب تم دونوں بھی اپنے دلوں سے کدورت کی گردور کر دو۔“

بادشاہ کی ماں نے بڑی خندہ پیشانی سے ان دونوں بھائیوں کو شاہاںش دی اور فرخ سیر کو نصیحت کی۔ ”بیٹے! جہانگیری بہت مشکل شے ہے۔ اس میں جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت رہتی ہے۔ عقل و تدبیر کا دامن پکڑے رہو اور جھوٹی افواہوں اور سازشوں سے ہوشیار رہو اور خبردار رہو کیونکہ سازشوں اور افواہوں کی تند و تیز آندھیوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو اکھاڑ کر دشت گمنامی میں پھینک دیا ہے اور پھر پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں چلی گئیں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”کچھ بھی ہو لیکن مجھے ایک فیصلہ ابھی اسی وقت کرنا ہے اور وہ یہ کہ مجھے میرا جملہ سے بہر صورت نجات حاصل کرنا ہے۔ میں نے اگر اس شخص کو اپنے آپ پر مسلط رکھا تو مجھے معلوم نہیں کہ میرا اور میری حکومت کا کیا حشر ہوگا۔“

حسین علی خاں نے عرض کیا۔ ”اگر میرا جملہ سے آپ نجات حاصل کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس عاجز کی چند معروضات کو سامنے رکھ کر کوئی قدم اٹھائیے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں تم دونوں بھائیوں کی سفارشات اور مشوروں کا منتہی ہوں کیونکہ تم

جیسے مخلص اور دانا و بینا امیر میرے ملازمین میں موجود ہی کہاں ہیں۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”ابھی تو حضور والا جب زہرہ سے باتیں کریں گے تو میرا جملہ کی گندگی اور خباثت کھل کر سامنے آئے گی، ہم دونوں بھائی اگر میرا جملہ کے خلاف کچھ عرض کریں گے تو اسے ہمارے حسد پر محمول کیا جائے گا۔“

حسین علی خاں نے بڑے بھائی کو منع کیا۔ ”بھائی صاحب! میرا جملہ کے خلاف بولنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے اس طرح آہستہ آہستہ بادشاہ سلامت پر ظاہر ہوتا رہے گا۔ ہم دونوں اس کی غیبت سے اپنی زبان کیوں آلودہ کریں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”تم دونوں نے مشورہ نہیں دیا کہ ہمیں میرا جملہ کے خلاف کون سا قدم اٹھانا چاہیے؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”آپ اس کے خلاف جو قدم بھی اٹھائیں اس میں اس کا لحاظ نہ رکھیں کہ وہ سزا نہ معلوم ہو، ورنہ اس کے حمایتی امرا میں بے چینی پھیل جائے گی اور وہ مل جل کے سازشیں شروع کر دیں گے فی الحال درگزر کر دینا ہی کافی ہے۔“

بادشاہ نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس کی موجودگی اور قربت سے فتنے بہ دستور جنم لیتے رہیں گے۔ آخر اس کا تذکرہ کس طرح عمل میں لایا جائے؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”میرے خیال میں میرا جملہ کو عظیم آباد کا صوبے دار بنا کر بہار بھیج دیا جائے، اس طرح وہ دارالخلافہ سے دور بھی ہو جائے گا اور اس کی لیاقت اور انتظامی صلاحیتوں کا بھانڈا بھی پھوٹ جائے گا اور اس طرح حضور والا کو اس کے خلاف کوئی بڑا اور انتہائی قدم اٹھانے کا جواز بھی ہاتھ آجائے گا۔“

فرخ سیر ان دونوں بھائیوں سے اتنا متاثر تھا کہ ان کی ہر بات ماننا چلا گیا اور بادشاہ اور سیدزادوں میں ایک بار پھر مفاہمت ہوئی اور اس مفاہمت کا سہرا بادشاہ کی ماں کے سر بندھتا تھا۔

☆☆☆

بادشاہ کو زہرہ سے میرا جملہ اور تقرب خاں کی بابت جو کچھ معلوم ہوا، اس کے پورے جسم میں ایک آگ سی لگ گئی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میرا جملہ کو اپنے پاس نہیں رکھے گا۔ بادشاہ کو زہرہ سے گھن آنے لگی۔ ایک ایسی لڑکی جو ڈوالفقار خاں کے پاس رہ چکی تھی اور اس کے بعد اس میں میرا جملہ اور تقرب خاں نے تصرف کیا ہو وہ لڑکی

حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا تو اسے دکن کی صوبے داری عطا کر دی جائے گی۔ داؤد خاں برہان پور پہنچ گیا اور وہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب امیر الامرا کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے داؤد خاں کو خط لکھا۔

”داؤد خاں! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ صوبہ جات دکن چونکہ مجھ سے متعلق ہیں اس لیے تم پر لازم ہے کہ جادہ فرماں برداری سے منحرف نہ ہو اور فوراً میرے استقبال کو حاضر ہو۔ اگر ایسا کرنے میں کوئی قہاحت ہو تو فوراً بادشاہ کے حضور میں چلے جاؤ اور فتنہ و فساد برپا کرنے کا سبب نہ بنو۔“

داؤد خاں تو بادشاہ کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ اس نے امیر الامرا کے حکم کی ذرا بھی پروا نہ کی اور امیر الامرا سے جنگ کرنے کی ٹھان لی۔ امیر الامرا جواب نہ پا کر چھتیس ہزار سواروں کے ساتھ داؤد خاں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ داؤد خاں بھی اپنے ہمراہیوں سمیت بالمقابل آن کھڑا ہوا اور کچھ ہی دیر بعد ان دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ داؤد خاں دکن کی صوبے داری کی طمع میں اپنا ہاتھی بڑھا کر امیر الامرا کو تلاش کرنے لگا۔ امیر الامرا حسین علی خاں کا خاص رفیق میر مشرف خاں، داؤد خاں کے ارادوں کو بھانپ گیا اور اپنا ہاتھی بڑھا کر داؤد خاں کے ہاتھی کے قریب لے گیا۔ میر مشرف خاں سر سے پیر تک آہن پوش تھا۔ داؤد خاں غلطی سے میر مشرف کو امیر الامرا سمجھ بیٹھا اور چلا کر کہا۔ ”حسین علی خاں! آخر تو عورتوں کی طرح منہ کیوں چھپا رہا ہے، اپنے چہرے سے نقاب اٹھاؤ بزدل انسان۔ میں تیرا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

خود داؤد خاں کے جسم پر زرہ بکتر نہیں تھی اور وہ اپنے عام لباس میں جنگ لڑ رہا تھا۔ داؤد خاں نے میر مشرف خاں کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑا تو وہ میر مشرف کے گلے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے کراہتے اور گرتے ہوئے ہاتھی کی ہودج کو پکڑ لیا۔ داؤد خاں کے فیل بان نے موقع غنیمت دیکھ کر کئی آنکس میر مشرف خاں کی گردن میں پیوست کر دیے۔ امیر الامرا کی فوج نے جب یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو افواہ اڑ گئی کہ میر مشرف خاں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ امیر الامرا حسین علی خاں کو بھی اس خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور جب اپنے ساتھیوں میں ہراسانی محسوس کی تو خود بھی مایوس ہو گیا۔ اس دوران داؤد خاں اپنے ہاتھی کو بڑھاتا ہوا حسین علی خاں کے سر پر پہنچ گیا۔ امیر الامرا حسین علی خاں کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ داؤد خاں، حسین علی خاں پر حملہ

ہو شیاری اور چالاکی سے ہونا چاہیے ورنہ قیامت اٹھ کھڑی ہوگی۔“

اور اسی وقت بادشاہ نے دکن کی صوبے داری پر حسین علی خاں کی تعیناتی کا اعلان کر دیا۔ میر جملہ نے ایک بار پھر بادشاہ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور اس سے شیشی ٹپکھتی باتیں کرنے لگا۔ اب بادشاہ ایک بار پھر ان دونوں بھائیوں کا دشمن ہو چکا تھا۔

بادشاہ کے نئے اعلان نے دونوں بھائیوں کو ایک بار پھر بادشاہ کی طرف سے بدگمان کر دیا۔ دونوں بھائی بادشاہ سے ملے اور ذرا سختی سے کہا۔ ”ہمیں بادشاہ کے فیصلے سے اتفاق ہے لیکن اس کے طریقہ تعمیل میں ہماری مرضی کا خاص خیال رکھا جائے۔“

بادشاہ نے کسی اجنبی کی طرح سوال کیا۔ ”یعنی، کیا مطلب؟“

حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”میر جملہ عظیم آباد مجھ سے پہلے روانہ ہوگا، اس کے بعد میں جاؤں گا۔“

بادشاہ نے شرم سے نظریں چرائے ہوئے کہا۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“

حسین علی خاں نے دوسری شرط پیش کی۔ ”میری عدم موجودگی میں بھائی عبداللہ خاں کا خاص خیال رکھا جائے گا اور ان کے خلاف سازشیں نہیں کی جائیں گی۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”یہ بھی منظور ہے۔“

حسین علی خاں نے آخری بات بھی کہہ دی، بولا۔ ”اور اگر اس کی خلاف ورزی ہوئی تو بادشاہ کو میری یہ بات بھی یاد رکھنی ہوگی کہ میں بیس دن کے اندر اندر دہلی میں موجود رہوں گا پھر جو کچھ ہوگا میں نہیں جانتا میرے خدا کو اس کا بہتر علم ہوگا۔“

دونوں بھائی اس عہد و پیمان کے بعد دربار سے چلے گئے لیکن ان کی تیوریوں کے بل بتاتے تھے کہ ان کے ارادے ایچھے نہیں ہیں۔

یہ تسلط کئی مرحلوں میں حاصل ہوگا۔ ان کے منصوبے کی درمیانی کڑی یہ ہے کہ حضور کو حضور کے جاں نثاروں سے محروم کر دیا جائے۔ مجھے عظیم آباد کی صوبے داری پر روانہ کر دینا اسی مقصد کی حصول یابی کی ایک کڑی ہے۔ میں عظیم آباد چلا جاؤں گا لیکن ایک گزارش ضرور کروں گا، اس گزارش کو ماننا یا نہ ماننا حضور پر موقوف ہے لیکن اس کے ماننے میں فائدے ہیں اور نہ ماننے میں نقصانات۔“

بادشاہ نے بے چینی سے دریافت کیا۔ ”اپنی درخواست پیش کر، میں جانتا چاہتا ہوں کہ تو اپنی گزارش میں کیا کہنا چاہتا ہے۔“

میر جملہ نے عرض کیا۔ ”قبلہ بند گاں! اگر آپ اپنے دشمنوں کی سازش کو ناکام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے ضروری ہے کہ دونوں بھائیوں کو ایک جگہ نہ رہنے دیں۔ عبداللہ خاں یاد و فادار اپنے چھوٹے بھائی حسین علی کے بغیر بے کار ہے۔ حسین علی خاں بہت چالاک اور عیار انسان ہے۔ میرے ساتھ ہی اسے بھی کہیں کا صوبے دار مقرر کر دیجیے۔ اس طرح دونوں بھائیوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور ان کا زور ٹوٹنا بہت ضروری ہے کیونکہ طاقت کے نشے نے ان دونوں کو فرعون بنا رکھا ہے۔“

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا، اسے متزلزل دیکھ کر میر جملہ نے اپنا پورا زور صرف کر دیا، کہا۔ ”میں ایک بار پھر حضور کو خبردار کرتا ہوں کہ ان دونوں کا ایک جگہ رہنا بہت خطرناک ہے اور ان کا زور یوں ہی توڑا جاسکتا ہے کہ انہیں منتشر کر دیا جائے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”تو گویا تمہارا مشورہ یہ ہے کہ حسین علی خاں کو بھی صوبے دار بنا کر کہیں دور بھیج دیا جائے تو مناسب ہوگا؟“

بالکل، بالکل۔“ میر جملہ نے جلدی سے کہا۔ ”اگر یہ دونوں بھائی خدمت ہی کرنا چاہتے ہیں تو دار الخلافہ سے دور رہ کر بھی کر سکتے ہیں اور بے خوف و خطر آزادی سے کر سکتے ہیں۔“

بادشاہ کے دل میں زہر والا کانٹا بہ دستور چھ رہا تھا۔ اس نے بے رخی سے کہا۔ ”اور یہ زہرہ کے معاملے میں تم کیا کہتے ہو؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”حضور والا! یہ سب کئی بدی باتیں ہیں۔ زہرہ کو انعام و اکرام کا لالچ دے کر اس سے من مانا بیان دلوا لیا جائے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”بہر حال میں جو کچھ کرنا ہے بہت

بادشاہ کے لائق کس طرح ہو سکتی تھی۔ اس نے زہرہ کو بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھا لیکن ابھی اس میں تھوڑی بہت تیموری غیرت باقی تھی، چنانچہ اس نے بڑے جبر کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ زہرہ کو حرم سرا میں نہیں رکھے گا۔ اسے شاہی محل سرا میں رہنے کو ایک جگہ تول گئی لیکن بادشاہ کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے زہرہ سے بہت ساری باتیں کیں اور ان باتوں سے بہت محظوظ بھی ہوا۔ زہرہ کو چونکہ بادشاہ کی نیت کا ابھی علم نہیں تھا اس لیے وہ اس گھڑی سے خوف زدہ بھی جب بادشاہ اسے حرم سرا کے ریوڑ میں ڈال دے گا۔

اس نے میر جملہ کو بہت ڈانٹا اور اس پر بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ اس نے زہرہ کے سلسلے میں جو الزام عبداللہ خاں پر لگایا تھا، اس کا تقرب خاں کے ساتھ وہ خود مرتکب ہو چکا ہے۔ میر جملہ اس فرد جرم کو یوں ستا رہا گویا اس پر یہ الزام عائد کیا جا رہا ہو۔ بادشاہ نے غصے میں اپنا فیصلہ بھی سنایا۔

”چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے جیسے نمک حرام کو دربار سے رخصت کر دیا جائے۔ اب تو عظیم آباد کا صوبے دار ہے، داروغہ دیوان اور ڈاک کا عہدہ تجھ سے چھین لیا گیا اور ہا تقرب خاں تو تیرے بعد اس کا بھی فیصلہ کرنا ہے۔“

میر جملہ مایوس اور دل برداشتہ ہونے کے بجائے مسکرانے لگا، بولا۔ ”حضور والا! سب کچھ فرما چکے یا ابھی کچھ کہنا باقی ہے؟“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”یہ بے شرمی کہ اپنے گناہوں پر نرس رہا ہے۔“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”کیسے گناہ؟ کس کے گناہ؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ حضور والا! اگر صبر و تحمل اختیار فرمائیں اور نرمی سے گفتگو فرمائیں تو یہ عاجز بھی کچھ عرض کرے۔ حضور کو پتا نہیں کہ ان کے خلاف کتنی زبردست سازش تیار کی گئی ہے۔ یہ دونوں بھائی آفت کے پرکالے ہیں اور اتنے شاطر ہیں کہ انہیں سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، انہیں تو میں نے ہی خوب سمجھا ہے۔“

بادشاہ میر جملہ کے ہوش و حواس کی برقراری پر حیران رہ گیا اور اس کا سارا غصہ کا فور ہو گیا۔ شاہی محل بادشاہ کی تبدیلی حراج کو بھانپ گیا اور کہنے لگا۔ ”یہ جو کچھ جس طرح ہوا ہے اس ناچیز کو اس کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ دونوں بھائیوں نے عرصہ پہلے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آہستہ آہستہ بتدریج اقتدار پر پوری طرح تسلط حاصل کر لیتا ہے اور انہیں

کرنے ہی والا تھا کہ کسی طرف سے ایک گولہ آیا اور اس کی پیشانی سے ٹکرا کر اس کا کام تمام کر گیا۔ داؤد خاں کی موت نے باری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ حسین علی خاں نے حکم دیا کہ فتح مندی کے شادیانے بجائے جائیں۔

بادشاہ دہلی میں بیٹھا داؤد خاں اور حسین علی خاں کی جنگ کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ جیت آخر کار داؤد خاں ہی کی ہوگی لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ داؤد خاں مارا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ بادشاہ بہت پریشان تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس شکست سے اس کا وہ راز افشا ہو جائے گا، جس کی وجہ سے داؤد خاں نے جنگ لڑی تھی۔ اس کا خفیہ خط اگر امیر الامرا کے ہاتھ لگ گیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا بہت برا حال تھا۔ اس عالم یاس میں اسے زہرہ یاد آئی، اس نے اسے طلب کر لیا۔ زہرہ یہ بھی شاید بادشاہ کو وہ اب یاد آئی ہے اور اس کے ساتھ وہی عمل دہرایا جائے گا جو پہلے تقرب خاں اور میر جملہ دہرا چکے ہیں۔ وہ خوف زدہ، کبھی ہوئی بادشاہ کے روبرو آن کھڑی ہوئی۔ بادشاہ نے اسے پہلی بار نظر بھر کر دیکھا۔ زہرہ نے بھی اسے غور سے دیکھا اور دل میں اس کا اعتراف کیا کہ شاید مغلوں میں اتنا حسین فرماں روا پہلے نہ گزرا ہوگا۔ بالکل نوجوان، اس کا ہر عضو خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔

بادشاہ نے زہرہ کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ زہرہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ”زہرہ! تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو۔ ہم تم سے کچھ باتیں کریں گے۔“

زہرہ اجازت پانے کے بعد بھی نہیں بیٹھ سکی، بولی۔ ”میں حضور کی باتیں سن کر واپس جانا چاہتی ہوں۔ اگر کھڑے کھڑے ہی حضور کا ارشاد سن لوں گی تو خوشی خوشی واپس جاؤں گی کہ حضور نے اس کیز کو شرف ہم کلامی تو بخشا۔“

بادشاہ نے حکماً کہا۔ ”میں کہتا ہوں تو بحث نہ کرو اور چپ چاپ میرے روبرو بیٹھ جا۔ آج مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکالنا ہے تو فکر نہ کر میں تجھے اس حد تک پریشان کروں گا جتنا میں خود ہوں۔“

زہرہ شرمیلی نظروں سے بادشاہ کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ بادشاہ نے کہا۔ ”زہرہ! تو تو ذوالفقار خاں کی محبوبہ رہ چکی ہے، رنج بتاؤ کیسا آدمی تھا؟“

زہرہ کے دل پر چوٹ لگی، سر جھکا کر جواب دیا۔

”حضور والا! وہ بڑا شاندار انسان تھا۔ کم از کم میں نے اسے جتنی مدت دیکھا ہے اس میں ایک شاندار مرد، ایک بہترین جرنیل اور اعلیٰ درجے کا سیاست، ایک مثالی مدبر، ایک بے بدل جاں نثار اور وفادار۔ میں اس شخص کی ہمیشہ تعریف کروں گی۔“

بادشاہ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”گویا میں نے ذوالفقار خاں پر بہت ظلم کیا ہے؟ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنا لائق اور وفادار ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اس لیے کیا کہ میں بادشاہ تھا، میرے پاس اختیارات تھے اور میں نے اپنی بادشاہت اور اختیارات کا بے سوچے سمجھے حاسدانہ استعمال کر لیا۔ آج میں ان پر شرمندہ ہوں۔ آج اگر ذوالفقار خاں زندہ ہوتا تو شاید میرا دست بازو ہوتا اور میں اپنے ان نمک حراموں سے نجات حاصل کر سکتا جو میرے لیے وبال جان بنے ہوئے ہیں۔“

زہرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن اب گئی گزری باتوں کا غم کرنے سے فائدہ؟“

بادشاہ نے زہرہ کی آواز میں بھراہٹ محسوس کی، چونک کر زہرہ کو غور سے دیکھا، پوچھا۔ ”کیا تو رورہی ہے؟ کیوں رورہی ہے؟ کس پر رورہی ہے؟ مجھ پر یا ذوالفقار خاں پر؟ یا پھر میری اس حیثیت پر کہ میں بادشاہ تو ضرور ہوں لیکن ایک مصلوب الاختیار بادشاہ، بادشاہت تو سید زادوں کی ہے۔“

زہرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں کسی شخص پر نہیں، ان لحاظ پر رورہی ہوں جنہوں نے کبھی مجھے فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا اور اس وقت کا ماتم کر رہی ہوں جس نے ایک ذرے کو آفتاب بنادیا تھا۔ حضور والا! میں سوچتی ہوں ایک شخص وہ بھی تھا جو اختیارات میں تو بادشاہ سے کم تھا لیکن ان کے استعمال میں بادشاہ سے کہیں بڑا تھا اور اس وقت، آج قبلہ حاجت منداں! مجھے اجازت دیجیے کہ میں وہ سب کچھ جو میرے دل میں ہے، بے خوف و خطر کہہ دوں۔“

بادشاہ کا دل بھی بھر آیا۔ اس کے خشک گلے میں آواز پھنس رہی تھی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ ”ہاں زہرہ، تو جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے، میں تیری ہر بات سنوں گا۔ تو آج مجھے بادشاہ نہیں، اپنے جیسا معمولی انسان سمجھ۔ میں تیری ہر بات سننے کو تیار ہوں۔“

زہرہ نے آنسو پونچھ کر ایسی صورت بنائی گویا چڑھی ندی اتر گئی ہو یا پھر آیا طوفان ٹل گیا ہو، بولی۔ ”اب میں

اس کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ آپ بادشاہ ہیں لیکن اپنے اختیارات کے اعتبار سے بادشاہ کی توہین ہیں۔“

بادشاہ نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”تو سچ کہتی ہے زہرہ، تو سچ کہتی ہے۔“

☆ ☆ ☆

میر جملہ کا عظیم آباد میں ول ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے عظیم آباد میں سرکاری فوجوں کے علاوہ مغلوں اور دوسرے کئی ملکوں کے باشندوں کی فوج تیار کی تھی۔ خزانہ اس بار کا تحمل نہ ہوسکا اور فوجیوں کو ان کی تنخواہیں نہ ملیں تو انہوں نے عاجز آکر اپنے ہی صوبے کی حدود میں لوٹ مار مچا دی۔ اس بدانتظامی نے میر جملہ کو بہت بدنام کر دیا۔ خزانہ خالی ہو چکا تھا۔ لوگوں کے واجبات ادا ہونا باقی تھے۔ ایک طرف تو یہ پریشانی تھی اور دوسری طرف زہرہ کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ اس نے زہرہ کو عبد اللہ خاں کے حوالے کر دیا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اب زہرہ بادشاہ کے پاس پہنچ چکی ہے اس لیے اس کی دوبارہ حصولیابی ایک ناممکن سی بات ہے پھر بھی اس کا دل عظیم آباد میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دہلی جانے کے لیے بے چین تھا۔ جب تنخواہ نہ پانے والوں نے میر جملہ کو بہت تنگ کرنا شروع کر دیا تو وہ عورتوں والی پاکی میں بیٹھ کر دہلی روانہ ہو گیا۔ عظیم آباد سے دہلی تک کا سفر اس نے پندرہ دن میں طے کیا۔ وہ آدھی رات کو قلعہ شاہی کے دروازے پر کھڑا اندر داخلے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ یہاں اس کا بڑی سردمہری سے استقبال ہوا۔ بادشاہ اس سے ناراض تھا۔ بادشاہ نے اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ چونکہ عظیم آباد سے بتائے بغیر اپنی مرضی سے دہلی آ گیا ہے اس لیے بادشاہ اسے نااہل قرار دے کر اپنی عتاییت و نوازش کا حق نہیں سمجھتا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کے گلی کوچوں میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ قطب الملک عبد اللہ خاں یار وفادار نے حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کی مکمل منصوبہ بندی کر لی ہے۔ اب میر جملہ کی آمد نے اس افواہ میں اتنا اضافہ اور کر دیا کہ میر جملہ کو خود بادشاہ نے خفیہ طور پر عظیم آباد سے اس لیے بلا لیا تھا کہ اس کی مدد سے وہ عبد اللہ خاں یار وفادار کی سرکوبی کر سکے۔ میر جملہ بادشاہ کی سردمہری اور عبد اللہ خاں کے اثر و اختیار سے گھبرا کر پناہ کی تلاش میں عبد اللہ خاں کے پاس چلا گیا اور کہا۔ ”قطب الملک! میں آپ کے پاس پناہ لینے آیا ہوں۔“

عبد اللہ خاں نے طنز یہ پوچھا۔ ”پناہ لینے یا بادشاہ کی

کسی سازش کو عملی جامہ پہنانے؟“

میر جملہ نے جواب دیا۔ ”عبد اللہ خاں! اب میں درباری سازشوں اور سیاستوں سے عاجز آچکا ہوں میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اتنی مدد دیں کہ میں دہلی میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عافیت اور سکون کی زندگی گزار سکوں۔“

تقرب خاں اب عبد اللہ خاں کی سرپرستی میں آ گیا تھا اور اس وقت بھی عبد اللہ خاں کے پاس ہی موجود تھا۔ میر جملہ نے اس کا سہارا لینا چاہا، بولا۔ ”تقرب خاں! تو میری وکالت کیوں نہیں کرتا؟“

تقرب خاں نے جواب دیا۔ ”ایک ایسے شخص کی میں کیا وکالت کروں جس نے ماضی میں ہمیشہ مکرو فریب ہی سے کام لیا ہو۔ تو نے اسد خاں اور ذوالفقار خاں کی جاں بخشی کی سوگند میرے ہی ذریعے کھائی تھی لیکن تو نے جب ان دونوں پر قابو پا لیا تو پورے دہلی کو معلوم ہے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ ماضی کے تجربات کی روشنی میں، میں تیری اتنی ہی سفارش کر سکتا ہوں کہ تیرے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جس کا تو واقعی مستحق ہے۔“

بادشاہ کے یار وفادار عبد اللہ خاں نے ہنس کر پوچھا۔ ”میر جملہ! اب تم کیا کہو گے؟“

میر جملہ نے سر آدھ بھری، بولا۔ ”میری بد قسمتی کہ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔“

میر جملہ یہاں سے نکل کر ایک دوسرے امیر محمد امین خاں کی حویلی میں چلا گیا۔ ان دنوں محمد امین خاں کا نام اس حیثیت سے لیا جانے لگا تھا کہ جن امرا کو سید زادوں کی سرکوبی پر متعین کیا گیا ہے ان میں محمد امین خاں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ محمد امین خاں نے اسے پناہ تو دے دی لیکن ساتھ ہی اس حویلی میں میر جملہ کا مذاق بہت اڑایا گیا۔ بادشاہ میر جملہ کو دہلی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی دہلی میں موجودگی سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ امیر الامرا حسین علی خاں دکن سے واپس آجائے گا۔ ادھر عبد اللہ خاں یار وفادار اپنے بھائی حسین علی خاں کو خوب نمک مرچ لگا کر خبریں بھیج رہا تھا جس سے حسین علی خاں مشتعل ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے کچھ ملکی اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اور کچھ محمد امین کی سفارش سے میر جملہ کو پنجاب کا صوبے دار مقرر کر دیا اور عظیم آباد والوں کے واجبات شاہی خزانے سے ادا کر دیے۔ امیر الامرا حسین علی خاں دکن کے انتظامات میں مشغول تھا اور بادشاہ کو یہ دھڑکا ستا رہا تھا کہ حسین علی خاں ادھر سے فارغ ہوتے ہی دہلی کا رخ کرے گا اور یہ دونوں

نے بادشاہ کا یہ حکم نہیں مانا اور بادشاہ کو صاف صاف مطلع کر دیا کہ ”میں ایک ایسے بادشاہ کی ملازمت کو اپنے لیے باعث شرم سمجھتا ہوں جس کے پاس نہ تو حکومت ہے نہ ہی شاہی اختیارات، وہ دوسروں کا دست نگر ہے۔ اب میں اس شخص کے پاس جا رہا ہوں جو اس ملک کا حقیقی حکمران ہے۔ میری مراد عبداللہ خاں سے ہے، وہی عبداللہ خاں جسے حضور نے یار وفادار کا خطاب دے رکھا ہے۔“

بادشاہ کو میر جملہ کی اس حرکت نے چراغ پا کر دیا اور اس نے اسی وقت میر جملہ کے سارے خطابات اور مناصب ضبط کر لیے۔ اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔ میر جملہ عبداللہ خاں کے پاس چلا گیا۔ امیر الامرا حسین علی خاں ستر ہزار فوج لیے دکن سے دہلی کی طرف دھاوے مارتا چلا آ رہا تھا۔ بادشاہ کا بہت برا حال تھا۔ عبداللہ خاں کو جب یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو میر جملہ کا اس کے پاس پناہ لینا ناگوار گزرا ہے اور میر جملہ کے اس جرم نے اس کے سارے خطابات اور مناصب چھنوا دیے ہیں تو وہ بادشاہ سے اور زیادہ ناراض ہو گیا اور میر جملہ کے خلاف بادشاہ کی اس کارروائی کو اس نے اپنے حق میں چیلنج تصور کیا اور یہ خبر بھی حسین علی خاں کے پاس روانہ کر دی گئی۔

بادشاہ کی سمجھ میں جب اور کچھ نہ آیا تو اس نے ایک بار پھر یہ فیصلہ کیا کہ عبداللہ خاں سے ملاقات کر کے صلح و صفائی کر لی جائے لیکن اس بار عبداللہ خاں بادشاہ کے پاس آنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ وہ محل میں حاضری دینے سے معذور ہے، مابعد دولت خود قدم رنج فرمائیں تو ذرہ نوازی ہوگی۔ بادشاہ اتنا خوف زدہ تھا کہ وقار شاہی کا خیال کیے بغیر اپنے چند امرا کے ساتھ عبداللہ خاں کے محل میں پہنچ گیا۔ عبداللہ خاں نے اس کا استقبال تک نہیں کیا۔ بادشاہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عبداللہ خاں نے نہایت سرد مہری سے اپنا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں دے دیا۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”عبداللہ خاں! یہ کیا خبر ہے کہ امیر الامرا واپس آ رہا ہے۔“

عبداللہ خاں نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ واپس آ رہا ہے کیونکہ دکن کی آب و ہوا اسے راس نہیں آرہی ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اگر تبدیلی آب و ہوا اتنی ہی ضروری تھی تو وہ احمد آباد چلا جاتا جو وہاں سے قریب بھی ہے اور آب و ہوا بھی اچھی ہے۔“

ہماری لاعلمی اور جہالت کا بڑا دخل رہا ہے۔ اب ہم اپنے کئے پر پچھتا رہے ہیں۔ ہمارے آنسو بہہ رہے ہیں اور ہمارا دل اس پر ماتم کر رہا ہے لیکن اب بجز ندامت اس کی تلافی ممکن ہی نہیں۔ ہماری کوتاہیوں کے باوجود تمہاری شخصیت اتنی عظیم، اتنی قابل عزت اور اتنی لائق احترام ہے کہ ہم ان نازک حالات میں سادات کے بارے میں تمہارا مشورہ چاہتے ہیں۔ تمہاری ذات والا صفات سے امید ہے کہ تم زندگی کے آخری لمحوں میں بھی ہمیں مایوس نہ کرو گے۔“

بادشاہ اسد خاں کے جواب کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جواب اسی دن آ گیا۔ قاصد نے زبانی بتایا کہ اسد خاں بیمار ہے اور دو چار گھنٹی سے زیادہ کا مہمان نہیں ہے لیکن اپنی نازک حالت کے باوجود اس نے جواب دیا ہے۔ اسد خاں نے اپنے جواب میں لکھا تھا۔

”حضور سے جو غلطی سرزد ہو چکی ہے وہ معمولی نہیں، عظیم ہے لیکن کیا کیا جائے انسان قسمت کے ہاتھوں بے بس اور مجبور ہے۔ حضور بھی بے بس اور بے دست و پا ہیں۔ شاید اب مکافات عمل کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر نزاع، پھوٹ اور انتشار کی یہی گرم بازاری رہی تو سلطنت تیمورتجائی اور بربادی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائے گی۔“

اب جبکہ سلطنت کے جملہ اختیارات سادات کے ہاتھوں میں دے دیے گئے ہیں اور ان سے واپس لینے کا وقت نہیں رہا تو بہتری اسی میں ہے کہ دونوں بھائیوں کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کیا جائے۔ انہیں رنجیدہ نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے اس بات کا یقین ہے کہ وہ دونوں حضور والا سے خوش ہو جائیں ورنہ اگر سیدوں کو چھیڑا گیا اور ان کی مرضی کے خلاف کام کیے گئے تو ڈر ہے کہ کہیں حضور کے قبضہ اختیار سے عنان حکومت ہی نہ چھن جائے۔“

اسد خاں کا اس کے بعد انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے کوشش کی کہ وہ اسد خاں کے مشوروں پر عمل کرے اور اس نے چند دن اس پر عمل بھی کیا لیکن اس کے بعد اس نے پھر اسی پرانی روش پر چلنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

میر جملہ کوراستے میں جب بادشاہ کا یہ فرمان ملا کہ وہ پنجاب واپس جائے اور تا حکم ثانی وہیں موجود رہے لیکن میر جملہ نے اس پر عمل نہیں کیا اور دہلی میں داخل ہو گیا۔ بادشاہ کو میر جملہ کی یہ حرکت بہت بری لگی اور اس نے اس عدولی حکم پر میر جملہ کو یہ سزا دی کہ اس سے ملنے سے ہی انکار کر دیا اور پھر حکم دیا کہ وہ اسی وقت پنجاب چلا جائے لیکن میر جملہ

اس سے کسی قسم کی استمداد اور اعانت کی طلب گاری میں شرمندگی اور خجالت محسوس کرتا ہوں۔“

زہرہ نے کہا۔ ”یہ تو درست فرما رہے ہیں آپ مگر آج اپنی شرمندگی اور خجالت کو بالائے طاق رکھ کر بوڑھے اسد خاں سے مدد مانگنا ہوگی۔ اس کے مشوروں پر چل کر ہی ان دونوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔“

بادشاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”زہرہ! تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں بوڑھے اسد خاں سے قائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔“

اس کے بعد بادشاہ نے اسے اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن زہرہ نہیں بیٹھی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”تو مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہے؟ کیا اس لیے کہ تو میرا احترام کرتی ہے یا اس لیے کہ تو ڈرتی ہے کہ میں تجھے روند مل نہ ڈالوں؟“

زہرہ نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”میں بادشاہ کا احترام تو ضرور کرتی ہوں لیکن ڈرتی ہرگز نہیں۔ اگر بادشاہ میرے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو تقرب خاں شیرازی اور میر جملہ کر چکے ہیں تو اس سے خوف کھانا کیسا سستی رکھتا ہے۔ میں اپنی تقدیر پر شاکر ہوں اور ان باتوں سے نفرت رکھنے کے باوجود جب میں ان برائیوں میں ملوث ہو جاتی ہوں تو اس شخص کی طرح صبر کر لیتی ہوں جو شاہی قید خانے میں وہ چیزیں کھانے پینے پر مجبور کر دیا گیا ہو جو حرام بھی ہوں اور طبیعت اور مرضی کے خلاف بھی۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”زہرہ! کیا تو نے آج تک اس پر غور نہیں کیا کہ میں نے تجھے اپنے حرم میں کیوں نہیں داخل کیا؟“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”میں اس پر غور کر کے کروں گی بھی کیا؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”زہرہ! میں تیموری حکمران ہوں، میری حمیت نے یہ نہیں گوارا کیا کہ میں ایک ایسی لڑکی یا عورت کو اپنے حرم میں داخل کروں جو تقرب خاں شیرازی اور میر جملہ کے تصرف میں رہ چکی ہو، اب تو شاہی محل میں بے خوف و خطر رہ۔ یہاں تو بالکل محفوظ رہے گی۔“

زہرہ نے شکر گزار نظروں سے بادشاہ کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر فرط جوش میں بادشاہ کا دہانہ ہاتھ چوم لیا۔

بادشاہ نے کچھ دیر بعد اسد خاں کو ایک خط روانہ کیا جس میں لکھا تھا۔

”افسوس کہ ہم نے تمہاری اور تمہارے خاندان والوں کی قدر نہیں کی۔ ذوالفقار خاں کے قتل کی صورت میں جو اندوہناک اور غم ناک واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اس میں

بھائی مل کر معلوم نہیں بادشاہ کی کیا درگت بنادیں۔ اس وقت بادشاہ کو کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اپنی فکر و تدبیر سے بادشاہ کو سیدوں کے قتل سے بچالیتا۔ بادشاہ کو اس نازک وقت میں ایک بار پھر میر جملہ کی یاد آئی اور اس نے اسے پنجاب سے طلب کر لیا۔ میر جملہ کا مارے خوشی کے برا حال ہو گیا۔ وہ فوراً ہی پنجاب سے چل پڑا۔ میر جملہ کی طلبی کا علم عبداللہ خاں کو بھی ہو گیا۔ اس نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ میر جملہ کی طلبی سے وہ اس معاہدے سے آزاد ہو گیا ہے جس کی رو سے اس کا بھائی حسین علی خاں دکن میں رکھا ہوا ہے۔ بادشاہ خوف زدہ ہو گیا اور اس نے فوراً ہی دوسرا قاصد بھیج کر میر جملہ کے پاس بھیج دیا اور اسے حکم دیا کہ بادشاہ کا پہلا حکم منسوخ سمجھا جائے اور اس دوسرے حکم کے بموجب وہ پنجاب واپس چلا جائے۔

اس فیصلے کے بعد بادشاہ ایک بار پھر خود کو بے یارو مددگار محسوس کرنے لگا۔ جب کوئی مرد نہیں ملا تو اس نے ایک بار پھر زہرہ کو طلب کیا اور اپنا دکھ درد بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”زہرہ! میں اندھیروں کی طرف بڑھتا جا رہا ہوں، میں اپنے خاص مسائل میں جب بھی کسی امیر سے مشورہ کرتا ہوں، وہ یہ خبر اور اس کی تفصیلات عبداللہ خاں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس بات نے ہر امیر کا میرے دل سے اعتماد اٹھالیا ہے۔ اب تو ہی بتا ان سیدزادوں سے میں کس طرح نجات حاصل کروں؟“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”کنیز پرور! بندی نے آج تک تو کبھی سیاست اور حکومت کے امور میں حصہ نہیں لیا پھر اس سلسلے میں کوئی معقول اور سودمند مشورہ کس طرح دے سکتی ہوں؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں زہرہ! یہ واقعی ہے کہ بعض اوقات جہاں عاقل اور دانش ور ناکام رہتے ہیں وہاں ایک معمولی عقل دماغ والا کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس لیے تو اپنے برے بھلے فیصلے سے ہمیں مطلع کر، ممکن ہے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔“

زہرہ نے اپنے دل و دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”حضور والا! میری نظر میں بس ایک ہی شخص ایسا ہے جو حضور کی دست گیری کر سکتا ہے اور وہ ہے مقتول ذوالفقار خاں کا بوڑھا باپ اسد خاں۔ وہ اگر چاہے تو اپنے ناخن تدبیر سے دونوں سیدزادوں سے حضور کو نجات دلا سکتا ہے۔“

فرخ سیر نے خاموشی سے اپنی گردن جھکالی، بولا۔

”لیکن افسوس کہ میں اس کے ساتھ ایک ایسا ظلم کر چکا ہوں کہ

کنجوس ہو تو ایسا

ایک دفعہ کچھ لوگ ایک کنجوس سیٹھ کے پاس گئے اور کہا ہم ایک نہایت نیک کام کے لیے آپ سے چندے کے طلب گار ہیں، سیٹھ نے انہیں کہا کہ میرا باپ بوڑھا اور بیمار ہے، کیا اس کی ضروریات کا خیال رکھنا اور اس کی خدمت کرنا نیک کام نہیں؟ سب نے کہا یہ تو بڑا نیک کام ہے اس سے تو خدا بھی خوش ہوتا ہے، اس کے بعد سیٹھ بولا میری ایک بیوہ بہن ہے کیا اس کے اخراجات اٹھانا اور اس کے بچوں کے تعلیمی اخراجات اٹھانا، ان کی فیسیں، وردیاں اور کتابیں وغیرہ مہیا کرنا نیک کام نہیں؟ جس پر انہوں نے کہا واقعی یہ ایک نیک کام ہے، پھر سیٹھ نے کہا میری ایک معذور بیٹی ہے جو چل پھر نہیں سکتی کیا اس کی ضروریات اور جملہ مسائل کا خیال رکھنا نیک کام نہیں، وفد کے تمام ارکان نے یک زبان ہو کر کہا کہ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے، تو سیٹھ بولا کہ میں، جو یہ سارے کام نہیں کرتا تو تمہیں چندہ کس خوشی میں دوں؟

مرسلہ: طارق کلیر اینڈ کرم علی چوہان، تحصیل نور پور قتل گاؤں جاڑا

جلاوطن کی زندگی گزار کر مر چکا تھا، اب اس کا بیٹا معین الدین مغلیہ تاج و تخت کا دعویدار بن کر دہلی آنے والا ہے مگر اس نے اسے حراست میں لے لیا اور اسے قیدی بنا کر دہلی لا رہا ہے۔

گویا حسین علی خاں، بادشاہ کو یہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر اس سے زیادہ جملیں چڑکی تو وہ شہزادے معین الدین کو فرخ سیر کی جگہ لا بٹھائے گا۔ بادشاہ اور زیادہ سہم گیا۔ امیر الامرا حسین علی خاں اپنے لشکر کے ساتھ دہلی کے قریب فیروز شاہ کے منارے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہاں خیمے لگائے گئے۔ امیر الامرا نے جیسے ہی اپنے خیمے میں قدم رکھا تو یکا یک نوبت بجنے لگی۔ یہ نوبت ہمیشہ بادشاہوں کے در پر بجا کرتی تھی، آج امیر الامرا کے خیمے کے در پر بج رہی تھی۔

کسی امیر نے پوچھا۔ ”جناب والا! یہ نوبت شاہی محل کے در پر بجتی رہی ہے پھر آج یہ یہاں کیوں بج رہی ہے؟“ امیر الامرا نے جواب دیا۔ ”میں خود کو بادشاہ کا غلام نہیں سمجھتا اس لیے ضابطے اور آداب کی پابندی بھی نہیں کروں گا۔“

راجا بے سنگھ سوائی، امیر الامرا کی اس حرکت سے بہت برہم ہوا اور بادشاہ سے اجازت چاہی کہ اسے امیر الامرا کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے لیکن بادشاہ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان حالات میں عبداللہ خاں نے بادشاہ کو پیغام بھیجا۔

”اگر حضور ہمارے خاندان کے جانی دشمن بے سنگھ سوائی کو اپنے دربار سے نکال دیں اور خدمات حضوری مثلاً توپ خانہ، داروغگی دیوان خاص و عام اور دیگر عہدوں پر ہمارے آدمیوں کو مقرر کر دیا جائے اور قلعہ میں بھی ہمارا انتظام ہو تو ہم دونوں بھائی شکوک و شبہات کو اپنے ذہن سے نکال کر حضور کے دربار میں حاضر ہو سکتے ہیں۔“

بادشاہ نے اس کا فوراً یہ جواب دیا۔ ”حقیقتاً خدمات مذکورہ قطب الملک کے نام دیگر سادات اور اس کے ہمراہیوں کو مقرر کرتے ہیں۔ بے سنگھ 3 ربیع الثانی کی رو سے وطن سے جا چکا ہے اور اب دربار سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔“

بادشاہ کے اس چند سطری جواب نے دونوں بھائیوں کو شیر کر دیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب بادشاہ کچھ بھی نہیں رہا۔ بادشاہ نے اپنا وفادار اور جاں نثار عملہ برطرف کر دیا۔ عبداللہ خاں قلعے میں داخل ہوا اور برطرف عملے کی خالی

مکدہ ہو گیا۔ بادشاہ نے محل سرا میں داخل ہوتے ہی عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کے خلاف منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اسے عبداللہ خاں پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے میر جملہ کو بادشاہ کے سامنے لا کر اس کی توہین کی ہے اور اس توہین کی عبداللہ خاں کو قراری سزا ملنی چاہیے لیکن سزا دینے کی نہ تو اس میں ہمت تھی اور نہ ہی جوش اور جذبہ۔ سپہ سالار مبارز الملک، راجا بے سنگھ سوائی، نظام الملک اور سر بلند خاں جیسے نامی گرامی امرا نے فرخ سیر کے چھ سالہ دور حکومت میں پہلی بار متفقہ طور پر اپنی زبان کھولی اور کہا۔ ”حضور والا! عبداللہ خاں کو فوراً اس کے عہدے سے برطرف فرما دیجیے۔ اگر حضور ذرا سی ہمت سے کام لیں تو ہم چشم زدن میں ان دونوں بھائیوں کو کیفر کردار تک پہنچا سکتے ہیں۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میں ان دونوں کے خلاف کوئی سخت قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔“

بے سنگھ سوائی نے عرض کیا۔ ”تب پھر حضور ہمیں اجازت دیں کہ ہم عبداللہ خاں کے پاس جائیں اور اسے باتوں سے قائل کر دیں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، بادشاہ، امرا اور رعایا کسی کے بھی حق میں مفید نہیں ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”اور اگر وہ تمہاری باتوں سے قائل نہ ہوئے تو؟“

نظام الملک نے جواب دیا۔ ”اگر وہ ہماری باتوں سے قائل نہ ہوئے تو پھر کیا ہوگا، اس کا جواب بھی ہمارے پاس ہے۔ ہم ان دونوں کے خلاف جنگ شروع کر دیں گے اور انہیں ان کی کوتاہیوں کا مزہ چکھادیں گے۔“

بادشاہ نے ڈرے سبے انداز میں کہا۔ ”نہیں، یہ مشورہ درست نہیں ہے۔ اس سے بڑے فتنے جنم لیں گے۔“

بے سنگھ سوائی نے عرض کیا۔ ”اگر آپ ہم جاں نثاروں کی موجودگی میں ایسی باتیں کریں گے تو وہ دن دور نہیں جب حضور والا اس دنیا میں منہا اور دیکھنا ہی زیادہ پسند کیا کریں گے کیونکہ اس کے علاوہ حضور والا کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں۔“

بادشاہ نے امرا کو ڈانٹ دیا، کہا۔ ”میں اتنا بڑا خطرہ نہیں مول لے سکتا۔ تم لوگ جو چاہو کرو لیکن مجھ کو اس سے الگ رکھو۔“

حسین علی خاں دہلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے بادشاہ کو مطلع کر دیا کہ اورنگ زیب کا باغی بیٹا اکبر، جو مرہٹوں سے مل گیا تھا اور ان میں ایک شاہی معتوب اور

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”آب و ہوا تو شاہجہان آباد کی بھی اچھی ہے اور یہ اسی وقت سدھرے گی جب حسین علی خاں اپنی فوج کے ساتھ یہاں آجائے گا۔“

بادشاہ عبداللہ خاں کی دھمکی سمجھ چکا تھا، شکایتا بولا۔ ”امیر الامرا سے ایک شکایت ہے، اس نے میرے وفا دار اور خدمت گزار داؤد خاں کو خواجہ قتل کر دیا۔“

عبداللہ خاں نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ”حالانکہ حضور کی یہ خواہش تھی کہ داؤد خاں، میرے بھائی حسین علی خاں کو قتل کر دیتا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”یہ تمہارا واہمہ ہے، ایسا ہرگز نہ ہوتا۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”کیا ہوتا اور کیا نہیں ہوتا، ہمیں معلوم ہے حضور کے عزائم کا ایک زمانے کو علم ہے، ہم کیا چیز ہیں۔“

بادشاہ نے عاجزی سے کہا۔ ”عبداللہ خاں! ہم نے تمہیں جن خطابات سے نوازا ہے تم خوب واقف ہو۔ تم قطب الملک ہو اور میں نے تمہیں یار وفادار کا خطاب دیا ہے لہذا تم کوئی ایسا کام ہرگز نہ کرنا جو اس خطاب کے برعکس ہو۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”حضور والا! ہم کیا کریں گے، ہماری مقدرت اور استطاعت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اپنا دفاع کرتے رہیں اور دفاع کا حق تو ہر کسی کو حاصل ہے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔ آؤ ہم دونوں ایک بار پھر یہ عہد کریں کہ ایک دوسرے سے دغا نہیں کریں گے۔ ایک دوسرے کے مخلص رہیں گے۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”عہد و پیمان کا کیا ہے، ابھی ہو جائے گا لیکن اصل چیز ہے اس کا نباہنا، اس پر قائم رہنا اور میں نہیں جانتا کہ حضور کے نادان دوست عہد و پیمان پر کار بند بھی رہنے دیں گے یا نہیں۔“

بادشاہ نے خوشامد سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے قول و قرار سے ہرگز نہ پھروں گا۔“

عبداللہ خاں نے کہا۔ ”اگر آپ اپنے قول و قرار سے نہیں پھریں گے تو میں بھی نہیں پھروں گا۔ یہ میرا عہد ہے، ایک مرد یار وفادار کا عہد۔“

اسی وقت عبداللہ خاں کی ایما پر یا خود آپ سے آپ میر جملہ بادشاہ کے سامنے آ گیا۔ وہ بادشاہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بادشاہ کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ میر جملہ نے بادشاہ کو سلام نہیں کیا۔ بادشاہ کا خوشگوار مزاج

آدمی متعین کر دیے گئے ہیں تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ بارہ دری شائستہ خاں میں اترا۔ یہ محل قلعے سے بالکل ملحق ہے۔ اس نے بادشاہ کو خوف زدہ کرنے کے لیے فرضی شہزادے معین الدین کو اس طرح ہاتھی پر بٹھا رکھا تھا کہ وہ دور سے پہچانا نہیں جاتا تھا۔

دوسرے دن قطب الملک عبداللہ خاں محل میں گیا اور بادشاہ سے شکایت کیا۔ ”ہم نے حضور کے دور مصائب و آلام میں جو خدمات انجام دی ہیں اور حضور کے آباؤ اجداد کے لیے جس طرح اپنا خون ارزاں کیا ہے، اس کا ایک زمانہ معترف ہے لیکن اس کا ہمیں صلہ کیا ملا؟ یہ کہ حضور کے دل میں ہمارے خلاف بغض و عناد کی اور شکوک و شبہات کی آگ بھڑکتی رہی اور ہماری عزت و ناموس پر حملے کیے جاتے رہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے، تمہت ہے۔“ عبداللہ خاں نے وہ تمام خطوط بادشاہ کے سامنے رکھ دیے جو مختلف امرا اور صوبیداروں کو خفیہ لکھے گئے تھے اور ان میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کسی بھی طرح امیر الامرا کا کام تمام کر دیا جائے۔“

بادشاہ ان خطوط کو نہیں جھٹلا سکتا تھا، جزبز ہو کر چپ ہو رہا پھر دریافت کیا۔ ”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”ان تمام امرا کو برطرف کر دیا جائے جو حضور کے ذہن کو ہماری طرف سے برگشتہ کر رہے ہیں اور یہ بھی ہمارا فیصلہ ہے کہ جب تک ایسا نہیں ہوگا اور سازشی امرا کی جگہ ہمارے آدمی متعین نہیں ہوں گے ہم محل میں غلام کی طرح حاضری نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی حضور کی خدمت کر سکیں گے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ چند روز میں تمہارا یہ کام بھی کر دوں گا۔“ عبداللہ خاں نے ضد کی۔ ”بھلا اس وقت آپ کے لیے کون سی قباحت ہے جو محل کے کلی انتظامات ہمارے سپرد نہیں فرما رہے ہیں؟“

بادشاہ نے غصے میں کہا۔ ”تو اس طرح ضد کر رہا ہے گویا میں کوئی معمولی آدمی ہوں، تجھے اپنی زبان اور لب و لہجے پر قابو رکھنا چاہیے۔ یہ میں ہوں جو تیری گستاخیوں کو درگزر کرتا چلا جا رہا ہوں لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔“ عبداللہ خاں نے بھی ذرا پر جوش لہجے میں جواب دیا، بولا۔ ”تو خود کو بڑا آدمی سمجھتا ہے تو یہ تیری خوش فہمی ہے، تو ایک ذلیل انسان ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ تیری

رذالت کا حساب کتاب چکا دیا جائے۔“ اس وقت بادشاہ کے پاس اس کا خاص امیر اعتقاد خاں بھی موجود تھا۔ اس نے عبداللہ خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”عبداللہ خاں! اپنی حد میں رہو، آگے مت بڑھو۔ ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔“

عبداللہ خاں نے اعتقاد خاں کو بھی ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ۔ علت المشائخ کے عادی اور خوگر بوڑھے ورنہ بادشاہ کے ساتھ تیری بھی خبر لے لی جائے گی۔“ اعتقاد خاں گھبرا گیا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ عبداللہ خاں نے چیخ کر کہا۔ ”تو اسی وقت یہاں سے دفعتاً ہو جا ورنہ اتنے ڈنڈے لگاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یار آجائے گا۔“

اعتقاد خاں نے منہ بسورتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ اب بادشاہ تنہا رہ گیا تھا۔ عبداللہ خاں نے بادشاہ کو دھمکی دی۔ ”فرخ سیر! اس ملک میں ہم دونوں بھائیوں کی حیثیت ان بت تراشوں جیسی ہے جو خود ہی بت تراش کر اس کی پرستش کرتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے تو اس بت کو چکنا چور کر دیتے ہیں۔ جب تک ہم نے چاہا تو نے ہم پر بادشاہت کر لی لیکن اب ہم بادشاہت کے اس بت کو توڑ دینا چاہتے ہیں چنانچہ آج سے نہ تو تو ہمارا بادشاہ ہے اور نہ ہم تیرے امیر۔ اب اس ملک کا وہ شخص بادشاہ ہوگا جسے ہم بادشاہ کہیں گے۔“

فرخ سیر، عبداللہ خاں کی باتوں کی تاب نہ لا کر اندر مستورات میں چلا گیا۔ عبداللہ خاں نے اسی وقت حالات کی تفصیل سے حسین علی خاں کو مطلع کر دیا۔

قلعے کے باہر یہ افواہ گرم ہو گئی کہ بادشاہ نے عبداللہ خاں کو قتل کر دیا ہے۔ بادشاہ کے حامی امرا کی ہمتیں بڑھ گئیں اور انہوں نے امیر الامرا کی فوج پر حملہ کر دیا۔ گلی کوچوں میں جنگ شروع ہو گئی۔ امیر الامرا کے ساتھیوں کی ہمتیں پست ہو گئیں اور وہ راہ فرار کی سوچنے لگے لیکن اسی وقت امیر الامرا حسین علی خاں کو اپنے بڑے بھائی عبداللہ خاں کا وہ پیغام ملا، جس میں فرخ سیر سے گفتگو کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ امیر الامرا نے اسی وقت جواب دیا۔

”ہنگامے برابر سر اٹھا رہے ہیں، سامان جنگ و حرب سے لیس فوجوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ عام بغاوت کے آثار نمایاں ہیں۔ اندر ہی اندر جو شیطانی پرورش پارہے ہیں وہ بھڑکنے ہی والے ہیں لہذا سب سے پہلا کام ذرا بھی تاخیر کے بغیر ان ہنگاموں کو فرو کرنا ہے اور اب توقف کا وقت نہیں ہے۔“

عبداللہ خاں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محل سرا کے باہر فرخ سیر کی واپسی کی امید میں کھڑا رہا لیکن جب وہ نہیں نکلا اور امیر الامرا کا پیغام ملا تو وہ افغان سپاہیوں کے ایک دستے کے ساتھ نجم الدین علی خاں کے بالاخانے سے اتر کر شاہی حرم سرا میں اتر گیا۔ یہاں ان گنت حبشی النسل اور تاتاری عورتیں حرم سرا کی حفاظت پر تعینات تھیں۔ افغان سپاہیوں نے انہیں مار کر بھگا دیا اور عبداللہ خاں شاہی مستورات میں فرخ سیر کو تلاش کرنے لگا۔ عبداللہ خاں عورتوں کو پکڑ پکڑ کر اور مار مار کر ان سے بادشاہ کے چھپنے کی جگہ معلوم کر رہا تھا۔ آخر چند عورتیں عبداللہ خاں کی سختیوں کو برداشت نہ کر سکیں اور انہوں نے بادشاہ کے چھپنے کی جگہ بتادی۔ عبداللہ خاں سپاہیوں کے ساتھ ادھر بڑھا۔ بادشاہ کی ماں، خادماہیں اور شہزادیاں بادشاہ کی مدد کو پہنچ گئیں اور فرخ سیر کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور رو رو کر رحم کی التجائیں کرنے لگیں۔ عبداللہ خاں کے اشارے پر ان عورتوں اور لڑکیوں کو مار مار کر اور ہاتھوں اور گدیوں سے پکڑ پکڑ کر اپنی راہ سے ہٹا دیا گیا۔ فرخ سیر ان کی بیچ میں، اپنے دونوں ہاتھوں میں سر چھپائے، شتر مرغ کی طرح دبا بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی نے اس کے بال پکڑ لیے اور کھینٹا ہوا عبداللہ خاں کے پاس لے آیا۔ عبداللہ خاں اسے شاہی حرم سرا کے پھانک پر بٹھائی ہوئی ترپولہ میں لے گیا اور اس میں قید کر دیا۔

ادھر سے فارغ ہوتے ہی عبداللہ خاں نے رفیع القدر کے حقوق بنے شمس الدین رفیع الدرجات کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ یہ شہزادہ اس وقت بیس سال کا تھا اور قید خانے میں زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ عبداللہ خاں نے یہ کام اتنی عجلت میں کیا کہ شہزادے کو نہ تو نہلا یا جاسکا اور نہ ہی لباس تبدیل کروایا جاسکا۔ جسم پر جو کپڑے تھے انہی پر مالائے سروارید پہنا دیا گیا اور یہ مالا بھی عبداللہ خاں نے اپنے گلے سے اتار کر اس کے گلے میں ڈالی تھی۔

☆☆☆

جب ہنگامے ختم ہو گئے اور حالات پر سکون ہو گئے تو عبداللہ خاں نے محل سرا کی چند خوب صورت عورتوں کو اپنے قبضے میں لیا اور کچھ دن پیش کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ بادشاہ کے قید خانے میں پہنچا۔ عبداللہ خاں کے ساتھ چند سپاہی بھی تھے۔ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”عبداللہ خاں! میرے یار وفادار کیا وفاداری کا ثبوت دیا ہے تو نے، قربان جائیے تیری وفاداری کے۔“

عبداللہ خاں نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں، غیر

جذباتی آواز میں کہا۔ ”فرخ سیر! سنے بادشاہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تیری آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی جائیں۔“ فرخ سیر چیخنے چلانے لگا۔ عبداللہ خاں نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے فرخ سیر کو پچھاڑ دیا اور اس کی آنکھوں میں زبردستی گرم سلائیاں پھیروا دیں۔ فرخ سیر چیخیں مار مار کر رونے لگا۔ عبداللہ خاں ہنستا رہا۔ گرم سلائیاں پھیرنے والوں میں سے کسی ایک کو اس پر رحم آ گیا تھا چنانچہ اس نے سلائی پھیرنے میں کسی قدر احتیاط سے کام لیا جس سے فرخ سیر کی کچھ بینائی باقی رہ گئی۔

عبداللہ خاں نے واپس جانے سے پہلے طنزاً پوچھا۔ ”بادشاہ سلامت اس غلام کے لیے کوئی حکم؟“ فرخ سیر اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے آنسو بہاتا رہا۔

عبداللہ خاں نے پھر سوال کیا۔ ”فرخ سیر! میں جا رہا ہوں کوئی خواہش ہو تو بیان کرو۔“

فرخ سیر نے روتے ہوئے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا، گرم سلائیاں نے اس کی آنکھوں کے گڑھوں کو سیاہ کر دیا تھا، اس نے کہا۔ ”عبداللہ خاں تم نے جو کچھ کیا، اس کا میں کس سے گلہ کروں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے میرے جملہ سے حاصل کی ہوئی ایک زہرہ نامی کنیز میرے حوالے کی تھی، اگر تم اسے میرے پاس بھیج دو تو میں شکر گزار ہوں گا۔“

عبداللہ خاں نے جواب دیا۔ ”گوکہ اس کے دو امیدوار ہیں۔ تقرب خاں شیرازی اور میر جملہ لیکن میں اس پر تمہارے حق کو مقدم رکھوں گا۔“

عبداللہ خاں نے زہرہ کو فرخ سیر کے پاس ترپولہ میں بھیج دیا۔ زہرہ اسے اس حال میں دیکھ کر رو ہنسی ہو گئی۔ جب فرخ سیر کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹولنے کی کوشش کی، پوچھا۔ ”کون ہے؟“

زہرہ نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ میں ہوں، زہرہ۔“

فرخ سیر نے پوچھا۔ ”تو تنہا ہے یا کوئی اور بھی ہے تیرے ساتھ؟“

زہرہ نے جواب دیا۔ ”میں تنہا ہوں۔“ فرخ سیر نے اسے دیکھنے کی کوشش کی، اسے زہرہ کا دھندلا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا، بولا۔ ”زہرہ! ادھر آؤ میرے قریب۔“

زہرہ اس کے قریب چلی گئی۔ فرخ سیر نے اس کا سر

دونوں ہاتھوں میں لے لیا، بولا۔ ”زہرہ! میں ایک بار پھر بادشاہ بن سکتا ہوں بشرطیکہ تو میرا ساتھ دے۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

فرخ سیر نے جواب دیا۔ ”اگر تو کسی طرح ساز باز کر کے مجھے جے سنگھ سوئی تک پہنچا دے تو مجھے یقین ہے کہ میں اس کے تعاون سے دوبارہ تاج و تخت حاصل کر لوں گا اور غداروں کو کیفر کردار تک پہنچا دوں گا۔“

زہرہ نے زہر خند کیا، بولی۔ ”جب آنکھوں والا بادشاہ اپنی حکومت محفوظ نہ رکھ سکا اور اپنے یار وفاداروں کو نہیں پہچان سکا تو اب تاجپا بادشاہ اتنا بڑا کام کس طرح انجام دے گا؟ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اب آپ حالات پر صبر کر لیجیے ورنہ یہ باتیں آپ کی جان لے لیں گی۔“

فرخ سیر نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”تو بھی پست ہمتی کا اظہار کر رہی ہے، خیر میں یہ کام کسی اور سے کروا لوں گا، جب تک سانس تب تک آس۔“

زہرہ نے پوچھا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

فرخ سیر نے جواب دیا۔ ”جب تک میں بادشاہ تھا، حکم تو میں نے اس وقت بھی تجھے نہیں دیا تھا۔ اب کیا حکم دوں گا، جا حکم میرے یار وفادار عبداللہ خاں سے لے کیونکہ آج کل حکم اسی کا چل رہا ہے۔“

اس کے بعد بادشاہ چپ ہو کر کچھ سوچتا رہا، کچھ دیر بعد بولا۔ ”ویسے بھی تیرے دو امیدوار اس وقت بھی موجود ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔“

زہرہ نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”دو کون؟“

فرخ سیر نے جواب دیا۔ ”تقرب خاں شیرازی اور میر جملہ خاں ناٹا۔“

زہرہ رونے لگی، بولی۔ ”میں خود کشی کر لوں مگر ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی نہیں جاؤں گی۔“

فرخ سیر نے جے سنگھ سوئی والی بات پہرے پر موجود سپاہی سے بھی کہہ دی اور اسے عہدے منصب کا لالچ بھی دیا۔ اس نے یہ بات عبداللہ خاں تک پہنچا دی۔ عبداللہ خاں نے اپنے بھائی سے مشورہ کیا۔ حسین علی خاں نے جواب دیا۔ ”یہ ایک مستقل خطرہ ہے اسے اپنی راہ سے ہٹا دینا بہت ضروری ہے۔“

دونوں بھائیوں نے فرخ سیر کے کھانے میں زہر ملا دیا لیکن وہ اسے بھی جھیل گیا۔ دوبارہ پھر زہر دیا، فرخ پھر بھی بچ گیا۔ تیسری بار دونوں بھائی بادشاہ کے پاس موجود رہے اور اپنی موجودگی میں فرخ سیر کو زہر کھلوا دیا اور جان کنی کا تماشا دیکھنے کے لیے اس کے پاس ہی موجود رہے۔ فرخ سیر نے ان دونوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی ہنستے رہے۔ زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ فرخ سیر نے کہا۔ ”غدار تو تم ہنس رہے ہو۔ بے غیر تو، تمہیں شرم نہیں آتی ہنستے ہوئے۔“

عبداللہ خاں مشتعل ہو کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”تیرا کام تو میں تمام کروں گا۔ کہتے ہیں بے شرم بڑے سخت جان ہوتے ہیں، تو بھی بڑا سخت جان نکلا۔“

اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”وہی تمہ، جس سے یہ مردود ذوالفقار خاں کو ہلاک کروا چکا ہے اس کے گلے میں ڈالا جائے اور اس سے جکڑ کر ہلاک کر دیا جائے۔“

سپاہیوں نے جب یہ حکم فرخ سیر کی گردن میں ڈالنا چاہا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گلے کو پکڑ لیا اور تسمے کے دباؤ کو پوری قوت سے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک طرف تو منہ طاقت در سپاہیوں کی قوت تھی اور دوسری طرف زہر خورانی سے زائل ہوتی ہوئی توانائی تھی۔ سپاہیوں نے تسمے کو اتنی زور سے جکڑا کہ وہ فرخ سیر کے ہاتھوں سمیت گلے میں پیوست ہو گیا۔ اسیر بادشاہ بے دم ہو کر زمین پر گر گیا۔

فرخ سیر کا یار وفادار عبداللہ خاں آگے بڑھا اور دم توڑتے ہوئے بادشاہ پر گھونسوں مکوں کی بارش کر دی۔ وہ چاہتا تھا بادشاہ فوراً ہی ہلاک ہو جائے لیکن وہ ابھی سسک رہا تھا۔ عبداللہ خاں اس کی سخت جانی سے عاجز آیا ہوا تھا۔ اس نے خنجر نکال کر دم توڑتے ہوئے بادشاہ کے پیٹ اور سینے کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔

فرخ سیر مر گیا، دونوں بھائیوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہاں سب سے آخر میں انہوں نے ایک کام رحم دلی کا کیا۔ زہرہ دنیا کے دھندوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ چلی جانا چاہتی تھی، دونوں بھائیوں نے نہ صرف اس کی اجازت دے دی بلکہ سورت کی بندرگاہ تک بھجوا کے سرزمین حجاز روانہ کر دیا۔

وین برائن فی وی دیکھ رہا تھا۔ مارک گولڈ کی سنہری عمارت کے سامنے رپورٹرز اور میڈیا والوں نے ویکس مارک اور اس کی بہن شیل مارک کو گھیر رکھا تھا۔ وہ مانگ اور ریکارڈر آگے کیے ان سے سوالات کر رہے تھے اور دونوں بہن بھائی انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے ان کے آدی اور گاڑی میڈیا کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ایک صحافی لڑکی نے چلا کر پوچھا۔ ”مس مارک۔ یہ سچ ہے کہ جیکوئس مائن کا سونا جس راستے سے آئے گا

زندہ رہو

کاشف زہیر

منفی سوچوں کی یلغان غلط رستوں کا انتخاب، ہر بات میں تاریک پہلو دیکھنے کی عادت اور بات بات پر لوگوں سے الجھنا... سازشی ذہنوں کی روایت ہے یا ان کی فطرت... بہر حال ان تمام باتوں کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں... اس بات کا احساس جب اسے ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی... ایسے میں مسافر کے قدم جب واپسی کے لیے پلنتے ہیں تو پہلے جیسا کچھ بھی نہیں رہتا۔ نہ رستے، نہ منزل، نہ جوش نہ ولولے... بس ایک احساس ندامت کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور بالآخر اجڑے ہوئے دیار میں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔

پردیس کی فضا..... جذبات کا طوفان اور وحشتوں کی

منزل کا احوال



سیر المتاخرین، غلام حسین طباطبائی۔ منتخب الباب، خافی خان۔ دکن کی سیاسی تاریخ، سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مائرا لامرا، مصاصم الدولہ۔ تاریخ پاکستان و بھارت، سید ہاشمی فرید آبادی

ماخذات

چند مہینے پہلے اس راستے پر دو سو مقامی افراد کو قتل کیا گیا تھا، ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے؟“

شیلہ مارک رک گئی تھی۔ وہ تقریباً پینتیس برس کی حسین اور ایک مکمل عورت تھی۔ اس نے سرد نظروں سے صحافی لڑکی کی طرف دیکھا اور نظروں سے زیادہ سرد لہجے میں بولی۔ ”یہ سب جھوٹ اور پروپیگنڈا ہے، وہاں کچھ لوگ ضرور مارے گئے ہیں لیکن کوئی قتل عام نہیں ہوا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ صحافی لڑکی کے انداز میں چیخ تھا۔ شیلہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ویکس پہلے ہی گاڑی میں جا چکا تھا۔ شیلہ کے بیٹھے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ وین برائن نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ وہ تقریباً پچیس برس کا خوش شکل اور مضبوط جسم کا شخص تھا۔ وین خود بھی صحافت سے منسلک تھا لیکن اس کا شعبہ ریڈیو تھا۔ وہ ہفتے میں چار دن ریڈیو سے پروگرام کرتا تھا جس کا عنوان تھا۔ ”سچ تو یہ ہے“ اس پروگرام میں وہ ملک یا دنیا سے متعلق کسی ایک اہم معاملے کے حقائق سامنے لاتا تھا۔ شخصیات اور دستاویزات کی مدد سے ایسے امور کا انکشاف کرتا جو پہلے عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے تھے۔ وین تیرہ سال پہلے ایف بی آئی میں شامل ہوا لیکن چند سال بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ اس جاب کے لیے موزوں نہیں ہے۔ وہ بڑی محنت سے اور اکثر اوقات اپنی جان خطرے میں ڈال کر جو حقائق دریافت کرتا تھا وہ عام طور سے چھپے رہ جاتے اور عوام تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔

اس لیے اس نے ایف بی آئی کی ملازمت ترک کر دی اور ریڈیو پر یہ پروگرام کرنے لگا۔ آغاز میں اسے زیادہ پذیرائی نہیں ملی مگر پھر اس نے کچھ ایسے پروگرام کیے جن میں نیویارک اور ملک کے دوسرے حصوں میں بعض معاملات کے بارے میں ایسے انکشافات شامل تھے جنہوں نے صورت حال ہی بدل دی۔ خاص طور پر نیویارک سب وے کی تعمیر کے دوران ہونے والی بے ضابطگی پر پروگرام نے اسے بے پناہ شہرت بخشی تھی اور اس کے سامعین کی تعداد ایک ملین تک پہنچ گئی تھی۔ آج دو ملین افراد پورے امریکا میں اس کا پروگرام باقاعدگی سے سنتے تھے اور مجموعی تعداد پانچ ملین سے زیادہ تھی کیونکہ اس کا پروگرام چوبیس گھنٹے میں تین دفعہ نشر ہوتا تھا۔ اپنے پروگرام کے دوران وہ سامعین سے کال بھی لیتا تھا اور ان کے خیالات اور نقطہ نظر کو براہ راست نشر کرتا تھا۔ وین کوئی وی کی طرف سے بھی آفر ہوئی جہاں آمدنی بھی کہیں زیادہ ہوتی لیکن اس نے انکار کر

دیا، وہ اپنی جاب سے پوری طرح مطمئن تھا۔

وین برائن دس لاکھ ڈالر سالانہ آمدنی حاصل کرتا تھا۔ سیونٹین ایونیو پر اس کا خوب صورت اور تمام سہولیات سے آراستہ قلیلتہ تھا۔ اچھا بینک بینکس تھا کیونکہ اس کے ذاتی اخراجات بہت کم تھے اور وہ خود پر جتنا خرچ کرتا اس سے زیادہ رقم فلاحی کاموں میں خرچ کرتا تھا۔ اس کا پروگرام رات دس بجے نشر ہوتا تھا اور ریٹنگ کے لحاظ سے یہ ریڈیو کے دس مقبول ترین لائیو پروگراموں میں شامل تھا۔ ہائی اسکول کے بعد وہ میرین میں چلا گیا لیکن تربیت کے بعد اسے فوج میں جگہ نہیں ملی تھی۔ اس لیے اس نے ایف بی آئی کا انتخاب کر لیا۔ ملازمت کے دوران اس نے ایک بار شادی کی تھی لیکن یہ شادی اور اس کی جاب ایک ساتھ ختم ہو گئی تھیں۔ تب سے وہ اکیلا رہ رہا تھا اور اسی میں خوش تھا۔ وین نو بجے تیار ہو کر براڈوے پر واقع ریڈیو اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ آج اسے معمول کا ایک پروگرام کرنا تھا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوا تو اس کی پروگرام منیجر مگی کینٹ اپنی سیٹ پر موجود تھی۔

”تم تیار ہو؟“ اس نے وین کو دیکھا۔ ”آج تم کچھ تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”گرمی زیادہ ہے۔“ اس نے کوٹ اتار کر لٹکایا اور ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے اپنے اسٹوڈیو کی طرف بڑھا جہاں اسے پروگرام کرنا تھا۔ اس کی معاون جولی نے کافی کافین اس کی میز پر رکھ دیا تھا۔ وین نے کافی پیتے ہوئے اسکرپٹ دیکھا اور اپنے وقت پر پروگرام شروع کر دیا۔ کیونکہ آج کوئی خاص ایجنڈا نہیں تھا اس لیے اس نے کالز زیادہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دس بج کر پچاس منٹ پر وہ آخری کال لے رہا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ اس کے بعد کوئی کال نہیں لے گا لیکن مگی نے اشارہ کیا کہ ایک کال ہے۔ شاید یہ کال خاصی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ وین نے بادل ناخواستہ کال لی۔ ”جی! کون بات کر رہا ہے؟“

”میں فلاڈلفیا سے آرٹھر بات کر رہا ہوں۔“

”ویل آرٹھر کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”مسٹر برائن کیا تمہیں یقین ہے جیکب مائن میں کوئی قتل عام نہیں ہوا ہے؟“

آرتھر کے اچانک سوال نے اسے جھٹکا دیا تھا، اسے سمجھنے میں چند لمحے لگے۔ ”کیا تمہیں یقین ہے وہاں کوئی قتل عام ہوا ہے؟“

”مجھے اور مجھے جیسے لاکھوں کروڑوں امریکیوں کو شک

ہے اور ہمیں یقین چاہیے، کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟“

وین چپ ہو گیا تھا، اسے توقع نہیں تھی کہ آج اس کا کوئی کالر جیکب مائن کا معاملہ اٹھا دے گا اور پھر اس سے گفتگو کا مطالبہ بھی کر دے گا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ویل آرٹھر... میں سوچوں گا، تمہارا شکریہ۔“

وہ اسٹوڈیو سے باہر آیا تو سوچ میں گم تھا۔ مگی نے اسے مشورہ دیا۔ ”اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ اتنا اہم نہیں ہے۔“

”کیا اس لیے کہ مارے جانے والے امریکی نہیں تھے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ مگی جھنجھلا گئی اور خود پر قابو پانے لگی۔ وہ تقریباً پچاس برس کی لمبی اور استخوانی عورت تھی لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ ریڈیو کی چند بہترین پروڈیوسرز میں سے ایک تھی۔ ”تم سمجھتے ہو میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔“

”سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وین برائن نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کے آنے والے دن طے شدہ تھے اور اس طے شدہ شیڈول میں تبدیلی یا کسی نئے کام کی گنجائش کم تھی۔ ویسے بھی جیکب مائن کے واقعے کو امریکی میڈیا نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور عوام کو بھی اس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ریٹنگ کے لحاظ سے یہ معاملہ خاصا نیچے تھا۔ مگی اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ مطمئن نہیں تھی اس نے ایک بار پھر وین سے تصدیق چاہی۔ ”ہم اس معاملے میں دخل نہیں دے رہے ہیں نا؟“

”ابھی میں نے سوچا نہیں ہے۔“

جیکب مائن جنوبی امریکا کے ایک چھوٹے سے ملک کا دور دراز پہاڑی قصبہ تھا۔ اس کی وجہ شہرت وہ سونے کی کان تھی جس سے آج سے تیس سال پہلے سونا نکلتا تھا۔ جب یہاں کام شروع ہوا تھا تو کان میں تیس ہزار افراد کام کرتے تھے۔ پھر سونے کی قیمت پہلے جیسی نہیں رہی اور سیاسی حالات بھی خراب ہو گئے تھے، اس لیے وہ کان بند کر دی گئی۔ کان کی وجہ سے علاقے کا ماحول تباہ ہو گیا تھا۔ جاہل کان سے نکلے فسطے کے ڈھیر لگے تھے حتیٰ کہ یہاں جنگل اور زراعت بھی تباہ ہو گئے تھے۔ کان بند ہونے سے اقتصادی حالت بھی تباہ ہو گئی۔ ایک لاکھ کی آبادی کا قصبہ سکڑ کر دس ہزار افراد پر مشتمل رہ گیا۔ ان لوگوں نے بے پناہ غربت سے اٹھ کر گزشتہ دس سالوں میں اپنی اور علاقے کی حالت کو بہتر کیا تھا۔ انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کیمیکلز اور کان

سے نکلنے والے کچھ کو صاف کیا۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر کھیت بنائے اور علاقے کو دوبارہ سے سرسبز اور خوشحال کر دیا تھا۔

سیاسی حالات بدلے اور ملک کے اس حصے میں ایک سابق فوجی جنرل کو کیلو مارلو نے اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ یہ ظاہر یہ علاقہ مرکزی حکومت کے تابع تھا لیکن درحقیقت یہاں جنرل مارلو کی حکومت تھی۔ جنرل سابق فوجی تھا وہ شاید میجر کے عہدے تک پہنچا تھا جب اسے فوج میں بغاوت کا مرتکب قرار دیا گیا اور وہ سزا سے پہلے فرار ہو گیا۔ پہلے وہ سوشلسٹ خیالات رکھتا تھا اور منشیات کا شت کرتا تھا لیکن سوویت یونین کے زوال کے بعد اس نے پٹری بدلی اور علاقے میں منشیات کی کاشت کے خلاف سی آئی اے کو اپنا کندھا پیش کر دیا۔ کرائے کے فوجی کا کردار ادا کر کے اس نے بہت کمایا تھا اور اب اس کی نظر جیکب مائن کے سونے کی کان پر مرکوز تھی۔

گزشتہ کئی سالوں سے جاری سونے کی گرم بازاری کی وجہ سے دنیا بھر میں سونے کی کان کنی کا رجحان بڑھ رہا تھا اور بعض جگہوں پر متروک کانوں کو دوبارہ کھولا جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک جیکب مائن بھی تھی۔ جنرل مارلو نے جنوبی امریکا میں سونے کی اور سائٹ پر کام کرنے والی امریکی فرم مارک گولڈ کو جیکب مائن میں کان کنی کی پیشکش کی۔ ابھی یہ معاہدہ ہوا بھی نہیں تھا کہ جیکب مائن کی آبادی نے اس معاہدے کے خلاف مظاہرے شروع کر دیے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر کان سے سونا نکالنا شروع کیا گیا تو اس سے علاقہ ایک بار پھر تباہ ہو جائے گا۔ کان کنی سے پھیلنے والی آلودگی ان کے کھیتوں اور جنگلوں کی شادابی برباد کر دے گی اور یہ کھیت ان کے پاس ان کی آنے والی نسلوں کی امانت تھے۔ وہ کسی صورت انہیں برباد ہونے نہیں دیں گے۔ اس تحریک کے پیچھے ایک مقامی اسکول ٹیچر جوزف کارلوس کا ہاتھ تھا۔ سب سے پہلے اسی نے احتجاج شروع کیا تھا اور اس کے بعد جلد دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔ قصبے کے لوگوں نے جوزف کی قیادت میں ایک وفد دارالحکومت روانہ کیا اور وہاں مطالبہ کیا کہ حکومت امریکی فرم اور جنرل مارلو کے درمیان ہونے والے اس غیر قانونی معاہدے کو روکے اور جیکب مائن میں سونے کی کان ہمیشہ کے لیے بند کر دی جائے مگر وفاقی حکومت اس معاملے میں بے بس تھی۔ جنرل مارلو پر اس کا کوئی زور نہیں چلتا تھا۔ اس لیے اس نے زبانی کلامی تو ہمدردی کی لیکن اس معاملے میں کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ خود وفاقی حکومت ماضی

کی تلافی کرتے ہوئے امریکا سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جوزف اور اس کے ساتھی ناکام واپس آ گئے لیکن انہوں نے اپنا احتجاج جاری رکھا اور کان کی طرف جانے والے تمام راستوں کو بند کر دیا۔

کوئی دو ہفتے پہلے اچانک جیکب مائن کا رابطہ باقی ملک اور دنیا سے منقطع ہو گیا۔ وہاں کام کرنے والی سیلور سروس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور علاقے میں کام کرنے والے دو صحافی بھی لاپتا ہو گئے۔ بعد میں یہ صحافی بڑی مشکلوں سے دارالحکومت پہنچے اور وہاں انہوں نے جو بتایا وہ خاصا ہولناک تھا۔ ان میں ایک صحافی جیمی شا واٹکین پوسٹ کے لیے کام کرتا تھا اور اس نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اچانک ہی جنرل مارلو کی فورس نے جیکب مائن کا محاصرہ کر کے اس کا رابطہ باقی ملک سے کاٹ دیا۔ بجلی بند کر دی گئی اور دو دن کے محاصرے کے بعد جنرل مارلو کے مسلح دستے قصبے میں داخل ہوئے اور انہوں نے کل عام شروع کر دیا وہ چین چین کر ان لوگوں کو نشانہ بنا رہے تھے جو احتجاج میں جوزف کارلوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ جیمی کے مطابق کل عام میں کم سے کم دو سو افراد مارے گئے تھے اور ان میں اکثریت عورتوں بچوں اور بوڑھوں کی تھی۔

جنرل مارلو کے آدمیوں کو خاص طور سے جوزف اور اس کے اہل خانہ کی تلاش تھی لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جیمی کی اس رپورٹ کے بعد جیکب مائن کے حالات مکمل تاریکی میں تھے۔ جنرل مارلو کے آدمی میڈیا کو اس علاقے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ساتھ ہی مارک گولڈ سے اس کا معاہدہ ہو گیا اور مارک گولڈ کا دعویٰ تھا کہ جلد علاقے میں کان کنی کا آغاز ہو جاتا۔ اس کان سے سالانہ ڈھائی ٹن سونا نکل سکتا تھا جس کی بین الاقوامی قیمت ساڑھے سترہ کروڑ ڈالر تھی۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ بعض ماہرین کا کہنا تھا کہ جدید طریقہ کان کنی سے نکلنے والا سونا تین گنا زیادہ ہو سکتا تھا یعنی اس کی مالیت نصف ارب ڈالر تک جاسکتی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ مقامی لوگوں کا احتجاج نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ کل عام کے بارے میں متضاد خبریں تھیں، آزاد ذرائع دعویٰ کر رہے تھے کہ واقعے میں سچائی تھی جبکہ جنرل مارلو اور مارک گولڈ اس کی تردید کر رہے تھے مگر ساتھ ہی وہ میڈیا کو علاقے میں رسائی دینے سے کترارہے تھے۔ امریکی میڈیا کل عام سے زیادہ اس معاملے میں مارک گولڈ کے کردار میں دلچسپی لے رہا تھا۔ راستے میں وین سوچا رہا کہ کیا واقعی جیکب مائن میں

قتل عام ہوا تھا اور اس میں مارک گولڈ بھی ملوث تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مارک گولڈ کس قانون کے تحت جیکب مائن میں کان کنی چاہتی تھی جبکہ اس کا اس ملک کی حکومت سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اسے تجسس ہو رہا تھا مگر فی الحال وہ اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپارٹمنٹ میں آتے ہی اپنے چھوٹے سے جم کا رخ کیا۔ وہ رات سونے سے پہلے ہلکی ورزش کے بعد شاور لے کر سوتا تھا۔ ڈنر وہ پروگرام کے لیے جانے سے پہلے کر لیتا تھا۔ وہ شاور لے کر باہر آیا تھا کہ کال بیل بجی۔ اس وقت کون آ سکتا ہے؟ وہ سوچتا ہوا دروازے تک آیا اور کیٹ آئی سے جھانکا۔ وہ باہر موجود شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

☆☆☆

طیارہ اس چھوٹے سے ائرپورٹ پر اتر اتر اور وین کسٹم اور امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہو کر باہر آیا۔ چھوٹا سا ائرپورٹ تھا اور باہر وہی مناظر تھے جو تیسری دنیا کے شہروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، دھواں پھیلاتے ٹریفک کا اثر دھام اور گلی کوچوں میں کھلتے بچے۔ وین نے پھولدار شرٹ پہن رکھی تھی اور گلے میں سیاحت کا ٹریڈ مارک یعنی کیمرا لٹکایا ہوا تھا۔ اس نے موبائل نکال کر ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر اس نے کہا۔ ”جیمی شا، میں پہنچ گیا ہوں۔“

”میں پتا ایس ایم ایس کر رہا ہوں کسی ٹیکسی والے کو دکھا کر آ جاؤ لیکن ٹیکسی کا انتخاب خود کرنا۔“ جیمی شانے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہاں بے شمار ٹیکسیاں تھیں۔ وین ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا اور اس کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے نے پلٹ کر پوچھا۔ ”سر کہاں جانا ہے؟“

”مجھے کسی ایسے ہوٹل لے چلو۔“ وین نے کسی خوشحال سیاح کی طرح بے نیازی سے کہا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ائرپورٹ سے ذرا دور نکلنے ہی اس کے پاس ایس ایم ایس آ گیا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”میرا ارادہ بدل گیا ہے اب مجھے کولمبی میں چھوڑ دینا۔“

”کولمبی کہاں سر، یہ بڑا علاقہ ہے؟“

”بارہوین اسٹریٹ پر۔“

جیمی شا کا گھر کولمبی میں تھا، یہ ایک درمیانے درجے کا علاقہ تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر وین نے لوگوں کی مدد سے پتا تلاش کر لیا۔ جیمی گرم جوشی سے ملا اور اسے اندر لے گیا۔ اس کا گھر سجا ہوا تھا اور بیوی بچے موجود تھے۔ جیمی کی بیوی

سیرین خوبصورت عورت تھی، اس نے وین کو انٹاس کا جوس پیش کیا۔ جوس کے بعد جیمی وین کو اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر کے الماری سے ایک بریف کیس نکالا اور وین کے سامنے رکھ دیا۔ وین نے نمبر ملا کر اسے کھولا۔ اندر ایک عدد اعشاریہ اڑتیس کا پستول، اس کے میگزین اور ایک رائفل ٹکڑوں کی صورت میں تھی، اس کے اضافی میگزین اس کے نیچے موجود تھے۔ وین نے پستول نکال کر چیک کیا اور اسے کمر کے ساتھ بیلٹ میں لگا لیا۔ باقی چیزیں اس نے بریف کیس میں رہنے دیں اور اسے بند کر دیا۔ ”ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟“

”بس لے جی جی۔“ جیمی نے کہا۔

سیرین نے لٹچ میز پر لگا دیا تھا۔ وہ یہ سن کر فکر مند ہو گئی کہ جیمی پھر جیکب مائن کی طرف جا رہا ہے۔ ”تم کتنی مشکل سے وہاں سے آئے ہو اور جب تک تم آئے نہیں تھے میرا برا حال تھا۔“

”میں جانتا ہوں ڈیئر۔“ جیمی نے کہا۔ ”لیکن اس بار میں احتیاط سے کام لوں گا اور پھر وین بھی میرے ساتھ ہوگا۔“

”میں تمہارے شوہر کا خیال رکھوں گا۔“ وین نے وعدہ کیا۔ اسے یہ سادہ گھریلو شوہر اور بچوں سے پیار کرنے والی عورت اچھی لگی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے مانی اور جب وہ روانہ ہو رہے تھے تو اس کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے۔ جیمی کے پاس دو سال پرانی ایک کھلی دو نشستوں والی جیپ تھی۔ اس کے پیچھے گدلی بیٹھ چھین جن کے نیچے سامان رکھنے والے خانے تھے۔ اس نے شہر سے نکلنے ہی وین کو مشورہ دیا۔

”ابھی سات گھنٹے کا سفر ہے تم سو جاؤ۔ جیکب مائن کے پاس پہنچ کر تمہیں جگا دوں گا۔“

خود وین بھی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ طیارے میں سفر کے دوران اس علاقے کے بارے میں رپورٹس دیکھتا رہا تھا۔ اس نے سیٹ پیچھے کی اور کچھ دیر میں اٹھ کھڑے لگا۔ وین نے نیویارک سے جیمی شا سے رابطہ کیا تھا اور اسی نے وین کے لیے تمام انتظامات کیے تھے۔ ان میں اسلحہ بھی شامل تھا۔ شہر میں گرمی تھی لیکن جب وہ باہر نکلے اور جیپ بلندی پر چڑھنے لگی تو موسم بہتر ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے لوری کا کام کیا اور وین بے خبر سو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد جیمی نے اسے بیدار کیا تو وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ جیپ سڑک سے ہٹ کر ایک پہاڑی چشمے کے پاس روکی ہوئی تھی۔ جیمی چشمے سے پانی لا کر ریڈی ایٹر میں بھر رہا

تھا۔ وہ راستے کے لیے کافی اور سینڈ وچز بنا کر لایا تھا۔ وین کو بھوک لگ رہی تھی اس نے خود کو چشمے کے پانی سے ترو تازہ کیا اور کافی کے ساتھ سینڈ وچز کھانے لگا۔ یہ بہت خوب صورت پہاڑی مقام تھا۔ یہاں بلند درخت کم تھے لیکن آس پاس صرف سبزہ تھا۔ ہوا میں خشکی اور ایک الوکی خوشبو تھی۔ جیمی نے کہا۔

”یہ جگہ سمندر سے پندرہ سو میٹر کی بلندی پر ہے اور یہاں موسم بہترین رہتا ہے۔“

”ہم جیکب مائن سے کتنی دور ہیں؟“

”دو گھنٹے کا سفر اور ہے لیکن شاید ایک گھنٹے بعد ہی ہمیں روک دیا جائے۔“

”وہ کیسے؟“

”جنرل مارلو کے آدمی اس علاقے میں نہ کسی کو جانے دے رہے ہیں اور نہ وہاں سے کسی کو باہر آنے دے رہے ہیں۔“

”کوئی اطلاع ہے؟“

جیمی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”اطلاعات اچھی نہیں ہیں۔ جیکب مائن کی نصف آبادی گھروں سے نکل کر پہاڑوں پر چلی گئی ہے اور باقی نصف گھروں میں قید ہے۔ جنرل مارلو کے آدمی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے ساتھ عورتوں کی آبروریزی بھی کر رہے ہیں۔“

وین سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”اگر سڑکوں پر ناکے لگائے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمیں روک دیا جائے گا اور ممکن ہے گرفتار بھی کر لیا جائے۔“

”اس کا پورا امکان ہے۔“ جیمی نے تائید کی۔

”اس صورت میں ہمیں چھپ کر سفر کرنا پڑے گا۔“ وین نے تجویز دی۔ ”جہاں کہیں ہمیں ناکا نظر آیا ہم جیپ چھوڑ کر دوسرے راستوں سے پیدل سفر کریں گے۔“

جیمی نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد دوبارہ روانہ ہوئے۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور روشنی کم ہو رہی تھی شاید اسی وجہ سے وہ اس فوجی جیپ کو نہیں دیکھ سکے تھے جو اچانک ہی سامنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دو فوجی کھڑے تھے۔ ان کی جیپ دیکھتے ہی فوجیوں نے رائفلیں تان لی تھیں۔ جیمی نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔ اسی لمحے انہیں کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ وین نے ہاتھ اوپر کیے اور جیمی سے کہا۔

”ان سے بولو کہ میں امریکی صحافی ہوں۔“

جیمی نے اسپینش زبان میں چلا کر کچھ کہا لیکن فوجیوں کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ رائفلیں

2013 اکتوبر

61

سپنس ڈائجسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

2013 اکتوبر

60

سپنس ڈائجسٹ

تائے کھڑے رہے پھر ایک فوجی نے درشت لہجے میں کچھ کہا، جیسی نے ترجمہ کیا۔ ”یہ ہمیں نیچے آنے کو کہہ رہا ہے۔“

”نیچے اترو۔“ وین نے آہستہ سے کہا۔ ”جب میں کہوں تو فوراً کسی آڑ میں ہوجانا۔“

جیسی کا رنگ اڑ گیا تھا لیکن وہ نیچے اتر آیا اور گاڑی کے پاس ہی ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وین دونوں ہاتھ اوپر کیے نیچے تلے قدموں سے فوجیوں کی طرف بڑھا۔ اسے نہتا دیکھ کر فوجیوں نے رائفل جھکالی تھی۔ عورت کی چیخیں اب واضح ہو گئی تھیں۔ جیب کے ساتھ سڑک پر دو فوجی ایک جوان لڑکی کو نیچے گرائے دست درازی میں مصروف تھے۔ لڑکی بھرپور مزاحمت کر رہی تھی اور اس کے نتیجے میں اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ وین نے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

وین کے اشارے پر انہوں نے بے ساختہ لڑکی کی طرف دیکھا اور وین نے تیزی سے پستول نکالتے ہوئے سامنے موجود فوجی پر فائر کیا۔ پھر وہ دوسرے فوجی پر فائر کرتے ہوئے تیزی سے دائیں طرف واقع درختوں کی طرف گیا۔ وہ بدحواس ہو کر وین کی فائرنگ سے بچنے کے لیے جیب کی آڑ میں ہو گیا۔ اس نے پوزیشن لیتے ہی وین پر برست مارا لیکن اتنی دیر میں وہ درختوں کی آڑ میں جا چکا تھا۔ لڑکی پر دست درازی کرنے والے اسے چھوڑ کر اپنا اسلحہ سنبھالتے ہوئے جیب سے آگے آئے تھے کہ ایک برست چلا اور وہ دونوں گر گئے۔ وین نے چونک کر دیکھا۔ جیسی ایک چھوٹی مشین گن اٹھائے ہوئے تھا جو اس نے نہ جانے کہاں سے نکالی تھی کیونکہ وین نے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک ہی برست میں دونوں کا کام تمام کر دیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے آخری بچ جانے والے فوجی نے رائفل پھینک دی اور خود سر پر ہاتھ رکھے سامنے آ گیا۔

وین نے اسے جیسی کے سپرد کیا اور خود لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ سرخی مائل رنگت اور دل کش نقوش والی نو جوان لڑکی تھی، اس کی عمر چوبیس پچیس برس تھی۔ وہ اپنے گھٹنوں پر جھکی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس کا لباس چھتڑے ہو گیا تھا۔ وین نے اپنی شرٹ اتار کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔ اس نے جلدی سے شرٹ پہنی۔ مزاحمت کی وجہ سے اسے کچھ خراشیں اور معمولی زخم آئے تھے لیکن اس کی حالت ٹھیک تھی۔ وین نے نرمی سے کہا۔

”تم انگش جانتی ہو؟“

لڑکی نے سر ہلایا۔ ”جانتی ہوں۔“

”تم کون ہو اور یہ تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟“ وین نے لاشوں کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے بتایا۔

”میرا نام میریا ہے۔ میں اور میری فیملی جیکب مائن سے جان بچا کر نکلے تھے لیکن جنرل مارلو کے آدمی ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ ہمیں گھیر لیا۔ وہ بوڑھوں، بچوں اور مردوں کو مار رہے تھے صرف جوان عورتوں اور لڑکیوں کو زندہ رکھا تھا، یہ مجھے لے آئے۔“

”یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“

”دو گھنٹے پہلے کی۔“ میریا رونے لگی تھی۔ ”پتا نہیں میری بوڑھی ماں اور بھائی کس حال میں ہوں گے۔“

اچانک فائر کی آواز آئی۔ وین اور میریا نے چونک کر دیکھا جیسی نے آخری فوجی کو بھی مار دیا تھا میریا کی باتوں نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ ”یہ کیا کیا؟“

”یہ لوگ اسی قابل ہیں۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”پھر میں اسے چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا یہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ جنرل کا اثر شہروں میں بھی ہے۔“

وین نے زیادہ بحث نہیں کی۔ ”میرا خیال ہے اب ہمیں آگے چلنا چاہیے۔“

”آگے اس سے بھی زیادہ چپکے ہوگی۔“

”ہم فوجی وردیوں میں جائیں گے۔“ وین نے کہا۔ ایک گھنٹے بعد وہ سب فوجی وردیوں میں تھے۔ انہوں نے مارے جانے والے فوجیوں کی وردیاں اور دوسری تمام چیزیں لے کر ان کی لاشیں ایک کھائی میں لٹکا دی تھیں۔ میریا کو ایک نسبتاً چھوٹی وردی دی تھی لیکن یہ بھی اسے ڈھیلی تھی اس لیے اسے عقبی حصے میں بٹھایا تھا جہاں اس پر نظر کم جاتی۔ اس نے اپنے ریشمی بال ٹوپی تلے چھپا لیے تھے اور چہرے کی ملاحات چھپانے کے لیے منہ پر بچھڑ والی مٹی لگا لی تھی۔ پھر رات ہونے کی وجہ سے بھی امکان کم تھا کہ میریا پر کسی کی نظر پڑے گی۔ میریا فوجیوں کے مارے جانے پر بہت خوش تھی۔

”یہ اس سے بھی زیادہ برے سلوک کے قابل تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میں بتا نہیں سکتی۔“

میریا نے جو بتایا تھا اس سے ایک خوفناک تصویر سامنے آئی تھی۔ جیکب مائن پر کم سے کم پانچ سو مسلح افراد نے چڑھائی کی۔ وہ مشین گنوں، رائفلوں اور ہلتر بند گاڑیوں پر لگی بھاری مشین گنوں سے مسلح تھے۔ قصبے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے اندھا دھند قتل عام شروع کر دیا اور ہر نظر آنے

والے فرد پر گولیاں برسائے گئے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ بچہ تھا یا عورت۔ جیکب مائن ایک پہاڑی پر پھیلے ہوا تھا، ڈھلانوں پر آباد گھروں سے لوگ نکل کر بھاگے اور پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ لیکن جنرل مارلو کے آدمی مسلسل ان کے تعاقب میں تھے اور جن جن لوگوں کو ہلاک کر رہے تھے۔ وین نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ انتہا درجے کی درندگی ہے۔“

”اس کے پیچھے ایک امریکی فرم مارک گولڈ ہے۔“

میریا تلخ لہجے میں بولی۔ وین نے اس کی تردید نہیں کی۔ کیونکہ اسے بھی یہی خیال آرہا تھا کہ اس کے پیچھے مارک گولڈ کے کسی نہ کسی فرد کا ہاتھ ضرور ہے۔

☆☆☆

مین مین میں مارک گولڈ کی سنہری بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر ویکس کے دفتر میں ویکس اور شیلہ کے ساتھ فرم کا چیف آپریٹنگ آفیسر ریگل کلارک اور فرم کا ہارڈ مین راجر بروک موجود تھے۔ سارے ناپسندیدہ اور خون خرابے والے کام اس کے ذمے تھے۔ ان کے تاثرات گہمیر تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی جسے ویکس نے توڑا۔ ”حالات قابو سے باہر ہو رہے ہیں۔ وین برائن وہاں پہنچ گیا ہے اور وہ یقیناً جیکب مائن کے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔“

”جنرل کے آدمی اسے روکنے کے لیے موجود ہیں۔“

ریگل بولا۔

شیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وین نہ صرف میرین کی تربیت لے چکا ہے بلکہ اسے ایف بی آئی میں کام کا تجربہ بھی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے جنرل کے آدمیوں کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اگر وہ جوزف تک پہنچ گیا اور اسے یہاں لے آیا تو ہمارے لیے مزید مشکل پیدا ہو جائے گی۔“

”سوال یہ ہے کہ وین کے پیچھے کون ہے۔ اسے کسی نے تو وہاں بھیجا ہوگا۔“ راجر نے زبان کھولی تو شیلہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔

”اسحقانہ باتیں مت کرو۔ وین ایک صحافی ہے اور وہ اسٹوری کے لیے گیا ہے۔“

”لیکن میرا بھی خیال ہے اسے کسی نے بھیجا ہے۔“ راجر نے اصرار کیا۔ ویکس نے مداخلت کی۔

”وہ خود گیا ہے یا کسی نے اسے بھیجا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”انتظار۔“ شیلہ نے سکون سے کہا۔ ”اگر جنرل نے کام کر دیا تو ٹھیک ہے ورنہ واپسی پر ہم یہ کام راجر کے سپرد کر سکتے ہیں۔“

ریگل اور راجر کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ شیلہ کی بات سے متفق تھے۔ ویکس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور جب میننگ ختم ہونے کا اشارہ کر دیا تو ریگل اور راجر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ویکس نے شیلہ کی طرف دیکھا تو اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ اب اس کے چہرے پر نرمی تھی۔ وہ شیلہ سے محبت کرتا تھا۔ دونوں بہن بھائی نے شادی نہیں کی تھی۔ اس دنیا میں وہی ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تھے۔ ویکس، شیلہ سے پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ وہ صرف اس کا بھائی ہی نہیں باپ کی جگہ بھی تھا کیونکہ شیلہ صرف چھ سال کی تھی جب ان کے ماں باپ ایک پلین کریش میں ہلاک ہو گئے اور پھر ویکس نے اس کی پرورش کی تھی۔ ویکس نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو یہ پروجیکٹ بہر صورت ہمیں ملے گا۔“

شیلہ نے شکوہ کیا۔ ”لیکن تم نے شروع سے مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی۔“

”میں جانتا ہوں تم پریشان ہوتیں۔ خیر اب معلوم ہو گیا۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو۔ کاش تم میری بات مان لو اور شادی کر کے اپنا گھر بسالو۔“

”میں ایسے زیادہ خوش ہوں۔“ شیلہ نے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

وہ رات کے وقت جیکب مائن کے پاس پہنچے تھے۔ راستے میں دو مقامات پر ان کا سامنا جنرل مارلو کے آدمیوں سے ہوا لیکن جیب دیکھ کر کسی نے ان کا راستہ نہیں روکا اور انہیں جانے دیا تھا۔ جیسی اپنی جیب کے لیے فکر مند تھا حالانکہ وہ اسے اچھی طرح جھاڑیوں میں چھپا کر آیا تھا۔ فکر یہ تھی کہ اگر گاڑی مل گئی تو اس کی مدد سے جیسی کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ میریا نے جیکب مائن سے پہلے ایک جگہ انہیں روک دیا۔ ”ہمیں یہاں سے اوپر جانا ہوگا۔“

”جیب چھپانا ہوگی۔“ وین نے جیسی سے کہا۔ ”لیکن سارا اسلحہ ساتھ لے جائیں گے، اس کی ضرورت پڑے گی۔“

انہوں نے جیب سڑک سے ہٹا کر ایک جگہ چھوڑ دی اور اسلحے سمیت اوپر روانہ ہوئے۔ ابھی وہ فوجی وردی میں تھے کیونکہ راستے میں جنرل مارلو کے آدمیوں سے ٹکراؤ کا پورا امکان تھا، وہ اس علاقے میں جا رہے جا پھیلے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہونے کے بعد چاند نکل آیا تھا، اس لیے راستہ دیکھنے میں اتنی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ راستے میں کئی جگہوں پر انہیں وردی پوش فوجی دکھائی دیے تھے۔ وہ ان سے کترا کر آگے بڑھتے رہے۔ سڑک کے

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ اکتوبر 2013ء
کی جھلکیاں

متاع کاروان

تحریک آزادی کے اولین مجاہد کا
تذکرہ جسے لوگ بھول رہے ہیں

فسوں گر

کھیل کی دنیا کی ایک حیرت انگیز شخصیت کا قصہ

میرا بھائی

دہشت گردی کی کوکھ جنم لینے والی ایک دلچسپ بیتی

الکاحی علاج

سراب قلمی الف لیلہ، ترکی نئی دامن اور بہت سی آپ
بیتیاں جگ بیتیاں، سچے قصے انوکھے واقعات

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ..... خاص شمارہ..... ہر شمارہ

اتھام سے لبریز اور مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔“
وین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ باقاعدہ فوج کا مقابلہ
نہیں کر سکتے اس لیے بہتر ہوگا یہ دوسری آبادیوں میں چلے
جائیں۔“

”اتفاق سے میں نے بھی یہی مشورہ دیا ہے اور
جوزف کا بھی یہی خیال ہے۔ مگر مرد جانے کے لیے تیار نہیں
ہیں۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھیجا جا رہا ہے۔“

کچھ دیر میں جوزف نے اس کی تصدیق کر دی کہ
عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو دوسری بستیوں میں بھیجا جا رہا تھا،
اسے مارے جانے والوں کا دکھ تھا۔ اس نے وین سے
کہا۔ ”اس منحوس سونے نے ہماری ہستی بستی زندگیوں کو نکل لیا
ہے۔ میرا بس چلے تو اس دھات کو کرۂ ارض سے مٹا دوں۔“

وین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سونے نے نہیں لاؤچ نے
لوگوں کو برباد کیا ہے۔ سونا بذاتِ خود بری چیز نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو سونا تو ہمیشہ سے یہاں ہے۔

جب کان سے سونا نکالا جا رہا تھا تو دنیا جہان کے چھٹے ہوئے
بد معاش اور برے لوگ جیکب مائن میں جمع تھے۔ آئے
دن دن کا فساد اور قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی تھیں۔

لوگوں کا جینا حرام ہو گیا تھا۔ کان کنی سے ماحول الگ برباد
ہو رہا تھا۔ پھر کان کنی ختم ہو گئی اور جرائم پیشہ یہاں سے چلے
گئے مگر علاقہ اس بری طرح برباد ہوا تھا کہ اسے ٹھیک کرنے

میں ایک عشرہ لگ گیا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ کان یہاں
سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم نے جیکب مائن اور اس کے
آس پاس کا علاقہ بہتر کیا ہے لیکن کان کے قریب تمام جگہیں
آلودہ ہیں۔“

جوزف اسے ایک بلند جگہ لایا۔ یہاں سے نہ صرف
کان بلکہ جیکب مائن کا علاقہ کا بھی واضح دکھائی دے رہا تھا۔

کان کے آس پاس تمام پہاڑ سیاہ تھے اور یہاں نباتات جل
گئی تھیں۔ جابجہ جائید منڈ چھوٹے درخت اور سخت قسم کی
ایسی چھاڑیاں تھیں جن کا رنگ زرد تھا۔ کان سے نکلے فضلے

نے واقعی بہت تباہی پھیلانی تھی۔ یہ واضح تھا کہ کان کنی کے
تمام اصولوں اور حفاظتی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر کان کنی
کی گئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وین نے سونے کی کان کنی

کے بارے میں کچھ تحقیق کی تھی اور اس سے یہ نتیجہ سامنے آیا
تھا کہ کان کنی اگر اصول و قواعد کے مطابق کی جائے تو اس
سے ماحول پر بہت معمولی اثر پڑتا ہے اور اسے بہ آسانی ختم

کیا جاسکتا ہے۔ اس نے جوزف کو بتایا تو وہ تلخی سے بولا۔
”یہ امریکا نہیں ہے یہاں اول تو قوانین نہیں ہیں اور

اسپرین لے آیا۔“ ویسے میرا نام جوزف کارلوس ہے۔“
وین چونکا۔ ”میں تمہاری تلاش میں یہاں آیا ہوں۔“
جوزف نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے

دیکھا۔ ”جیسی شامقامی ہے اور میں اسے جانتا ہوں لیکن وہ
تمہارے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہے۔“

”ہم پر حملہ کرنے والے تمہارے آدمی تھے؟“
”وہ تمہیں قابو کر رہے تھے، مزاحمت پر یہ سلوک
کیا۔“ جوزف نے معذرت کی۔ ”اس کے لیے سوری۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وین نے کافی کا گھونٹ لیا اور
جوزف کو اپنے بارے میں سب بتا دیا۔ سوائے ایک بات
کے اس نے سب سچ بولا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”میں

تمہیں لینے آیا ہوں تاکہ تمہیں امریکا کی عوام اور حکام کے
سامنے پیش کر سکوں۔“

”میں سوچ کر اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے
تمہیں جواب دوں گا۔“ جوزف نے کہا اور خیمے سے چلا گیا۔
کچھ دیر میں وین کی حالت بہتر ہوئی تو وہ بھی باہر نکل

آیا۔ یہاں جیکب مائن سے بھاگ کر آنے والے کم سے کم
ہزار افراد موجود تھے۔ یہ سب ملی جلی نسلوں والے لوگ
تھے۔ ان میں تقریباً ایک چوتھائی سفید قام بھی شامل تھے۔

گندمی رنگت والے اور سیاہ قام بھی تھے۔ نقوش بھی
یورپ، سیاہ قام اور مقامی نسلوں کے ملے جلے تھے لیکن وہ
سب خود کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ ان کی زبان اسپینش

تھی۔ جوزف سیاہ قام تھا۔ ایک طرح سے ان پناہ گزینوں کا
سربراہ وہی تھا۔ یہاں جابجہ بھی تھا جو سابق فوجی تھا اور وہ
جزل مارلو کے خلاف مزاحمت منظم کر رہا تھا۔ اس نے بڑے

فخر سے وین کو بتایا کہ وہ اب تک جزل کے درجنوں افراد
ہلاک کر چکے ہیں۔ پہلے ان کے پاس اسلحہ کم تھا لیکن مارے
جانے والے دشمن کے اسلحے سے اب وہ بہتر طور پر مسلح

تھے۔ جیسی اور میریا اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ میریا
جس طرح اس کے گلے لگی تھی اس سے وین کو کسی حد تک اس
کے جذبات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے کھانے کو روٹی

قبوہ لے آئی۔ جیسی اسے صورت حال بتانے لگا۔
”ان کا کہنا ہے کہ جیکب مائن کے کم سے کم ایک ہزار
افراد جزل مارلو کی درندگی کا نشانہ بن چکے ہیں۔ تقریباً چھ

سے سات ہزار افراد فرار ہو کر پہاڑوں پر آگئے ہیں اور اب
یہ دور دراز واقع دوسری بستیوں میں اپنے رشتے داروں سے
رابطہ کر رہے ہیں۔ کچھ اسلحہ ان کے پاس تھا اور کچھ انہوں

نے مارلو کے آدمیوں سے حاصل کیا ہے۔ اب یہ جوش

دوران وین نے میریا سے جوزف یا دوسرے افراد کے
بارے میں پوچھا لیکن وہ اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی
تھی۔ البتہ اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ جوزف اپنے اہل خانہ

اور ساتھیوں سمیت جیکب مائن سے نکل گیا تھا اور جزل مارلو
کے آدمی شاید اسی کی تلاش میں پاگلوں کی طرح بھاگ دوڑ
کر رہے تھے۔ اس دوران میں ان کے ہاتھ جو آ رہا تھا وہ

اسے قتل کر رہے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی شیطانیت
کی بھیشت چڑھانے کے لیے زندہ چھوڑ رہے تھے لیکن بعد
میں ان کا انجام بھی یہی ہوتا۔ میریا کی خوش قسمتی تھی کہ وین

اور جیسی بروقت وہاں پہنچ گئے ورنہ وہ عزت اور جان دونوں
سے ہاتھ دھو لیتی۔

وین نے سوال کیا کہ جوزف اور اس کے ساتھی مسلح
مزاحمت کر رہے تھے؟ میریا کا کہنا تھا کہ جیکب مائن میں
تقریباً ہر گھر میں اسلحہ تھا۔ اس لیے ان کی طرف سے مزاحمت

ہوئی ہوگی۔ جیسی نے فخر سے کہا۔ ”ہم پُر امن لوگ ہیں لیکن
جب ہماری جان پر بن آئے تو ہم لڑ کر جان دیتے ہیں۔“

وہ سڑک سے خاصی دور نکل آئے تھے لیکن ابھی تک
انہیں جیکب مائن کا کوئی فرد نہیں ملا تھا۔ البتہ ایک جگہ تین
لاشیں دکھائی دی تھیں۔ ان میں دوسرا اور ایک بوڑھی عورت

تھی۔ انہیں فائرنگ کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ میریا انہیں نہیں
جانتی تھی لیکن یہ ظاہر وہ عام افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ اس
دریافت نے ان سب کو دکھی کر دیا تھا۔ وین خود کو تیار کر رہا

تھا کہ آگے بھی شاید ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملیں۔ نصف
رات کو انہوں نے تھک کر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ وہ ایک پہاڑی

... ڈھلان کے وسط میں تھے۔ بلندی کی وجہ سے موسم خنک
تھا لیکن یہ اتنا بھی نہیں تھا کہ انہیں آگ جلانے کی ضرورت
پڑتی اور آگ جلانا ویسے بھی خطرناک تھا۔ وہ رات بھر

اونگھتے رہے، کبھی کبھی ان کی آنکھ لگ بھی جاتی تھی۔ وین سو
رہا تھا کہ اچانک کسی نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو

کوئی چیز اس کے سر پر لگی اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔
ہوش آیا تو وہ نرم بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر پر

پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ کپڑے کا خیمہ تھا اور باہر سے دن کی
روشنی کے ساتھ لوگوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ ابھی
لیٹا ہوا تھا کہ خیمے کا پردہ ہٹا اور ایک سیاہ قام ادھیڑ عمر شخص

نے اندر جھانکا۔ وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔ ”ہیلو، کیسا
محسوس کر رہے ہو؟“

”بہتر، بس سر میں درد ہے۔“

”میرے پاس اس کا علاج ہے۔“ وہ کافی کا گنگ اور

جو ہیں ان پر عمل نہیں ہوتا، ورنہ ہمیں احتجاج کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں معلوم ہے امریکی فرم بھی یہاں سے سستا سونا حاصل کرنے کے لیے قوانین اور حفاظتی اصولوں کو نظر انداز کر دے گی۔

”تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح احتجاج کر کے یا لڑ کر اس معاہدے کو روک دو گے۔“

”ہم کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”تم ہماری مدد کرو تو یہ معاہدہ ختم ہو سکتا ہے۔“

وین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مسئلہ یہ مائن ہے اگر مارک گولڈ اس سے دست بردار ہو جائے تو کوئی دوسری گولڈ فرم اس کے لیے جزل مارلو جیسے کسی طاقتور آدمی سے رابطہ کرے گی اور جیکب مائن کے باسی مشکل میں رہیں گے۔“ جوزف پھر سچ ہو گیا۔ ”تب ہم کیا کریں، لاپچی دنیا سے لڑتے رہیں اور مرتے رہیں۔“

”نہیں، مسئلے کا بہتر حل نکالا جا سکتا ہے۔ اب ٹیکنالوجی بہت ترقی کر گئی ہے اور محفوظ طریقے سے ماحول کو نقصان پہنچائے بغیر کان کنی کی جاسکتی ہے۔ تم لوگ اس کان سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے ماحول کو بھی محفوظ رکھو لیکن اس کے لیے ضروری ہے معاملات تم لوگوں کے ہاتھ میں رہیں۔ ایک بار تم دنیا کو اپنی حمایت پر راضی کرنے میں کامیاب رہے تو سب کچھ تمہاری مرضی سے ہو سکتا ہے۔ اگر تم نے کان کنی کا فیصلہ کیا تو یہ بھی بین الاقوامی معاہدے اور قوانین کے تحت ہو سکتا ہے۔“

جوزف کارلوں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں اپنے لوگوں سے مشورہ کر کے بتاتا ہوں لیکن تم بھول رہے ہو مسئلہ ابھی کا ہے، جزل مارلو کے آدمی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں اور دو ہفتے میں درجنوں جھڑپیں ہو چکی ہیں جن میں دونوں طرف سے بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔“

”اگر دوسری بستیوں نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو پھر جزل مارلو کے آدمی تمہارے سامنے نہیں ٹک سکتے۔“ لیکن دوسرے لوگ ہمیشہ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جزل مارلو کے آدمی ابھی پسپا ہو جائیں گے لیکن بعد میں موقع دیکھ کر دوبارہ حملہ کر سکتے ہیں۔“

”میں تم پر کسی قسم کا زور ڈالنے نہیں آیا ہوں۔ صرف مدد کرنے آیا ہوں۔ اگر تمہارے مفاد کا معاملہ ہوا تو میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں مسٹر وین۔“ جوزف

کارلوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگرچہ میرا تاثر امریکی حکومت کے بارے میں اچھا نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ امریکا میں اکثریت تمہارے جیسے اچھے لوگوں کی ہوگی اور وہ ہماری بات سن کر ہماری مدد کریں گے۔“

وین خوش ہو گیا۔ ”یعنی تم میرے ساتھ چل رہے ہو؟“

”میں اکیلے اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا اور جب تک میرے لوگ محفوظ مقام تک نہیں پہنچ جاتے میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔ اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو مجھے کچھ وقت لگے گا۔“

وین گھوم پھر کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔ تقریباً ہر فرد نے اپنے خاندان کے کسی نہ کسی فرد کو کھود یا تھا اور وین نے محسوس کیا کہ وہ سونے کی کان کنی کے سخت خلاف تھے۔ وہ لوگ پُر عزم تھے کہ وہ جزل مارلو سے اس قتل عام کا انتقام لے کر رہیں گے۔ وہ کسی صورت اپنے علاقے میں کان کنی نہیں ہونے دیں گے اور اس کے لیے انہیں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔ وہ غریب تھے مگر اپنی غربت میں خوش تھے۔ انہیں کان میں موجود سونے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس شام جوزف نے وین کو اپنی کونسل کے سامنے پیش کیا اور اس نے ان کے سامنے مدد کی پیشکش دہرائی۔ وہ مان گئے تو وین نے ایک بار پھر سونے کی کان کنی کا مسئلہ چھیڑا۔ اس نے کہا۔ ”سونے کی یہ کان ایک حقیقت ہے اور مستقبل میں بھی اسے استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی رہے گی۔ ایک جزل مارلو کا مسئلہ نہیں ہے اس دولت کی وجہ سے بار بار فتنہ اٹھتا رہے گا اس لیے تم لوگوں کو اس پر غور کرنا ہوگا۔ محفوظ طریقے سے محدود کان کنی سے نہ صرف علاقے کے لوگوں کو روزگار ملے گا بلکہ تمہارے ملک کو بھی اس سے فائدہ ہوگا۔“

”وین برائن ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ جوزف نے اس کی حمایت کی۔ ”اس بحران سے نکلنے کے بعد ہمیں اس مسئلے پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔“

کونسل اراکین کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حق میں نہیں تھے لیکن وین جانتا تھا، آنے والے وقت میں وہ اس پر غور کریں گے۔ فی الحال جو مسائل سامنے تھے ان سے نمٹنا تھا۔ آنے والے چند دنوں میں تمام عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو دور دراز بستیوں میں بھیج دیا گیا تھا اور ان بستیوں سے رضا کاروں کی آمد شروع ہو گئی تھی، وہ اپنے ساتھ خوراک اور اسلحہ بھی لا رہے تھے۔ وہ پہاڑوں اور ان کے درمیان سے گزرنے والے راستوں پر مورچے بنا رہے تھے۔ وین اپنا سرین کا تجربہ استعمال کرتے ہوئے ان کی مدد کر رہا تھا۔ جزل

مارلو کے آدمی جیکب مائن سے ہٹ گئے تھے اور اب وہ اس سارے علاقے کا محاصرہ کر رہے تھے۔ ان کا مقصد کسی کو یہاں سے جانے سے روکنا تھا۔ دوسری طرف وین نے علاقے سے گزرنے والے راستوں اور سڑکوں پر گھات لگا کر جزل مارلو کے آدمیوں اور مسد پر حملے کرنے کی حکمت عملی تیار کی اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ جوزف کارلوں کے بیوی بچے بھی جا چکے تھے اور وہ وین کے ساتھ امریکا جانے کے لیے تیار تھا، اس نے وین سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، کیا امریکا میں اتنی آسانی سے قبول کر لیا جائے گا۔ وہاں وہ لوگ بیٹھے ہیں جو اس سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ مجھے قتل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔“

☆ ☆ ☆

ویکس، شیلہ، ریگل اور راجر، ویکس کے دفتر میں موجود تھے۔ ان کے چہروں پر فکر آمیز تاثرات تھے۔ ریگل نے الزام دینے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ جزل مارلو پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، اس نے ناکارہ آدمی رکھے ہوئے ہیں۔“ ویکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جزل کے آدمی تربیت یافتہ ہیں لیکن وہ عوام کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

راجر بولا۔ ”لوگ جیکب مائن میں اپنے گھروں میں واپس آ رہے ہیں اور مواصلاتی رابطے بھی بحال ہو رہے ہیں۔“

”امریکی عوام اس مسئلے سے بے خبر ہیں۔“ شیلہ نے کہا۔ ”ان کا بے خبر رہنا ضروری ہے۔“

”مجھے یقین ہے وین برائن، جوزف کارلوں کو امریکا لائے گا اور اس کے لیے لابیگ کرے گا۔“ ریگل نے کہا۔ ”ایک بار یہ معاملہ کھل گیا کہ ہم وہاں قواعد سے ہٹ کر کان کنی کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے بہت سے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”جوزف کارلوں کو یہاں زندہ نہیں پہنچنا چاہیے۔“ ویکس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ پہنچ جائے تب بھی اسے اپنا موقف سنانے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔“

ریگل کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا، اس نے راجر کی طرف دیکھا۔ ”اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔“

راجر نے سر ہلایا۔ ”اگر جوزف یہاں پہنچ گیا تب بھی وہ وین کے اسٹوڈیو تک نہیں پہنچ پائے گا۔“

”تمام ذرائع استعمال کرو ہمیں لمحے لمحے کی رپورٹ ملنی چاہیے۔“ ویکس نے حکم دیا۔ ”تا کہ جوزف یہاں پہنچے تو

ہم اس کے استقبال کے لیے تیار ہوں۔“

شیلہ خاموش اور فکر مند تھی۔

☆ ☆ ☆

وین، جوزف، جیمی اور میریا جس لیئر جیٹ میں تھے وہ نیویارک سے کچھ دور ایک ایئر پورٹ پر اتر تھا۔ جب وہ جیکب مائن سے روانہ ہونے لگے تو میریا نے وین کے ساتھ جانے پر اصرار کیا تھا۔ وہ چند دنوں میں وین کے لیے پاگل ہو گئی تھی۔ وین اسے نہیں لے جانا چاہتا تھا کیونکہ انہیں خود جزل مارلو کے آدمیوں کے محاصرے سے گزر کر جانا تھا اور اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا لیکن جب میریا نے دھمکی دی کہ اس صورت میں وہ خود اس کے پیچھے آئے گی تو وین مجبور ہو گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح دارالحکومت پہنچنے میں کامیاب رہے جہاں یہ لیئر جیٹ پہلے سے موجود تھا اور وہ فوری امریکا کے لیے پرواز کر گئے۔ سات گھنٹے کی طویل فلائٹ کے بعد جس میں میامی میں ایک اسٹاپ بھی شامل تھا، وہ نیویارک کے پاس اتر گئے تھے۔ جوزف حیران تھا اس نے راستے میں وین سے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک عام امریکی میڈیا مین بھی اتنے وسائل رکھتا ہے۔“

جواب میں وین مسکرا کر رہ گیا تھا۔ ایئر پورٹ پر ایک سیاہ ویکن ان کی منتظر تھی۔ رازداری کے نقطہ نظر سے ویکن طیارے کے بالکل پاس روکی گئی تھی اور وہ طیارے سے اترتے ہی ویکن میں سوار ہو گئے۔ کسٹم اور امیگریشن کے معاملات میامی میں مکمل ہو گئے تھے۔ اس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک مسلح گارڈ اور عقبی نشستوں پر وہ شخصیت موجود تھی جس نے وین کو جیکب مائن بھیجا تھا۔ جوزف نے اندر بیٹھنے کے بعد اسے دیکھا تو اسے جھکا لگا تھا۔ ”مس شیلہ مارک۔۔۔“

”اسی نے مجھے جیکب مائن بھیجا تھا۔“ وین نے انکشاف کیا۔

جوزف کا چہرہ تن گیا۔ ”تم سب نے مل کر میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ مجھے یہاں لے آئے ہو؟“

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ شیلہ بولی۔ ”درحقیقت میں نے حقائق سامنے لانے اور تمہاری مدد کے لیے وین کو وہاں بھیجا تھا۔“

میریا، شیلہ کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جیمی نے جلدی سے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں، وین نے مجھے ساری بات بتائی تھی۔“

”تب تم نے مجھے وہاں کیوں نہیں بتایا؟“ جوزف کا لہجہ سخت تھا۔

”اگر وہاں شیلہ مارک کا نام سامنے آتا تو تم شاید یہاں آنے سے انکار کر دیتے اور لوگ بھی بھڑک جاتے۔ اگر تم مان جاتے تب بھی اپنے لوگوں سے جھوٹ بولنا پڑتا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے میں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی تھی لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ باقی سب وہی ہے جو میں نے تم سے کہا تھا۔“

”میں مارک گولڈ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“ جوزف نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میرے لوگوں کے نقل عام میں یہ جنرل مارلو کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔“

شیلہ نے اس کی بات کی تردید نہیں کی۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو لیکن معاملات تاخیر سے میرے علم میں آئے اور میں نے فوری طور پر وین کو تمہاری مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اب بھی میں تمہاری اور تمہارے لوگوں کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا تم سونے کی کان کنی رکھ سکتی ہو؟“

”مارک گولڈ کی حد تک یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شیلہ نے اعتماد سے کہا۔ ”لیکن مارک گولڈ کے پیچھے ہٹنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دنیا میں گولڈ مائننگ کرنے والی کمپنیوں کی کمی نہیں ہے اور وہ سب جبکہ مائن سے سونا نکالنا چاہیں گی۔ دوسری طرف اگر جنرل مارلو نہیں رہے گا یا پیچھے ہٹ جائے گا تب بھی اس سونے کے لالچ میں اس جیسا کوئی دوسرا طالع آزمایہ پیدا ہو جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

جوزف نے سر ہلایا۔ ”سمجھ رہا ہوں۔“

شیلہ پُر جوش ہو گئی۔ ”اس لیے بہت ضروری ہے کہ تم ان معاملات کو دنیا کے سامنے لاؤ خاص طور سے امریکی عوام اور حکومت کے سامنے کیونکہ جنوبی امریکا میں گولڈ مائننگ کرنے والی تقریباً تمام کمپنیوں کا تعلق امریکا سے ہے۔“

شیلہ کے ساتھ تین افراد تھے اور یہ تینوں تربیت یافتہ گارڈز تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی تھا۔ سیاہ ویگن ان کے پیچھے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ ایک پل کر اس کر کے وہ نیو یارک میں داخل ہوئے تھے کہ دو گاڑیاں ان کے پیچھے آنے لگیں۔ ان کو پتا نہیں چلا کیونکہ وہاں ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ وین نے شیلہ سے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”براڈ وے کے پاس میرا اپارٹمنٹ ہے۔“ جوزف وہاں رکے گا، میرے آدمی اس کی حفاظت کریں گے جب تک تم اس کا انٹرویو نہیں کر لیتے، اس کے بعد مجھے اُمید ہے کہ حکومت اس کی حفاظت کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔“

ویگن کے عقبی حصے میں آنے والے سامنے سیٹوں پر وہ اس

ترتیب سے بیٹھے تھے کہ شیلہ درمیان میں تھی اور اس کا آدمی اس کے بائیں طرف تھا۔ شیلہ کے دائیں طرف جیسی آیا تھا۔ ان کے سامنے جوزف درمیان میں تھا۔ وین اس کی دائیں طرف اور میریا بائیں طرف تھی۔ وین گنگو کے دوران اس پاس بھی دیکھ رہا تھا اور اس کا دیکھنا کام آ گیا۔ اس نے برابر میں دوڑتی سیاہ کار کے درمیانی دروازے کا شیشہ نیچے ہوتے اور اس سے ایک ٹال کو برآمد ہوتے دیکھا۔ اس نے چلا کر سب کو نیچے ہونے کو کہا اور جوزف کو جھکاتے ہوئے اسے اپنی آڑ میں کر لیا۔ اگلے لمحے گولیاں برسے لگیں۔ شیلہ کے برابر میں بیٹھا گارڈ فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ چیخ مار کر آگے گرا اس کے بائیں شانے سے خون نکل رہا تھا۔ مشین گن تو اس سے گولیاں برسارہی تھی۔ ڈرائیور نے بچنے کے لیے ویگن لہراتے ہوئے ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ یہاں ٹریفک کم تھا۔ دونوں گاڑیاں پیچھے سے آئیں۔ پھر دوسری گاڑی کی چھت سے ایک مشین گن بردار نمودار ہوا اور اس نے بھی گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ویگن کے عقبی اور دائیں طرف کے شیشے بکھر گئے تھے۔ خوش قسمتی سے وین کی پاڈی مضبوط تھی ورنہ گولیاں اس سے گزر کر انہیں کب کا چھلنی کر چکی ہوتیں۔ اچانک ویگن کے دونوں عقبی ٹائر پھٹنے لگے اور وہ سڑک پر لہرانے لگی۔

ڈرائیور نے یہ مشکل اسے ایک طرف فٹ پاتھ کے ساتھ روکا تھا۔ گاڑیوں کی اندھا دھند دوڑ اور فائرنگ نے وہاں موجود افراد کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور وہ جان بچانے کے لیے پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ وین نے اپنا پستول نکالا اور نیچے اترنے سے پہلے دوسروں سے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہیں؟“

سب ٹھیک تھے البتہ جب جوزف سیدھا ہوا تو اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ شیلہ تیزی سے آگے آئی اس نے جیکٹ ہٹا کر دیکھا بائیں پہلو میں دل سے ذرا نیچے زخم تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”یہ زخمی ہے۔“

”ایمرجنسی کو کال کرو۔“ وین کہتے ہوئے نیچے اترا۔ تعاقب میں آنے والی دونوں گاڑیاں کچھ فاصلے پر رگ گئی تھیں اور ان سے مسلح افراد اتر رہے تھے۔ وین نے ان کی طرف دو فائر کیے اور نیچے آ جانے والے ڈرائیور اور گارڈ سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس اسلحہ ہے؟“

”پستول ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

صورتِ حال مایوس کن تھی کیونکہ پیچھے آنے والے تعداد میں کہیں زیادہ اور خود کار اسلحے سے مسلح تھے۔ وین

نے برہمی سے کہا۔ ”صرف پستول کے بل بوتے پر تم لوگ یہاں چلے آئے۔“

ڈرائیور نے شانے اچکائے۔ ”جس نوعیت کا خطرہ بتایا گیا تھا اسی لحاظ سے آئے ہیں۔“

”ان کو روکو۔“ وین نے کہا اور ایک شخص پر لگا تار دو فائر کیے جو ذرا آگے آگیا تھا، وہ گھوم کر گر اور ساکت ہو گیا۔ چوتھا گارڈ زخمی تھا اب انہیں ہی دفاع کرنا تھا۔ دوسری طرف سے مشین گنیں گرج رہی تھیں اور گولیاں اتنی تواتر سے برس رہی تھیں کہ انہیں دفاع کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ وین نے محسوس کیا کہ وہ اسی جگہ پھنسے رہے تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس نے دونوں گارڈز سے کہا۔ ”مجھے کور دو، میں اس گاڑی تک پہنچنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سڑک کے پار کھڑی ایک فاکسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بہت خطرناک ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”میں گز میں گولیوں سے بچنا ناممکن ہوگا۔“

”کوشش کرنی ہوگی ورنہ یہ آگے آگے تو ہمارا بچنا مشکل ہو جائے گا۔“ وین نے کہا۔ ”میں تین تک گنوں گا اور پھر بھاگوں گا تم لوگوں نے انہیں فائرنگ سے روکنا ہے۔“

وہ تیار ہو گئے۔ وین نے ایک دو تین کہا اور اچانک وین کے سامنے سے نکل کر فاکسی کی طرف دوڑا۔ فائرنگ کرنے والوں کی توجہ ذرا تاخیر سے اس کی طرف گئی اور جب انہوں نے اپنی گنوں کا رخ وین کی طرف کیا تو دونوں گارڈز کو موقع مل گیا اور انہوں نے آڑ سے فائرنگ شروع کر دی۔ ایک آدمی اور نشانہ بنا تھا۔ وین جسم و جان کی پوری قوت سے دوڑا تھا اور فاکسی کے پاس آ کر اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی۔ اسی لمحے ایک گولی اس کی دائیں ہڈی کو چھیدتی گزر گئی، وہ سڑک پر گرا اور قلابازی کھا کر فاکسی کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے فاکسی گولیوں سے چھلنی ہونے لگی۔ آن واحد میں اس کے سارے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ لیکن مضبوط پاؤں کی وجہ سے وین محفوظ تھا، اس نے بونٹ سے پشت ٹکا کر زخم کا جائزہ لیا اور اس پر رومال کس کر باندھ لیا۔ گوشت متاثر ہوا تھا لیکن ہڈی بچ گئی تھی۔ دو آدمی کم ہونے سے دشمن بھی محتاط ہو گیا تھا اور اب فائرنگ کی شدت میں کمی آگئی تھی۔

وین نے فاکسی کے دوسری طرف سے جھانک کر دیکھا ایک گاڑی کے عقب میں موجود دو افراد اسے دکھائی دے رہے تھے اس نے نشانہ لیا اور اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک میگزین ختم نہیں ہو گیا۔ اس کا فائدہ ہوا، ایک

گر تھا اور دوسرا افراتفری میں اس جگہ سے ہٹا تو شیلہ کے گارڈز کی چلائی گولی کی زد میں آ گیا۔ شیلہ نے پولیس کو کال کی تھی اور فائرنگ کے شور میں چلا چلا کر بات کر رہی تھی۔ اس نے پولیس کو لوکیشن اور صورت حال بتائی اور ایسویٹس بھی بھیجنے کو کہا تھا۔ زخمی گارڈ اور جیسی بھی نیچے اتر آئے تھے۔ وین میں شیلہ اور میریا زخمی جوزف کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ آنے والے دس منٹ میں دونوں طرف سے شدید فائرنگ ہوئی تھی۔ دشمن تعداد میں زیادہ اور مہلک ہتھیاروں سے مسلح تھا لیکن انہوں نے بھی بھرپور مزاحمت کی اور اسے پاس پھٹکنے نہیں دیا تھا پھر پولیس سائرن کی آواز آنے لگی تو حملہ آور افراتفری میں اپنی گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں سے بھاگ نکلے تھے وہ جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کی لاشیں اور زخمی بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ پولیس آئی تو جائے وقوع پر بس وہی ملے تھے۔

جوزف کو ایمر جنسی میں طبی امداد دی گئی اور پھر اسے اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ باقی سب پولیس کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر گئے تھے جہاں شیلہ نے نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف رپورٹ کرائی۔ ان سب نے بیانات دیے تھے۔ وین اور باقی سب نے بھی اپنے بیانات موجودہ صورت حال تک محدود رکھے تھے اور اس کے پس منظر میں جانے سے گریز کیا تھا۔ وین کی ابتدائی مرہم پٹی وہیں کر دی گئی تھی۔ گارڈ کے شانے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اس لیے اسے بھی اسپتال بھیجا گیا تھا۔ پھر وین، شیلہ اور میریا کے ساتھ اسپتال آیا یہاں انہیں معلوم ہوا کہ جوزف کی خوش قسمتی کہ گولی نے دل یا کسی اہم عضو کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لوہے کی چادر سے گزر کر آنے کی وجہ سے اس کی شدت میں کمی آئی تھی۔ جوزف کا آپریشن کر دیا گیا تھا جس سے اس کی حالت بہتر تھی لیکن فی الحال ڈاکٹر ز اور پولیس اسے کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بینڈج کرا کے وین اور میریا وہاں سے جانے لگے تو شیلہ نے انہیں چھوڑنے کی پیشکش کی۔ وین نے کہا۔

”نہیں شکریہ، ہم ٹیکسی سے چلے جائیں گے۔“

”مجھے امید ہے تم ویکس یا مارک گولڈ کا نام نہیں لو گے۔“ شیلہ نے آہستہ سے کہا۔

”ظاہر ہے۔“ وین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”یہ تمہارے بھائی کے بھیجے آدمی تھے اور انہوں نے تم سمیت ہمیں مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”میں اس معاملے کو دیکھ لوں گی۔“ شیلہ نے کہا اور

اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وین جانتا تھا وہ مجبور تھی اپنے بھائی کی محبت اور خاندان کی عزت کی وجہ سے۔ اگر پولیس ویکس تک نہ پہنچ سکی تو وہ کبھی اس کا نام نہیں لے گی۔ مگر جب وہ میریا کے ساتھ اپنے ایمرٹنٹ پہنچا اور فی وی لگا یا تو صورت حال بدل گئی تھی۔ پولیس نے واردات کے دو گھنٹے کے اندر مین ٹین کے پرانے علاقے میں چھاپہ مار کر وہاں سے چار افراد کو گرفتار کیا تھا جن کے ساتھ دو لاشیں اور دو زخمی تھے۔ واردات میں استعمال ہونے والی دونوں گاڑیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ یہ تمام افراد جرائم پیشہ تھے جن کی خدمات کرائے پر حاصل کی گئی تھیں۔ ابتدائی طور پر انہوں نے پولیس سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”یہ لوگ بچ جائیں گے؟“ میریا نے برہمی سے کہا۔ اس کا اشارہ مارک گولڈ کے کرتا دھرتا افراد کی طرف تھا۔

”میرا خیال ہے وہ پکڑے جائیں گے کم سے کم فرنٹ مین تو پکڑا جائے گا لیکن ممکن ہے ویکس مارک بچ جائے۔“

”اور شیلہ مارک؟“

”وہ ہماری مددگار ہے اور اسی کی وجہ سے آج جوزف یہاں پہنچا ہے۔“

میریا ہنسی بھری کان سے سونا نکالنا چاہتی ہے؟

”مجھے معلوم نہیں لیکن اندازہ ہے کہ وہ بھی ایسا ہی چاہتی ہے مگر وہ یہ کام ماحولیاتی اور حفاظتی اصولوں اور قواعد کے ساتھ کرنا چاہتی ہے۔“

”وہ اپنے بھائی کے خلاف کیسے ہو گئی؟“

”اس کا سہرا جیسی کے سر ہے اسی نے شیلہ سے رابطہ کیا اور اسے جیکب مائن میں ہونے والے ظلم کی تصاویر اور ثبوت پیش کیے۔ شیلہ کو یقین نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس میں ملوث ہو سکتا ہے اس لیے اس نے مجھے ہار کیا تاکہ میں جیکب مائن جا کر حقائق تلاش کروں اور ہو سکے تو جوزف کو یہاں آنے پر آمادہ کروں۔“

”اس حملے نے ثابت کر دیا ہے کہ مارک گولڈ جیکب مائن کے قتل عام میں شریک رہی ہے۔“

”بالکل، اب اس کی عوام اور حکام کو قاتل کرنا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔“ وین نے جوش سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے جوزف کارلوں کا انٹرویو تھمکے مجادے گا۔“

”لیکن اس کی جان کو ابھی بھی خطرہ ہے؟“

”اسپتال میں پولیس پوری طرح اس کی حفاظت کر رہی ہے اور اسے بہتر ہوتے ہی پولیس کی تحویل میں کسی محفوظ



مقام پر منتقل کر دیا جائے گا۔ جو لوگ پکڑے گئے ہیں وہ جلد سازشیوں کی نشان دہی بھی کریں گے۔ ایک بار مارک گولڈ کے کرتا دھرتا قانون کی گرفت میں آگئے تو جوزف کے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔“

میریا خوش ہو رہی تھی۔ ”جوزف کا انٹرویو کب ہوگا؟“

”میرا خیال ہے تین سے چار دن لگ سکتے ہیں۔ ابھی دو دن تو ڈاکٹروں نے جوزف کو کسی سرگرمی سے منع کر دیا ہے۔ انٹرویو کا وقت اس کی حالت دیکھ کر طے کیا جائے گا۔“

وین اپنا زخم بھول کر انٹرویو کی تیاری میں لگ گیا تھا اور اس نے اس سلسلے میں ابتدائی دو پروگراموں کا خاکہ تیار کرنے کے لیے میگی سے رابطہ کر لیا تھا۔ پہلا پروگرام اسی رات نشر ہوا اور یہ اس سال ریڈیو کا سب سے زیادہ سنا جانے والا لائیو شو ثابت ہوا۔ وین نے اپنے سفر، جیکب مائن کے حالات کے بارے میں تفصیل سے بتایا البتہ آج کے حملے کے بارے میں اس نے اعلان کیا کہ اس پر کل کے پروگرام میں بات ہوگی۔ اس پروگرام کے دوران ریڈیو کو سیکڑوں کی تعداد میں فون کالز اور ایس ایم ایس موصول ہوئے تھے۔ اس ایک پروگرام نے ”سچ تو یہ ہے“ کی رینٹنگ کو صف اول میں پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

شیلہ مسلسل ویکس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ اس کے رابطے کے دوسرے نمبر بھی بند تھے اور وہ اپنے پینٹ ہاؤس میں بھی نہیں تھا۔ شیلہ نے نیوجرسی میں واقع اپنے گھر میں کچھ دیر پہلے ہی فی وی پر ریگس اور راجر کی گرفتاری کی خبر دیکھی تھی۔ پولیس نے گرفتار

مزموموں کی نشان دہی پر انہیں گرفتار کیا تھا۔ مزموموں کا کہنا تھا کہ انہیں ان دونوں نے جوزف کارلوس اور شیللا مارک کو قتل کرنے کے لیے ہار کیا تھا۔ شیللا کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اگر اس سب کے پس پشت ویسکس تھا تو وہ کسی صورت اسے قتل نہیں کر سکتا تھا وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ جب سے شیللا نے یہ خبر دیکھی تھی اس کی آنکھیں مسلسل نم تھیں۔ وہ جانتی تھی مارک گولڈ جو ان کی خاندانی فرم تھی اسے اب تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس قدر بھرمانہ اقدامات کے بعد قانون کا حرکت میں آنا اور دوسرے اداروں کا تفتیش کرنا لازمی تھا جس کے بعد مارک گولڈ ایک ایسے اسکینڈل کی زد میں آ جاتی جو اسے ختم کر دیتا۔ جب اس نے وین کو تفتیش کے لیے جیکب مائن جانے پر آمادہ کیا تھا تو اس نے سوچا تک نہیں تھا کہ حالات اس حد تک بھی خراب ہو سکتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ویسکس کو منالے گی کہ وہ جیکب مائن کے معاہدے سے پیچھے ہٹ جائے۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ جوزف کو یہاں خطرہ ہوگا لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی اس نے لپک کرفون اٹھایا، اسکرین پر ویسکس کی مسکراتی تصویر آ رہی تھی۔ اس نے کال ریسپونڈ کی اور کانٹیکٹ آواز میں بولی۔

”ویسکس تم کہاں ہو...؟ میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں... تم ٹھیک ہونا؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ ویسکس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”نی وی پر یہ سب کیا آ رہا ہے، یہ لوگ بکو اس کر رہے ہیں، تم مجھے کیسے قتل کر سکتے ہو؟“

”وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ ویسکس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”یہ راجا اور ریگل کی سازش تھی۔“

”اور باقی سب؟“

شیللا کے اس سوال پر ویسکس کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ”شیللا، آئی ایم ریلی سوری۔“

”تو یہ سچ ہے، تم اور مارک گولڈ جیکب مائن میں ایک ہزار سے زیادہ بے گناہ افراد کے قتل عام میں ملوث ہیں؟“

”ہم نے جنرل مارلو سے رابطہ کیا تھا اور اس نے یقین دلایا تھا کہ کوئی مزاحمت ہوئی تو وہ دیکھ لے گا۔“

”اس نے اسی طرح دیکھا۔“

”شیللا میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن جب تک مجھے معلوم ہوا بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا، مجھے معلوم ہے تم یہ سب برداشت نہیں کر سکو گی اس لیے میں

نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔“

”لیکن مجھے بھگتنا تو پڑے گا کیونکہ میں بھی اس فرم کی ایک حصے دار ہوں۔“ شیللا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”براہر کی حصے دار اور میں اپنی ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتی۔“

”تم فکر مت کرو۔“ ویسکس کا لہجہ مزید دھیمہ ہو گیا۔ ”میں ساری ذمہ داری قبول کر رہا ہوں اور کوئی تم سے کچھ نہیں کہے گا۔ مارک گولڈ کی آئندہ مالک بھی تم ہوگی۔“

”کیا... ویسکس تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”تمہیں ایک موقع ملے گا میرے کہنے کی تلافی کرنے کا اور مجھے یقین ہے کہ تم اس موقع کو گنواؤ گی نہیں۔“

”ویسکس۔“ شیللا چلائی۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا چاہے میں اس دنیا میں رہوں یا نہ رہوں۔“

”پلیز ویسکس تم کیا کہہ رہے ہو۔“ شیللا رونے لگی۔ ”تم کہاں ہو، مجھے تمہارے پاس آنا ہے۔ تم جانتے ہو اس دنیا میں میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔“

”اب میرا ساتھ تمہارے لیے بوجھ اور رسوائی کا باعث ہوگا اور اس بوجھ کو ختم ہو جانا چاہیے۔ خدا حافظ۔“

شیللا چلائی لیکن دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ شیللا نے اس کا نمبر ملایا لیکن نمبر ایک بار پھر بند جا رہا تھا۔ وہ بار بار نمبر ملاتی رہی اور ہر بار اسے یہی جواب ملتا رہا کہ مطلوبہ نمبر بند ہے بعد میں کوشش کریں۔ شیللا نے موبائل ایک طرف پھینک دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ویسکس اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اس کا اب کوئی نہیں رہا تھا، وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وین برائن کے آنے والے تین دن بہت مصروف گزرے تھے اس دوران میں ویسکس مارک کی خودکشی کی خبر آ گئی تھی۔ اس کی لاش مشی گن جمیل کے کنارے مارک خاندان کے تفریحی ولا کے ساتھ تیرتی ہوئی پائی گئی تھی، اس نے خود کو شوٹ کر لیا تھا اور جیٹی پر ملنے والے پستول پر اس کی انگلیوں کے نشانات تھے اور اس کے ہاتھ پر بارود کے ذرات تھے۔ خودکشی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ مرنے سے پہلے ویسکس نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا تھا جس میں اس نے مارک گولڈ کی طرف سے کیے جانے والے تمام غیر قانونی کاموں کی مکمل ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ اس نے نشان دہی کی کہ اس کے لپ ٹاپ میں ایسی معلومات ہیں جن سے پولیس بھی اسی نتیجے پر پہنچے گی۔ اس نے شیللا کو تمام معاملات سے

بری الذمہ قرار دیا تھا۔ البتہ ریگل اور راجا نے شیللا پر برابر کی ذمہ داری ہونے کا الزام لگایا تھا مگر وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکے تھے کہ اس صورت میں شیللا کو قتل کرانے کی کوشش کیوں کی گئی۔ وین نے شیللا کے گھر جا کر اس سے ویسکس کی تعزیت کی تھی۔

آج جوزف کارلوس کا انٹرویو تھا، ڈاکٹروں نے اسے ایک دن پہلے اسپتال سے فارغ کیا تھا۔ اس کا زخم بھر گیا تھا اور آج کے انٹرویو سے پہلے ہی تقریباً سارا امریکا اسے جان گیا تھا۔ جب وہ اسپتال سے باہر نکلا تو اس کے ڈھیروں مداح پھولوں کے گلدستے اور شہنشاہی کارڈز لے کر موجود تھے۔ وین کے ریڈیو اسٹیشن پر بے شمار میڈیا رپورٹرز اور کیمرامن موجود تھے لیکن جوزف نے فی الحال کسی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا۔ ”یہ وین برائن کا حق ہے میں اسے انٹرویو دے لوں اس کے بعد بھی آپ مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں گا۔“

اس رات ”سچ تو یہ ہے“ کا اسٹیشن لائیو شو پورے ڈھاکہ کی گھنٹے تک چلا اور لاکھوں امریکیوں نے اسے براہ راست سنا تھا۔ جوزف نے بہت تفصیل سے سونے کی کان کنی کے بارے میں اپنا اور اپنے لوگوں کا نقطہ نظر بیان کیا۔ اس نے جیکب مائن میں انسانوں پر ٹوٹنے والی قیامت کا بتایا کہ کیسے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کیا گیا تاکہ سونے کی کان کنی میں ہونے والی رکاوٹ کو دور کیا جاسکے۔ جنرل مارلو کے آدمی درندے بن گئے تھے مگر جیکب مائن کے باسیوں نے ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اور وہ اب بھی ڈٹے ہوئے تھے۔ جیکب مائن سے آنے والی آخری اطلاعات کے مطابق جنرل مارلو کے آدمی پسپا ہو رہے تھے۔ پروگرام کے آخر میں جوزف نے امریکی عوام سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”جیسے آپ اپنے ملک میں اپنے اور اپنے ماحول کے لیے فکر مند ہوتے ہیں اسی طرح جیکب مائن کے باسی بھی اپنے ماحول کی حفاظت کا حق رکھتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے امریکی عوام ہمارے اس حق کی حمایت کرے گی۔“

☆☆☆

ایک مہینے بعد جوزف کارلوس واپس جا رہا تھا۔ نیویارک کے جے ایف کیڈی انرپورٹ پروین، میرا اور شیللا اسے سی آف کرنے آئے تھے۔ جوزف نے سب کا گرم جوش سے شکریہ ادا کیا۔ ”میں یہاں سے بہت سی محبتیں اور اُمیدیں لے کر جا رہا ہوں۔“

وین نے کہا۔ ”مجھے بھی اُمید ہے تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔“

شیللا نے اسے ایک بریف کیس تھمایا۔ ”اس میں تمہارے لیے کچھ تھے اور ایک معاہدے کا مسودہ ہے۔ یہ معاہدہ جیکب مائن میں سونے کی کان کنی کے بارے میں ہے۔ اسے اپنے لوگوں کو دکھانا اور ان سے مشورہ کر کے اس کا جواب دینا۔ میں ابھی صرف اتنا بتا رہی ہوں کہ اگر مارک گولڈ نے وہاں کان کنی کی تو کل نفع کا صرف دس فیصد حاصل کرے گی اور نوے فیصد جیکب مائن کی عوام اور وہاں کی حکومت کا حق ہوگا۔“

جوزف کے لیے یہ ایک حیرت انگیز پیشکش تھی کیونکہ عام طور سے سونے کی کان کنی کرنے والی کمپنیاں نوے فیصد تک نفع خود رکھتی ہیں اور صرف دس فیصد حکومتوں کو دیتی ہیں۔ اس نے کہا۔ ”مجھے اُمید ہے کہ اس صورت میں جیکب مائن کی عوام اور حکومت مان جائے گی لیکن وہاں کے ماحول...“

”میں یقین دلاتی ہوں اس کا قوانین سے زیادہ خیال رکھا جائے گا۔ اس معاہدے کو بزنس کے بجائے فلاحی نقطہ نظر سے کیا جائے گا۔ کمپنی اپنے نفع سے ایک حصہ جیکب مائن میں لوگوں پر خرچ کرے گی۔ یہی نہیں مارک گولڈ پہلے کان کنی سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی کوشش بھی کرے گی۔“

”اس صورت میں مجھے اُمید ہے میرے لوگ مان جائیں گے۔“ جوزف بولا۔ ”لیکن معاہدہ تمہیں حکومت سے کرنا ہوگا۔“

”نہیں، معاہدہ اس صورت میں ہوگا جب جیکب مائن کے لوگ بھی اس میں شامل ہوں گے اور انہیں اس کا براہ راست فائدہ ہوگا۔“

طیارے کی روانگی قریب تھی، جوزف نے ان سب سے ہاتھ ملایا اور ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔ دو دن پہلے اس نے اور شیللا نے بہت سارے دوسروں کو لوگوں کے ساتھ وین اور میریا کی شادی میں شرکت کی تھی۔ شیللا نے میریا کو پیشکش کی تھی کہ اگر مارک گولڈ کو جیکب مائن میں کان کنی کے حقوق ملتے ہیں تو وہ جیکب مائن کے بارے میں اس کی مشیر کے طور پر کام کرے گی۔ شیللا خوشی سے مان گئی تھی لیکن ابھی تو وہ وین کے ساتھ اپنی نئی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو ایک ساتھ جاتے دیکھ کر شیللا نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔ سب کو کچھ نہ کچھ ملا تھا یا ملنے والا تھا لیکن وہ اکیلی رہ گئی تھی، اس کے پاس جو کچھ تھا وہ بھی چھین گیا تھا۔ وہ تھکے قدموں سے وہاں سے چل پڑی۔

⊙

کشکول

انوار صدیقی

اسرار اور تحیر کے پردے
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو پر تپنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبیہی بھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑالے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلازی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ ساز یوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

***** گزشتہ اقساط کا خلاصہ *****

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گروگھوٹی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیر سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی ایک کبھی بھگتے نہیں دی تھی۔ اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے دی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے دی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعا میں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی ہنگی ہستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ قام دراز قد شخص پر تاب بھونک کر برہنہ حالت میں کوئی پر اسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیو ملا جس میں مٹی کے گندے عمل والی جان لیوا سونیاں بیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیو سے سونیاں نکال کر چھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشالینے جاتا ہے تو پیچھے ایک ٹائید شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ ٹائید شخص کے اسرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھو لدا ری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ ٹائید خود چھو لدا ری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں مجھتی ہے۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چمکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں ٹائید لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چمکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر ٹائید نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چمکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہیں۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دو چار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر انڈ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیو ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بے نظار سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغن اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روٹی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی

ہے اور اسی دوران پلید پر تاب بھون اپنے عمل کے ذریعے بچان مہم کو فرمین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی فیملی طاقت اسے بھانپ لیتی ہے جبکہ فریاد کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے باہن رشتے کی آمادگی پر متعین ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی یادداشت میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنگا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سر پرست احمد اعلیٰ کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی طاقت زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف دشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک کویتہ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرِ پیکار گروپ میں ماسٹر ماسٹرز کا کردار اورنگزیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوائسٹیو اور شیخ حامد کے خلاف گھیرائنگ سے تنگ رہتا تھا۔ شبنم اور اسلم ڈنگا کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے انٹیلی کا پٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا۔ البتہ لاش منسل کی۔ دوسری جانب دشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگزیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آہ پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگزیب ہتھوڑ بھانسنے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مرچکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگزیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آنکلوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں، میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بعد تھا لیکن اسے چند دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی واراتیں ایسی ہوئیں جن میں آنکلوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معمائی ہوئی تھی جبکہ اورنگزیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی لاش کو باوجود سخت پیرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اور ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی مٹنگ کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج اورنگزیب کے علاوہ سینئر عہدوں کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مٹنگ کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آنکلوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ چھوڑ دیا۔ جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے فنڈوں نے تباہ کر دیا۔ دشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگزیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پر تاب بھون سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے گلے نے اس کی رجحانی اور حفاظت کی اور پر تاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زعمہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر قبضہ لگا لیا تھا۔ فرمین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرمین تھوڑی دُشمنی ہوئی اسے اسپتال داخل کر دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ دشنوا انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکرٹری تھریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگزیب اور سراج ایک نئے کردار اسکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شیلہ ورما کے بیوی پارلر میں جاتی رہتی ہے اور شیلہ ورما اور جونی ٹو جو ان لڑکیوں کی اسٹنگنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوئی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا متعلق منظور نہیں ہو رہا تھا اسے ”کوبرا“ کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگزیب کا تباہ کرے بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحومہ بیوی کو خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہذا وہ جو پہلے اورنگزیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلچکا تھا اس کا تباہ منظور کر لیا اورنگزیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان کوئی قائم ہوئی۔ دشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگزیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے اسکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگزیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ پرتانی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری انجینئری نے مفید معلومات حاصل کیں۔ اسکندر علی شاہ کو ”شکرہ“ کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد مختار بننے کا مشورہ دیا گیا۔ اسکندر کے ذریعے پر ایک لڑکی مار دی گئی تھی۔ جسے رات کی تاریکی میں جنونی عمل سے گزارا گیا۔ اورنگزیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آنکلوپس کی خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگزیب جتنا سے پوچھ کچھ کرتا ہے کرنل احتشام دشنو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور اسکندر علی شاہ کو شکرہ کے نام سے بیکر ملنگ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہے۔ اسکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کرتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شیلہ ورما کے بیوی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ یہ لوچن اور جگا کی کارروائی تھی۔ لیاقت حسین کے حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے بعد گرفتاری دینے کے بعد اسے بری کرنے والے مجسٹریٹ کی پراسرار موت واقع ہوئی ہے۔ دارا کی بیوی روشنا کو اغوا کر کے بے عزت کیا جاتا ہے اور سابق چیف پولیس عظیم احمد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اورنگزیب ماروی سے پوچھ کچھ کرتا ہے۔ دوسری جانب دشنو ملٹری کسٹڈی میں تفتیش کے دوران مارا جاتا ہے۔ دشنو کی لاش کو ایک ہندو سماجی تنظیم کے ذریعے جلا دیا جاتا ہے۔ لوچن اور جگا اسکندر علی شاہ کی بیوی نگینہ کو پھانسنے کے قابل اعتراض حالت میں واپس کرتے ہیں یہ اسکندر کے لیے دھمکی ہے۔ دوسری جانب اسکندر بگ باس سے حاصل شدہ اطلاعات کی روشنی میں اورنگزیب کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسکندر کی دست راست دلربا کے ٹھکانے پر ایک اجنبی اس کی چند موثر تصاویر اتار کر غائب ہو جاتا ہے۔

موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روہی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوبا، لوچن اور سیاہ قلم ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اشارے کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روہی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر سرورق کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم روہی کو اغوا کر کے اس کی ضرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحمن کو بھی اغوا کر تا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالتور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی طلیم احمد کے رہائزہ ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کانٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بہ ظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی طلیم احمد کے علم میں لے آتا حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور قرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی دشمن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا نیگیسم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آ چکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری پارلنوں کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موہا بل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے جو مشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا نیگیسم کی خودکشی کی نقیشت شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا نیگیسم کی اہم قابل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوادیتا ہے۔ سینئر عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری گوشہ خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنالیتا ہے۔ اسی گوشہ کی اینگنی میں لیاقت حسین اور فرحمن بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کر لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پر تاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیپو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روہی سیون اشارے کے پاس ورڈ سے سیاہ قلم ہاشم اور جہا نکیر بٹ عرف چکا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکرٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک پینگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جنگلے ملتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھا نہ میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پاکر اوچی کو معطل کرادیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روہی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی ”بلیک ٹائیگر“ کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ قلم ہاشم کو سیون اشارے کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دمکلی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر حافظ کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلایو کی خودکشی کی نقیشت کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے من میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مودی کیمبرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحمن کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب چکا اور اپنے سر پرست ادا علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے مگر ادا علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی گوشہ پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت ستا تا ہے اور نگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سعی میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا نگ کرتی ہے، شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دین پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کا ردوائی کوڈ سکٹی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحمن نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدھڑکی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرادیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر فوج جانے والے دشمنی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد سرکردہایت دیں حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر نو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلام ڈکاک کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈومانے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈومانار گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی طلبوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دمکلی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو قتل کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سپریم کورٹ میں پیش کیا گیا۔ اسے آفسر اکسر اور دیگر ناگزیر افراد کے ساتھ پیش کیا گیا۔

دکان پر ہونے والی توڑ پھوڑ اور حملہ آوروں کی جسارت نے جگا کے ذہن میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کبھی وہ ایک، دس پر بھاری تھا لیکن حلال رزق کمانے اور سیدھا راستہ اختیار کرنے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی تھی۔

وہ اورنگ زیب کے برابر والی نشست پر بیٹھا دل ہی دل میں حملہ آوروں کے بارے میں سوچ و تاب کھا رہا تھا، وہ اسے ڈکیتی کی عام واردات نہیں سمجھ رہا تھا۔ جو بھی تھے کسی خاص منصوبے کے تحت آئے تھے۔ فوج اور ملازم کو قابو کر لینے کے بعد وہ جگا تک بھی ضرور پہنچے پھر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندر آنے والے اگر جگا کا شکار بھی ہو جاتے تو باہر جو نفری موجود تھی وہ بھی ان کی جگہ لینے سے دریغ نہ کرتی۔ ہسپتال کی گولیاں ختم ہو جاتیں تو شاید جگا کو دوبارہ اسے بھرنے کا موقع بھی نہ ملتا لیکن لوچن نے بروقت پشت سے آکر کھیل کی بساط پلٹ دی تھی۔ اگر لوچن نہ آ جاتا تو جگا کے ہاتھ پھر خون آلود ہو جاتے۔ قانون کے رکھوالے پھر گڑے مردے اکھاڑنے پر آمادہ ہو جاتے۔ اس کی پرانی فائل بھی سرد خانے سے نکل کر سامنے آ جاتی۔ ماضی کی طرح ایک بار پھر وہ حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا جاتا۔ بنی بنائی کاروباری ساکھ بھی تباہ ہو جاتی۔

جگا کے ذہن میں یہی خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے جب اورنگ زیب کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”کیا سوچ رہے ہو.....؟“

جگا نے چونک کر اورنگ زیب کی سمت دیکھا۔ کسمسا کر بولا۔

”سر..... آج دوسری بار کسی نے اچانک میری شرافت کو داغ لگانے کی کوشش کی ہے اور آج..... آج بھی آپ کے درمیان میں آ جانے سے کھیل ادھورارہ گیا ورنہ.....“

”تمہارا شبہ کن لوگوں پر ہے.....؟“ اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر سوال کیا۔

”کوئی پرانا دشمن ہی ہو سکتا ہے۔“ جگا نے ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔

”لوچن کیا اچانک درمیان میں آ گیا تھا؟“

جگا اس سوال پر چونکے بغیر نہ رہ سکا پھر اس کے ذہن میں نگینہ کو ریڈیو کلب سے اغوا کرنے اور اس کا گفٹ پیک بنا کر سکندر علی شاہ کو روانہ کرنے کی کہانی گونجنے لگی۔ لوچن نے بھی اسی شبہ کے پیش نظر نگینہ کے ذریعہ سکندر علی شاہ کو چھیڑنے

کی کوشش کی تھی کہ اسے بھی شیخ حامد سے کچھ پرانے حساب بے باق کرنے تھے۔ لوچن کا خیال تھا کہ شیخ حامد تک پہنچنے کے لیے سکندر علی شاہ بھی ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو گئے؟“ اورنگ زیب نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”تمہاری دکان پر حملہ کسی سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ..... کہا جاسکتا ہے لیکن لوچن کی اسی وقت آمد کو کیا کہا جائے گا؟“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں صاحب لیکن ایک بات میں بھی دریافت کرنا چاہوں گا۔“ جگا نے بات جاری رکھی۔ ”کیا سکندر علی شاہ کے ڈائریجے بھی آپ کے آکٹوپس سے ملتے ہیں؟“

اس بار اورنگ زیب کے چونکنے کی باری تھی۔ اس نے جگا کو غور سے گھورتے ہوئے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ ”تمہارے دماغ میں یہ سوال کیوں ابھرا؟“ جواب میں جگا نے نگینہ کے اغوا اور اس کے گفٹ پیک کی کہانی تفصیل سے بیان کی تو اورنگ زیب کے تجسس میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ذہن میں پہلا نام سراج کا ابھرا..... اس نے بھی سکندر علی شاہ کے فارم ہاؤس کے علاوہ خود سکندر علی شاہ پر بھی اسی شبہ کے امکانات کی بات کی تھی، لوچن بھی اسی لائن پر قدم اٹھا رہا تھا اور..... سکندر علی شاہ نے بھی پہلی ملاقات میں اورنگ زیب کی ایک گم گشتہ کہانی کو دہرا کر اسے چونکا دیا تھا؟

”کیا یہ سب محض اتفاق تھا.....؟“

”ملاقات کے دوران سکندر علی شاہ نے منہ بنا کر کس کی کال ریسیو کی تھی؟ پھر دوسری جانب سے جو آواز ابھری اسے سن کر وہ ایک پل میں موم کیوں ہو گیا تھا؟“

”فون کرنے والا کون تھا؟“

”اور..... اس فون کے آنے کے بعد ہی سکندر علی شاہ نے پرانے زخموں کو کرید کر اورنگ زیب کو فارم ہاؤس میں نفسیاتی علاج کا مشورہ کیوں دیا تھا.....؟“

اورنگ زیب کے ذہن میں مختلف سوالات ابھر کر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ جگا نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔ کچھ دیر بعد اورنگ زیب نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔ جگا سے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”آئندہ سے جلد بازی میں میک اپ کرنے کی غلطی نہ

کرنا۔ نگینہ کی نگرانی پر کچھ اور لوگ بھی ضرور تعینات ہوں گے جنہوں نے لوچن کو نہیں لیکن تمہیں ضرور شناخت کر لیا تھا۔“

”پھر؟ کیا میں وقتی طور پر کاروبار بند کر دوں؟“ جگا کو پھریری آ گئی۔ ”صرف آپ کا خیال ہے صاحب ورنہ.....“

”کھاری سوڈے کی بوتل کی طرح ایک دم ابل پڑنے کی عادت ترک کر دو.....“ اورنگ زیب نے سرزنش کی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ محتاط رہو، دکان کی نگرانی اب میرا ذمہ ہے۔“

”آپ کا ملازم ہوں صاحب..... جیسا حکم دیں گے ویسا ہی کروں گا۔“ جگا خاموشی سے اتر گیا تو اورنگ زیب کی گاڑی دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ جگا کے بیان کی روشنی اور سکندر علی شاہ سے پہلی ملاقات کے سلسلے میں بے شمار سوالات ابھرتے رہے۔ خاصی دیر تک وہ ڈور کا آخری سرا تلاش کرتا رہا پھر اس نے موبائل نکال کر میڈم رونی کے نمبر ملائے۔ دوسری جانب سے خود میڈم نے کال ریسیو کی تھی۔

”اورنگ زیب بول رہا ہوں۔“

”زبے نصیب.....“ میڈم نے خوش گو اور انداز میں کہا۔ ”اس وقت کیسے یاد آ گئی؟“

”ایک درخواست کرنی تھی.....“ اورنگ زیب نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ”کوئی ایسا قدم جو قانونی نکتہ نگاہ سے اہم ہو۔ اس کے بارے میں دوستوں سے مشورہ کر لینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔“

”آپ کا اشارہ کس سمت ہے.....؟“

”لوچن اور نگینہ.....“

”اوہ.....“ میڈم نے بات سمجھ کر کہا۔ ”اگر بات قانونی اعتبار سے الجھتی ہے تو معذرت چاہوں گی لیکن جو شخص مر کر زندہ ہو گیا ہے اس نے ماضی کے کچھ زخم بھی تازہ کر دیے ہیں۔ میرے مرحوم شوہر نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ رونی مجھ سے وعدہ کرو..... تم ان زخموں کا حساب گن گن کر چمکا کرنا جو میرے جسم اور میری روح کو پہنچائے گئے ہیں۔ مجھے دفن کرنے کے بعد میری اس آخری خواہش کی فراموشی نہ کرونا.....“ میڈم کی آواز رندھنے لگی۔ ”میں نے اس خواہش کے احترام میں پوسٹ مارٹم کرائے بغیر ہی اپنی زندگی کی تمام خوشیوں کو بھی خاموشی سے دفن دیا تھا..... اور..... آج بھی مرنے والے کا آخری مطالبہ میرے کانوں میں سوتے جاگتے، صدائے بازگشت بن کر گونجتا رہتا ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ اورنگ زیب نے میڈم کی

کشکول

سکیوں کی آواز سن کر وضاحت کی۔ ”آکٹوپس کو کیفر کروار تک پہنچانا میری زندگی کا بھی ایک اہم فریضہ ہے۔ میں بھی اسے نظر انداز نہیں کروں گا لیکن میں نے صرف اتنا عرض کیا ہے کہ ایسا قدم اٹھانے سے پیشتر دوستوں سے.....“

”اس کے لیے میں معذرت کر چکی ہوں۔“ میڈم نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آئندہ خیال رکھوں گی۔“

”آپ کے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔“ اورنگ زیب نے میڈم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے خیال سے کہا۔ ”لوچن نے نگینہ کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے۔ اس کے بعد آکٹوپس کے ملنے کے کچھ امکانات روشن ہوتے نظر آ رہے ہیں۔“

”پھر..... ایک درخواست میں بھی کروں گی، اگر وقت اور موقع اجازت دے تو مجھے بھی مرحوم کی خواہش پوری کرنے کا کچھ وقت ضرور دیجیے گا۔“

”حالات اگر میرے اختیار میں ہوئے تو آپ کو مایوس بھی نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا پھر چند کمری جملوں کے تبادلے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد وہ سراج کی رہائش گاہ پر پہنچا تو الماس اور سراج دونوں شام کے ناشتے پر اس کے منتظر تھے، سراج خلاف توقع کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اورنگ زیب نے صورت حال معلوم کرنے کی خاطر الماس سے مسکرا کر پوچھا۔

”خیریت تو ہے..... اس وقت موسم کچھ بدلا بدلا نظر آ رہا ہے؟“

”درجہ حرارت عام سطح سے کچھ زیادہ ہی ہے۔“

الماس نے دبی زبان میں کہا پھر سراج کو محبت سے دیکھتے ہوئے چائے پینے چلی گئی۔

”کوئی خاص بات؟“

”آج کل آپ بڑے بڑے فیصلے بھی تنہا کرنے لگے ہیں۔“ سراج نے شکوہ کیا۔ ”میں ماتحت ہوں اس لیے.....“

”حقائق نہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات لیکن وہاں جانے کا خیال بس اچانک ہی ذہن میں آ گیا تھا۔“

”آپ کو دیکھ کر اسے حیرت تو ہوئی ہوگی؟“

”میں اس سے وقت لے کر گیا تھا۔ ملاقات بڑے دوستانہ ماحول میں ہوئی..... اور میرا خیال ہے کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوا۔“ اورنگ زیب نے جگا کی دکان پر حملے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا، نگینہ کے اغوا والی کہانی بھی دہرا دی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ سکندر علی شاہ آپ کو اپنی حویلی میں

دیکھ کر خوش ہوا ہوگا۔“ سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ آپ کی ملاقات کو بھی گنہگار کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھ رہا ہوگا۔“

”میں تمہارے خیال کی تردید نہیں کروں گا لیکن مجھے بھی جگہ سے گنہگار والی بات بعد میں معلوم ہوئی ہے۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ”تمہارے لیے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی ہے میرے پاس۔“ سکندر علی شاہ نے مجھے فارم ہاؤس آنے کی باقاعدہ دعوت بھی دی ہے۔“

”وہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ہوگا آپ کے علم میں؟“

”دعوت بھی مع لوازمات کے دی گئی ہے اور میں نے قبول بھی کر لی لیکن سوچنے کے لیے کچھ وقت بھی لے لیا ہے۔“

”کوئی خاص مصلحت؟“

جواب میں اورنگ زیب نے پوری تفصیل بتائی تو سراج بھی سنجیدہ ہو گیا۔ الماس چائے لے کر آگئی تھی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ چائے پینے کے بعد سراج اور اورنگ زیب لاؤنج میں آگئے۔ الماس گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔

”آپ نے اپنی ذہنی کیفیت کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی اس رنگے سیار کو؟“ سراج نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے بات بنائی۔ ”کام کی مصروفیات اور کچھ ذاتی پریشانیاں۔“

”جوفون درمیان میں آیا۔۔۔۔۔ وہ کس کا ہو سکتا ہے؟“

”یہی بات میرے ذہن میں بھی چھ رہی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے رنگے سیار نے اس فون کے آنے کے بعد ہی مجھے فارم ہاؤس کا انویٹیشن دیا تھا۔“

”گو یا میرا اندازہ درست بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جگہ آپ کے آکٹوپس کے لیے بھی بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ کم از کم سکندر علی شاہ براہ راست سچ حامد سے واقف نہیں ہوگا۔“

اورنگ زیب نے موضوع بدل کر پوچھا۔ ”افضل خان کے فلیٹ پر ہونے والے حملے کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“

”فائرنگ ورائٹی سپراسٹورز کے چھت سے کی گئی تھی۔ بلڈنگ کے چوکیدار کا بیان ہے کہ کوئی مکینک کسی سگنل ٹاور کو ٹھیک کرنے کا کہہ کر چھت پر گیا تھا، ملیشیا کے لباس میں ہونے کی وجہ سے وہ کسی ادارے کا ورکر ہی نظر آ رہا تھا۔ چھت سے رائفل میں استعمال کی جانے والی گولیوں کے تین خون بھی مل گئے ہیں۔“

”کون تھا وہ؟“ اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”ابھی ہمارے محکمے کے پاس الہ دین کا کوئی ایسا جادوئی چراغ نہیں ہے جسے گھستے ہی۔۔۔۔۔“

”میرے پاس اس کے علاوہ طلسماتی انگلی بھی مائی ڈیز۔۔۔۔۔“ اورنگ نے بے تکلفی سے کہا۔ ”جس نے گرا چلائی وہ بھی مر کر دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”میرا اشارہ دشمن کی طرف ہے جو چتا کی آگ میں لوگوں کے خیال کے مطابق جل کر راکھ ہو چکا ہے۔“

”آپ۔۔۔۔۔“ سراج نے پلکیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”کیا آپ مجھ سے۔۔۔۔۔“

”مذاق نہیں۔۔۔۔۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“ اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ”شمشان گھاٹ جاتے وقت جس گاڑی میں دشمن کی ارٹھی رکھی تھی اس میں راستے کی پولیس چوکی سے میرا ایک آدمی بھی سوار ہو گیا تھا۔ چتا کی آگ بھڑکنے سے پہلے اس نے قریبی جھاڑیوں میں جا کر فائرنگ کیا تھا۔ لوگوں کی توجہ ادھر گئی تو دشمن کا مردہ چھلانگ لگا کر اندھیرے میں فرار ہو گیا تھا۔“

”بات ابھی واضح نہیں ہوئی۔۔۔۔۔ اگر آپ کا سارا لباس والا فائر نہ کرتا تو۔۔۔۔۔؟“

”دوسری شکل میں بھی دشمن آگ میں جلنا پسند نہ کرتا۔۔۔۔۔ میں نے یہ محض ایک شبے کی تصدیق کی بنا پر ایسا کہا تھا جس کا فائدہ دشمن جیسے عیار مجرم کو مل گیا۔۔۔۔۔ جس وقت کرل احتشام نے اس کے مرنے کی اطلاع دی تھی اس وقت میرے ذہن میں جس دم کا خیال ابھرا تھا۔۔۔۔۔ یہ ہندو جو گیوں کا ایک عمل ہے جس میں وہ سانس روکنے کی مشق کرتے ہیں اور پھر کافی عرصے تک سانس لیے بغیر زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔ دشمن بھی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک ہے۔ بہر حال، شمشان گھاٹ سے فرار ہونے کے بعد سے میرا ایک آدمی برابر سایے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ ورائٹی سپراسٹور کے باہر بھی موجود تھا۔ اس کے بعد دشمن وہاں کے نکل کر کہاں گیا اور اس وقت کہاں ہے یہ بھی میرے علم میں ہے۔“

”فائن۔۔۔۔۔“ سراج نے قدرے طنزیہ انداز اختیار کیا۔ ”اگر اس بد ذات کی چلائی ہوئی گولیاں افضل خان اور شبنم کو چاٹ جائیں تو پولیس کے علاوہ ملٹری انٹیلی جنس والے بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تم سے ایگری (Agree) کرتا ہوں مگر ہم پولیس والوں کو بھی علم غیب نہیں آتا۔۔۔۔۔ سناں زینوں پر دشمن کا تعاقب میرے آدمی کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اب۔۔۔۔۔ اب میں نے ایک آخری فیصلہ کر لیا ہے۔“

”وہ کیا۔۔۔۔۔؟“

کشکوں

”جس کی زندگی بچ گئی وہی دشمن کے حق میں ملک الموت بھی ثابت ہوگا۔“ اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے سمجھ بھج میں جواب دیا۔ ”جگا نے گنہگار کے سلسلے میں جو تفصیلات بتائی ہیں اب اس کی کچھ گہری بھی کھلتی جا رہی ہیں۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ دشمن آکٹوپس کے لیے کتنا اہم ہے۔ شمشان گھاٹ پر اگر میں اپنے شبے کی تصدیق کا تجربہ نہ کرتا تو آکٹوپس کے زرخیز شکاری کتے اسے فرار کا موقع فراہم کر دیتے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں لیکن کیا اب آکٹوپس کے آدمی بھی آپ کے سادہ لباس والے کا تعاقب نہ کر رہے ہوں گے؟“

”یقیناً کر رہے ہوں گے۔۔۔۔۔ میں نے اسے بھی تمہارے اس خدشے سے آگاہ کر دیا ہے۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے پہلو بدل کر کہا۔ ”موجودہ صورت حال کی روشنی میں شاید میں بھی منظر عام سے غائب ہو جاؤں۔“

”یہ۔۔۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ سراج نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”میری زندگی میں آپ کو کوئی۔۔۔۔۔“

”جلد بازی میں نتائج اخذ کرنے سے پرہیز کرنے کی عادت ڈالو۔۔۔۔۔ میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تم صرف ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہو۔۔۔۔۔“ اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”قانون شکنوں کو کٹھنرے تک پہنچانے کی خاطر اکثر حالات کے پیش نظر کچھ غیر قانونی اقدام بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔“

سراج کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب کرل احتشام کی کال آگئی اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

تین روز سے سکندر علی شاہ صرف حویلی میں اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ان تین دنوں میں اس نے کسی سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پہلی بیوی کے پاس جاتے ہوئے اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ جسے اس نے ایک عرصے سے نظر انداز کر رکھا ہے وہ اس کے بارے میں کیا خیال کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس معصوم مشرقی عورت نے کل سکندر علی شاہ سے کسی بات کا شکوہ کیا تھا نہ اس نے دوبارہ آنے پر کسی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ ایک گھریلو عورت کی طرح شوہر کی پذیرائی میں تن من دھن سے لگ گئی تھی۔ پہلی رات سکندر علی شاہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ اس کے احساسات کا خیال تھا اور کچھ گنہگار کا خیال تھا جس نے اسے حالات کے لیے دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اسے خود بھی کسی سمت کا یقین نہ تھا۔

ایک طرف اس کا ذاتی فیصلہ تھا، گنہگار کے گند کو ہمیشہ کے لیے خاموشی سے کہیں ایسی جگہ دفن کر دے جہاں سے دنیا کا کوئی فرد بھی اس کا کوئی سراغ حاصل نہ کر سکے۔ یہی ایک طریقہ تھا جس کو اختیار کر کے وہ گنہگار کو اغوا کرنے والوں کی بلیک میلنگ سے بچ کر بھی اپنی بیوی مریدی کے ڈھونگ کو برقرار رکھ سکتا تھا لیکن اس کا نامعلوم محسن اس کے فیصلے میں حائل ہو گیا۔ وہ سامنے ہوتا تو شاید سکندر علی شاہ اس سے بھی دودھ پاتا تھا کرنے سے گریز نہ کرتا لیکن وہ نہ صرف اندھیرے میں تھا بلکہ سابقہ مہربانیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی باور کر چکا تھا کہ وہ طاقت میں بھی سکندر علی شاہ سے زیادہ زور آور ہے۔

دوسری طرف سکندر علی شاہ نے اپنے محسن کی بات مان کر جو خطرہ مول لیا تھا وہ اس کے ذہن میں ایک پچھلی سی مچا رہا تھا۔ گنہگار سے شادی کے بعد اس نے دلربا کے علاوہ گنہگار کو بھی اپنے لیے دلچسپی کا سامان تلاش کرنے کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی، خود گنہگار بھی جانتی تھی کہ سکندر علی کی نظروں سے گرنے کے بعد اس کی تمام حیثیت پانی کے بلبلے کی طرح جھاگ بن کر رہ جاتی لیکن حالات نے اسے بھی شکار کر کے بے بس کر دیا تھا۔

سکندر علی شاہ اس وقت پہلی بیوی کے کمرے میں دیوان پر لیٹا حالات کی کشمکش سے دوچار تھا۔ اس کی پہلی بیوی جسے وہ بھی پیار سے گل کہہ کر مخاطب کرتا تھا اس کے دیوان کے قریب بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھی۔ خاصی دیر تک وہ شوہر کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا سراغ لگاتی رہی پھر دبی زبان میں بولی۔

”آپ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ سکندر علی شاہ نے اسے جھکی نظروں سے گھورا۔

”کوئی الجھن ہے جو آپ کے چہرے سے جھلک رہی ہے۔“ گل نے دل پر جبر کر کے بڑی حسرت سے کہا۔ ”بھی میں نے بھی آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آج بھی احساس ہے کہ آپ ہنسنے بولنے کے عادی ہیں۔ پہلے بھی اگر کبھی خاموش ہوتے تھے تو آپ سے یہی سوال کرتی تھی۔ اس وقت آپ اپنے دل کا حال کھل کر بتا دیتے تھے، ہم مل کر اس کا حل تلاش کر لیتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ میں آج بھی آپ کے کسی کام آسکوں۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہوگی۔“

سکندر علی شاہ کی تجربہ کار نظروں نے گل کے سراپا پر نظر ڈالی۔ اس میں تازہ گلاب اور ٹہنی پر کھلے پھول کی مہک نہیں تھی لیکن اس کی اصلیت اور تازگی میں کہیں کوئی کھوٹ

نہیں تھا۔ ایک ہی چمت کے نیچے دور ہو جانے کے باوجود اس نے کبھی کوئی شکوہ..... کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ جب بھی بھولے بیٹھے کبھی شوہر کا سامنا ہوتا تو وہ اس کے احترام میں دوپٹا سر پر ڈال لیتی۔ سب کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود اس نے بھی بیزاری کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

”تم کس دھات کی بنی ہوئی عورت ہو؟“ سکندر علی شاہ نے نرم لہجے میں سوال کیا۔

”میں آپ کے سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکی۔“ گل نے معصومیت سے جواب دیا۔

”تم..... تم میرے شب و روز کے مشاغل سے واقف ہو، پھر بھی تمہیں میری پریشانی کا احساس ہو رہا ہے۔“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟.....“ گل کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

سکندر علی شاہ کے دل کا پتھر پکھلنے لگا۔ گل کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”گمینہ کے بارے میں تم کیا کہو گی؟.....“

”وہ..... وہ شرعی اعتبار سے آپ کی دوسری بیوی ہے۔“

”اور دوسری لڑکیاں جو آتی جاتی رہتی ہیں؟.....“

”وہ سب کھلونا ہیں.....“ گل نے نظریں جھکا کر کہا۔

”بچے بھی یہی کرتے ہیں..... ایک کھلونے کے بعد دوسرا بازار سے خرید لاتے ہیں جن کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔“

”تم اپنی حیثیت کے بارے میں کیا کہو گی؟“

”مجھے آپ کی منکوحہ بیوی ہونے پر فخر ہے۔ کل بھی تھا..... آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔“ گل کے لہجے میں صداقت تھی۔

”تمہاری یہی خوبی ہے جو آج بھی اس حویلی میں عزت سے بیٹھی ہو..... لیکن.....“ سکندر علی شاہ روانی میں کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

گل نے اس کے جملے کی نزاکت اور یکلخت خاموشی کو محسوس کر کے قدرے سہمے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ”کیا آپ کو گمینہ سے کہیں کوئی شکایت تو نہیں پیدا ہو گئی؟“

”تمہارے ذہن میں گمینہ کا نام کیوں ابھرا.....؟“

”آپ..... آپ بھول رہے ہیں کہ اس وقت آپ گل کی خواب گاہ میں ہیں۔“

سکندر علی شاہ لا جواب ہو گیا۔ تادیر گل کو نگاہوں لگا ہوں میں ٹٹولنے کے بعد بولا۔

”فرض کر لو کہ گمینہ کے بارے میں تمہارا خیال درست ہو تو..... تو تم کیا مشورہ دو گی؟“

”پودوں اور درخت میں فرق ہوتا ہے۔“ گل نے اپنا مفہوم بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ ”پودوں میں اگر کسی طرف جھکاؤ زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کو جھکا کر اس کے لیے بند لگا کر اس کی بند خلیں مضبوط کر دی جائیں تو.....“

”ڈھکے چھپے الفاظ میں نہیں..... کھل کر بیان کرو۔“

”میرا خیال ہے کہ اس وقت آپ کو صرف سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔“ گل نے اپنا تیت سے کہا۔ ”آپ ادھر جا کر مسہری پر آرام کریں۔ صبح تروتازہ ہو کر انہیں گے پھر بات ہوگی۔“

”تم کہاں لیٹو گی؟.....“ سکندر علی شاہ نے گل کو ترچھی نظروں سے گھورا۔

”جہاں آپ حکم دیں گے.....“ گل نے نظریں جھکا لیں لیکن آنسوؤں کے ان قطروں کو نہ روک سکی جو بے اختیار ہو کر اس کی پلکوں سے ڈھلک گئے تھے۔

سکندر علی شاہ آہستہ سے اٹھا۔ اس نے گل کا ہاتھ تھام کر سوچا۔ مسافر تھکا ہوا ہو تو کسی پرانے درخت کا سایہ بھی اس کے لیے سکون بخش ہوتا ہے..... ”تم اور میں آج پھر ایک ہی مسہری پر رات گزاریں گے۔“

گل خاموشی سے شوہر کے حکم کے احترام میں اس کے ساتھ بستر پر چلی گئی۔ اس رات سکندر علی شاہ کو ایک عربی بعد وقت نہیں بلکہ قلبی سکون حاصل ہوا تھا۔ دوسری صبح وہ بیدار ہوا تو اس کے ذہن میں پھر گمینہ کا خیال کھلبلائے لگا۔ تاہا اس نے گل کے ساتھ ہی کیا پھر وہ تیور بدل کر گمینہ کے کمرے میں گیا جو حسب معمول سفید ٹاول کے ڈریسنگ گاون میں لمبوں تھی۔ اس کے چہرے پر آج وہ شوخی نہیں تھی جو سکندر علی شاہ کو مائل کر لیا کرتی تھی۔ دو راتوں کی دوری ہی نے اس کو ضرورت سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔

سکندر علی شاہ کو دیکھتے ہی اسے اپنے اغوا کی کہانی بھی ڈسنے لگی۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ پروفیسر چنگ لائی فارچون سے اس کی ملاقات ریڈیو کلب میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ سکندر علی شاہ کے لیے ایک خوب صورت شکار کو دانہ ڈالنے میں مصروف تھی۔ پروفیسر کی باتوں نے اس کو اس حد تک متاثر کیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں سب کچھ جان لینے کے لیے بے چین ہو کر اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئی تھی پھر راستے میں جب پروفیسر چنگ لائی نے اس کا ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس کے بازو کو تھاما تو گمینہ کو ایک جھپٹن کا احساس بھی ہوا جو اتنا شدید بھی نہیں تھا کہ وہ سنجیدگی سے اس پر غور کرتی لیکن اس کے بعد وہ اپنے ذہن پر طاری ہونے

کشکول

والی برقی رفتار غنودگی کو بھی نہیں کنٹرول کر سکتی تھی..... بے ہوشی کے بعد اسے کہاں لے جایا گیا؟..... لے جانے والے دونوں افراد نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ بھی اس کے علم میں نہیں تھا مگر دوبارہ ہوش آنے پر اس نے خود کو اپنی ہی خواب گاہ میں جس حالت میں فرش پر پڑا پایا تھا وہی بہت سی کہانیوں اور اندیشوں کو جنم دینے کے لیے کافی تھا۔ دو روز بعد سکندر علی شاہ کے سامنے آتے ہی وہ ہم کر رہ گئی تھی۔ سکندر علی شاہ اس کے چہرے پر بدلتے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تم جس حالت میں ہوش میں آئی ہو وہ یاد ہے؟.....“

”گمینہ تھوک نکل کر رہ گئی۔ کوئی جواب نہ دے سکی۔“

”تم ریڈیو کلب کیوں گئی تھیں؟.....“

”آپ کے لیے ایک نئے ہیرے کی تلاش میں.....“

وہ ایک دو ملاقات کے بعد میرے چال میں.....“

”بکومت.....“ سکندر علی نے گرج کر کہا۔ ”تم وہاں سے کس کے ساتھ گئی تھیں؟..... ڈرائیور کو کیوں واپس کر دیا تھا؟ کون تھے وہ پرانے آشنا جن کی خاطر تم نے میری اجازت کے بغیر قدم اٹھا لیا؟“

گمینہ نے قسم قسم کر پوری روداد بیان کرنی شروع کر دی۔ سکندر علی شاہ خوشخوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ اس کا تجربہ کہہ رہا تھا کہ گمینہ غلط بیانی نہیں کر رہی مگر خود گمینہ کا مانسی اس کے آڑے آ رہا تھا۔

”اب تم نے خود اپنے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟“

سکندر علی شاہ نے فیصلہ کن انداز میں دریافت کیا۔

”میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ خود کو کوئی فیصلہ کر سکوں..... آپ کا جو حکم ہو گا اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔“ گمینہ نے اختیار ڈال دیے۔

”گمینہ عورت..... جس کی وجہ سے میں نے تجھے اپنا یا تھا اسی نے کہا ہے کہ اب تم بغیر اجازت اس خواب گاہ سے بھی باہر قدم نہیں نکالو گی۔“ سکندر علی کا طیش بڑھتا گیا..... ”اسی خواب گاہ میں اب تیری موجودگی میں اپنا شغل بھی نئی تخلیوں سے جاری رکھوں گا..... تیری پیشانی پر بھی کوئی ٹل آیا تو پھر اس حویلی میں تیری قبر بھی میرے ہی ہاتھوں بنے گی.....“

”مجھے اب آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ گمینہ نے آگے جھٹک کر سکندر علی شاہ کے گھٹنوں کو چھو کر اس کے کشادہ سینے پر سر رکھا یا تو سکندر علی شاہ کے اندر چھپے شیطان کے قدم پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

www

ماربل کے ایکسپورٹ کا کاروبار روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لیاقت حسین کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ بندرگاہ تک شپمنٹ کا کام راحیلہ بیگم کے فیصلے کے بعد دوسرے ڈرائیور کو سونپ دیا گیا تھا لیکن مقامی مارکیٹ میں آنا جانا آرڈر وصول کرنا اور مال کو جہازوں میں لپٹنے کے حوالے کرانے کی خاطر اپنی نگرانی میں لوڈ کرانا اسی کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

اس وقت بھی دن بھر کا تھکا ماندا شام کو پانچ بجے وہ گھر پہنچا تھا۔ ایسے موقع پر وہ فرحین کو محبت سے سینے سے لگا کر اپنی دن بھر کی تھکن دور کر لیتا تھا مگر اتفاق سے اس وقت فرحین گھر پر نہیں تھی۔ چوکیدار نے بتایا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ہی راحیلہ بیگم کی طرف گئی ہے۔ جلدی آنے کا بھی بول گئی تھی۔

لیاقت حسین نے واش روم میں جا کر لباس تبدیل کیا۔ ہاتھ منہ دھو کر باہر نکلا تو تھکن اتارنے کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا، تھکن کے سبب اس کا پورا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا تا کہ فرحین کے آنے پر خود کو سوتا ظاہر کر سکے۔ اس کے ذہن میں فرحین کا تصور تھا۔ وقتی طور پر وہ اسی معصوم تصور سے دل بہلانے میں مصروف تھا جب اس کا ذہن غنودگی کی کیفیت سے دوچار ہونے لگا، اس نے خود کو بیدار رکھنے کی خاطر اٹھنے کی کوشش کی لیکن غنودگی اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ وہ اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا پھر.....

اس نے اپنی آنکھوں سے ایک عجیب منظر دیکھا۔

اس کا دوست گل خان لیاقت حسین کو ایک گندے عمل کرنے کا توڑ کرنے کے بعد جس بزرگ کے پاس لے گیا تھا۔ اس وقت لیاقت حسین اسی کے سامنے دو زانو بیٹھا تھا۔ بزرگ نے پہلی بار دیکھے بغیر زمین سے خاک کی ایک چٹکی اٹھا کر اس کے منہ میں ڈال دی تھی لیکن اس وقت اسی بزرگ نے نظریں اٹھا کر لیاقت حسین کو دیکھا۔ ایک لمحے تک دیکھتا رہا پھر اس کے لبوں کو چیش ہوئی۔

”لیاقت حسین!“ اس نے مسخوڑ کن لہجے میں کہا۔

”مجھے اس وقت تمہارا ہی انتظار تھا۔ ایک بات ذہن نشین کر لو۔ بزرگوں کی دعائیں ضرور کام آتی ہیں لیکن تعویذ گنڈے اور علامتی نشانات سب فریب ہیں۔ کچے عقیدے کے لوگ خدا کے نام پر دکان داری چکانے والوں کے فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر جو اللہ کو چھوڑ کر بندوں کے سامنے جھولی پھیلاتا ہے وہ بھی سرخرو نہیں ہوتا۔ ٹھوکر اس کے مقدر میں رقم کر دی جاتی ہیں۔ دنیا اور آخرت دونوں نارت

ہو جاتی ہیں۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں محترم لیکن آپ نے خاک کی جو چٹکی.....“

”نہیں.....“ بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔ ”تم جو سمجھ رہے ہو وہ غلط ہے..... خاک کی جو چٹکی میں نے تمہارے منہ میں ڈالی تھی وہ بھی مشیت ایزدی کا اشارہ تھا۔ اس میں جو اثر تھا اور ہے..... وہ بھی اسی مالک دو جہاں کا فیض و کرم ہے..... وہی ایک وحدہ لا شریک لہ ہے جو ہر جگہ موجود ہے لیکن انسان کی نظریں اس کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں۔ مقدس کتاب میں بھی یہی درج ہے کہ وہ جس کام کو کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ..... ہو جا..... اور وہ کام ہو جاتا ہے۔“

”یہی حق ہے محترم.....“

”اس وقت بھی تم اسی کے اشارے پر میرے پاس موجود ہو۔“ بزرگ نے اس بار قدرے جلالی انداز میں کہا، سارے جسم سے کپکپاتے ہوئے بولے۔ ”یہ دنیا ایک امتحان کا کمرہ ہے جہاں تمام جنس و ملک اپنا اپنا پرچہ حل کر رہے ہیں۔ اسی دنیا میں شیطان مردود بھی ہے جو انسانوں کو بہکا تا ہے اور انسان بہک کر شیطان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتا ہے لیکن اللہ ہر فرعون کے لیے کوئی نہ کوئی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ نیکی کا انجام دینا بھی سعادت ہے۔ اس سعادت کے لیے بھی تمہارا انتخاب کیا گیا ہے۔“

”میں..... میں سمجھا نہیں محترم؟“ لیاقت حسین نے سادگی سے سوال کیا۔

”فی الحال کچھ سمجھنے کی کوشش نہ کرو..... میرے ساتھ چلو..... جو نصر آئے، اسے ذہن میں رکھنا..... جب تک اجازت نہ ہو اس کے بارے میں زبان بھی نہ کھولنا..... ہر کام کے لیے قدرت ہی وقت کا انتخاب کرتی ہے..... ہم تم دونوں اسی کے محتاج ہیں.....“

لیاقت حسین پھر کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا جب بزرگ نے اس کا ہاتھ تھام لیا، لیاقت حسین کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کی غنودگی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کی نظروں کے سامنے سے جب دوبارہ تاریکی چھٹی تو اس نے ایک خوب صورت اور کسن لڑکی کو سرکاری کوارٹر نما مکان سے نکلتے دیکھا..... اس کے جسم کا لباس بھی اس کی غربت کی کہانی سنا رہا تھا۔

شام کے اندھیرے پھیل چکے تھے۔ لڑکی نے کوارٹر سے نکل کر سر پر دوپٹا ڈالا۔ سہمی ہوئی نظروں سے دائیں

بائیں دیکھا پھر وہ کوارٹروں کی دور و دور عبور کرنے کے بعد پھر ہی آگے بڑھی، دو بڑے کٹے آدمیوں نے لکھتے اسے لپکے دیوچ لیا، لڑکی کے منہ پر ہاتھ جما کر اسے گھسیٹتے ہوئے وین کے عقبی حصے میں لے گئے جہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔

”اس وین کے ڈرائیور کی شکل کو ذہن میں محفوظ رکھنا۔“ بزرگ کی آواز لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔ لیاقت حسین نے ڈرائیور پر بہ غور نظر ڈالی پھر منہ تبدیل ہو گیا۔ جس کسن لڑکی کو اغوا کیا جا رہا تھا وہ وین کی پشت پر بیٹھی اغوا کرنے والوں سے رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر فریاد کر رہی تھی۔

”تمہیں خدا اور اس کے محبوب کا واسطہ! مجھے چھوڑ دو۔ میں یتیم ہوں، مجھے ہاتھ نہ لگاؤ..... مجھ پر رحم کرو۔“

”تم کہاں جا رہی تھیں.....؟“ ایک بڑے کٹے جوان نے اس کو لپکا لپکا ہوئی نظروں سے سر تا پا دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”مم..... میں باں کی ایک واقف کار خاتون سے کچھ قرض لینے کی خاطر نکلی تھی۔“

”ہم تم کو ایسی ہی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں تم کو قرض نہیں بلکہ ہیرا سمجھ کر تمہاری قیمت ادا کی جائے گی۔“ دوسرے نے مسکرا کر کہا۔ ”ایسی قیمت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“

”نہیں..... خدا کے لیے نہیں۔“ لڑکی نے پھر اچھا کی۔ ”میں گناہ آلود ہونے سے پہلے مرجانا پسند کروں گی۔ مجھے واپس جانے دو۔“

”خاموش رہو ورنہ..... ہمیں تمہارے ہونٹوں کو بند کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔“

تیسرے کے لہجے میں ایسی دھمکی تھی کہ لڑکی سہم کر رہ گئی۔ دل ہی دل میں خدا سے فریاد کرنے لگی۔

لیاقت حسین کی نظریں روز روشن کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھیں..... لڑکی کا ستر ایک عورت کے پاس جا کر ختم ہوا، اس نے تنہائی میں عورت سے بھی فریاد کی۔ عورت اسے تسلیاں دیتی رہی۔ دلاسا دیتی رہی کہ اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسی عورت کے کہنے پر لڑکی نے مجبوراً غسل کیا پھر اس کا دیا ہوا لباس بھی مجبوراً پہن لیا۔ عورت نے اسے سوسو کے دو نوٹ بھی دیے پھر بولی۔

”اسے خاموشی سے رکھ لو اور غور سے میری بات سنو..... جو لوگ تمہیں اٹھا کر لائے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ شکر کرو کہ تم میرے پاس آ گئی ہو..... اب میں تمہیں

کشکوں

ایک ٹیک اور با اثر آدمی تک پہنچا دوں گی جو تم کو تمہاری ماں کے پاس واپس بھیج دے گا۔ ایک فصاحت اور ذہن نشین کر لو..... وہ آدمی جو کہے اس سے انکار بھی نہ کرنا.....“

”تم..... تم.....“ لڑکی عورت کا جواب سن کر بڑے معصوم لہجے میں بولی۔ ”تم تو خود ایک عورت ہو..... کیا عورت ہو کر بھی تم مجھے یتیم کو کسی کے ہاتھوں فروخت کر دو گی۔“

”وقت اور حالات کا تقاضا سمجھ لو.....“ عورت نے سرد آواز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے..... دوسری صورت میں..... میں بھی تمہارے کسی کام نہ آسکوں گی..... تم حالات کا شکار ہو کر کھلونا بن جاؤ گی۔“

”اس عورت کی شکل کو بھی اپنے حافظے میں کر لو.....“

بزرگ کی آواز پھر لیاقت حسین کے کانوں میں گونجی۔ لیاقت حسین جو کچھ دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا، اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے عورت کی صورت و شکل کو بزرگ کی ہدایت پر ذہن میں محفوظ کر لیا۔ اسی لمحے منظر بھی تبدیل ہو گیا۔

کسن لڑکی اب ایک دوسرے کمرے میں کسی مرد کے سامنے موجود تھی جس کی آوارہ نظریں لڑکی کے جسمانی نشیب و فراز پر متحرک تھیں۔ لڑکی اس وقت بھی کسی معصوم پرندے کی طرح ایک پنجرے میں بند اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی جب مرد نے قریب آ کر بیٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم یقیناً ایک ہیرا ہو جسے تراش خراش کر میرے پاس بھیجا گیا ہے اور میں..... میں ہیرے کی قدر و قیمت جانتا ہوں..... تمہیں کل صبح میرے آدمی تمہاری ماں تک بہ حفاظت پہنچا دیں گے اور..... تمہیں ایک رات کی قیمت بھی ہزاروں میں مل جائے گی..... ہو سکتا ہے کہ میں دوبارہ پھر بھی تمہیں بلا لوں.....“

”مم..... میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“ لڑکی نے ہونٹ چباتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”تم.....“

میری سرف ایک خواہش پوری کر دو.....“

”خواہش نہیں..... تم حکم دو جان من..... میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا.....“ مرد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قریب تر کر لیا۔ ”کیا چاہتی ہو.....؟“

”تمہارا ساز بہر..... اس کے بعد تم اپنی خواہش بھی پوری کر لینا.....“ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

پھر..... جو کچھ ہوا اس نے لیاقت حسین کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی گردش کو تیز سے تیز کر دیا لیکن.....

زیتون ایک مقدس غذا

زیتون ایک سوغات کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے کھانے، پینے والے معدہ کے علاوہ دیگر بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں یا پھر امراض کی تکلیف سے مکمل طور پر نجات پالیتے ہیں۔ زیتون کا درخت قدیم ترین درخت ہے۔ کہا جاتا ہے طوفان نوح کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پانی اترنا شروع ہوا تو زمین پر سب سے پہلے چیز جو نمایاں ہوئی وہ زیتون کا درخت تھا۔ قرآن مجید کی سورۃ المؤمنون میں زیتون کا ذکر ہے جس میں کہا گیا ہے۔ ”طور پہاڑ کے علاقے میں وہ درخت ہے جس سے تیل نکلتا ہے جو تمہاری روٹی کے ساتھ سالن کا کام دیتا ہے۔“ (آیت 20) سورۃ النہل کا آغاز بھی انجیر اور زیتون سے ہوتا ہے ”قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی اور طور سینا کی۔“

توریت میں بھی زیتون کے تیل کا ذکر ہے۔ مقدس کتابوں میں زیتون کے بابرکت ہونے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”زیتون کا تیل کھاؤ اور اسے لگاؤ کیونکہ یہ پاک صاف اور مبارک ہے۔“

خالد بن سعد روایت کرتے ہیں کہ میں غالب ابن ابجر کے ہمراہ مدینہ آیا راستے میں غالب بیمار ہو گئے ان کی عیادت کو ابن ابی عقیق آئے اور بتایا کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کلوئی میں شفا بتائی ہے۔ ہم نے کلوئی کے چند دانے کوٹ کر زیتون کے تیل میں ملائے اور ناک کے دونوں اطراف میں ٹپکائے تو غالب شفا یاب ہو گئے۔ (ابن ماجہ، بخاری)

ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک مہمان آیا۔ آپ نے رات کے کھانے پر اونٹ کا سر اور زیتون کا تیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں یہ تمہیں اس لیے کھلا رہا ہوں کہ نبی پاک ﷺ نے اس کو مبارک درخت قرار دیا ہے۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل ملتان

اس وقت وہ عمل کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، کسی نادیدہ ہاتھ کی سرگرفت نے اسے پوری طرح اپنے قبضے میں کر رکھا تھا..... وہ خاموش تماشا بن رہا۔

مرد نے لڑکی کی خواہش سن کر قہقہہ لگا یا پھر وہ معصوم اس کے بوجھ تلے پھڑ پھڑانے کے سوا کچھ نہ کر سکی..... خاصی دیر تک ایک مجبور لڑکی ایک مرد کی درندگی کا شکار ہوتی رہی پھر وہ اسے تنہا چھوڑ کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

لڑکی خود اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی پھر اس نے کسی خیال کے بغیر اپنے جسم کو لباس میں چھپایا۔ ہاتھ میں پرانی دوکانچ کی چوڑیوں کو اتار کر ایک گوشے میں رکھی سنگ مرمر کی کارنر ٹیبل پر لے جا کر گل دان سے کچلا پھر اسے چبانے لگی۔

جتی دیر شیطانی کھیل جاری رہا، لیاقت حسین خاموش تماشا بن رہا پھر وہ اس معصوم لڑکی کی عبرتناک موت کو بھنی بھنی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ چوڑیوں کے ذرات چبانے کے بعد کچھ دیر قیمتی قالین پر پڑی مانی بے آب کے مانند تڑپتی..... اس کے منہ سے خون ابلا..... اس کے معصوم جسم کو دو چار جھٹکے لگے پھر وہ موت کی ابدی نیند سو گئی۔

”جس درندے نے اس معصوم کچی کو روندنا اس کے چہرے کو بھی یاد رکھنا۔“ بزرگ کی آواز لیاقت حسین کی سماعت سے ٹکرائی پھر منظر یکھت تبدیل ہو گیا۔

ایک ویرانے میں دو چار بے حس افراد لڑکی کے جسم کو زمین میں دفن کر رہے تھے۔ لیاقت حسین کے دل میں ان افراد کو زندہ درگور کرنے کی خواہش ابھری لیکن وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، سن رہا تھا..... عمل کرنے سے قاصر تھا۔

”اس قبر کی نشاندہی بھی تمہیں کرنی ہوگی۔“ بزرگ کی آواز پھر ابھری تو لیاقت حسین نے کہا۔

”میرے محترم..... اگر وقت آنے میں دیر لگی..... اس معصوم کی لاش کو کیڑے کھا گئے تو میں بھی بے بس ہو جاؤں گا۔“

”تم حافظ ہو لیاقت حسین..... فرعون کے روشن واقعے پر غور کرو..... اس شیطان نے بھی موت کو سامنے دیکھ کر خدا پر یقین لانا چاہا..... مگر وقت گزر چکا تھا..... جو مہلت اسے دی گئی وہ ختم ہو چکی تھی..... خدا نے کہا تھا..... میں تیری لاش کو دنیا والوں کے لیے عبرت بنا دوں گا..... سمندر کی گوشت خور مچھلیوں نے بھی فرعون کے جسم کو منہ نہیں مارا..... اس رب کریم کا کہا بھی غلط نہیں ہوا..... فرعون کی لاش برسوں بعد بھی محفوظ رہی..... جو مشرک مقدس کتاب کے اس واقعے کی

تردید کرتے تھے..... خود انہوں نے فرعون کی لاش بھی جلا کر..... اس کے فرعون ہونے کی تصدیق بھی کی۔ آج کے لوگ اس مردود کی اکڑی ہوئی لاش کا مشاہدہ دنیا کی گوشوں گوشوں میں سائنسی ایجادوں کے ذریعے کر رہے ہیں..... مشرکین بھی انگشت بدنداں ہیں..... اسی خدا اگر چاہا تو اس معصوم بچی کی لاش کو بھی صحیح و سلامت رکھ کر ہے..... کل کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا..... تم صرف راستوں اور چہروں کو ذہن میں محفوظ رکھو..... جب مالک جہاں کو منظور ہوا وہ خود تمہارے لیے ساری مشکلات دور کر دے گا..... میری ذمہ داری پوری ہوئی.....“

”میرے محترم..... کیا میں آپ سے.....“ لیاقت حسین اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

وہ فرحین کی آواز ہی تھی جس نے اسے سوتے سے جگا دیا تھا۔ اس نے پلٹ کر فرحین کو دیکھا جو قریب کھڑا اسے گھور رہی تھی۔

”تو کب آئی.....؟“ لیاقت حسین نے پورے ہوٹل دھواں میں فرحین کو مخاطب کیا۔ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا وہ اس کے ذہن میں کہیں گم ہو کر رہ گیا۔

”میری چھوڑ..... تو بتا کہ مجھے ڈرانے کی خاطر ڈراما کر رہا تھا؟..... لاش..... قبر.....! کسے دفنانے کی بات کر رہا تھا؟ کیا فرحین سے تیرا دل بھر گیا؟ تجھے میری جان کی قسم ہے..... سچ بتا کہ تو ابھی کیا بک بک کر رہا تھا؟“

لیاقت حسین کا خیال تھا کہ فرحین مذاق کر رہی ہوگی لیکن جب فرحین سنجیدہ نظر آئی تو اسے خیال آیا۔ ”ممکن ہے کچھ دیر کو میری آنکھ جھپک گئی ہو۔ میں دن میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“ ایک لمحے تک وہ فرحین کو دیکھتا رہا پھر اس نے بڑی معصومیت سے بولا۔ ”تو یقین نہیں کرے گی میں لاش، قبر اور دفنانے کی بات کیوں کر رہا تھا۔“

”چل اب بتا دے..... کیا چکر ہے؟“

”وہ..... سب میں اپنے ارمانوں اور بے چینی کے لیے کہہ رہا تھا۔“ لیاقت حسین دیدہ و دانستہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نہیں ہوتی تو میں بے چین ہو جاتا ہوں، یہ بے چینی کتنا دیوانگی کی شکل نہ اختیار کر لے اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اپنے ارمانوں کی لاش اور بے چینی کو قبر میں دفن کر دوں۔ پھر تو بھی یہ شکایت نہ کرے گی کہ میں تیرے قرب کے لیے اتنا ندیدہ کیوں بنا رہا ہوں۔“

”دماغ چل گیا ہے تیرا۔“ فرحین نے اس کا جواب سنا تو مسکراتے ہوئے قریب آگئی۔ ”وہ سب تو میں پہلے

میں کہتی ہوں۔“

”بس..... چپ ہو جا۔“ فرحین نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تو نہیں ہوتا تو میں بھی بے چین ہو جاتی ہوں اور آج..... آج تو میں تجھے ایک نئی بات بتانے کی خاطر بے چین تھی۔“ فرحین کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑنے لگی۔

”وہ کیا.....؟“

”بیگم صاحبہ نے بلایا تو ادھر چلی گئی تھی، میرا خیال تھا کہ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے تو وہ اندر اکیلے ہی ہوں گی، میں منہ اٹھائے بے دھڑک اندر گئی تو میرا دل دھک سے رہ گیا..... چپ سا دھ کر دے قدموں واپس آگئی اور..... ان دونوں کو خبر تک نہ ہوئی۔“

”کیا دیکھ لیا تو نے ایسا انوکھا کہ تیرا دل دھک سے رہ گیا.....؟“

”وہ..... وہ..... حیرت صاحب بیگم صاحبہ کو انگریزوں والا پیار کر رہے تھے۔“

”اور یہ انگریزوں کے پیار والی بات تجھے کیسے معلوم ہوئی؟“

”بیگم صاحبہ نے..... مجھے کمرے میں آتے دیکھ لیا تھا۔“ فرحین نے شرما کر کہا تو لیاقت نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ کسی بھونرے کی طرح پھول کی پتھریوں کا رس چوسنے لگا تو فرحین نے اسے یاد دلایا۔

”دروازہ تو بند کر لے انگریزی بندر.....“

لیاقت نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا پھر ان دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکنے شروع ہو گئے۔ اس روز فرحین کی خود پسندی میں بھی کچھ نئے رنگ گل مل گئے تھے۔

اورنگ زیب اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

وشنو کا فرار ہو جانا اس کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک شے کی تصدیق کی خاطر اس نے جو قدم اٹھایا تھا وہ کامیاب رہا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک خاص آدمی کو وشنو کے پیچھے لگا دیا تھا جو پل پل کی خبر دے رہا تھا۔ وشنو کے سلسلے میں اورنگ زیب سے جو ایک غلطی سرزد ہوئی تھی اس کا احساس بھی اسے اس وقت پوری شدت سے ہوا جب اس نے پھر اسٹور والی چھت سے افضل خان کے فلیٹ پر گولیاں

چلائی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وشنو نے کسی جذباتی وجہ سے شکار سامنے نہ ہونے کے باوجود گولیاں داغ دی تھیں۔ وہی گولیاں اگر دیوار کا پلستر ادھیڑنے کے بجائے افضل خان یا شبنم میں سے کسی ایک کی بھی زندگی کا چراغ گل کر دیتیں تو اورنگ زیب خود کو بھی معاف نہ کر پاتا۔

اسے علم تھا کہ وشنو کے ملٹری انٹیلی جنس والوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد افضل خان ہی نے دوبارہ اس کی گرفتاری کا جال تیار کیا تھا۔ ایسی صورت میں وشنو کا افضل خان کے خطرے کو درمیان سے ہٹانا قدرتی امر تھا۔ بہر حال افضل خان اور شبنم دونوں محفوظ تھے۔

وشنو کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات تھیں جس کے پیش نظر اس نے سکندر علی شاہ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہاں جو صورت حال پیش آئی اس نے اورنگ زیب کے خدشات کو اس کی توقع سے زیادہ حیران کر دیا۔ سکندر علی شاہ کا ملاقات کے دوران کسی سے فون پر بات کرنا بھی خلاف معمول تھا پھر اس نے اورنگ زیب کے اوراق زندگی کے ایک ایسے باب کو الٹ کر اسے چونکا دیا تھا جسے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ خود اورنگ زیب بھی فراموش کر چکا تھا۔ اسی ضمن میں سکندر علی شاہ نے غالباً اسے ٹریپ کرنے کی خاطر اپنے فارم ہاؤس آنے کا انویٹیشن بھی دیا تھا۔ ذہنی سکون کے لیے اس کو مخصوص دوا کی فراہمی کا اشارہ بھی کیا تھا۔ جو کھیل فارم ہاؤس کے دونوں ریٹ ہاؤس میں ہو رہا تھا اورنگ زیب اس سے بھی ناواقف نہیں تھا۔ سراج نے بھی آکٹوپس کے لیے خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اسی فارم ہاؤس کو ایک مناسب جگہ قرار دیا تھا لیکن اورنگ زیب نے ذاتی اور خفیہ معلومات کی بنیاد پر یہ بات تسلیم نہیں کی تھی۔ اس نے سراج کو بارہا یہی جواب دیا تھا کہ سکندر علی شاہ براہ راست شیخ حامد سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس یقین کی وجہ اورنگ زیب کی ذاتی اور خفیہ تفتیش کی رپورٹس تھیں اس نے شیخ حامد کو آکٹوپس کا نام بھی اسی وجہ سے دیا تھا۔ آکٹوپس کے بارے میں انسانی کمپیوٹ یا میں یہی پڑھا تھا کہ وہ ایک خطرناک سمندری مخلوق ہے۔ اس حد تک محتاط رہتا ہے کہ اس سمندری کیکڑے کے آٹھ زہریلے ہاتھ بھی ایک ہی وقت میں مختلف ارادوں سے دشمن کی سمت جھپٹتے ہیں لیکن ایک کی حرکت کا علم دوسرے کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ بیک وقت کئی دشمنوں کو اپنے قالمانہ انداز میں شکار کر لیتا ہے۔

شیخ حامد سمندری مخلوق نہیں۔ وہ ذی ہوش اشرف المخلوقات میں شمار ہوتا تھا اس لیے حالات کے پیش نظر سکندر علی

36

37

38

39

40

41

42

43

شاہ جیسے مختلف فطرت کے انسان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ وہ سامنے آئے بغیر سکندر علی شاہ سے رابطہ رکھتا ہو؟ اس سوال کے ذہن میں آتے ہی اورنگ زیب کے ذہن میں وہ کال بھی ابھری جو ملاقات کے دوران سکندر علی شاہ کو موصول ہوئی تھی جسے مجبوراً سنا گیا تھا۔ اگر وہ شخص حامد ہی کی کال تھی تو سکندر علی شاہ اس کو کس حیثیت سے جانتا تھا.....؟

اورنگ زیب کے ذہن میں ایک کے بعد ایک سوالات ابھر رہے تھے..... اگر سراج کی بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ سوال بھی تھا کہ آکٹوپس وہاں کس حیثیت سے اور کس شکل میں چھپا ہے؟ چھپنے کی وہ جگہ ایسی کہاں ہے جس کا علم خود سکندر علی کو بھی نہ ہو؟..... اس مفروضے کی تردید روشا کے اغوا اور بالآخر کے معاملے سے بھی نکتی تھی۔ روشا کے سلسلے میں دارا نے بھی بے حد اصرار پر مجرم کا جو حلیہ بیان کیا وہ بھی حیرت انگیز طور پر آکٹوپس سے ملتا تھا؟..... کیا فارم ہاؤس میں آمدورفت کے باوجود سکندر علی شاہ کے شکاری کتے کسی اجنبی کی بو نہیں سونگھ سکتے تھے؟

ذہن میں یکے بعد دیگرے مختلف سوالات ابھر رہے تھے جب اورنگ زیب کے ذہن میں جگا اور لوچن کا خیال آیا۔ لوچن نے کسی مستقبل شناس کا روپ دھار کر نگینہ کو شکار کیا تھا مگر..... جگا کو یقیناً میک اپ کے باوجود شناخت کر لیا گیا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو اس کے فریچر ہاؤس پر منظم حملہ بھی نہ ہوتا..... اس واردات کے پس پردہ بھی سکندر علی شاہ کی شخصیت سامنے آئی تھی..... نگینہ کا تعلق اس کی بیوی کی حیثیت سے تھا۔ لوچن نے اس کا ”برہنہ گفٹ پیکی“ سکندر علی شاہ کو کیوں روانہ کیا تھا؟..... اس کا جواب میڈم روہی سے بات کرنے کے بعد مل گیا تھا۔ اس کی وضاحت کے مطابق لوچن کو بھی کسی وجہ سے یہی شبہ لاحق تھا کہ سکندر علی شاہ کو بلیک میل کرنے کے بعد ہی..... شیخ حامد تک اس کی رسائی ممکن ہو سکتی تھی۔

ان بکھری ہوئی کڑیوں کو ملانے کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کو اس بات کا یقین تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر بھی دشمن کی نظر ضرور ہوگی۔ اس نکتے کے ذہن میں ابھرنے کے بعد ہی اس نے سوچا تھا کہ وقتی طور پر کچھ عرصے کی چھٹی لے کر منظر عام سے ہٹ جائے۔

اسی خیال کے تحت اس نے ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھی پھر اٹھ کر آئی۔ جی کے کمرے میں جانے کے لیے پرتول رہا تھا کہ پینتھر کی کال آگئی۔

”اس وقت کیسے فون کیا؟“ اس نے موبائل آن کر کے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”کوئی اہم اطلاع؟“

”جی ہاں..... چتا سے فرار ہونے والے نے کچھ دیر پہلے اپنا ٹھکانا بدل دیا ہے۔“

”اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے تمہارے خیال میں؟“

”محض احتیاط.....“ دوسری سمت سے جواب ملا۔

میرا ذاتی خیال ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اس کی نگرانی پر کڑی نظر رکھنا۔ ایک بات اور بھی نوٹ کر لو۔“

”آپ حکم دیں.....“

”چور پتا اگر حتم کر دیا جائے؟.....“ اورنگ زیب نے سرسراہٹے مگر مدہم لہجے میں سوال کیا۔

”بہت مناسب رہے گا..... آپ اشارہ کر دیں، ایک کھٹنے کے اندر اندر.....“

”نہیں..... یہ نیک کام کوئی مستحق آدمی ہی کرے گا۔“

اورنگ زیب نے جملہ کاٹ کر کہا پھر موبائل آف کر کے وہ آئی جی کے کمرے کی جانب بڑھا۔ دو منٹ کے مختصر انتظار کے بعد اس کی طلبی بھی ہو گئی۔ آئی جی کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہیں۔ اورنگ زیب کے بیٹھ جانے کے بعد ہی اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”اس وقت کیسے زحمت کی.....“

جواب میں اورنگ زیب نے اپنی درخواست اس کے سامنے رکھ دی۔ آئی جی نے درخواست کو غور سے پڑھا پھر پہلو بدل کر بولا۔

”اچانک آپ کو طویل رخصت کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

”کچھ ذاتی اور نجی معاملات نمٹانے ہیں۔“ اورنگ زیب نے سادگی سے جواب دیا۔

”میں آپ کے دفتری اوقات کی پابندی میں نرمی بھی کر سکتا ہوں۔“

”جانتا ہوں لیکن ذاتی کام کے ساتھ اسی بہانے کچھ آرام بھی کر لوں گا۔“

”آرام.....“ آئی جی نے مسکرا کر سوال کیا۔ ”یہ آپ کہہ رہے ہیں۔“

”جی ہاں، میں بھی انسان ہوں۔“

”سوری.....“ آئی جی نے سادہ کاغذ پر کچھ لکھنے ہوئے کہا۔ ”میرا مطلب آپ غلط سمجھے۔“ جملے کے اختتام کے ساتھ ہی اس نے کاغذ بھی آگے بڑھا دیا۔

اورنگ زیب نے کاغذ پڑھا۔ آئی جی نے لکھا تھا۔ ”مجھے کسی وقت آپ کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، حالات ایسی

معمول پر نہیں آئے۔“

”ٹیکنالوجی (Technology) نے اب بہت ترقی کر لی ہے سر.....“ اورنگ زیب نے خشک لہجے میں کہا۔ ”جو لوگ دور بیٹھ کر آوازیں سن سکتے ہیں، وہ کسی دوسری ڈیوائس کے ذریعے ایک ایک نقل و حرکت کا جائزہ لینے سے بھی غافل نہیں ہوتے۔“

آئی جی جواب سن کر ہڑبڑا گیا۔ اسے شاید اورنگ زیب سے اس جواب کی توقع نہیں تھی، پہلو بدل کر بولا۔

”آپ درخواست چھوڑ جائیں، میں بعد میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“

”ایز پوزش.....“ لیکن میں اپنی درخواست میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کروں گا۔“ اورنگ زیب نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”دہاٹ.....“ آئی جی کو اپنے عہدے اور اختیارات کا خیال آ گیا۔ ”اگر میں نے آپ کی درخواست نام منظور کر دی تو.....“

اورنگ زیب جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا جب آئی جی کی میز پر رکھا موبائل گنگنا نے لگا، اس نے یہ دستور اورنگ زیب کو دیکھتے ہوئے موبائل آن کر کے کہا۔

”آئی۔ جی۔ آن لائن.....“

”گو برا بول رہا ہوں۔ تمہارا باپ۔“ دوسری جانب سے سرد اور سفاک لہجے میں کہا گیا۔ ”میں تمہاری اور ایس پی کی بات سن چکا ہوں، ایس پی کی درخواست منظور نہیں ہونی چاہیے۔“

”مجھے رہا ہوں۔“ آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے دوستانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”میرا ذاتی پروگرام بھی یہی ہے لیکن دوسری پارٹی.....“

”اسے پرانی سیٹ پر واپس جانے کا دانہ ڈال کر دیکھو، شاید یہ آفر اس کا ارادہ تبدیل کر دے۔“ اس بار زیادہ سفاک انداز اختیار کیا گیا۔ ”اس کے بعد بھی وہ انکار کرے تو پھر مجھے اپنے طریقے سے راستہ صاف کرنا پڑے گا۔“ جملے کے ساتھ ہی لائن بھی کاٹ دی گئی۔

آئی جی نے موبائل واپس رکھ دیا پھر اورنگ زیب سے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”کچھ پارٹیاں ہر کام اپنی مرضی کے مطابق چاہتی ہیں۔ اس وقت بھی ایک واقف ایسی ہی سفارش کر رہا تھا۔“

”ہم جس سیٹ پر بیٹھے ہیں وہاں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔“ اورنگ زیب نے بھی لہجہ بدل کر جواب دیا۔

”کیا آپ لاٹک لیو کے بارے میں اب بھی سنجیدہ ہیں۔“

”کچھ مجبوریوں نہ ہوتیں تو میں اصرار بھی نہ کرتا.....“

”او۔ کے..... ایک درمیانہ راستہ اور بھی ہے۔“ آئی جی نے کوبرا کے حکم پر عمل کرنے کی خاطر کہا۔ ”میں آپ کا فوری تبادلہ اسی سیٹ پر کر دیتا ہوں جہاں آپ پہلے تھے..... وہاں آپ کو آؤٹ ڈور اور ان ڈور کا مکمل اختیار بھی ہوتا ہے۔“

اورنگ زیب نے آئی جی کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے ذہن میں موبائل پر موصول ہونے والی کال کھٹکی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے نارمل ہو کر کہا۔ ”آپ اگر لمبی چھٹی دینے پر رضامند نہیں ہیں تو صرف ایک ہفتے کی منظوری دے دیں۔ بہر حال میں پرانی سیٹ کی آفر فی الحال مناسب نہیں سمجھتا.....“

”آپ کی درخواست میں ترمیم کرنا بھی نامناسب ہے۔“ آئی جی نے درخواست کو پرزے پرزے کر کے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے بڑے دوستانہ انداز میں کہا۔

”میں آپ کو دفتر کی تمام پابندیوں سے آزاد کرتا ہوں۔ اسٹ از مائی پرامس (It is my promise)“

اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر آئی جی کی بات مان لی۔ کچھ دیر بعد وہ گاڑی میں بیٹھا کرٹل احتشام کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ چھٹی کی درخواست آئی جی نے جس انداز میں موبائل کال آنے کے بعد ٹالی تھی وہ بھی قابل غور تھا لیکن یہ سوال بھی ذہن میں ابھر رہا تھا کہ موبائل پر کس نے کال کی تھی؟..... وہ یقیناً وہی تھا جس نے آئی جی کو اس کی کسی دکھتی رگ کی وجہ سے قابو کر رکھا تھا مگر..... اورنگ زیب کی چھٹی کی درخواست سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا.....؟

یہی ایک سوال ذہن میں تادیر چبھتا رہا پھر اورنگ زیب کے ہونٹوں پر ابھرنے والی معنی خیز مسکراہٹ پھیل کر گہری ہوتی چلی گئی..... کچھ کڑیاں تھیں جو از خود ایک دوسرے سے مربوط ہو رہی تھیں.....

بھیکے بالوں کو تولیے سے لپیٹے وہ غسل خانے سے نکلی تو افضل خان کی نظریں کسی وجہ سے مسکرانے لگیں۔ شبنم اپنے کمرے میں جاتے جاتے رک گئی۔ افضل خان اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ والہانہ انداز میں نگاہوں میں نگاہیں ڈالے دیر تک اسے تکتا رہا تو شبنم نے سنبھل کے پوچھا۔

”کیا میں کچھ بدل گئی ہوں.....؟“

”نہیں.....“

”پھر اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟..... کیا پہلے کبھی

نہیں دیکھا؟“

”اس وقت کچھ عجیب سا خیال آگیا تھا۔“ افضل خان نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ ”تمہیں ایک خاص انداز میں دیکھ کر میں بھی اس زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ تمہیں برا تو نہیں لگا۔“

”نہیں.....“ شبنم نے اس کے لہجے کی گرمی کو محسوس کر کے قدرے شرما کر کہا۔ ”اس دن تم راجو کی خاطر بنگالی پاڑہ گئے تھے لیکن واپسی میں تنہا تھے۔ جس کو ساتھ لانے کا کہہ کر گئے تھے۔ اس کو لاتے تو میں انکار بھی نہ کرتی۔“

”جانتا ہوں.....“

”پھر اب کس بات پر غور کر رہے ہو.....؟ کیا نہائی دھوئی میں تمہیں اچھی نہیں لگ رہی ہوں۔“ شبنم کے لہجے میں شوخی کھلنے لگی۔

”سچ بتا دوں.....“ افضل خان نے اس کے بازو تھام کر اس کی نظروں میں جھانکا۔ ”برائو نہ مانو گی؟“

”سامنے دروازہ کھلا ہے.....“ شبنم نے بالکونی کی سمت اشارہ کیا۔ ”کوئی سنسناتی ہوئی گولی آگئی تو.....“

”پہلے میری پشت پر لگے گی پھر..... پھر میں تمہیں بچانے کی خاطر ہاتھوں کے حصار میں لے کر ابدی نیند سو جاؤں گا۔“

”پلیز افضل.....“ شبنم یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ ”ایسی بری فال مذاق میں بھی منہ سے نہ نکالا کرو۔“

افضل خان کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دستی گھڑی پر نظر ڈال کر بولا۔ ”اس وقت کون آسکتا ہے؟“

”یہاں کھڑے کھڑے نظر نہیں آئے گا۔“ شبنم نے مسکرا کر کہا۔ ”دن کی روشنی میں خطروں کی گنجائش کم ہوتی ہے۔“

جواب میں پستول کی موجودگی کو ٹٹول لینے کے بعد ہی افضل خان دروازے کی سمت بڑھا۔ شبنم لاؤنچ میں رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں بھی دروازے ہی کی جانب تھیں۔

”اس نمبر پر فوری کال کر لیں۔“ کسی مرد کی ٹھوس آواز ابھری پھر افضل خان دروازہ بند کر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا لیے شبنم کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ کاغذ پر لکھے نمبروں کو وہ بار بار پڑھ رہا تھا۔

”کون تھا.....؟“

”میرا خیال ہے کہ نگرانی پر مامور کوئی سادہ لباس والا

ہوگا لیکن یہ نمبر..... مجھے یاد نہیں آ رہا کہ یہ کس کے نمبر ہیں؟“

جواب میں شبنم نے بھی ان نمبروں کو دیکھا۔ اس کے لیے بھی وہ انجانے ہی تھے۔ افضل خان ایک لمحے تک پر سوچتا رہا پھر اس نے سامنے میز سے اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملائے۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”کون بول رہا ہے؟.....“ کسی نے بھاری بھر کم آواز میں سوال کیا۔

”یہ نمبر مجھے کسی نے دروازہ ٹاک کر کے دیے ہیں۔“ افضل خان بہ دستور محتاط تھا۔

”اوہ، افضل خان..... میں کرل احتشام بول رہا ہوں۔“

”خیریت تو ہے سر..... اس وقت خادم کو کیسے یاد کیا.....؟“ افضل نے تری سے دریافت کیا۔

”تمہیں وہ انڈین وشنو تو یاد ہوگا جسے تم نے دوبارہ گرفتار کرانے میں میری مدد کی تھی۔“

”وہ میرا فرض تھا جناب..... اپنے اور قوم کے دشمنوں کی طرف سے میں کبھی غافل نہیں رہتا۔“

”اچھی عادت ہے لیکن انسان سے کبھی کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں سر.....“

”وہ باسٹرڈ میری قید میں مر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی جس کے بعد میں نے اس کی لاش ہندوؤں کے ایک مقامی ادارے کے حوالے کر دی تھی۔ انہوں نے بھی اس کی ڈرنی باڈی کو لکڑیوں کے ڈھیر پر رکھ کر آگ لگا دی تھی۔ جب تک آگ راکھ نہیں ہو گئی وہ ایک لمحے کو بھی وہاں سے نہیں ہٹے تھے۔“

”یہی رسم ہے جناب۔“ افضل خان نے کہا۔ ”آگ سرد ہونے کے بعد وہ وہاں سے راکھ جمع کر کے دریا میں بہا دیتے ہیں۔“

”اس کی نوبت نہیں آئی، اس لیے کہ..... وہ باسٹرڈ جس دم کا ماہر تھا، سانس روک کر اس نے ہم سب کو دھوکا دیا تھا پھر وہ آگ لگنے کے بعد ہی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو گیا.....“

”سر.....“ افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ کرل کی بات پر اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”جس نے تمہارے فلیٹ پر فائرنگ کی..... وہ بھی وہی تھا۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ افضل خان بری طرح چونکا۔ شبنم اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں

مصروف تھی۔

”یہ تمام باتیں ایس پی اورنگ زیب کے علم میں بھی ہیں..... تم کو اپنا نمبر بھیجئے گا بھی ایک خاص مقصد تھا۔ جس کو تم نے دوبارہ ہمارے حوالے کیا تھا اب اس کو ہمیشہ کے لیے موت کی غنڈہ سلائے کا کام بھی میں تمہیں سونپ رہا ہوں۔“

”میں اسے بھی ایک اعزاز سمجھوں گا سر..... لیکن اب اس کا ہاتھ آتا آسان نہیں ہوگا۔“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اس وقت وہ باسٹر ڈکھاں اور کس میک اپ میں ہے۔“ دوسری طرف سے سنجیدگی سے کہا گیا پھر جو تفصیل بیان کی گئی اسے افضل خان بڑی توجہ سے سنتا رہا اور ذہن نشین کرتا رہا۔ ”تم اپنی ذمہ داری نبھاتے وقت کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ میرے سادہ لباس والے بھی تمہارے آس پاس ہی موجود ہوں گے۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی سر..... میں بچان پر بیٹھ کر شکار کرنے کا عادی بھی نہیں ہوں۔“

”جانتا ہوں..... ایک بات اور سن لو..... تمہارا کام صرف اسے ٹھکانے لگانا ہے، اس کی ڈیڈ باڈی کو میرے آدمی سنبھال لیں گے۔“

دوسری جانب سے کال ختم کا سنگل ملا تو افضل خان نے موبائل آف کر کے رکھ دیا۔ شبیم نے بے چینی سے پوچھا۔

”کس کا فون تھا؟“

”کرنل احتشام کا.....“ نام بتانے کے ساتھ ساتھ افضل خان نے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بھی بیان کی تو شبیم بھی سنجیدہ ہو گئی۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ فلیٹ پر فائرنگ کرنے والا شاید ہمیں لٹا کر مارنے کا خواہش مند رہا ہوگا ورنہ وہ بلاوجہ گولیاں بھی ضائع نہ کرتا۔ مگر وشنو.....“

”تم فکر مت کرو..... میں بھی اسے لٹا کر ہی موت کے گھاٹ اتاروں گا۔“ افضل خان کی فوری ارادے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”وہ بھی ضرور جانتا ہوگا کہ افضل خان کس درندے کا نام ہے۔“

شبیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ افضل خان لپکتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو گنتے لگی، اس نے خوشی سے افضل خان کا ہاتھ تھام کر زندگی کا ہم سفر بنانے کا پروگرام طے کیا تھا لیکن حالات کے اس اچانک موڑ پر اس کے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ اور بے قراری کی کیفیت سر ابھار رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی..... ”اگر خدا نخواستہ افضل خان کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا

کرے گی..... کیا دونوں کے ارمان دل کے دل ہی میں گھر کر دم توڑ دیں گے؟“

اپنے خیالات کے تانے بانے میں الجھ کر شبیم کو وقت کا احساس بھی نہ رہا..... وہ اس وقت چونکی جب افضل خان دوبارہ اپنے کمرے سے ایسے میک اپ میں برآمد ہوا کہ وہ بھی ایک لمحے کو چونکی پھر اس کے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا۔

”تمہاری واپسی کب تک ہوگی.....؟“

”گھبراؤ مت..... میں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

”مم..... میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ شبیم نے قدرے جھجک کر کہا پھر اس نے افضل خان کا سیدھا ہاتھ تھام لیا۔ بڑے جذباتی انداز میں بولی۔ ”افضل میں پہلے بھی تمہاری امانت تھی اور اب..... اب میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تم کو اپنا ہم سفر بھی تسلیم کر رہی ہوں۔ اس وقت تم بھی میرے ساتھ ایجاب و قبول کی رسم پوری کر لو..... بعد میں نکاح کی سنت ادا کر کے ہمارے درمیان کوئی فاصلہ بھی نہیں رہے گا۔“

جواب میں افضل خان نے بھی شبیم کا ہاتھ تھام کر اسے اپنا تسلیم کر لیا پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پریشان مت ہونا۔ وشنو کو ٹھکانے لگانے کے بعد میں براہ راست کرنل احتشام سے کسی قاضی کے بندوبست کی درخواست کروں گا..... فی الحال تم سے ایک اجازت درکار ہے۔“

”وہ کیا.....“ شبیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ایک پیار.....“

جواب میں شبیم نے اسے شوخ نظروں سے دیکھ کر سر جھکا کر پیشانی اس کے سامنے کر دی۔ افضل خان نے اس کی پیشانی کو چومنا پھر اس کو جلد واپسی کی تسلی دیتا ہوا لمبے لمبے قدم اٹھاتا فلیٹ سے باہر چلا گیا۔

حالات کے پیش نظر شبیم نے حسب ہدایت اپنی خواب گاہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ سکندر علی شاہ کے حکم کے علاوہ اسے خود بھی اپنی غلطی کا احساس تھا۔ پروفیسر چنگ لائی نے یقیناً اس کے ساتھ فراڈ کیا تھا۔ وہ اس کے سحر میں گرفتار ہو کر اپنے ماضی کو دوبارہ کریدنے اور مستقبل کا حال جاننے کی خاطر اس کے بچھانے ہوئے جال میں پھنس گئی تھی۔ اس کا پکا یقین اس وقت ہو گیا تھا جب اس نے خود کو سرتاپا بے بس دیکھا تھا، ماضی میں شکار ہونے والی شبیم وقت سے پہلے کی عورت بن گئی تھی۔ سکندر علی شاہ کی حویلی میں جب وہ سرخ جوڑا پہن کر داخل ہو گئی تو اسے اپنے مقدر پر یقین نہیں آیا تھا۔ ایک بار کسی

کشتوں

کی درمیانی کشتار ہونے کے بعد کسی نے اسے سکندر علی شاہ کی ہوس کا نشانہ بننے پر مجبور کر دیا تھا اس روز اس نے یہی سوچا تھا کہ اب اس کی زندگی کسی ایک مرد کی آغوش میں نہیں مزرے کی لیکن پھر جس نے اسے سکندر علی شاہ کے پاس بھیجا تھا اسی کے اشارے پر سکندر علی شاہ نے پاؤں کی جوتی کو سر کا تاج بھی بنالیا تھا پھر شبیم نے زندگی کی آسائش ملنے کے بعد سوچا تھا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی سکون سے گزار دے گی لیکن سکندر علی شاہ کی فطرت آئے دن ایک تازہ شکار کرنے کی عادی تھی۔ شیلہ ورما کے بیوٹی پارلر جانے اور خود کو حویلی کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کا مشورہ بھی سکندر علی شاہ نے دیا تھا۔ باقی کٹر شیلہ ورما نے پوری کر دی۔

شبیم کے ماضی کی بھٹک مل جانے کے بعد خود شیلہ ورما کے اشارے پر جونی نے اسے شکار کیا پھر شیلہ ورما نے عین موقع پر سامنے آ کر شبیم کو ایک بار پھر اس کی نظروں میں مجرم بنادیا۔ بعد ازاں جب شبیم کو نئی لڑکیاں شکار کرنے کا کام سونپا گیا تو اس کے اندر کی مظلوم عورت جو پہلی بار خود حالات کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی اپنی ہم جنس دوسری لڑکیوں کی مجبوریوں سے اپنا انتقام لینے لگی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سکندر علی شاہ شبیم کی کارکردگی سے خوش تھا لیکن اسے اپنے مرتبے کا احساس بھی شدت سے تھا، شبیم کے جسمانی نشیب و فراز اسے بار بار کے استعمال کے بعد بھی پسند تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی بستر پر سونے کا عادی ہو گیا۔ شبیم سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھی لیکن.....

پروفیسر چنگ لائی نے بھی یقیناً اسے کسی مقصد کے تحت شکار کیا ہوگا۔ جس انداز میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ گہری غنودگی کا شکار ہوئی۔ وہ بھی یقیناً پہلے سے سوچی سمجھی کوئی سازش رہی ہوگی۔ جس حالت میں اسے حویلی بھیجا گیا وہ بھی پہلے سے پلان کیا ہوگا۔ حالات کے نشیب و فراز سے کھیلی کودی شبیم کو یقین تھا کہ بے ہوشی کے دوران بھی لے جانے والوں نے شخص اپنے کام سے کام رکھا ہوگا۔ اس کے جسم کو روندنا نہیں گیا..... مگر کیوں؟..... ایسا کیا مقصد تھا جس کے پیش نظر چنگ لائی سامنے آیا تھا..... کون تھا وہ؟..... کیا چاہتا تھا؟

اس وقت بھی اس کا ذہن اسی ایک سوال کو سلجھانے میں الجھ رہا تھا۔ کسی حد تک وہ اس راز کو پاگئی تھی کہ جن لوگوں نے اسے اغوا کیا وہ سکندر علی شاہ سے اپنی کوئی بات منوانے کے خواہش مند ہوں گے..... یہ بھی جانتی تھی کہ سکندر علی شاہ کسی سکے باؤ میں آنے والی اسامی نہیں تھی..... وہ شبیم جیسی سو لڑکیوں

کو بھی اپنی ضد پر قربانی کا بکرا بنانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اور بھی کئی سوالات تھے جو شبیم کے ذہن میں کلپلا رہے تھے جب اس کے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ سکندر علی شاہ کچھ دیر پہلے ہی کسی کام کا کہہ کر حویلی سے باہر گیا تھا۔ اس نے شبیم کو صرف خواب گاہ تک محدود کر دیا تھا۔ عام حالات میں سکندر علی شاہ اپنے فون خود ہی اٹینڈ کرتا تھا، دوسروں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔

شبیم کے کانوں میں گھنٹی کی آواز گونجتی رہی پھر بند ہو گئی لیکن دو منٹ بعد پھر سے نئے سرے سے گونجنے لگی۔ اس بار بھی شبیم نے فون سیٹ کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن جب تیسری بار پھر گھنٹی کی آواز ابھری تو شبیم نے یہ سوچ کر فون اٹھا لیا کہ شاید خود سکندر علی شاہ اسے چیک کرنا چاہتا ہو یا کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا کوئی ہوتا تو اتنی جلدی جلدی کال کرنے کی حماقت بھی کبھی نہ کرتا۔

”ہیلو.....“ اس نے ریسپونڈ کر دیا مگر آواز میں کہا۔

”شبیم بول رہی ہو.....؟“ ایک اجنبی لہجے نے سوال کیا۔

”آپ کون ہیں، کس سے بات کرنی ہے؟“ اس نے بہ دستور مہذب لہجے میں پوچھا۔

”میں..... پروفیسر چنگ لائی بول رہا ہوں سویت ہئی.....“ دوسری جانب سے بے تکلفی سے جواب ملا۔ ”فون بند کرنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ مجھے کچھ نایاب تصویریں بھی سکندر علی شاہ کو بھیجینی پڑیں گی۔“

”شاہ صاحب اس وقت حویلی میں نہیں ہیں..... پھر کسی وقت کال کرنا.....“ اس نے نفرت سے جواب دیا۔

”وہ رنگسار نہیں ہے یہی معلوم کرنے کے بعد تمہیں کال کیا ہے۔“ اس بار سنجیدگی سے کہا گیا۔

”اب کیا کام ہے مجھ سے.....؟“

”وہی کام جس کے لیے تمہیں اغوا کیا گیا تھا..... اور کوئی کام ہوتا تو.....“

”مطلب کی بات کرو.....“ شبیم نے بے رخی اختیار کی۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”ہم بھی وقت ضائع کرنے سے گریز ہی کرتے ہیں۔“ دوسری جانب سے بولنے والے کا لہجہ اور کھردرا ہو گیا۔ ”تم سے صرف ایک کام کی بات معلوم کرنی ہے.....“

”خامد کہاں مل سکے گا؟“

”میں..... کسی خامد کو نہیں جانتی۔“

”بکواس مت کرو.....“ جواب میں گرجتی ہوئی آواز

ابھری۔ ”ہوسکتا ہے کہ تم اس نام سے اسے نہ جانتی ہو لیکن میرا اشارہ اسی شخص کی جانب ہے جس نے تمہیں پہلی بار کلی سے پھول بنا دیا تھا۔ اسی نے شاید تمہارے شاہ صاحب کی دم پر پاؤں بھی رکھا ہوا ہے۔ ورنہ وہ تم جیسی استعمال شدہ عورت کو جو نیپڑی کی جیلہ کے بجائے حویلی کی گلیہ کی حیثیت بھی کبھی نہ دیتا۔“

گلیہ خون کا گھونٹ نی کران فٹس جلوں کو پی گئی۔ اغوا کرنے والے اس کی زندگی کی بہت سے کہانیاں جانتے تھے جس مقصد کے لیے اسے اغوا کیا گیا تھا اب وہ کھل گیا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں معلوم کیا جا رہا ہے خود سکندر علی شاہ بھی نہیں جانتا کہ اس کا نام کیا ہے؟ وہ کون ہے؟..... کہاں ہے؟..... گلیہ کوئی زندگی بھی اسی کے حکم سے ملے تھی ورنہ سکندر علی شاہ اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر گلیہ کو اسی حالت میں کسی نامعلوم جگہ دفنانے کا حکم ارادہ بھی کر چکا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“ ریسور پر جھلا کر سوال کیا گیا۔ ”کیا میں نے کوئی مشکل سوال کر دیا ہے؟“ ”میں نے کہاناں کہ میں کسی شیخ حامد کو نہیں جانتی۔“ وہ پھر تلملا کر رہ گئی لیکن خود پر فوراً ہی قابو پا کر بولی۔ ”میں صرف ایک ایسے فرد کو جانتی ہوں جو کبھی سامنے نہیں آیا لیکن..... شاہ جی بھی اس کے حکم سے کبھی انکار نہیں کرتے۔“

”اس کا کوئی نام بھی ہوگا؟.....“ ”نہیں..... فون بھی وہی کرتا ہے..... شاہ جی کے پاس اس کا کوئی مخصوص نمبر نہیں ہے۔“ ”مخصوص نمبر سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ ”وہ جو بھی ہے ضرورت سے زیادہ دورانہدیش اور محتاط ہے..... ہر بار نئے نمبروں سے کال کرتا ہے۔“

”گڈ.....“ اس بار دوسری جانب سے دوستانہ لب و لہجہ اختیار کیا گیا۔ ”تمہارے اور شاہ جی کی طرح ہمیں بھی اس کا کچھ پرانا قرض ادا کرنا ہے..... اس بات کا یقین بھی ہے ہمیں کہ سکندر علی شاہ کو موجودہ حیثیت تک پہنچانے والا بھی وہی تھا۔ بہر حال تم ہمارے ساتھ تعاون کر سکتی ہو.....“ ”مجھے جو معلوم تھا بتا دیا..... اب اگر شاہ جی کو تمہارے فون کی بھینک بھی مل گئی تو.....“

”ڈونٹ وری..... میں تمہیں پبلک بوتھ سے فون کر رہا ہوں..... تم ایسا کرو کہ کسی طرح ان تمام نمبروں کو نوٹ کر کے ہمیں بتا دو جو تمہارے خیال میں نئے ہوتے ہیں۔“ ”باقی کام ہم خود کر لیں گے۔“

”نہیں.....“ گلیہ نے ادھر ادھر دیکھ کر سبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اتنی ہمت نہیں کر سکتی۔ ایک معمولی سا شبہ بھی میری اذیت ناک موت کا سبب بن جائے گا۔“ ”تم کوشش کرو.....“ نرم لہجے میں دھمکی کی آمیزش بھی شامل تھی۔ ”میں پھر کسی ایسے وقت ہی فون کروں گا جب تمہارا دوغلا پیر حویلی سے باہر ہوگا۔“

”مم..... میں ایک چیز نوٹ کر کے تمہیں بتا سکتی ہوں۔“ گلیہ نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔ ”وہ وقت جب اس کی کال آتی ہے..... نمبروں کو معلوم کرنا تمہارا کام ہوگا۔“

”فی الحال یہی کرتی رہو.....“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

گلیہ نے سکون کا بڑا مختصر سانس لیا۔ فون کا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئی تھی لیکن اغوا کرنے والوں کے خطرے کی تلوار اس کے سر پر بہ دستور منڈلاتے رہنے کا خدشہ باقی تھا۔ وہ فون کے قریب ہی رکھے دیوان پر نیم دراز ہو کر اس برے وقت کے بارے میں سوچ رہی تھی جب وہ ایک خوب صورت اور نوخیز لڑکی کو شکار کرنے کی خاطر ریٹو گلب گئی تھی۔ لڑکی اس کے جال میں پوری طرح نہیں پھنسی تھی لیکن کسی نامعلوم شخص نے پروفیسر چنگ لائی کا روپ دھار کر اسے نہایت خوب صورتی سے اپنے بچھائے ہوئے سنہری جال میں پھانس لیا تھا۔ اب گلیہ کے پاس اسے برواشت کرنے کے سوا کوئی اور راستہ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ”آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا“ کی جیتی جاگتی مثال بن کر رہ گئی تھی۔ جو نیا موڈ ایک بار پھر اغوا کرنے والوں نے پیدا کر دیا تھا اس سے فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

شہر سے قریب وہ بھی ایک خالی میدان تھا جس میں وقت کے ساتھ ضرورت مندوں نے چھوٹی بڑی عارضی رہائش گاہیں بنا رکھی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس میدان کے بجائے غریبوں کی کچے کچے مکانوں پر مشتمل ایک بستی وجود میں آگئی۔ آہستہ آہستہ سیاسی جوت توڑ کرنے والوں نے اس بستی میں بجلی اور پانی کی ضرورت بھی گھروں میں مہیا کر دی۔ متعدد بار اس مہنگی زمین کو خالی کرانے کا مسئلہ زیر غور آیا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اس پر سیاسی دباؤ نے پردہ ڈال دیا۔

افضل خان نے یہاں تک سفر ایک بس میں طے کیا تھا۔ بس سے اتر کر وہ کچھ دیر بعد اس بستی میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلے بھی ایک دوبار یہاں آچکا تھا اس لیے جو پتا اسے دیا گیا تھا

وہاں تک پہنچنا اس کے لیے زیادہ دشوار بھی نہیں تھا۔ میک اپ کے اعتبار سے وہ بھی اسی بستی کا کوئی رہائشی نظر آ رہا تھا۔ مختلف جگہوں سے گزرتا ہوا اس مکان کے سامنے سے بھی گزر گیا جو اسے مطلوب تھا، اس نے دیدہ و دانستہ ایسا کیا تھا، کچھ دور آگے جانے کے بعد وہ اس طرح رک کر جھپٹیں مٹولنے لگا جیسے جلدی میں کوئی چیز یاد آگئی ہو پھر وہ پلٹ کر قدم اٹھانے لگا۔ مقصد کسی ممکنہ تعاقب سے آگاہ ہونا تھا۔ گلیوں میں دو چار بچوں کے سوا کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آیا جس پر وہ شبہ کر سکتا۔ اطمینان سے قدم اٹھاتا وہ مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ دروازے کی کنڈی دوبار کھڑکھڑانے کے بعد وہ قدرے آڑ میں ہو گیا تھا تا کہ اندر سے اسے دیکھا نہ جاسکے۔

”کون ہے؟.....“ دروازے کے دوسری جانب سے کسی نے کھانتے ہوئے دریافت کیا۔

”ماسٹر جی کے گھر آج شام فاتحہ ہوگی.....“ افضل خان نے آواز بنا کر کہا۔ ”اطلاع دیتا پھر رہا ہوں۔“

دوسری سمت سے دوبارہ صرف کھانسی کی آواز یہ طور تصدیق ابھری۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ افضل خان نے دائیں بائیں دیکھا، سامنے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ نگاہیں چار ہوئیں تو بوڑھے نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اپنی شناخت بھی کر دی، وہ کرنل کا کوئی سادہ لباس والا تھا۔ جواب میں افضل خان نے بھی وہی اشارہ کیا پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بجلی کا کھمباتام کر اسے دی جانے والی دائرے کے شکل والی سینٹ کی سپورٹ پر قدم جما کر کھڑا ہو گیا۔ مطلوبہ مکان کی دیوار کا فاصلہ دو فٹ سے زیادہ نہیں تھا، اس نے محتاط انداز میں جسم کو قدرے لوچ دے کر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیوار تک پہنچ گیا۔ سامنے کچے محن میں موجود شخص چونکا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو افضل خان نے اس کے قد و قامت سے اندازہ لگا لیا کہ وہی دشمن ہوگا۔ پلک جھپکاتے ہی اس نے جیب سے آٹو بیگ پستول نکال کر میک اپ میں نظر آئے فرد پر تان لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اب میں تمہیں دوبارہ جس دم کا مظاہرہ کرنے کا موقع بھی نہیں دوں گا.....“ جملے کی اداسگی کے ساتھ ہی اس نے سیدھے ہاتھ کے شانے کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ محن میں موجود شخص جو دشمن کے سوا کوئی اور نہیں تھا لڑکھڑا گیا مگر اس سے پیشتر کہ افضل خان جیب لگاتا یا دوسرا فائر کرتا۔ دشمن پھرتی سے اٹھ گیا۔ تیزی سے بہتا ہوا خون اس کے لباس کو سرخ کر رہا تھا پھر بھی دشمن نے الٹا ہاتھ

افضل خان کے پستول پر ڈال دیا۔ کسی زخمی سائڈ کی طرح اس نے افضل خان کو ہاتھوں کے حصار میں لینے کی کوشش کی۔ دونوں ہی لڑکھڑا کر کچے فرش پر گر کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاطر زور لگانے لگے۔

افضل خان دوسرا فائر کرنے کے لیے زور لگا کر موقع تلاش کر رہا تھا لیکن دشمن بار بار اس کی کوشش کا توڑ کر رہا تھا۔ ”تم زیادہ دیر خود کو موت سے نہیں بچا سکو گے دشمنو..... اس بار تمہارا کریا کرم بھی میں کروں گا۔“

”میں بھی گولیاں ضائع کرنے کے بجائے کسی دوسرے سے (وقت) کی راہ دیکھ سکتا تھا لیکن میں مرد ہوں.....“ دشمن نے زور لگاتے ہوئے خوشخوار لہجے میں جواب دیا۔ ”تم کا رُہو جو تم نے چھپ کر وار کیا..... میں تمہیں آسانی سے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔“

افضل خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا..... کچھ دیر پیشتر وہ دیوار پر جس پوزیشن میں تھا اگر وہیں سے اس نے دشمن کے جسم پر چیمبر میں موجود گولیاں تڑتڑادی ہوتیں تو کھیل اسی وقت ختم ہو جاتا۔ اس وقت بھی زخمی دشمن پر ایک اعتبار سے بھاری تھا۔ مگر وہ کسی کیلئے ہی کی طرح اس کے جسم کو اپنے زخمی ہاتھوں اور پیروں کی گرفت میں لینے کی خاطر یہ زور زور لگا رہا تھا جب دروازے پر کسی نے زور سے بوٹ کی ٹھوک مار کر کہا تھا۔

”دروازہ کھولو..... ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے.....“ دشمن کی توجہ ایک پل کو آواز کی سمت گئی، خطرے کا نیا احساس بھی اس کے ذہن میں ضرور ابھرا ہوگا۔ اسی دوران افضل خان نے اس کے جسم کے نازک حصے پر گھٹنوں کی ضرب لگائی تو دشمن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وقت ضائع کیے بغیر افضل خان نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار گولی دشمن کے سینے کے بائیں جانب لگی تو وہ تڑپ کر چاروں خانے چت ہو گیا۔ افضل خان پھرتی سے اٹھا۔ آگے قدم بڑھا کر اس نے الٹے ہاتھ سے دروازے کی کنڈی کھولی پھر اس نے تیسرا فائر کیا جس نے دشمن کے سیدھی ران کو خون سے تریز کر دیا۔ وہ ربر کی کسی گیند کی طرح اچھلا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی تیزی سے اندر آ گئے۔ دروازہ دوبارہ اندر سے بند کر لیا گیا۔

”آپ نکل جائیں صاحب.....“ ایک سادہ لباس والے نے افضل خان سے کہا۔ ”ہم حکم کے مطابق اس ولد الحرام کو ڈنڈا ڈولی کر کے کرنل صاحب کے روبرو پیش کر دیں گے۔“

”نہیں.....“ افضل خان نے سرسراتے لہجے میں کہا۔
”کرنل صاحب نے مجھے اس کو اوپر پہنچانے کا کام سونپا تھا۔“
دشتو نے پلٹ کر خون آلود نظروں سے افضل خان کو
گھورا پھر فرش پر حقارت سے تھوک دیا لیکن اس کے بعد وہ
موت کے بے رحم ہاتھوں سے خلاصی بھی نہیں کرسکا۔ افضل
خان نے اس بار اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا،
دشتو منہ کے بل فرش پر اوندھ گیا، اس کا بھیجا نکل کر باہر
آگیا، وہ دم توڑ چکا تھا لیکن افضل خان نے پستول میں بچی
ہوئی باقی گولیاں بھی اس کے جسم میں اتار دیں۔

پھر وہ..... دشتو کے مردہ جسم پر آخری نظر ڈال کر
جانے کے ارادے سے پلٹا تو ایک سادہ لباس والے نے
ہاتھ میں دیا موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
”کرنل صاحب کی کال ہے۔ آپ کے لیے.....“
”سر.....“ افضل خان نے موبائل لے کر فاتحانہ
انداز میں کہا۔ ”میں نے آپ کے مطلوبہ مقرر مجرم کی
کھوپڑی کے ٹکڑے اڑا دیے ہیں..... اور کوئی حکم؟.....“
”یو آر گریٹ ینگ مین.....“ کرنل کی آواز
ابھری۔ ”اب تم وہاں سے نکل جاؤ..... میرے سادے
لباس والے اس باسٹرو کی ڈیڈ باڈی بھی اٹھالیں گے۔“
”رائٹ سر.....“ افضل خان نے موبائل سادہ لباس
والے کے سپرد کر دیا۔ دروازے سے باہر نکلا تو وہاں ایک
سادہ لباس والا اور موجود تھا۔

”میرے پیچھے پیچھے آجائیں جناب..... آپ کو آپ
کے اپارٹمنٹ تک یہ حفاظت پہنچانے کی ذمہ داری بھی
ہماری ہے۔“

افضل خان نے انکار نہیں کیا۔ وہ سادہ لباس والے
کے ساتھ گلی عبور کر کے تیزی سے اس راستے کی سمت بڑھنے
لگا جدھر سادہ لباس والا اس کی رہنمائی کر رہا تھا..... دشتو کا
قصہ پاک کرنے کے بعد اس کے ذہن میں شبنم کے آخری
الفاظ کے ساتھ نکاح کی سنت ادا کرنے کا خیال ابھرا تو اس
کی ساری تھکن بھی دور ہو گئی۔

شام کی چائے سراج نے اورنگ زیب سے فون پر
بات کرنے کے بعد ہی پی لی تھی۔ اورنگ زیب نے جلدی
واپس آنے کی بات بھی کی تھی لیکن وہ رات کے کھانے کے
وقت تک نہیں آیا تھا۔

سراج کے علاوہ خود الماس بھی اسی کی راہ تک رہی تھی
جب سراج نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم کھانا بھی کھالیں.....“ اس کے
لہجے میں جھلاہٹ تھی جسے محسوس کر کے الماس نے سنجیدگی
سے دریافت کیا۔
”آپ کس بات پر الجھ رہے ہیں؟..... فون کر کے
معلوم کر لیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اہم کام میں مصروف
ہوں۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ منظر عام سے غائب ہو گئے
ہوں.....“

”ایسی بری قال زبان سے کیوں نکال رہے ہیں؟“
الماس نے سراج کو ٹوکا۔

”یہ میرے نہیں..... خود ان ہی کے الفاظ ہیں.....“
سراج نے بہ دستور الجھ کر جواب دیا پھر حالات کی کڑیاں
ملانے لگا۔
دشتو کے افضل خان کے فلیٹ پر قارئین کے بعد
جب سراج نے یہ کہا تھا کہ ”ہو سکتا ہے آکٹوپس کے شکاری
کتے بھی آپ کے سادہ لباس والوں کا تعاقب کر رہے
ہوں۔“ اس وقت اورنگ زیب نے کچھ سوچ کر بے حد
گھمبیر لہجے میں کہا تھا کہ..... ”موجودہ حالات کی روشنی میں
شاید مجھے بھی منظر عام سے ہٹنا پڑے۔“ پھر سراج کی
وضاحت پر اس نے حسب معمول وہی پرانی بات کہی تھی
کہ..... ”تم صرف ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر
ہو جبکہ قانون شکنی کرنے والوں کو حوالات کے پیچھے تک
پہنچانے کی خاطر بھی کبھی قانونی کارندوں کو بھی غیر قانونی
حرے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔“

اس کے علاوہ صبح سے سراج اسے کئی بار فون کر چکا
تھا۔ اورنگ زیب نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ آئی جی نے اس
کی طویل چھٹی کی درخواست منظور نہیں کی۔ اس کے بعد وہ
آفس سے نکل کر کرنل احتشام کی طرف گیا تھا، یہ بھی کہا تھا
کہ واپسی پر وہ تفصیل سے بہت سی اہم باتیں بتائے گا لیکن
اس کے بعد سے اب تک نہ وہ آیا تھا نہ ہی اس نے فون کیا
تھا۔ اسی نے تاکید کی تھی کہ خود سراج بھی اسے بار بار فون
کرنے سے گریز کرے۔

سراج بڑی دیر تک حالات کے تاتے پاتے
ملا تار رہا۔ کرنل احتشام نے دشتو کو مردہ سمجھ کر اس کی لاش کو
ہندو تنظیم کے حوالے کر دیا تھا پھر چتا کی آگ جل کر راکھ
ہو جانے کے بعد دشتو کی کرایا کرم کرنے والے بھی اس راز
سے بے خبر ہی رہے کہ جس کو جلا کر راکھ کرنے کا خواب دیکھ
رہے تھے وہ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا

تھا۔ اگر اورنگ زیب نے اپنے شبے کی تصدیق کی خاطر
ذہانت سے کام نہ لیا ہوتا تو شاید یہ سوال بھی تشنہ رہ جاتا کہ
افضل خان کے فلیٹ پر گولیاں کس نے چلائی تھیں؟
”آپ کیا سوچے جا رہے ہیں؟“ الماس کی آواز
کانوں میں گونجی تو سراج کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔
”کچھ مجھے بھی تو بتائیں کہ بھائی اورنگ زیب نے منظر سے
ہٹ جانے والی بات کیوں کہی تھی.....؟“

”کچھ مجرموں کو ہتھکڑیاں پہنانے کی خاطر وہ بھی
غیر قانونی اقدامات کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔“
”آپ انہیں فون کر کے معلوم کر لیں پلیز۔“ الماس
نے بڑی اپنایت سے کہا۔ ”اتنی دیر تو وہ بتائے بغیر بھی آپ
سے دور نہیں رہے.....“

ٹھیک اسی وقت اورنگ زیب قدم اٹھاتا اندر آیا۔
اس نے شاید الماس کی بات سن لی تھی۔ کرسی پر سراج کے
برابر بیٹھنے کے بعد اس نے بڑی مصومیت سے پوچھا۔
”کون کم ہو گیا؟..... کس کو فون کرنے کی بات ہو
رہی تھی.....؟“

”ہیں ان کے ایک چہیتے بھائی صاحب جنہوں نے
مجھے بھی بھوکا مار دیا ہے۔“ سراج نے بچوں کی طرح بے
مہربانی کا مظاہرہ کیا تو الماس اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

”تمہارے لیے ایک گرما گرم اطلاع ہے۔“
اورنگ زیب نے سراج سے کہا۔ ”دشتو مار دیا گیا..... میری
خواہش پر خود کرنل نے فون کر کے افضل خان کو یہ نیک کام
انجام دینے کی تاکید کی تھی۔“

”گڈ.....“ سراج نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”کیا اس
بار یقین کر لیا گیا ہے کہ دشتو نے جس دم کے بجائے کوئی
دوسرا داذ تو نہیں آزمایا؟“

”اب اس کے امکانات نہیں ہیں..... دشتو کا بھیجا
بھی اس کی کھوپڑی سے باہر نکل چکا ہے۔“ اورنگ زیب
نے شروع سے آخر تک کی تمام تفصیل بیان کرتے ہوئے
کہا۔ ”کرنل احتشام نے اس بار دشتو کو میری نگرانی ہی میں
بھر دھاک کیا ہے۔ اس کا چپٹر (Chapter) اب ہمیشہ
کے لیے بند ہو گیا.....“

الماس کھانے کے ساتھ خود بھی آگئی تو سب کھانے
میں محو ہو گئے۔

”آپ آئندہ کبھی اتنی دیر نہیں کریں گے۔“ الماس
نے براہ راست بڑی اپنایت سے اورنگ زیب سے
درخواست کی۔ ”میرے علاوہ کچھ اور لوگ بھی پریشان

کشتوں

ہو جاتے ہیں۔“

”تمہاری شکایت بجا ہے مگر آج کچھ مجبوری تھی جو
میں فون کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔“

کھانے کے دوران الماس اور اورنگ زیب مل جل
کر ڈھکے چھپے لفظوں میں سراج پر حملہ کرتے رہے جبکہ سراج
سنجیدگی سے بھوک کے ساتھ انصاف کرنے میں مگن رہا.....
کھانے کے بعد حسب معمول الماس کافی بنانے گئی تو سراج
اور اورنگ زیب لاؤنج میں آگئے۔ ”آئی جی نے آپ کی
چھٹی کی درخواست کیوں نامنظور کر دی؟“

”تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ آئی جی ہونے کے
باوجود کسی نامعلوم شخص کے زیر اثر ہے۔ اس کی کہانی تم بھی
جانتے ہو۔“ اورنگ زیب نے قدرے سنجیدگی سے کہا پھر
مسکرا کر بولا۔ ”آج کسی کا فون میری موجودگی میں آئی جی
نے سنا تھا..... اس کے بعد اس نے میری درخواست کی
نامنظوری کے عوض مجھے میری پرانی سیٹ پر پوسٹ کرنے کی
آفر بھی دی ہے۔“

”خدا کا شکر ہے.....“ سراج نے سکون کا سانس لیا۔

”میں بھی اب اس اضافی چارج سے تنگ آنے لگا ہوں۔“
”اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔“ اورنگ زیب
نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اس پیشکش سے دو ٹوک انکار
کر دیا ہے۔“

”کوئی مصلحت؟.....“

”عقل استعمال کرو..... کسی کو میرا نظروں سے دور
رہنا گوارا نہیں ہے۔“

”آئی۔ سی.....“ سراج نے اپنی غلطی تسلیم کی پھر
پہلو بدل کر بولا۔ ”حالات کی روشنی میں آج ایک خیال میں
بھی ظاہر کروں گا۔“

”کیا.....“

”اب تک آکٹوپس ہر موقع پر شکوہ اور جواب شکوہ کے
اصول پر عمل کرتا رہا ہے..... دشتو کے قیمتی نقصان کے بعد اب
ہمارا بھی کوئی اہم مہرہ ہی خطرے کی زد میں آئے گا۔“

”گڈ.....“ اورنگ زیب نے اسے تعریفی نظروں سے
دیکھا۔ ”پہلی بار تم نے دورانہدیشی کا ثبوت دیا ہے۔ مہرے
کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی نام بھی ہوگا۔“

”وہ..... وہ ہم دونوں میں سے بھی کوئی ہو سکتا ہے۔“

سراج نے کچھ توقف سے جواب دیا۔

”ایسا نہیں ہوگا۔“ اورنگ زیب نے بڑے اعتماد
سے کہا۔ ”آکٹوپس فی الحال اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ

”اس عارضی اور مبہم سہارے کو دل سے نکال دو.....
جانے والے بھی واپس نہیں آتے۔“

جواب میں خالد ریاض کی نگاہوں میں ایک حسرت
بھری چمک پیدا ہوئی اور اس کے بعد..... وہ کسی کھٹکے کی

اس نے نظریں لٹھا کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خواب گاہ میں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اپنی وحشت کو دور کرنے کی

سوال کیا..... ”کیا دروازہ بند نہیں تھا.....؟“

شانے اچکائے پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا۔ ”تم سوتو نہیں
 رہتے؟“

”اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”نہیں..... فی الحال تمہاری موجودگی ہی کافی ہے۔“
تھریا نے غینہ کو خیر باد کہہ دیا..... منڈم روئی اس کی

خاصی دیر تک میڈم روپی اور تھریسا کے درمیان

”میرے سامنے اٹھ کر حسب معمول دروازہ بھی

میڈم روبی نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔
اس وقت بھی اسے اس بات کا مکمل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ

نے اپنے گارڈز میں بھی اسی احتیاط کے پیش نظر اضافہ کر دیا تھا کہ جو حادثہ تقریباً کو پیش آچکا تھا کہیں اس کے سلسلے میں

اس نے بیڈ سوچ کے ذریعے ٹائٹ بلب کے علاوہ تمام
 آئش آف کر دیں لیکن..... اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس

ی روی ان ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی سرسراہی آواز
بھی واضح طور پر ابھری۔

میدم روبی نے دوپارہ اُٹھ کر اپنی سیٹروں سے ریٹنگ روم کی جانب دیکھا، وہاں جو بھی تھا اس کے جسم پر

آنے والے کی نظروں میں کسا زہر لے لے تا حک جیسی

کھلے رہ جانے کا مسئلہ بھی میڈم روپی کے سمجھ میں آ گیا۔ وہ
سے حیرت سے گھورتی رہی، خود کو اپنی ہی حقیقت کے نیچے

وئے جسم کے مالک اجنبی نے پاٹ لہجے میں سوال کیا۔
 ”کون ہو تم؟.....“

”چوروں کی طرح یہاں ہس آئے ہو تو اس کا کچھ
نقصد بھی ہوگا؟“ میڈم نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

اكتوبر 2013ء

پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”یہ مت بھولو کہ ابھی باہر میرے کچھ گارڈز بھی

”یہ سوچنا میرا کام ہے جان من.....“ اس نے میڈم
روٹی کو سر تپا غور سے دیکھا۔ ایک لمحے دیکھتا رہا پھر بے حد

”جانتے ہو تم کس سے مخاطب ہو؟“ میڈم نے تلملا کر

آنے والے نے ہاتھ بڑھا کر اپنے چہرے سے

میں سڑک کے والوں اور میں..... میں حامد کا..... پہلے
 سے مانگ اتار دینے کے بعد بھی وہ نڈر اور بے خوف ہی
 نظر آتا رہا۔

اس نے غالباً تمہیں میرے بارے میں کسی خدشے سے

ایکسپٹ میں ہلاک ہو گیا۔ پولیس آج تک قاتل کا ر
ڈر انچور کا سراغ نہیں لگا سکی۔ تم اس کی ڈیڈ باڈی لے کر آئی

اور حقارت کے تاثرات کو غور سے دیکھا پھر بے پروائی سے بولا۔ "اس کو دفنانے کے بعد تمہارے ذہن میں مجھ سے

”تم..... تم میرے خیال میں دنیا کے سب سے گھٹیا اور نیچے ترین شخص“

www.ck12.org

پہلے تم نے میرے نمک حرام ثابت ہو جانے والے ایک پالتو
گتے افضل خان کو مرنے والے کی من گھڑت آخری خواہش

نہیں ہے۔ میں جب چاہوں ایک اُستارے پر تم کو لٹا دوں گا۔
 ہوں لیکن..... میں ایسا نہیں کروں گا..... مجھے اپنے تعاقب
 سے بچنا ہے۔“

”ڈی آئی جی..... باسٹرڈ آغا منظور کے سامنے بھی تم

مردہ پھر کے پرناو کی یقینیت پیدا ہوئے۔ زندگی میں تو کیا..... مرنے کے بعد بھی میرے کچھ وفادار کہ تمہیں آغا منظور سے شادی نہیں کرنے دوں گے۔ سن

”اب میدان میں صرف ایک آخری سر پھر اباتی ہے

اور نگ زیب کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے دن بھی گئے چپے رہ گئے ہیں۔“

”ایک بار تم میرے گھر میں آئی تھیں..... میں چاہتا تو اس وقت بھی تمہارے بدن سے کھیل سکتا تھا مگر نہیں.....“

ہستی مسکراتی میری آغوش کی زینت ہے۔“

”میں ایسے حالات پیدا کر دوں گا کہ تم مجبور ہو جاؤ گی۔“

سرداریات

ایک سردار بچپن سے ہی حیران، پریشان اور فل ٹیشن میں تھا یہ سوچ کر کہ میری بہن کے دو بھائی ہیں اور میرا ایک بھائی کیوں؟

☆☆☆

سردار ہارڈ ویئر کی دکان سے کھڑکیاں لایا اور کمپیوٹر پر فکس کرنے لگا۔

کیوں؟

کیونکہ کسی نے سردار کو کہا تھا کہ کمپیوٹر میں نئی ونڈوز انسٹال کرو۔

☆☆☆

ایک سردار امتحان میں گیا اور ساتھ میں ایک پلیمبر کو بھی لے کر گیا۔

کیوں؟

اس لیے کہ سردار کو خبر ملی تھی کہ پلیمبر لیک ہو گیا ہے۔

☆☆☆

تین سردار قلم شعلے دیکھنے گئے۔

ہیرو نے کہا: ”بسنی ان کتوں کے سامنے مت ناچنا۔“
سردار کھڑے ہو کر بولا: ”ٹکٹ لیا ہے اس کا باپ بھی ناچے گا۔“

سردار: ”ڈاکٹر صاحب پلاسٹک سرجری کروانے میں کتنا خرچہ آئے گا؟“

ڈاکٹر: ”باج لاگھ۔“

سردار: ”اگر پلاسٹک ہم دیں تو؟“

☆☆☆

ٹیچر: ”بڑے ہو کر کیا بنو گے؟“

سردار: ”میرا باپ کہتا ہے کہ جتنی مرضی پڑھ لو وہ نہیں بن سکتے جو چاہتے ہو۔“

ٹیچر: ”تم کیا بننا چاہتے ہو؟“

سردار: ”لیڈی ڈاکٹر۔“

☆☆☆

سردار: ”اسٹیشن جانے کے کتنے پیسے لو گے؟“

رکشے والا: ”پچاس روپے۔“

سردار: ”میں لے لو۔“

رکشے والا: ”20 میں کون لے کر جائے گا۔“

سردار: ”تم پیچھے بیٹھو ہم لے کر جائے گا۔“

مرسلہ: نابیر عباس، نگلیانہ روڈ، کھاریاں

میں گونجے کسی نغمے کی دھن کو انجوائے کر رہا ہو لیکن اس کا ذہن خاص طور پر اس فون لائن سے ابھرنے والی آوازیں سن رہا تھا جو سکندر علی شاہ اور نگینہ کی مشترکہ خواب گاہ میں تھا۔ دو تین کالیں اس کے مقصد کی نہیں تھیں۔ لوچن کو کوئی جلدی بھی نہیں تھی پھر اتفاق سے اسے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پچاس منٹ کے انتظار کے بعد جو کال اس نے سنی اسے سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ حسب معمول فون سکندر علی شاہ نے ریسو کیا تھا لیکن پھر دوسری جانب سے اسے جس لب و لہجے میں مخاطب کیا گیا وہ کسی مرید یا دوست کا نہیں تھا۔

”میں نے اس وقت تم کو ایک اہم اطلاع دینے کی خاطر فون کیا ہے..... کان کھول کر میری ہدایت نوٹ کرو.....“ کسی نے ایسی آواز میں گفتگو کا آغاز کیا جیسے کوئی بڑا افسر اپنے کسی چہرے سے مخاطب ہو۔

”سن رہا ہوں.....“ سکندر علی کی آواز ابھری جس میں محسن کا احساس بھی تھا۔

”نگینہ اب قابل اعتماد نہیں رہی..... تمہارا کیا اندازہ ہے اس سلسلے میں؟“

”ریجنو کلب سے اغوا کیے جانے کے بعد وہ جس حالت میں ملی تھی میں نے اسی وقت کہا تھا کہ اب اسے قارع کر دیا جائے۔“ سکندر علی شاہ نے بے حد بیزارگی سے جواب دیا۔

”وہ وقت مناسب نہیں تھا..... لیکن اب.....“ ایک لمحے کے توقف کے بعد سوال کیا گیا۔ ”اس وقت وہ کہاں ہے؟“

”تین چار منٹ پہلے شاور لینے کے ارادے سے غسل خانے میں لگی ہے.....“

”تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میں نے پہلے تمہیں اس کے بارے میں برداشت کرنے کو کیوں کہا تھا اور اب..... اسے ناقابل اعتماد کیوں اور کس وجہ سے کہہ رہا ہوں.....“

”جس سے نفرت ہو جائے میں اس پر زیادہ توجہ بھی نہیں دیتا۔“

”تم بھول رہے ہو کہ اس وقت کس سے مخاطب ہو.....؟“ اس بار دوسری جانب سے جتنی انداز میں کہا گیا۔

”اب کیا حکم ہے میرے لیے.....؟“

”اسی انداز میں آئندہ بھی گفتگو کرنے کی عادت ڈالو..... میں نے تمہیں بتایا ہے تو بگاڑ بھی سکتا ہوں۔“

”جانتا ہوں.....“ سکندر علی شاہ نے بے بسی کا

قابل بھی نہیں رہو گی.....“ اس پیغام کے نیچے آنکھوں کی شبیرہ والی مہر بھی موجود تھی۔

www

لوچن اس وقت بھی میک اپ میں تھا۔ اس نے اپنے آنکھوں کی مخصوص چائیز علامتوں کو گھر گلاس کے پیچھے چھپانے کی خاطر چشمہ لگا رکھا تھا اس نے نگینہ سے جو معلومات حاصل کی تھیں وہ کافی نہیں تھیں اس لیے اب وہ از خود سکندر علی شاہ کے گھر کے دو نمبروں کو خاص طور پر ایک جدید ڈیوائس کے ذریعے چیک کر رہا تھا۔ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اس نے جیب میں پاکٹ سائز ٹرانسمیٹر رکھا ہوا ہے اور کانوں میں اسی کا ایئر فون لگا رکھا ہوگا لیکن یہ ایک مخصوص ڈیوائس تھی جسے لوچن نے بہت عرصے قبل سیو دیوں کے ایک خفیہ ایجنٹ سے منہ مانگے داموں کے عوض اس وقت خریدا تھا جب وہ کسی مہم میں زخمی ہونے کے بعد ایک اسپتال میں معذور پڑا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس ایجنٹ کو کھل کر بتا دیا تھا کہ وہ زندگی میں اب دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس ڈیوائس کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر اس کے دوسرے کلب نما مختصر حصے کو ایئر فون کے جکشن بکس کے قریب مطلوبہ لائن پر لگا دیا جائے تو ایک مخصوص فاصلے کے دوری کے باوجود اس لائن پر ہونے والی گفتگو ایئر فون پر سنی جاسکتی تھی جس کے تاروں سے منسلک دوسرے لپ اسٹک سائز کے سیلڈ بند حصے کو جیب میں رکھا جاتا تھا۔

نگینہ سے ہونے والی گفتگو کے بعد لوچن نے ایڈا رہائش بھی فوری طور پر تبدیل کر دی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ جگا بھی تھا جو اس کے خیال میں دوسری پارٹی کی نظر میں آگیا تھا۔ یہ شبہ اسے ریجنو کلب میں اس وقت ہوا تھا جب وہ نگینہ کو دھوکا دے کر ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اکثر عورتوں کی طرح اپنے مستقبل کے بارے میں قبل از وقت جان لینے کی خاطر نگینہ نے بھی اسے کوئی مستقبل شناس سمجھ کر اس کے ساتھ جانا منظور کر لیا تھا۔ جگا کے بارے میں اس کا شبہ اس وقت درست ثابت ہوا جب جگا کے فرنیچر مارٹ پر حملہ ہوا تھا۔ اگر لوچن نے بروقت سامنے آکر بازی نہ پلیٹی ہوتی تو جگا تنہا ان دشمنوں کا مقابلہ بھی نہ کر پاتا جو اسے دوسری دنیا کے سفر پر روانہ کرنے کی خاطر بڑے منظم طریقے سے آئے تھے۔ اسی بہانے جگا سے اس کی دوستی کی بنیادیں بھی زیادہ مستحکم ہو گئی تھیں۔

لوچن اس وقت ایک ووکس ویگن کار میں تنہا بیٹھا اس کے اسٹیرنگ پر اس انداز میں انگلیاں چلا رہا تھا جیسے کانوں

سے میری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ..... ورنہ.....“
”ایسی کوئی غلطی نہ کرنا.....“ شیخ حامد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مفت میں تمہارے بہت سے گارڈ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔“

”اور کیا بکواس کرنا باقی رہ گیا ہے.....؟“
”جس طرح میں تمہاری خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اسی طرح تمہیں زبردستی دیوچ کراہتی بھوک بھی مٹا سکتا تھا۔ کیا تم میرا یہ احسان نہیں مانو گی؟“
”نہیں.....“ میڈم روبی نے بل کھا کر نفرت کا اظہار کیا۔ ”جو کچھ کمینگی کا ثبوت تم دیتے وہ تمہاری دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ ہوتی۔“

”ایک آخری بات اور سن لو..... میں اس وقت جس گارڈ کی وردی میں ہوں وہ مرا نہیں..... بے ہوشی کی حالت میں تمہیں زندہ مل جائے گا..... میرا ایک پیغام اپنے چہیتے ایس پی تک بھی پہنچا دینا..... وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ لے..... یہی اس کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا اور..... دوبارہ جب میں تمہارے سامنے آؤں گا تو تم میری خواہش کی تکمیل سے انکار کی پوزیشن میں نہیں ہو گی۔“

میڈم روبی نے جواب میں پھر حقارت سے تھوک دیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ شیخ حامد زبردستی اس کے ساتھ دست درازی نہیں کرے گا۔ جواب میں وہ سینہ تانے کھڑا چند لمحے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو دیکھتا رہا پھر..... بجلی کی تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے میڈم روبی کو سیدھے ہاتھ سے دیوچا..... الٹا ہاتھ جس میں اس کا رومال تھا اس کے ناک اور منہ پر رکھ دیا۔

ناگوار خوشبو کے احساس نے میڈم روبی کو صورت حال کا احساس دلایا تو اس نے خود کو شیطانی گرفت سے آزاد کرانے کی خاطر بھرپور مزاحمت کرنی چاہی لیکن رومال سے پھوٹنے والی تیز مہک نے اس کے پورے وجود پر غنودگی کی کیفیت طاری کر دی۔ اس کا ذہن گھپ اندھیروں میں ڈوب گیا..... پھر

دوبارہ ہوش آنے پر اس نے خود کو جس حالت میں پایا اس نے شیخ حامد کے آخری جملوں کے مفہوم بھی واضح کر دیے..... اس کا اوپری جسم بالکل برہنہ تھا جہاں ایک ٹائپ شدہ پیغام بھی کاغذ کے ٹکڑے پر موجود تھا۔ میڈم روبی نے اپنے برہنہ جسم کو چھپا کر اس پیغام کو پڑھا۔

”دوبارہ میری خواہش پوری ضرور کرنا ورنہ..... تمہاری تصاویر اخباروں میں آئیں تو کسی کو منہ دکھانے کے

اظہار کیا۔

”جن لوگوں نے نگینہ کو اغوا کیا تھا۔ ان کا ایک مہرہ بچے بچے بال بال بچ گیا۔ جب بھی چاہوں گا اسے بھی کسی چوٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔“

”نگینہ نے کیا نمک حرامی کی ہے؟..... کیا اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے؟“

”نہیں.....“ دوسری طرف سے بولنے والے نے تھکسانہ لہجے میں کہا۔ ”اسے طلاق دے کر پہلی فرصت میں حویلی سے نکال دو..... اس کے بعد میرے اپنے آدمی اس کے ایک ایک لمحے پر نظر رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے جو دوسرا آدمی ہاتھ سے نکل گیا اسی بہانے وہ بھی بے نقاب ہو جائے۔“

”کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔“

”حویلی سے نکلنے کے بعد وہ میری بدنامی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

”دوسری تجویز کیا پیش کرو گے.....؟“

”اسے ایک دور روز بعد تفریح کے بہانے کہیں بیرون ملک روانہ کر دیا جائے۔“ سکندر علی شاہ نے مدغم آواز میں تجویز پیش کی۔ ”وہاں کوئی بھی اچانک حادثہ اس کو کانٹے کی طرح نکال سکتا ہے۔“

”اچھا خیال ہے.....“ سراج بڑے انداز میں کہا گیا۔ ”ایک دور روز اور انتظار کر لو اس کے بعد ہی میں کوئی حتمی فیصلہ کر کے تم کو آگاہ کر دوں گا۔“

کال ختم ہوئی تو لوچن نے ایئر فون کو کان سے علیحدہ کر دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ محض وقت گزارنے کی خاطر ایک سپراسٹور پر گیا۔ عقی آئینے میں کسی تعاقب کے اندیشے کو بھی چپک کرتا رہا پھر واپس ہوٹل کے کمرے میں آ گیا۔ پہلی فرصت میں اس نے موبائل کی سم تبدیل کر کے جگا کو کال کی۔

”ہیلو.....“ کال جگا ہی نے اٹینڈ کی تھی۔

”پروفیسر چنگ لائی فار چون.....“ لوچن نے کہا۔ ”ایک ضروری کام پیش آ گیا ہے، تم اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر اسے آسانی سے کر سکو گے۔“

”تکلف نہیں..... جب دوستوں کے انداز میں ہاتھ ملایا ہے تو اپنا حق سمجھ کر بات کرو..... میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔“

”ایک کال میں نے کچھ دیر پیشتر کسی ذریعے سے سنی

ہے..... جس نمبر پر کال کی گئی تھی اس کا نمبر اور وقت نوٹ کر لو، لوچن نے کہا۔ ”دوسری طرف سے کال کرنے والے کا نمبر اور ایڈریس تمہیں اپنے ذرائع سے معلوم کرنا ہے۔“

”یہ میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا..... حالات کے پیش نظر میں نے بھی آپ کی آڈی کو خرید رکھا ہے..... تمہارا مطلوبہ کام پورا کرنے کے بعد ہی تمہیں کال کرتا ہوں۔“

”میں اسی سم پر تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“

لوچن نے موبائل بند کر دیا۔ نگینہ نے جو اطلاع دی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ جس نے سکندر علی شاہ سے بات کی تھی اس پر شیخ حامد ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ لوچن کے اندر ایک ہچکل سی جاری تھی۔ اگر جگا کال کرنے والے کا نمبر اور پتا بتا دیتا تو وہ اپنے اس شبے کی تصدیق میں بھی احتیاط ہی سے کام لیتا لیکن..... تقریباً سو اٹھنے بعد جگا نے اپنے ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد جو معلومات فراہم کیں وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ سکندر علی شاہ کو کسی پبلک ہوتھ سے کال کیا گیا تھا۔ اس علاقے کا نام بھی جگا نے بتا دیا مگر.....

لوچن سمجھ رہا تھا کہ صرف علاقے کے نام سے کال کرنے والے کو ٹریس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اورنگ زیب نے جس کا نام آکٹوپس رکھا تھا وہ بھی اتنا عیار اور دور اندیش تھا کہ اس نے بھی اپنے رہائشی علاقے کے کسی پبلک فون کو استعمال کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا ہوگا۔

چھٹی کا دن تھا اس لیے سب ایک ساتھ بیٹھے اطمینان سے ناشتا کر رہے تھے جب اورنگ زیب کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی۔

”ہیلو.....“ اورنگ زیب نے کال ریسیو کی۔

”صرف میری بات غور سے سنتے رہیں۔ کیا سراج اور ان کی مسز بھی موجود ہیں۔“

”جی ہاں.....“ اورنگ زیب نے آواز سن کر سنجیدگی اختیار کر لی۔ ”الماس بھی ساتھ ہی موجود ہیں۔“

”میرا نام مناشا کرم یاد رکھیں۔ الماس کو بھی بتا دیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اورنگ زیب نے موبائل بند کر کے سراج کو تیز نظروں سے گھورا۔ ”یہ مناشا کرم کون خاتون ہیں؟“

”پلیز.....“ سراج نے ہتھی نظروں سے درخواست کی۔ ”آپ گھر آباد نہیں کرتے نہ کریں لیکن میرا گھر.....“

”کیا بات ہے؟“ الماس نے مناشا کرم سن کر

کشکول

براہ راست اورنگ زیب سے پوچھا۔ ”نام سے ایرانی نکلتی ہیں۔“

”مجھے تم سے اس حماقت کی امید نہیں تھی۔“ اورنگ زیب بہ دستور سراج سے بولا۔ ”کم از کم کسی خاتون کو گھر بلانا، نا زیبا حرکت ہے۔“

پھر جب اس نے بیرون گیٹ سے رابطہ قائم کر کے یہ ہدایت دی کہ ٹینڈ گلاس کی جو گاڑی آرہی ہے اس کے لیے پچانک بغیر کسی باز پرس کے کھول دینا۔ خاص مہمان ہیں..... اورنگ زیب نے گیٹ پر یہ ہدایت دینے کے بعد ہی الماس سے کہا تھا۔ ”مناشا کرم نے ایک گرم گرم کافی کی فراہم کی ہے..... ضرور تیار کر دینا۔“

”خدا کے لیے پلیز.....“ سراج نے دوبارہ اورنگ زیب سے کہا۔ ”بھائی ہو کر بہن کے دل میں بدگمانی تو نہ پیدا کریں۔“

”آپ نے بتایا نہیں۔“ الماس کچھ کچھ سنجیدہ ہونے لگی۔ ”کون خاتون آرہی ہیں؟“

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موبائل پر دوسری جانب سے مختصر بات ہونے کے بعد وہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر اس وقت سراج بھی بوکھلا گیا جب ایک دراز قدر برقع پوش اندر داخل ہو کر اسی کی طرف آ گیا۔ الماس کے چہرے کی رنگت بدلتے لگی اور اس وقت تو اس کا خون بھی کھول گیا جب برقع پوش نے بڑے پیار سے سراج کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

سراج ہڑبڑا کر اٹھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے علاوہ الماس بھی ششدر رہ گئی۔ برقع کے نقاب پلٹنے کے بعد جو چہرہ نظر آیا وہ کمرل احتشام کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ سراج بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ کمرل نے برقع اتار کر ایک طرف رکھا پھر براہ راست الماس کی طرف دیکھا۔ ”اگر آپ ہی الماس اور مسز سراج ہیں تو آپ سے مل کر خوش ہوئی۔“

”آپ تشریف رکھیں، میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“

”نوفار مالٹی.....“ کمرل نے کہا۔ ”میں ایک اشد ضروری کام سے آیا ہوں۔ فوجی زندگی میں ایسے مواقع کم ملتے تھے جب انسان آن ڈیوٹی رہ کر گھریلو زندگی انجوائے کر سکے..... کمرل احتشام کے نام کے حروف سے ”مناشا کرم“ میں دو ایک بار پہلے بھی دوستوں سے یہ طور مذاق استعمال کر چکا ہوں..... اس نام میں کمرل کا ”لام ساکن“ رہ جاتا ہے۔ آپ اسے مجھوری سمجھیں۔“

کمرل کی بے تکلفی اور فلسفاری کو دیکھ کر الماس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، وہ کافی تیار کرنے کے لیے بچن میں گئی، کمرل نے اورنگ زیب سے کہا۔ ”میں نے اس وقت جو گاڑی استعمال کی ہے ابھی اس کی رجسٹریشن بھی نہیں ہوئی، کام کی نوعیت ٹاپ پر انٹری جیسی تھی اس لیے میں ادھر ہی آ گیا۔“

”بات کیا ہے.....؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”کیا ہم یہاں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

”اوپر کے کمرے میں آجائیں وہ جگہ زیادہ سیف ہے۔“ اورنگ زیب کے ساتھ سراج بھی اٹھ گیا۔ اوپر کے کمرے میں پہنچنے کے بعد کمرل نے کہا۔ ”صبح میری آنکھ فون کال پر کھلی تھی۔ میڈم روبی نے پہلی مرتبہ آپ کے حوالے سے کال کیا تھا۔ نام میرا سنا ہوا تھا اس لیے میں نے توجہ سے بات سنی.....“ کمرل نے پہلو بدل کر کہا۔ ”گزشتہ رات کے دوسرے پہر کسی نے اسے آکٹوپس کے نام سے کال کر کے دھمکی دی تھی کہ میڈم کو ایک ہفتے کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ فون پر یہ چیخ بھی دیا گیا ہے کہ تمام تر حفاظتی اقدام کے باوجود وہ خود کو موت سے نہیں بچا سکے گی..... اسی کی درخواست پر میں نے اس کے پرائیویٹ گارڈز کو ہٹا کر اپنے بہترین اور تجربہ کار کمانڈرز کو تعینات کر دیا ہے۔ ایک پاس ورڈ بھی بتا دیا ہے تاکہ کسی امیر جنسی میں میڈم براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کر سکے۔“

”حیرت ہے کہ اس نے مجھے یا سراج کو کال نہیں کیا.....؟“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس کی وجہ بھی مجھے بتا دی ہے..... اسے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ لوگوں کی کال شیپ نہ کی جارہی ہو..... مجھ سے بھی یہی درخواست کی ہے کہ میں رات کی بات صرف اپنی ذات تک محدود رکھوں۔“

”میرا ذاتی خیال ہے کہ اصل بات کچھ اور ہوگی۔“

اورنگ زیب نے کچھ توقف سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”بہر حال جب اس نے سیکرٹری سے کام لیا ہے تو ہم بھی اسے کریدنے کی غلطی نہیں کریں گے۔“

”ہو سکتا ہے کہ اس باسٹرڈ آکٹوپس نے ہماری توجہ اصل لائن آف ایکشن سے ہٹانے کی خاطر بلف (Bluff) کیا ہو۔“

”اس کے امکانات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”اب آپ کی پلاننگ کیا ہوگی.....؟“

105

104

103

102

101

100

99

98

97

96

95

94

93

92

91

90

ہاتھوں سے پھسلنے والے صابن اور قدم قدم پر پھسلنے والے چور کا ماجرا

کچھ لوگ معمولی کام کو بھی انتہائی غیر معمولی بنانے کے ماہر ہوتے ہیں جیسے کہ نیک ویلوٹ... جس کا نہ صرف کام بلکہ انداز بھی چونکا دینے والا تھا۔ اس کی اسی خوبی نے اسے معمولی چیزوں کی چوری کا مہنگا چور بنادیا تھا۔

صابن کس چوری

نجم مودی



شرٹ اور چست جینز میں ملبوس تھی۔

”معاف کرنا۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تم تک ویلوٹ ہو؟“

”آں ہاں..... تم نے ٹھیک پہچانا۔“ تک نے کہا۔

”لیکن میں نے تمہیں نہیں پہچانا۔“

”تم نے میری ایک دوست کی مدد کی تھی۔ کافی پرانی

بات ہے۔ کیا میں تم سے چند باتیں کر سکتی ہوں؟ میرا نام شیلہ

ملکا ہی ہے۔“

ان دنوں تک ویلوٹ کے مالی حالات بہت اچھے تھے اور وہ گوریلا کے ساتھ ایک ساحلی تفریح گاہ پر تعطیلات منا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کافی عرصے سے گوریلا کو نظر انداز کرتا چلا آ رہا تھا۔ اس لیے اس نے پانچ ہفتے تک کوئی کام نہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ تفریح کے پانچویں ہفتے وہ ایک ساحلی ریسٹوران میں ناشتا کر رہے تھے کہ ایک سیاہ بالوں والی دہلی پٹنی لڑکی ان کی میز کے قریب آئی۔ وہ فی

”کیسے ہو لیاقت حسین۔“

”آپ کی دعا ہے صاحب..... اس وقت خادم کو کیسے

یاد کیا۔“

”تمہیں ایک بہت اہم ذمے داری سونپنے کا

پروگرام بنایا ہے جس کے لیے تمہارا پلاسٹک میک اپ بھی

ضروری ہوگا۔“

”آپ کے لیے لیاقت حسین کی جان بھی حاضر ہے

صاحب..... کسی دشمن کو غرق کرنے کی خاطر زندگی داؤ پر لگا

دینا بھی ایمان کا درجہ رکھتا ہے۔ آپ لوگوں کے کسی کام

آگیا تو یہ بھی میری خوش نصیبی ہوگی۔“

”اس بار تمہارے ساتھ صرف ایس پی صاحب ہوں

مے۔“ سراج نے کہا۔

”آپ دونوں جس وقت حکم دیں گے میں سر سے کفن

باندھ کر خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

کچھ دیر بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا تو لیاقت حسین

دوبارہ لیٹ گیا۔ اس وقت اسے ایک کپ چائے کی شدید

خواہش ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی بنا سکتا تھا لیکن فرحین کے ہاتھ

کا ذائقہ اس کے منہ کو لگ گیا تھا۔ وہ فرحین کے بارے میں

سوچ رہا تھا کہ دروازے پر کسی کی آہٹ ابھری۔ لیاقت

حسین بھڑے ہوئے دروازے کو کھولنے کی خاطر اٹھا۔

اسے تعجب تھا کہ فرحین اسے خود کھول کر اندر کیوں نہیں

آگئی؟..... لیاقت حسین کچھ سوچ کر مسکراتا ہوا بے قدموں

اٹھا۔ اس نے دروازہ کھول کر فرحین کو ڈرانے کو سوچا تھا

لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ خود ہی ہکا بکارہ گیا۔

”تم.....“ لیاقت حسین کے وجود میں یکلخت شعلے

بھڑک اٹھے۔

”ہاں..... میں..... تمہاری موت.....“ جواب

حقارت سے دیا گیا۔

لیاقت حسین کے ذہن میں وہ باتیں گونجنے لگیں جو

ماں نے اسے خواب میں آکر بتائی تھیں۔ اس کے وجود میں

طوفان ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے آنے والے کو دیکھ کر

حقارت سے تھوک دیا۔

دروازے پر جو سینہ تانے کھڑا تھا۔ وہ پر تاب بھوشن

کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کی ویران نگاہوں میں اعتماد جھلک

رہا تھا..... اس اعتماد میں شیطانی قوتیں بھی شامل تھیں.....

اس پراسرار اور تھوڑے آمیز سلسلے کے مزید

واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

”فوری مگر محتاط ایکشن۔“ اورنگ زیب نے جواب

دیا پھر اس نے درخواست کی۔ ”آپ آئی جی کو اپنی ذاتی

حیثیت سے فون کر دیں کہ مجھے مرکز کی ملٹری ہائی کمان کی

طرف سے کوئی اہم کام سونپا گیا ہے اس لیے وہاں سے

ریٹائر ہونے کے بعد ہی ڈیوٹی جوائن کر سکوں گا۔“

کرنل نے اسی وقت آئی جی کو فون کر کے اورنگ

زیب کی درخواست کی تکمیل بھی کر دی۔ الماس کافی کی

ٹرے کے ساتھ داخل ہوئی تو کرنل نے ایک بار پھر اس سے

مناشا کرم والے وقتی مذاق سے معذرت چاہی۔

”اس کی ایک شرط ہوگی۔“ الماس نے بڑی اپنائیت

سے کہا۔ ”اب آگئے ہیں تو آئندہ بھی ملاقات کا سلسلہ جاری

رکھیے گا۔“

”اوکے..... اسٹاٹ اٹھائیے۔“

کافی کے دوران ہلکی پھلکی گھریلو باتیں ہوتی رہیں،

الماس کے علاوہ سراج بھی بہت جلدی کرنل سے بے تکلف

ہو گیا۔ کافی پینے کے بعد کرنل فوراً ہی جانے کے لیے اٹھ

گیا۔ اورنگ زیب نے اشارے سے سراج کو روکا پھر خود

اٹھ کر کرنل کو رخصت کرنے دروازے تک آ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے فوری طور پر اپنے پلان

پر عمل کرنا ہوگا۔“ اس نے تنہائی میں کرنل سے کہا۔ ”اس

موقع پر آپ کے کچھ کمانڈوز کو بھی دور دورہ کرواں کی

نگرانی اس طرح کرنی ہوگی کہ وہ کسی کی نظروں میں بھی نہ

آئیں اور ضرورت کے وقت فوری ایکشن بھی کر سکیں۔“

”ڈونٹ وری..... یہ خیال مجھے پہلے سے ہے.....

میں نے لوکیشن کی سرائیڈنگ کو بھی پوری طرح اسٹڈی کر لیا

ہے آپ کو تحفظ دینا ہمارا کام ہوگا۔“

پھر رخصت ہوتے وقت بھی کرنل برقع پہن کر بی باہر

نکلا تھا۔

لیاقت حسین کچھ دیر پہلے ہی سیٹھ عثمان کو ان کے بیٹے

پر ڈراپ کر کے گھر آیا تھا۔ یہ اطلاع بھی اسے مل گئی تھی کہ

فرحین راحیلہ بیگم کے پاس ہے۔ ایک بار خطرے سے

دو چار ہونے کے بعد لیاقت حسین کے مشورے پر ہی فرحین

کا یہ معمول ہو گیا تھا وہ تنہا گھر پر رہنے کے بجائے راحیلہ کی

طرف چلی جاتی تھی۔

لیاقت حسین شاور لینے کے بعد کمرے میں آ گیا۔

اس وقت شام کے پانچ کا وقت ہو رہا ہوگا۔ وہ کمر سیدھی

کرنے کی خاطر لینا تو سراج کی کال آگئی۔

نک اور گوری یا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 ”کیوں نہیں۔“ نک نے تامل کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔“
 شیلہ نے گوری یا کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ ”تم ناشتا کرلو۔ میں باہر کار میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ میری کار وہ سامنے کھڑی ہے۔“
 اس کے جانے کے بعد گوری یا نے کہا۔ ”مجھے یہ عورت کچھ اچھی نہیں لگی۔“
 نک کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔ ”جب دو عورتوں کے درمیان ایک مرد آجائے تو تاثرات کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
 ”ہونہہ! میں نہیں مانتی۔ اچھی عورت ہر جگہ ہی اچھی لگتی ہے۔“
 نک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناشتے کے بعد وہ شیلہ کی کار میں جا بیٹھا۔
 ”میں ایک چیز چوری کروانا چاہتی ہوں۔“ شیلہ نے کہا۔
 ”میں آج کل تعطیلات منارہا ہوں۔“
 ”یہ کام بہت اہم ہے، میں تقریباً ناکل ہو چلی تھی جب تم اچانک نظر آگئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا، ورنہ میں خود یہ چیز چوری کرنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔“
 ”میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ ویسے معاملہ کیا ہے؟“
 ”میرا خیال ہے کہ مجھے ٹیڈ سیکر کے بارے میں بتانا پڑے گا۔ یہ شخص کئی کلوں کا مالک ہے، اس کے ایک کلب کا نام میگلان ہے۔ میں ایک گلوکارہ ہوں اور بلیو اسٹار نامی ایک گروپ کے ساتھ تقریباً چھ ہفتے سے میگلان کلب میں کام کر رہی تھی۔ ایک روز اچانک اس کلب میں آگ لگ گئی اور نہ صرف ہمارے قیمتی آلات موسیقی جل گئے بلکہ ہم بے روزگار بھی ہو گئے۔ ہمارا سامان بیرہ شدہ تھا اور توقع ہے کہ کچھ رقم بیرہ کمپنی کی طرف سے مل جائے گی لیکن وہ ہمارے نقصان کے مقابلے میں بہت کم ہوگی اور میرا یہ خیال ہے کہ یہ نقصان ٹیڈ سیکر کو پورا کرنا چاہیے۔“
 ”یہ آگ کسی سازش کے تحت تو نہیں لگائی گئی تھی؟“ نک نے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ بعض لوگ کاروبار مند دیکھ کر بیرہ کی رقم وصول کرنے کے لیے خود بھی ایسی حرکت کر ڈالتے ہیں۔
 ”ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ جب میگلان کلب میں آگ لگی تو ٹیڈ سیکر بوسٹن میں تھا۔“
 ”سیکر اس بارے میں کیا کہتا ہے؟“
 ”وہ ہمارے نقصان کی ذمہ داری قبول کرنے پر تیار

نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انشورنس کمپنی سے بات کرو۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس پر ہمارے ایک لاکھ ڈالر واجب الاء ہیں تو اس نے ہنس کر ٹال دیا۔“
 ”ایک لاکھ ڈالر!“
 ”ہاں، بلکہ ایک لاکھ سے بھی زیادہ۔ ہمارے درمیان دو سال کا معاہدہ ہوا تھا جو دھواں بن کر اڑ گیا۔“
 ”اور تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہ ایک لاکھ چوری کر کے تمہیں لا دوں؟“
 ”اتنی بھی احمق نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کیا قیمت چیزیں چوری کرتے ہو۔ میں سیکر کے ہاتھ روم سے، بالاحاقانے پر ہے، صابن کی ٹکیہ چوری کروانا چاہتی ہوں۔“
 ”صابن!“
 ”ہاں۔“ شیلہ نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ”سیکر یہ صابن خاص طور پر تیار کروایا ہے۔ اس کا رنگ گلابی ہے اور اس پر ”میگلان“ لکھا ہوا ہے۔ یہ صابن میگلان کلب میں آگ لگنے سے کچھ روز پہلے ہی تیار ہو کر آئے تھے۔ میں جب پیسوں کے بارے میں سیکر سے بات کرنے گئی تو اس وقت میں نے یہ صابن اس کے ہاتھ روم میں رکھا ہوا دیکھا تھا، لیکن اس کی اہمیت کا احساس مجھے بعد میں ہوا۔ غالباً سیکر کو پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ کلب میں آگ لگنے والی ہے۔ اس لیے اس نے چند روز پیشتر سارے صابن کلب سے نکال لیے تھے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہوتا؟“
 ”تھوڑا تھوڑا۔“
 ”آج میں بات چیت کے بہانے اس کے گھر گئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ گفتگو کے دوران ہاتھ روم جانے کی خواہش ظاہر کروں گی اور صابن اٹھا کر پرس میں ڈال لوں گی، لیکن سیکر زیادہ ہی محتاط ثابت ہوا۔ اس نے مجھے دروازے سے ہی لوٹا دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتا، اگر مجھے کچھ کہنا ہے تو انشورنس کمپنی سے کہوں۔ میں آج اس کے گھر میں داخل ہونے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس کے گھر میں الارم لگا ہوا ہے۔“
 ”کیا وہ شادی شدہ ہے؟“
 ”تھا، بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ بالکل اکیلا رہتا ہے۔ نوکروں کی ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا، کیونکہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر سفر پر رہتا ہے۔ بھی پارٹی وغیرہ ہوتے نوکروں کو بلا لیتا ہے ورنہ تنہا ہی رہتا ہے۔“
 ”نک نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں صرف صحت

بٹانے کے لیے یہ کام نہیں کرتا۔ خاصی بھاری فیس لیتا ہوں۔“
 ”کتنی بھاری؟“
 ”پچیس ہزار ڈالر۔“
 شیلہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”صابن کے ایک ٹکڑے کے لیے پچیس ہزار ڈالر؟“ اس نے کہا۔
 ”اب تو اس صابن کا معمولی سا ٹکڑا باقی رہ گیا ہوگا؟“
 ”اگر تم سیکر سے ایک لاکھ ڈالر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہو تو یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے، صرف پچیس فیصد ہے۔“
 ”پچیس ہزار بہت بڑی رقم ہے۔ مجھے دوسروں سے مشورہ کرنا پڑے گا۔“
 ”دوسرے کون؟“
 ”میرا مطلب ہے کہ بلیو اسٹار گروپ کے دوسرے شرکاء۔ جیکر اور ماؤزے اور کین وغیرہ سے۔“
 ”اوکے، تم اپنے دوستوں سے مشورہ کر لو اور کل اسی وقت اور اسی جگہ پر ملو۔ میرا خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔“
 ”اوہ، شکریہ۔“ شیلہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ”میں اپنے دوستوں کو ساتھ ہی لے آؤں گی۔ ہم ناشتا بھی نہیں کریں گے۔“
 ”نک اس سے رخصت ہو کر گوری یا کے پاس آ گیا اور اسے ساری بات بتائی۔ خلاف توقع گوری یا نے لڑکی سے ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے ضرور لڑکی کی مدد کرنی چاہیے۔ خواہ کچھ کم پیسوں میں کیوں نہ کرنی پڑے۔ نک کافی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ عورتیں کتنی آسانی کے ساتھ اپنی رائے تبدیل کر لیتی ہیں۔
 اگلی صبح جب تک وہ اور گوری یا ریسٹوران میں پہنچے تو شیلہ اپنے دوستوں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ دونوں نوجوان تھے اور انہوں نے ڈاڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شیلہ نے رکھی تعارف کرایا۔ ایک کا نام جیکر اور دوسرے کا نام ماؤزے تھا۔
 ”شکریہ مسٹر ویلیوٹ!“ جیکر نے کہا۔ ”شیلہ نے بتایا ہے کہ تم ہماری مدد کرنے پر تیار ہو۔“
 ”لیکن ہمارے ساتھ نہیں آسکا۔“ شیلہ نے وضاحت کی۔ ”وہ کچھ سامان وغیرہ خریدنے بوسٹن گیا ہوا ہے۔“
 ”اگر تم وہ صابن چوری کر دو تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔“ ماؤزے نے کہا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور سامنے والے دانتوں کے درمیان نمایاں خلا تھا۔

”کیا تم نے انہیں میری فیس بتادی ہے؟“ نک نے شیلہ سے پوچھا۔
 ”ہم تمہاری پوری فیس ادا کر سکتے ہیں۔“ جیکر نے جلدی سے کہا۔ ”پورے پچیس ہزار ڈالر۔ ہمیں صابن ہر صورت میں چاہیے تاکہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ اسے آگ لگنے کے بارے میں پہلے سے معلوم تھا۔ صابن ہاتھ میں آجائے، اس کے بعد وہ ہماری بات اچھی طرح سمجھ سکے گا۔“
 ”تمہاری باتوں سے بلیک میلنگ کی بو آتی ہے۔“ گوری یا نے کہا۔
 ”سیکر مجرمانہ ذہنیت کا مالک ہے۔“ شیلہ نے کہا۔
 ”اس نے یہ آگ خود لگائی ہے، ہم اسی طریقے سے اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔“
 ”مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم کس طرح اپنا حق وصول کرتے ہو۔“ نک ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں صابن کا ٹکڑا چوری کر کے تمہارے حوالے کر دوں گا اور تم میری فیس ادا کر دینا۔ اس کے بعد تم جانو اور تمہارا کام۔“
 ”یہ کام تم کب تک کر سکتے ہو؟“ ماؤزے نے پوچھا۔
 ”قسمت نے یاوری کی تو آج ہی۔“
 ”تمہارا مطلب ہے کہ تم دن دھاڑے یہ چوری کر سکتے ہو؟“ شیلہ نے حیرانی سے کہا۔
 ”یہ کام دن میں ہی کرنا پڑے گا۔“ نک نے کہا۔
 ”کیونکہ تم نے بتایا ہے کہ سیکر کے گھر میں الارم سسٹم نصب ہے اور میں رات کو وہاں جا کر الارم کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔“
 ”لیکن تم نے ابھی تک سیکر کا گھر بھی نہیں دیکھا۔“ شیلہ نے اسے یاد دلایا۔
 ”آں ہاں..... گھر تو واقعی نہیں دیکھا۔ تو چلو پھر گاڑی میں سیکر کا گھر دیکھ آئیں۔ میں اس سے ملنا بھی چاہتا ہوں۔“
 ناشتے کے بعد پانچویں ٹیڈ سیکر کے گھر کی طرف ہو گئے۔ شیلہ اور اس کے ساتھی شیلہ کی پرانی سی پک اپ میں بیٹھ گئے، نک اور گوری یا اپنی کرائے کی کار میں ان کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ مرکزی شاہراہ پر چند میل شمال کی طرف جانے کے بعد وہ ایک ذیلی شڑک پر مڑ گئے کچھ دور جانے کے بعد شیلہ نے کھڑکی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ خاصا وسیع مکان تھا۔ سامنے کے حصے میں چند بلند قامت بلوط کے درخت سنتریوں کے مانند ایستادہ تھے اور کافی پیچھے ایک سفید رنگ کی جدید عمارت نظر آرہی تھی۔ وہ ایک نواحی علاقہ تھا اور قرب وجوار میں درختوں کی بہتات تھی۔

نک نے دیکھا کہ بلوط کے ایک درخت کے گرد مصری پتنگے گردش کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر نک کے ذہن میں ایک منصوبہ جنم لینے لگا۔ درخت کے گرد گردش کرنے والے پتنگے نہ تھے، کیونکہ مادہ پتنگے پرواز نہیں کر سکتے۔ نصف میل آگے جانے کے بعد شیلانے اپنی کارروک دی۔ نک بھی اس کے برابر پہنچ کر رک گیا۔

”کیا خیال ہے؟“ شیلانے پوچھا۔
”کام ہو جائے گا۔“ نک نے کہا۔ ”لیکن پہلے میں کچھ خریداری کرنا چاہتا ہوں۔“
”کس قسم کی خریداری؟“

”مجھے کسی گارڈن سپلائی اسٹور لے چلو، پھر تفصیل بتاؤں گا۔“

”ساحلی سڑک پر ایک خاصا بڑا اسٹور ہے۔ وہاں باغات کی ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔“

”تو چلو پھر۔“ نک انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

چند منٹوں کے اندر وہ مذکورہ گارڈن سپلائی اسٹور کے سامنے پہنچ گئے۔ نک نے دوسروں کو باہر رکنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا۔ اسے مطلوبہ چیز تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ مصری پتنگے پکڑنے والا ایک پھندا تھا۔ اس پھندے کے اندر مادہ پتنگے کی خوشبو ڈالی ہوئی تھی جو پتنگوں کو اندر جانے پر مجبور کر دیتی تھی لیکن اندر کیڑے مارنے والی دوائی تھی جو چند لمحوں میں پتنگوں کو ختم کر دیتی تھی۔ نک نے پھندے کی قیمت ادا کی اور اسے لے کر باہر آ گیا۔

”یہ کیا چیز ہے؟“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ نک نے کہا۔ پھر اس نے پھندے کو جو دو حصوں پر مشتمل تھا، کھولا اور اندرونی ڈبے میں ہاتھ ڈال کر اندر سے ایک چھوٹی سی تھیلی نکال لی۔ اس تھیلی کے اندر ڈاک ٹکٹ کے برابر ایک اسٹیکر تھا جس میں مادہ پتنگے کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ نک نے اس تھیلی کو جیب میں ڈال لیا۔

”مجھے ایک آدمی مدد کے لیے چاہیے۔“ اس نے کہا۔

پھر خود ہی فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کام کے لیے گھوڑیا مناسب رہے گی کیونکہ سیکر تم لوگوں کو پہچانتا ہے۔ البتہ تمہاری یہ پک اپ میرے کام آجائے گی۔“

شیلانے اپنے ساتھیوں سمیت نک کی گاڑی میں منتقل ہوئی اور نک پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گھوڑیا پنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم لوگ اسی ساحلی ریسٹوران میں جا کر ہمارا

انتظار کرو۔“ نک نے کہا۔ ”ہم تھوڑی دیر میں وہاں رہے ہیں۔“ پھر اس نے انجن کو گیسز میں ڈالا اور ٹیڈ سیکر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سیکر کے گھر کا پھاٹک کھلا ہوا اس لیے وہ ڈرائیونگ سے ہوتا ہوا عمارت کے سامنے گیا۔ گھنٹی کی آواز پر جس شخص نے دروازہ کھولا وہ اسپر شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔

”کیا میں اس عمارت کے مالک سے مل سکتا ہوں؟“ نک نے کہا۔

”کیا کام ہے؟ میں اس عمارت کا مالک ہوں۔“

نک نے خوش اخلاقی سے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

”نک ویلکس“ اسپرٹ کنٹرول کارپوریشن سے ہم لوگوں کو باغات میں پیدا ہونے والے کیڑے مکوڑوں کے بارے میں مشورے دیتے ہیں۔“

”ٹیکس“ سیکر نک سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”لیکن ہمارے ہاں کیڑے مکوڑوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”اچھا! ان مصری پتنگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ جو شاہ بلوط کے درختوں کے گرد گردش کر رہے ہیں!“

”اوہ، ہاں! چند روز سے میں ان درختوں کے گرد کچھ چیزوں کو اڑتے دیکھ رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مصری پتنگے ہیں، یہ تو واقعی مصیبت ہیں۔“

”مصیبت نہیں، بہت بڑی مصیبت۔“ نک نے کہا۔

”جب ان کی تعداد اس حد تک بڑھ جاتی ہے تو یہ انسان پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ ٹھہرو، میں تمہیں تجربہ کر کے دکھاتا ہوں۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔“ سیکر نے کہا اور نک کے ساتھ درختوں کی طرف بڑھا۔

”ہم اس قسم کی باتوں کو اخبارات میں نہیں دیتے۔“ نک نے کہا۔ ”کیونکہ اس سے خوف و ہراس پھیلتا ہے۔“

باتوں کے دوران نک نے سیکر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سیکر ابھی درختوں سے دور ہی تھا کہ ایک پتنگا تیر کی طرح نیچے آیا اور اس کے گرد گھومنے لگا۔ اس کے بعد دوسرے پتنگے بھی باری باری اس کی طرف رخ کرنے لگے۔ سیکر ہاتھ چلاتا ہوا پیچھے ہٹنے لگا۔

”اوہ، میرے خدا۔“ نک نے کہا۔ ”یہ تو ہماری توجہ سے بڑھ کر خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔“

”مم..... میری مدد کرو۔“ سیکر چلایا۔ اب پتنگوں کا ایک غول اس کے گرد گردش کرنے لگا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے دوڑ کر پک اپ کے اندر گھس گیا۔ اس کا سانس پھول

گیا تھا اور چہرے پر خوف پایا جاتا تھا۔ گھوڑیا اپنی جیکٹ سے پتنگوں کو بھگانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ہمیں اسپر جنسی اسپر سے ٹیم کو بلانا پڑے گا۔“ نک نے کہا۔ ”تمہارا فون کہاں ہے؟“

”فون پہلے والے کمرے میں ہے۔“ سیکر چلایا۔

”انہیں کہو کہ جلدی پہنچیں۔“

پتنگے اب پک اپ کے گرد گردش کر رہے تھے۔ نک کھلے ہوئے دروازے سے عمارت کے اندر گھس گیا۔ اگرچہ شیلانے اسے یہی بتایا تھا کہ سیکر اکیلا رہتا ہے تاہم وہ ڈر رہا تھا کہ اندر کوئی اور نہ ہو۔ اس نے ہال کمرے میں رکھے ہوئے فون پر سرسری نظر ڈالی اور تیزی سے سیریلیوں کی جانب بڑھا۔ وہ بیک وقت دو دوسریزھیاں ملے کر رہا تھا۔

اوپر پہنچ کر ہاتھ روم تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ صابن دانی میں استعمال شدہ صابن کی ٹکلیہ موجود تھی۔ اس پر میٹھکان کے مدہم حروف اب بھی موجود تھے۔ نک نے ٹکلیہ کو رومال میں لپیٹ کر جیب میں ڈالا اور تقریباً دوڑتا ہوا واپس پہنچ گیا، اس ساری کارروائی میں ایک منٹ بھی صرف نہیں ہوا تھا۔

”اسپرے ٹیم کتنی دیر میں پہنچے گی؟“ سیکر نے پوچھا۔

”انہیں کچھ وقت لگے گا۔“ نک نے کہا۔ ”فی الحال ہمیں ایک دوسرا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔ تم ایسا کرو کہ باہر نکل کر جلدی سے لان میں لیٹ جاؤ۔“ اس نے دروازہ کھولا اور سیکر کو باہر نکلنے میں مدد دی۔

سیکر قدرے تامل کرتا ہوا لان کی طرف بھاگا اور گھاس پر لیٹ گیا۔ نک دوڑ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”گھوڑیا! جیکٹ ہلاتی رہو۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”یہ پتنگے متحرک چیز کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں۔“ پھر اس نے پک اپ اسٹارٹ کی اور ہولے ہولے پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ پتنگوں کا غول گویا کسی پراسرار طاقت کے زیر اثر پک اپ کے ساتھ ہی پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

”اب کیا کرتا ہے؟“ گھوڑیا نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس جیکٹ ہلاتی رہو۔“

”لیکن یہ پتنگوں کا غول تو ہمارے ساتھ چلا آ رہا ہے۔“

”یہ تمہاری جیکٹ پر عاشق ہو گئے ہیں۔“ نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جب تک سیکر کا مکان نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا تو یہ جیکٹ ہلاتی رہو۔“

”یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ گھوڑیا نے کہا۔

”یہ سارا کرشمہ اس اسٹیکر کا ہے جو میں نے پھندے

میں سے نکالا تھا۔ پہلے میں نے یہ اسٹیکر سیکر کے کندھے پر چپکایا تھا لہذا پتنگے اس کے گرد گھومتے رہے۔ واپس آنے کے بعد اس کے کندھے سے اتار کر تمہاری جیکٹ پر چپکا دیا۔ یہ سارا ہاتھ کی صفائی کا کام تھا۔ نہ سیکر کو کچھ پتا چلا نہ تمہیں۔ ویسے گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ پتنگے خطرناک نہیں ہیں۔“

کچھ دور جانے کے بعد اس نے پک اپ کی رفتار تیز کر دی اور پتنگے پیچھے رہ گئے۔

ریسٹوران میں شیلانے اس کے ساتھی بے چینی سے نک کے منتظر تھے۔

”کیا تم صابن لے آئے؟“

”ہاں، یہ رہا۔“ نک نے جیب سے صابن نکال کر شیلانے کو تھما دیا۔ ”دیکھ لو یہی ہے نا؟“

”ونڈرفل، مسٹر ویلوٹ!“ جیکر صابن کی ٹکلیہ کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم نے کمال کر دیا۔ یہی ہے وہ صابن جس کی ہمیں ضرورت تھی۔“

”اور میری فیس؟“ نک نے پوچھا۔

”تمہیں فیس ضرور ملے گی۔“ شیلانے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔“

”میں ہمیشہ نقد لیا کرتا ہوں۔ یعنی ایک ہاتھ سے لو اور دوسرے ہاتھ سے دو۔“

شیلانے کچھ پریشان نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

جیکر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”بات یہ ہے مسٹر ویلوٹ کہ ہماری مالی حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔ ہم فوری طور پر فیس ادا نہیں کر سکتے، ویسے ہمیں امید ہے کہ اب ہم مسٹر سیکر کو کھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے اندر رقم مل جائے گی۔ فکر نہ کرو، ہم دھوکا نہیں کریں گے۔“

نک نے انہیں اپنا ایڈریس دے دیا اور کہا کہ وہ ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔

”آج تم نے کمال کر دیا۔“ راستے میں گھوڑیا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر فیس نہ بھی ملی تو تمہیں کوئی افسوس نہیں ہوگا۔“

”یقین کرو مجھے بہت سخت افسوس ہوگا۔“

نک اور گھوڑیا کا قیام کرائے کی لکڑی بوٹ میں تھا۔ اگلی صبح کشتی کے ہچکولوں سے نک کی آنکھ کھل گئی۔ چند ساعتوں تک وہ بستر پر لیٹا سوچتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ

وہ ہنکولے لہروں کے سبب نہیں تھے۔ تب ہی اس نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ آواز دو آدمیوں کے قدموں کی تھی۔ وہ دبے پاؤں کشتی کے تختوں پر چل رہے تھے۔

نک نے کہنی مار کر گوری یا کو جگا یا اور سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”بولنا نہیں، شاید کچھ ملاقاتی کشتی پر موجود ہیں۔“

پھر وہ آواز پیدا کیے بغیر اٹھا اور اگلا قدم اٹھانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس تفریح میں وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لایا تھا۔ البتہ کشتی میں گوشت کاٹنے کی چھری موجود تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کین کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں چھری رکھی تھی۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور کین ہلکی سی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ نک نے چھری کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کین کی چھت کا دروازہ کھلا اور ایک ہاتھ جس میں پستول پکڑا ہوا تھا، اندر نمودار ہوا۔

”خبردار۔“ کسی نے تھکانہ لہجے میں کہا۔ ”کوئی حرکت نہیں کرنا ورنہ لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔“

نک نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا پستول بردار ایک قوی الجھ شخص تھا۔ اس نے جینز اور جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ نک کو کور کیے ہوئے سیزم کے ذریعے کین میں پہنچ گیا۔ پھر نک نے ایک دوسرے شخص کو سیزم پر قدم رکھتے دیکھا۔ وہ ٹنڈ سیکر تھا۔

”ہیلو نک!“ اس نے کہا۔ ”کیڑے مکوڑوں کا کاروبار کیسا جا رہا ہے؟“

”ابھی تو پوری طرح آنکھ بھی نہیں کھلی۔“ نک نے کہا۔ ”ذرا ہوش میں آلوں تو کچھ اندازہ ہوگا۔“

گوری یا ایک چادر اپنے جسم کے گرد لپیٹ کر تھوڑا سا آگے آئی، اور بولی۔ ”کیا بات ہے گی؟“

”کچھ نہیں۔“ نک نے یہ ظاہر بے پروائی سے کہا۔ ”ٹنڈ سیکر آج ہمارے ساتھ ناشتا کرے گا۔“

سیکر کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ذرا ہوشیاری سے ٹامی ایہ شخص خاصا چالاک معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو شوٹ کر دیتا۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ نک نے کہا۔ ”مجھے ایکشن کے بجائے ڈائلاگ زیادہ پسند ہیں۔ ویسے تمہیں ہمارا پتا کیسے معلوم ہوا۔“

”ٹامی نے کل تمہیں گوتوں کی ٹولی کے ساتھ دیکھا تھا۔ تم ساحلی ریسٹوران میں ان کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھے۔ اسے کچھ شک گزرا۔ اس نے تمہاری

کرائے کی کار کا نمبر نوٹ کر لیا۔ میں نے کاروں کی اینجنی فون کر کے تمہارے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا تم میری ٹامی کشتی میں ٹھہرے ہوئے ہو۔“

گوری یا ٹامی اور سیکر کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”اگر تم واقعی ناشتا کرنا چاہتے ہو تو تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”خاموشی سے کھڑی رہو۔“ ٹامی پستول ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ناشتے کی باری بھی آجائے گی۔“

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ سیکر نے کہا۔ ”تم نے ان پتنگوں کو کس طرح میرے پیچھے لگا دیا؟ حالانکہ وہ پتنگ پہلے بھی میرے پیچھے نہیں لگے۔“

”یہ میرا بزنس سیکرٹ ہے۔“

”اور جب میں مکان کے اندر گیا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ تم نے فون کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس فون میں انٹرکام کے طور پر بھی استعمال کرتا ہوں۔ اس کے بلے علیحدہ بٹن لگا ہوا ہے۔ اگر باہر فون کرنا ہو تو ایک دوسرا بٹن دبانا پڑتا ہے لیکن تمہارے جانے کے بعد جب میں نے فون پر نظر ڈالی تو اس کا انٹرکام والا بٹن دبا ہوا تھا۔ اس پر مجھے شک ہوا اور جب ٹامی نے مجھے یہ بتایا کہ تم بلیو اسٹار گروپ سے باتیں کر رہے تھے تو میرا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔“

نک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس معاملے میں واقعی مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

”ہاں، تو اب بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ تم نے میرے گھر سے کوئی چیز چرائی ہے یا رکھی ہے؟“

”رکھی ہے، کیا مطلب؟“

”کوئی ٹائم بم یا ٹیلی فون شیپ وغیرہ؟“

”اگر بم ہوتا تو تم اب تک جنت میں پہنچ چکے ہوتے اور جہاں تک ٹیلی فون شیپ کا تعلق ہے، میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔“

”تم کام کیا کرتے ہو مسٹر ویلوٹ؟“ سیکر اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ”اور تم کس شخص کی ایما پر میرے گھر میں داخل ہوئے تھے؟ کیا تم اس لڑکی کے ساتھیوں میں سے ہو؟“

”ایک ساتھ اتنے سارے سوالات سن کر میں عموماً الجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔“ نک نے کہا۔

”تم کس چکر میں میرے گھر میں داخل ہوئے تھے؟ اور وہ کون سی چیز تھی جسے تم ایک منٹ کے اندر لے اڑے؟“

گوری یا مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ”تم سارا دن نک کے ساتھ باتیں کر سکتے ہو۔ آج کل اسے فرصت ہی فرصت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے ناشتا تیار کرنا چاہیے۔“

ٹامی نے ایک بار پھر گوری یا کو ڈانٹنے کا ارادہ کیا لیکن سیکر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ”ٹھیک ہے، اسے ناشتا تیار کرنے دو، لیکن اس پر نظر ضرور رکھنا۔“

گوری یا باورچی خانے میں چلی گئی۔ ٹامی ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ دونوں طرف نظر رکھ سکتا تھا۔

”کیوں نہ مہذب لوگوں کی طرح بیٹھ کر بات کر لی جائے۔“ نک نے خیال ظاہر کیا۔

”شیلہ! نک! تمہارا کیا تعلق ہے؟“ سیکر نے پوچھا۔

”ہماری شناسائی چند روز پرانی ہے شیلہ کا کہنا ہے کہ تم پران کی ایک بہت بڑی رقم واجب ہے۔“

”جتنی ہے۔ میرے ذمے کوئی رقم نہیں ہے۔ اگر کچھ ہے تو انشورنس کمپنی کے ذمے ہے۔“

باورچی خانے سے کافی اٹنے کی آواز آئی اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

”گئی! تمہارے لیے انڈے کیسے بناؤں؟“ گوری یا نے آواز لگائی۔ ”آلیٹ یا تلے ہوئے؟“

نک کا جسم تن گیا کیونکہ وہ ناشتے میں انڈے نہیں کھاتا تھا اور یہ بات گوری یا کو بھی معلوم تھی۔

”آلیٹ ٹھیک رہے گا۔“ نک نے جواب دیا اور دوبارہ سیکر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم شیلہ اور اس کے دوسرا ساتھیوں کے ساتھ.....“

”دوسرا تھی!“ نک نے حیرانی سے کہا۔

اسی لمحے ٹامی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ گوری یا نے کھولتے ہوئے کین سے بھرا ہوا فرانی پان اس کے منہ پر انڈیل دیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی نک نے سیکر کو دھکا دے کر فرش پر گرادیا اور ٹامی کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں کے اندر پانسا پلٹ گیا۔

”پستول میرے پاس ہے۔“ گوری یا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”غوب۔“ نک نے کہا۔ ”اگر ضرورت پڑے تو بلا تامل استعمال کر ڈالنا۔“

سیکر نے اٹھ کر نک پر حملہ کرنا چاہا لیکن گوری یا کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر رک گیا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم پولیس کو بلانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

نک نے جواب دینے سے پہلے تو لیا اٹھایا اور ٹامی کا منہ صاف کرنے لگا۔ لکھن نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا تاہم ٹامی خاصا خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔

”ہو سکتا ہے کہ پولیس کو بھی بلانا پڑے۔“ نک نے کہا۔ ”اتنی صبح کسی کے خلوت کدے میں گھس کر اس کی نیند خراب کرنا ایک سنگین جرم ہے۔“

”شیلہ! تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔“ سیکر اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ”اس نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہ جھوٹ کا پلندہ ہے، وہ لوگ مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔“

”پتا چل جائے گا۔“

”یہ لڑکی مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔“

نک گوری یا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ایک مضبوط سی سی لے آؤ۔ جب تک حقیقت نہیں کھل جاتی اور یہ پتا نہیں چل جاتا کہ کون جھوٹ بول رہا ہے اور کون سچ، اس وقت تک یہ دونوں ہمارے مہمان رہیں گے۔“

انہوں نے دونوں کو خوب اچھی طرح سے باندھ کر کین میں بند کر دیا اور شیلہ کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک اخبار کا دفتر دیکھ کر نک کو خیال آیا کہ پہلے آتش زنی کی خبر پڑھ لینی چاہیے اس نے گاڑی روک دی اور گوری یا کو ساتھ لے کر اخبار کے دفتر میں چلا گیا۔ اسے پرانا اخبار حاصل کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ خبر میں یہ شہ ظاہر کیا گیا تھا کہ آگ کسی سازش کا نتیجہ تھی۔

”تم کیا تلاش کر رہے ہو گی؟“ گوری یا نے پوچھا۔

نک کو اخبار کے اندرونی صفحات میں وہ چھوٹا سا اشتہار بھی مل گیا جو بلیو اسٹار پارٹی کے بارے میں تھا۔

”شیلہ نے باتوں کے دوران تین ساتھیوں کا ذکر کیا تھا۔“ نک نے کہا۔ ”لیکن سیکر کے بیان کے مطابق شیلہ کے صرف دو ساتھی ہیں۔“

پھر وہ اشتہار میں دی گئی تصویر کو گھورنے لگا۔ شیلہ کے دائیں بائیں دونو جوان تھے۔ ایک تو ماؤزے تھا۔ البتہ دوسرے کی شکل نک کے لیے اجنبی تھی۔ اس کا نام کین لکھا ہوا تھا۔

”اس اشتہار میں جیکر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص شیلہ کی میوزک پارٹی کا رکن نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جیکر کو بعد میں اپنے ساتھ ملایا ہو۔“

”ایسے موقع پر، جبکہ ان کے پاس نہ تو ساز و سامان ہے اور نہ ہی کوئی کام ہے کسی نئے آدمی کو پارٹی میں شامل کرنے کی کیا ضرورت۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیکر معاوضے

کے معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
 ”میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سارے معاملے کو ہی بھول جانا چاہیے۔“ گلوریا نے کہا۔ ”آؤ واپس چلیں اور سیکر اور ٹائی کو کھول کر اس چکر سے جان چھڑائیں۔“
 نک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری فیس کون دے گا؟“

دونوں اخبار کے دفتر سے باہر نکل کر کار میں جا بیٹھے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ انہیں شیلہ کی پرانی پک اپ دکھائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ماؤزے بیٹھا ہوا تھا۔ نک کار کی رفتار تیز کر کے اس کے برابر پہنچا اور روکنے کا اشارہ کیا۔
 ”ہیلو مسٹر ویلوٹ!“ ماؤزے نے کار روکنے کے بعد کہا۔ ”تم بہت جلدی بیدار ہو گئے؟“
 ”اور تم بھی!“ نک نے کہا۔ ”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟“
 ”شیلہ تو ابھی تک سو رہی ہے اور میں کین کو لینے اسٹیشن پر جا رہا ہوں۔ وہ بوسٹن سے کچھ سامان لے کر آ رہا ہے۔“
 ”اور جیکر کہاں ہے؟“

ماؤزے نے بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلا۔ ”مجھے پتا نہیں ادھر ہی کہیں ہو گا۔“
 ”کیا اسے گناہ بچانا آتا ہے؟“
 ”ہاں آتا ہے۔“

نک غصے سے بولا۔ ”دیکھو ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کرو۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اخبار میں تمہاری پارٹی کا اشتہار دیکھا ہے۔ اس میں جیکر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ کون ہے یہ شخص؟“

ماؤزے نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ادھر ادھر دیکھا۔ نک کار سے باہر نکلا، پک اپ کا دروازہ کھولا اور ماؤزے کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ ”کون ہے یہ شخص؟“
 ”پپ..... پولیس۔“

نک نے ماؤزے کو پرے دھکیلا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”ہم سیدھے شیلہ کے پاس جا رہے ہیں۔ گلوریا تم ہمارے پیچھے آؤ۔“

”لیکن میں جلدی میں ہوں۔“ ماؤزے نے احتجاج کیا۔ ”مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے۔“

اسٹیشن کی فکر نہیں کرو۔“ نک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے راستہ بتاتے چلو۔“

شیلہ ایک چھوٹے سے موٹیل میں مقیم تھی۔ جب نک اور گلوریا ماؤزے کی راہنمائی میں اس کے کمرے میں داخل

ہوئے تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے جلدی سے چادر کھینچ کر اپنا بدن ڈھانپ لیا۔
 ”کیا معاملہ ہے؟“ اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔
 ”ابھی تو بہت صبح ہے۔“
 ”فون اٹھاؤ اور اپنے دوست جیکر کو یہاں بلاؤ۔“
 نک نے غصے سے کہا۔
 ”کیا؟“ شیلہ نے حیرانی سے کہا۔

”تم نے سنا نہیں۔ میں نے کہا ہے کہ جیکر کو یہاں بلاؤ مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔“
 شیلہ نے اٹھ کر جیکر کو فون کیا اور چاروں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

”ہم نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا مسٹر ویلوٹ!“ شیلہ نے کہا۔ ”ہم صرف سیکر کے خلاف ثبوت حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”یہ باتیں ہم جیکر کی موجودگی میں کریں گے۔“
 گلوریا نک کو ایک طرف لے گئی اور بولی۔ ”اگر یہ جیکر واقعی پولیس کا آدمی ہے تو ہمیں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے۔“

”ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اگر یہ شخص میرے خلاف کوئی کارروائی کرنا چاہتا تو کل ہی کر سکتا تھا۔“

پونے نو بجے جیکر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے باری باری سب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کیا بات ہے؟ یہ اتنی خاموشی کیوں ہے؟“

”کیا تم پولیس کے آدمی ہو؟“ نک نے پوچھا۔
 ”ہاں، میرا تعلق شعبہ حادثات اور آگ سے ہے۔“ جیکر نے جواب دیا۔ ”میں یہ سمجھ رہا تھا کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا تھا۔ میں بھی حیران تھا کہ شیلہ مجھے کیسے جانتی ہے۔ تو یہ تم تھے جس نے شیلہ کو میرے بارے میں بتایا اور میرے پیچھے لگایا۔“

”نک ویلوٹ شمال مشرقی علاقوں میں ایک جانا بچا نام ہے۔“ جیکر نے کہا۔ ”اگر میں تمہاری مدد سے اس آفس زنی کے معاملے کی تک پہنچ گیا تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔“

میرے بارے میں تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا چوری اور ڈکیتی کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم لوگ میری فیس ادا کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو۔“

”اگر سیکر کے خلاف ثبوت مل گیا اور ہم اسے عدالت تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں انعام ضرور ملے گا۔“

”میں فیس کی بات کر رہا ہوں اور تم انعام کی، ہونہ اور جہاں تک ثبوت کا تعلق ہے مجھے ایک صابن کے ٹکڑے میں کوئی ثبوت نظر نہیں آتا۔ کلب کا صابن گھر میں استعمال کرنا ممنوع نہیں ہے۔“

”بات یہ ہے مسٹر ویلوٹ کہ ہم نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی۔“ جیکر نے کہا۔ ”سیکر کے خلاف ہمارے پاس ثبوت پہلے سے موجود ہے لیکن اس ثبوت کی تصدیق کے لیے ہمیں صابن کی ضرورت تھی۔ کیا تم نے بھی صابن کے بم کا ذکر سنا ہے؟ نہیں بھی نہیں سنا ہوگا سیکر نے صابن کے دو بم تیار کیے تھے جن میں سے ایک بم تو اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گیا اور دوسرا بم میگلان کلب کی تباہی کا باعث بن گیا۔ یہ ایک کیمیاوی بم تھا جس میں پانی اور سوڈیم کو صابن کے پلگ سے الگ رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد صابن کا پلگ پانی کی وجہ سے ٹھک گیا اور سوڈیم دھماکے سے چل اٹھا۔ اس بم میں نہ تو کوئی بجلی کا تار استعمال کیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی دھات کا ٹکڑا۔ مطلب یہ ہے کہ آگ پر قابو پانے کے بعد ہمیں بم کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔“

”اور ایک بم تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا؟“ نک نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں ماؤزے بتائے گا۔“ جیکر نے کہا۔

ماؤزے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”جس رات کلب میں آگ لگی اس رات میں کلب سے نکلنے والا آخری آدمی تھا۔ شیلہ اور کین جا چکے تھے اور میں ڈریسنگ روم میں اپنے سامان کو سنبھال کر رکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سیکر کو ہال کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں گتے کے دو ڈبے تھے۔ اس نے ایک ڈبا نہایت احتیاط کے ساتھ ردی کی ٹوکری میں رکھ دیا اور دوسرا ڈبالے کر باورچی خانے میں چلا گیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت کچھ عجیب سی لگی۔ ردی کی ٹوکری ڈریسنگ روم کے قریب ہی تھی اور اس کے آس پاس لکڑی کی چیزیں زیادہ تھیں۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ میں باہر گیا اور وہ ڈبا اٹھا کر اندر لے آیا۔ میں نے اسے الٹ کر دیکھا تو اس میں سے پانی نکل کر فرش پر بہہ گیا۔“

”اور پانی بہنے سے بم ناکارہ ہو گیا۔“ جیکر نے کہا۔

”کیونکہ پانی بہنے کے بعد سوپ پلگ کے ٹھکنے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔“

بول۔ ”میں نے اس ڈبے کو کھول کر بھی دیکھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ایک بم ہے۔ نصف گھنٹے بعد میں جانے لگا تو باورچی خانے سے ہلکے دھماکے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی آگ کے شعلے دکھائی دیے۔ تب مجھے شک ہوا کہ آگ گتے کے ڈبے کی وجہ سے لگی ہے۔ میں نے اس دوسرے ڈبے کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ فائر بریگیڈ کو فون کرنے کے لیے باہر بھاگا۔“

”لیکن فائر بریگیڈ کے پہنچنے تک ہر چیز جل کر رہ گئی تھی۔“ جیکر نے کہا۔ ”تاہم صابن کا بم جو ماؤزے نے باہر پھینکا تھا، ہمارے ہاتھ لگ گیا جسے ہم نے لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا۔ اگرچہ ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ سیکر نے ہی تیار کیا تھا لیکن عدالت کو یقین دلانے کے لیے ہمیں صابن کی ٹکیہ کی ضرورت تھی تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ یہ بم میگلان کلب کے خصوصی صابن سے تیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس صابن کا رنگ اور خوشبو خاص قسم کی ہے۔“

”کیا یہ صابن کسی اور جگہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا؟“ نک نے پوچھا۔

”نہیں، کلب میں جتنے صابن تھے وہ سب جل گئے تھے اور کسی دوسری جگہ پر اس صابن کی دوسری ٹکیہ موجود نہیں تھی۔ سوائے سیکر کے گھر کے، اور یہ ٹکیہ بھی اتفاق سے شیلہ نے دیکھ لی تھی۔“

”یہ سب تو ہوئیں قانونی باتیں۔“ نک نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم شروع سے ہی میری فیس دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔“

”تمہاری فیس کا معاملہ شیلہ کے ساتھ ہے۔“ جیکر نے کہا۔ ”اگر وہ دینا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ورنہ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں چوری کے الزام میں گرفتار نہیں کرا دیا۔“

”میں یقیناً تمہارا شکر گزار ہوں۔“ نک اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آؤ گلو ریا چلیں۔“

گلو ریا دروازے کے قریب رکتے ہوئے بولی۔ ”سیکر کے بارے میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم نے اسے گرفتار کر لیا ہے؟“

”مجھے صابن کی ٹکیہ کی لیبارٹری رپورٹ کا انتظار تھا۔ وہ کل صبح ہی موصول ہوئی ہے، آج کیس عدالت میں پیش کر کے سیکر کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے جائیں گے۔“

”کیا سیکر کی گرفتاری کے لیے کوئی انعام وغیرہ لگا رکھا جائے گا؟“ نک نے پوچھا۔

جیکر مسکرا کر بولا۔ ”انعام اس مجرم کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، جس کا پتا ٹھکانا معلوم نہ ہو۔ سیکر کو ہم جب چاہیں گھر سے اٹھا سکتے ہیں۔“

نک معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔ راستے میں گلو ریا نے کہا۔ ”مجھے شروع ہی سے شک تھا کہ اس کام میں کچھ نہیں ہے۔ بہر حال خوب تفریح رہی۔“

”اتنی مایوسی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“ نک نے بے پروائی سے کہا۔

کم و بیش پانچ میل دور جانے کے بعد نک نے سیکر اور ٹامی کے بندھن کھول دیے۔ گلو ریا پستول ہاتھ میں پکڑے تیار کھڑی تھی۔

”تم لوگ ہمیں کہاں لیے جا رہے ہو؟“ سیکر نے منہ سے کپڑا کھینچتے ہی پوچھا۔ ”یہ سراسر اغوا ہے۔“

”اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو مسٹر!“ نک نے کہا۔ ”اگر تم ہماری شمشیں میں نہ ہوتے تو اب تک آتش زنی کے الزام میں گرفتار ہو چکے ہوتے۔“

”وہ لوگ مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں کر سکتے۔“

”ثبوت بہت لپکا ہے ان کے پاس۔“ نک نے کہا۔

”ایک تو وہ صابن کا بم ہے جو تم نے ردی کی ٹوکری میں رکھا تھا اور اتفاق سے ماؤزے کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ دوسرے ان کے پاس صابن کی ایک ٹکیہ ہے جو تمہارے گھر سے حاصل کی گئی ہے۔ تم نے بم میں صابن کا جو پلگ استعمال کیا ہے وہ اسی قسم کے صابن سے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ٹکیہ گواہ بھی موجود ہے۔“

سیکر کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا بولا۔ ”کیا تم مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”میں کوئی سوشل ورکر یا خدائی فوجدار نہیں ہوں۔ مجھے اپنی فیس سے مطلب ہے، میں تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں، سمندر میں بھی پھینک سکتا ہوں اور کسی محفوظ جگہ پر بھی اتار سکتا ہوں فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ لگاؤ بولی۔“

”دس ہزار۔“ سیکر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

”تم نے اپنی قیمت بہت کم لگائی ہے۔“

اس کے علاوہ میں تمہیں گرفتار ہونے سے بھی بچا سکتا ہوں۔“ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ تمہارے پاس کوئی سادہ چیک ہوگا؟“

”یقیناً ہوگا۔“ نک نے کہا۔ ”تاہم چیک کیش ہونے تک تم ہمارے مہمان رہو گے۔“

سیکر نے پچیس ہزار ڈالر کا چیک لکھ دیا۔ نک اسے ایک ساحلی بینک میں لے گیا۔ انہوں نے فون پر نیویارک سے تصدیق کرانے کے بعد چیک کیش کر دیا۔ اس کے بعد نک نے فون پر جیکر سے رابطہ کیا۔

”ہیلو جیکر!“ اس نے کہا۔ ”میں نک ویلوٹ بول رہا ہوں، کیا تم نے سیکر کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے ہیں؟“

”ابھی نہیں۔“ جیکر نے جواب دیا۔ ”گریڈ جیوری ابھی شہادتیں سن رہی ہے۔ کل تک فیصلہ ہو جائے گا۔“

”سنو جیکر! وکیل صفائی تمہارے کیس کی دھجیاں اڑا دے گا۔ اس میں کوئی جان نہیں ہے۔ پہلی بات، سیکر کے پاس ٹامی نام کا ایک غنڈا ملازم ہے۔ اگر وہ کلب میں بم رکھنا چاہتا تو اس کے ذریعے رکھوا سکتا تھا۔ اسے خود یہ حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسری بات، یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ چونکہ بم میگلان کلب کے صابن سے بنایا گیا تھا لہذا سیکر نے ہی بنایا تھا۔ کلب سے کوئی بھی صابن کی ایک ٹکیہ چرا سکتا تھا۔ تیسری بات، جب ماؤزے نے باورچی خانے میں آگ کے شعلے بھڑکتے دیکھے تو اس نے اپنا موسیقی کا سامان کیوں نہیں نکالا۔ سارا نہیں تو آدھا سامان تو نکال ہی سکتا تھا۔ کم از کم بھاگتے بھاگتے ایک چیز ہی اٹھا کر لے جاتا۔“

”بات تو تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“

”اب نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کارروائی ماؤزے کی ہے۔ اس نے ہزاروں ڈالر مالیت کے آلات موسیقی پہلے ہی نکال کر کہیں چھپا دیے ہوں گے اور بعد میں کلب کو آگ لگا دی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک وہ اس سامان کو فروخت کر چکا ہوگا۔ اگر تم یوشن کے میوزک اسٹوروں سے پتا کرو تو تمہیں ضرور کوئی سراغ مل جائے گا۔“

”شکر یہ مسٹر ویلوٹ! میں ایسا ہی کروں گا۔“ جیکر نے کہا۔ ”تمہاری باتوں میں خاصا وزن ہے۔“

”شکر یہ کی کوئی ضرورت نہیں جیکر!“ نک نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بغیر فیس کے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔“

جب وہ بوتھ سے باہر نکلا تو اسے موسم خاصا خوشگوار محسوس ہوا۔

نیل اجهوٹ

ملک سمندر حیات

اس ریپ کائنات نے جب جب چاہا کہ بھٹکے ہو توں کو اپنی قدرت کی کوئی جھلک دکھائے تو کسی نہ کسی حوالے سے عبرت کا سامان پیدا کر دیتا ہے... ایسا ہی عبرت اثر وہ منظر بھی تھا جسے دیکھ کر نہ صرف رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے بلکہ یہ اختیار پر انسان کی زبان توبہ استغفار کا ورد کر رہی تھی۔ وہ چاہتا تو ایسا لرزہ خیز منظر انسان کی آنکھ سے اوجھل بھی رکھ سکتا تھا مگر اس کی قدرت کی نشانیاں ابتدا سے انتہا تک ایسے ہی نظر آتی رہی ہیں اور آئندہ بھی غیر یقینی انداز میں دکھائی دیتی رہیں گی... اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ ایسے واقعات سے عبوت پکڑتا ہے یا غفلت کے پردے میں نظر چرالیتا ہے۔

ملک صاحب کی ڈائری سے ایک اور

سبق آموز اور ناقابل

فرا موش واقعہ

خیر دین نے مجھے بتایا تھا کہ حفیظ جٹ کی قبر میں سے پچھلی رات اس نے روشنی نکلتی دیکھی تھی۔ اس روشنی کو دیکھ کر وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا اور صبح ہوتے ہی وہ میرے پاس دوڑا چلا آیا تھا۔

حسین آباد سمندری، ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کا ایک دور دراز قصبہ تھا۔ مجھے اس تھانے میں تعینات ہونے لگ بھگ ایک ماہ ہوا تھا۔ میں اس قصبے اور یہاں کے لوگوں کے معاملات سے ابھی پوری طرح واقف نہیں تھا۔ خیر دین سے ابتدا ہی میں میری ملاقات ہو گئی تھی اس لیے میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

”خیر دین! تم نے اس واقعے کے بارے میں اور کس کس کو بتایا ہے؟“ میں نے لہجہ دھیمار کھتے ہوئے سوال کیا۔

”کسی کو نہیں سرکار!“ وہ بھی نیچی آواز میں بولا۔

”یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے خیر دین.....؟“

”جی..... میں کچھ سمجھا نہیں!“

”تم نے بتایا ہے کہ ابھی ایک ہفتہ پہلے حفیظ جٹ کو یہاں دفن کیا گیا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے

وہ ایک تاریک اور جس زدہ رات تھی۔ میں اس وقت حسین آباد کے قبرستان میں خیر دین کے ساتھ موجود تھا۔ خیر دین اس قبرستان کا گورکن تھا اور میں اس کی ایک خوف زدہ فرمائش پر وہاں پہنچا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں جانب گہری تاریکی اور خاموشی تھی جس میں وقفے وقفے سے حشرات الارض کی مخصوص آوازیں بھی سننے کو مل رہی تھیں۔ جب یہ آوازیں پیدا ہوتیں تو خاموشی کا بھرم ٹوٹ جاتا اور تاریکی میں بھی زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ ہم دونوں قبرستان کے ایک حصے میں بیٹھے، دوسرے حصے کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری توجہ کا مرکز ایک قبر تھی..... حفیظ جٹ کی قبر!

آج صبح خیر دین میرے پاس تھانے آیا تھا اور اس نے مجھے حفیظ جٹ کی قبر کے حوالے سے ایک عجیب و غریب کہانی سنائی تھی۔ پہلے تو مجھے اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا لیکن جب اس کی سنجیدگی اور اصرار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تو میں نے رات میں قبرستان آنے کا وعدہ کر لیا تھا اور اپنے وعدے کے مطابق اس وقت میں اس کے ساتھ تھا۔

کہا۔ ”اس کے گھر والے ادھر حسین آباد میں موجود ہیں۔ تم نے اگر حفیظ کی قبر کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوتے دیکھا تھا تو اصولی اور فطری طور پر سب سے پہلے تمہیں متوفی کے وارثوں کو اطلاع کرنا چاہیے تھی اور تم..... میرے پاس دوڑے چلے آئے؟“

”اس کی ایک خاص وجہ ہے جناب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔“ کیسی وجہ خیر دین؟“

”یہ واقعہ دیکھتے ہی میرے ذہن میں زمان صاحب کی نصیحت تازہ ہو گئی تھی.....“ وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”زمان صاحب کون؟“ بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔

”میں زمان خان کی بات کر رہا ہوں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”جو آپ سے پہلے اس تھانے کے انچارج ہوا کرتے تھے.....!“

”اوہ..... تو تم ان کی بات کر رہے ہو۔“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”خان صاحب نے تمہیں کون سی نصیحت کی تھی؟“

”ہمارے درمیان سوال و جواب پر مبنی یہ گفتگو بھی جاری تھی اور میں نے اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی حفیظ جٹ کی قبر سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ خیر دین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”یہ کوئی دو ڈھائی سال پہلے کی بات ہے سرکار..... اسی قبرستان میں ایک انوکھا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس وقت میری بیوی جیواں بھی زندہ تھی اور وہ شیطانی کھیل سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا.....!“

”شیطانی کھیل؟“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

”جی شیطانی کھیل!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک رات وہ کسی کام سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تو اس نے تین چار افراد کو ایک قبر کی کھدائی کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے آکر مجھے بتایا۔ جب تک میں جیواں کے ساتھ جائے وقوعہ تک پہنچتا، وہ لوگ غائب ہو چکے تھے۔ کھلی ہوئی قبر اس بات کا ثبوت تھی کہ میری بیوی نے کوئی خواب دیکھا تھا اور نہ ہی کسی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں نے ہی موقع واردات پر پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ دراصل.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”دراصل، پہلے تو مجھے جیواں کی بات کا یقین ہی نہیں

آیا تھا۔ میں نے سوالات میں اچھا خاصا وقت برباد کر دیا اور عین ممکن ہے، ان لوگوں نے بھی جیواں کو دیکھ لیا ہوگا۔ قبرستان سے نکل گئے ہوں۔ بہر حال، اللہ کا شکر کہ قبر اندر مردہ سلامت موجود تھا۔ اب میں آپ کو اس غلطی بارے میں بتاتا ہوں جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔

وہ ایک بار پھر متوقف ہوا اور گھور کر گہری تاریکی دیکھنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اندھیرے کی سیاہی میں کچھ کھوج نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے صبح ہوتے ہی لوگوں کو اطلاع دی جن کے کسی رشتے دار کی قبر رات کو خرابی افراد نے کھود ڈالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر پورے حسین آباد میں پھیل گئی بلکہ اگلے دو دن میں تو اس پاس کے علاقوں میں بھی اس کی دھوم مچ چکی تھی۔ جب یہاں سے تھانا انچارج زمان صاحب کو اس واقعے کے بارے میں چلا تو انہوں نے مجھے تھانے بلا کر خوب ڈانٹا ڈپٹا.....“

”اس ڈانٹ ڈپٹ کا سبب کیا تھا؟“ وہ ذرا دیر کے لیے تھما تو میں نے پوچھ لیا۔

زمان خان صاحب سابق تھانا انچارج حسین آباد میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت ہی غصے والے مگر صاف دل کے پولیس آفیسر تھے۔ پچھلے دنوں ان کی گھروالی انتقال ہو گیا تھا لہذا انہوں نے کوشش کر کے اپنا تھانا سرگودھا کے ایک تھانے میں کرالیا تھا تا کہ بچوں کے قریب رہ کر ان کی بہتر تربیت اور دیکھ بھال کر سکیں۔ زمان خان محکمے میں عموماً ”خان صاحب“ کہا جاتا تھا۔

خیر دین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”کا کہنا تھا کہ میں نے اس خبر کو عام کر کے اچھا نہیں کیا۔ طرح مجرم محتاط ہو گئے ہیں اور انہیں گرفت میں لینا اب نہیں رہا۔ وہ اب بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔“

خان صاحب کا خیال تھا کہ اگر میں اس واقعے کے بارے میں صرف انہی کو اطلاع دیتا تو آئندہ راتوں میں قبرستان نگرانی کر کے ان مجرموں کو پکڑا جاسکتا تھا۔ انہوں نے موقع پر مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ آئندہ کبھی میں قبر کی حدود میں اس نوعیت کی کوئی خفیہ سرگرمی دیکھوں تو چھپ چاپ تھانے پہنچ کر انہیں اطلاع دوں۔ وہ فیصلہ کریں گے اس کے بعد کیا کرنا ہے اور یقین جانیں، زمان صاحب بالکل سچ کہا تھا..... جب بعد میں ان کے حکم پر باقی قبروں کا ایک ایک بانی سے معائنہ کیا گیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا

تین قبروں کو کھود کر بڑی صفائی سے بند کر دیا گیا تھا۔ جب مذکورہ تین قبروں کا زمان صاحب نے کھدوا کر اپنی نگرانی میں جائزہ لیا تو پتا چلا کہ ان قبروں میں دفن مردوں کی ہڈیاں غائب تھیں۔ وہ قدرے پرانی قبریں تھیں لہذا ان کے اندر مردوں کے جسم باقی رہنا ممکن نہیں تھا.....!“

”خان صاحب کی نصیحت پر عمل کر کے تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے خیر دین۔“ میں نے سمجھیر انداز میں کہا۔ ”لیکن ہمیں یہاں بیٹھے ہوئے لگ بھگ آدھا گھنٹا ہو گیا ہے مگر اس قبر میں سے ابھی تک روشنی نہیں نکلی۔ اس جس زندہ اور گرم رات میں اور کتنی دیر یہاں بٹھاؤ گے؟“

”تھانے دار صاحب! میں نے صبح تھانے آکر آپ کے سامنے جو کچھ بھی بیان کیا تھا، اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”رات میں نے خود اپنی آنکھوں سے حفیظ جٹ کی قبر میں سے نیلے رنگ کی روشنی نکلتے دیکھی تھی۔“

”لیکن صبح تو تم نے صرف روشنی کا ذکر کیا تھا۔“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”نیلارنگ تم نے ابھی اس میں شامل کیا ہے..... یہ کیا ماجرا ہے خیر دین؟“

”شاید میں صبح روشنی کے رنگ کے بارے میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”وہ روشنی نیلے ہی رنگ کی تھی، جیسے گیس والے اسٹوو میں سے نیلی آگ کے شعلے نکلتے ہیں.....“

قدرتی آگ کے شعلوں کا رنگ تو نارنجی سرخ ہی ہوتا ہے لیکن اگر اس آگ کے اندر کسی قسم کی گیس کا پریشر بھی شامل ہو تو یہی نارنجی سرخ شعلے نیلگوں صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس زمانے میں سوئی گیس کا تصور نہیں تھا اور گیس کی جگہ بھی گاؤں دیہات والوں کی نظروں سے نہیں گزرتی تھی، لہذا وہ نیلی آگ کے وجود سے آشنا نہیں تھے جیسی خیر دین خاصا گھبرایا ہوا نظر آتا تھا لیکن میرا ذہن اس حوالے سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں خیر دین کے ساتھ قبرستان کے اندر نیلی روشنی کے نظارے کے لیے کھات لگے تو بیٹھا تھا مگر میرا دماغ خاصا الجھا ہوا تھا۔

اپنی اسی الجھن کی سطح کے لیے میں نے خیر دین سے پوچھ لیا۔ ”تمہاری گھروالی کے انتقال کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”تین کوئی ڈیڑھ، دو سال۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جیواں نے اپنی موت سے کوئی چھ آٹھ ماہ پہلے ہی وہ قبر کی کھدائی والا واقعہ دیکھا تھا۔“

”کیا جیواں کی قبر بھی اسی قبرستان میں ہے؟“

”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ ادھر تیسری قبر جیواں کی ہے۔“

”کیا تم جیواں کے انتقال کے بعد اس قبرستان میں اکیلے ہی رہ رہے ہو؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”جی ہاں۔“ وہ میری سنجیدگی پر چونک اٹھا پھر پوچھا۔ ”آپ نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا ہے تھانے دار صاحب.....؟“

”میں نے اس کے استفسار پر توجہ نہیں دی اور پوچھا۔“

”کیا پہلے بھی تمہیں اس قسم کے غیر معمولی منظر نظر آتے رہے ہیں..... میرا مطلب ہے، جیواں کے انتقال کے بعد سے اب تک.....؟“

”کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ اس قبرستان میں اکیلے رہتے ہوئے میں کسی ذہنی یا نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں۔“ وہ حلقی آئینز لہجے میں بولا۔ ”میرا دماغ خراب ہو گیا ہے جو انٹی سیدھی چیزیں دیکھنے لگا ہوں۔“

”میں نے خیر دین گورکن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ایسا ناممکن تو نہیں ہے؟“

”آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا نا.....“ وہ دور تاریکی میں گھورتے ہوئے بولا۔ ”اب آپ خود اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ بھی دیکھ لیں.....!“

میں نے خیر دین کی نگاہ کا تعاقب کیا اور آن واحد میں میری نظر حفیظ جٹ کی قبر تک پہنچ کر ٹھہر گئی۔ خیر دین نے مجھ سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ حفیظ جٹ کی قبر میں سے واقعی نیلی روشنی خارج ہو رہی تھی۔

یہ نیلی روشنی شعاعوں کی شکل میں نہیں بلکہ شعلوں اور لپٹوں کی صورت میں نکل رہی تھی جیسے اس قبر کے اندر کوئی بجھتی دھک رہی ہو۔ اس منظر نے مجھے مبہوت سا کر دیا تھا۔ خیر دین کی سرسراہٹ ہوئی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

”تھانے دار صاحب..... اب تو آپ کو..... میری بات کا..... یقین آ گیا نا.....؟“

”آنکھوں دیکھی حقیقت پر بے یقینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن میں خیر دین کی طرح خوف زدہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”آؤ خیر دین..... چل کر دیکھتے ہیں، یہ کیا ماجرا ہے.....؟“

”کیا آپ حفیظ جٹ کی قبر کے قریب جائیں گے.....!“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

”ظاہر ہے، اتنی دور کھڑے ہو کر تو حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں ہو سکتی نا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”ادھر جا کر ہی پتا چلے گا، حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔“

”تو..... کیا..... میں بھی آپ کے ساتھ چلوں.....؟“

”کیوں..... کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے خیر دین؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں جناب، یہ کیسا چکر ہے۔“ وہ بہ دستور بھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ کوئی خطرناک معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا.....؟“

میں نے بڑی حد تک اس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا لیکن پھر بھی پوچھ لیا۔ ”کیسا خطرناک چکر خیر دین.....؟“

”مثلاً..... کوئی ہوئی چکر..... کوئی نادیدہ مخلوق.....!“ وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”شاید تمہارا اشارہ جن یا بھوت کی طرف ہے.....؟“

”جی تھانے دار صاحب! یہ چیزیں وجود تو رکھتی ہیں نا۔“ وہ گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”کل جب میں نے یہ منظر دیکھا تھا تو میں آگے نہیں آیا تھا، اپنے کوارٹر کے دروازے پر ہی کھڑا رہا تھا۔“

قبرستان کے ایک کونے میں گورکن کی رہائش کے لیے ایک کمر بنا ہوا تھا۔ خیر دین نے اسی کوارٹر کا ذکر کیا تھا۔ میں نے اس کی سرا سیمہ حالت کے پیش نظر کہا۔

”خیر دین! اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو تم اپنے کوارٹر میں جا کر آرام کرو۔ میں خود ہی جا کر دیکھ لیتا ہوں کہ حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ کیا معاملہ ہے.....“

”تو آپ کو ڈر نہیں لگ رہا.....؟“ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔

”ڈر اور خوف کو جو بنا کر میں اپنے پاؤں میں پہنتا ہوں خیر دین!“ میں نے حفیظ جٹ کی قبر کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں سے ڈرنے لگا تو پھر ہو گئی تھانے داری.....!“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”پولیس ڈیپارٹمنٹ کسی اوکھلی کے مانند ہے۔ جب اس میں سردے دیا تو پھر ڈنڈوں سے کیا ڈرنا!“

”آپ تو بہت بہادر پولیس آفیسر ہیں.....“ وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تم بھی کچھ کم دلیر نہیں ہو، خیر دین۔“ میں نے کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

بادل نا خواستہ وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ چند لمحوں کے بعد ہم ایک منٹ کے بعد ہم حفیظ جٹ کی قبر پر پہنچے۔

تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے ہی ایک عجیب واقعہ ہوا اور وہ یہ کہ وہ نیلی آگ دیکھتے ہوئے بھگتے بھگتے اب وہ عام اور نارمل قبر نظر آرہی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب ہم حفیظ جٹ کی قبر پر پہنچے تو میں نے کسی انسان کے کراہنے کی آوازیں بھی سنی تھیں جیسے کوئی شخص انتہائی اذیت کے میں داد و فریاد کر رہا ہو لیکن جیسے ہی ہم قبر پر پہنچے، یہ آواز آنا بند ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ نیلی آگ بھی دیکھنے سے غائب ہو گئی تھی۔

اس حیرت انگیز صورت حال کے پیش نظر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ تھا..... عذاب قبر!

میں نے اپنے خیالات سے جب خیر دین کو آگاہ کیا وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! قبرستان میں نیک و بد ہر قسم کے انسانوں کے جنازے لائے جاتے ہیں۔ میں نے بھی کسی قبر کے ساتھ ایسا واقعہ ہونے نہیں دیکھا۔“

”جو بات کبھی نہ ہوئی ہو.....“ میں نے سوچنے پر ڈوے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آئندہ کبھی کبھی نہیں ہوگی۔ میں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں ”عذاب قبر“ کے دو تین واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ تمہارے لیے یہ پہلا تجربہ ہو سکتا ہے۔“

”جی..... میں نے اپنی ساری زندگی قبرستان میں گزار دی ہے لیکن اس سے پہلے میں نے کبھی ایسا کوئی واقعہ نہیں دیکھا۔“ وہ خوف زدہ نظر سے حفیظ جٹ کی قبر پر گھورتے ہوئے بولا۔ ”ویسے ہمارے مذہب میں تو عذاب قبر کا ذکر ہے.....“

”ہمارے مذہب میں، قرآن و سنت اور احادیث مبارکہ کے توسط سے جو کچھ شامل ہے اس پر یقین رکھنا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اور قبر کے عذاب والا معاملہ بھی ہر زاویے سے معجزانہ تصدیق شدہ ہے.....“

خیر دین اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں نے دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جب ہم اس قبر سے چند فٹ کی دوری پر تھے تو.....“

”تم نے قبر کے اندر سے کسی انسان کے کراہنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ کیا ایسی کوئی صدا تمہاری سماعت تک بھی پہنچی تھی؟“

”جی تھانے دار صاحب! میں نے بھی کچھ ایسی ہی آوازیں سنی تھیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”بس، تو پھر یہ ثابت ہو گیا کہ حفیظ جٹ عذاب قبر میں مبتلا ہے۔“ میں نے جتنی انداز میں کہا۔ ”اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ تم بھی بھول جاؤ کہ ایسا کوئی منظر تمہاری نگاہ سے گزرا ہے۔“

ہم واپسی کے لیے مڑے تو خیر دین نے پوچھا۔ ”تھانے دار صاحب! اب دوبارہ تو یہ قبر آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے گی نا.....؟“

”اس بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا خیر دین!“

میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ”اللہ کے معاملات کا اللہ ہی کو پتا ہے۔ ہمیں ان معاملات کی تحقیق اور جستجو میں نہیں پڑنا چاہیے۔ جب حفیظ جٹ کا عذاب ختم ہوگا تو یہ معاملہ خود ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

”آپ جیسا کہتے ہیں، میں ویسا ہی کروں گا۔“

”ایک کام تمہیں یہ بھی کرنا ہے خیر دین.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس قفسے کو ادھر ہی دفن کر دو۔ کسی سے بھی اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات ہم دونوں کے بیچ ہی رہنا چاہیے.....“

اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔

”میں تو اس علاقے میں نیا ہوں۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کے لوگوں کے بارے میں اچھی طرح نہیں جانتا۔ تمہاری ساری زندگی حسین آباد کے قبرستان میں گزری ہے لہذا حسین آباد کے بچے بچے سے تم واقف ہو گے۔ حفیظ جٹ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جی..... میں کچھ سمجھا نہیں؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”مطلب یہ کہ اس بندے کے اعمال اور کردار کیسا تھا؟“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر مرنے کے بعد یہ عذاب قبر میں مبتلا ہے تو یقیناً اس سے زندگی میں کوئی بہت بڑا گناہ ہوا ہوگا.....؟“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جناب عالی!“ وہ

پریشان نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”حفیظ جٹ تو بہت ہی نیک اور شریف انسان تھا۔ نماز روزے کا پابند اور عبادت گزار۔ حسین آباد میں کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی.....“

”یہ سب اپنی جگہ درست ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں نے ابھی اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے اس کی تشریح جب تک نہیں ہوگی، میں مطمئن نہیں ہوں گا۔ بہر حال.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر پوچھا۔

”تم نے کیا بتایا تھا، حفیظ جٹ کو ایک ہفتہ پہلے یہاں دفن کیا گیا تھا؟“

”جی ہاں، اس کی تدفین کو ابھی آٹھ دس دن ہی ہوئے ہیں۔“ خیر دین نے جواب دیا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اس کے کوارٹر کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے سوال کیا۔ ”تم نے پچھلی رات پہلی مرتبہ حفیظ جٹ کی قبر میں سے نیلی آگ نکلتی دیکھی تھی یا پچھلے آٹھ دس دن میں پہلے بھی یہ منظر دیکھ چکے ہو؟“

”جی، کل رات پہلی بار اور آج رات دوسری دفعہ۔“

وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ابھی تو سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ کل دیکھوں گا، اس حوالے سے کیا جاسکتا ہے۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ اور اس بات کا یقین رکھو کہ تمہاری جان کے لیے خطرے والی کوئی بات نہیں۔“

”اور اگر دوبارہ اس قبر سے آگ نکلنا شروع ہوگئی تو.....؟“

خیر دین کا خوف ابھی تک پوری طرح رفع نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”تو ٹھٹکے دینا..... جس نے جو کچھ بھی اچھا برا کیا ہے، وہ اس کے سامنے تو آتا ہے۔ کسی کے سامنے دنیا میں، کسی کے سامنے قبر میں اور کسی کے سامنے ادھر..... دوسری دنیا میں جسے ہم آخرت کا نام دیتے ہیں.....“

وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں نے اسے سختی سے ہدایت کر دی کہ فی الحال وہ اس واقعے کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ اس نے میری نصیحت پر عمل کرنے کی یقین دہانی کرائی اور میں قبرستان سے نکل کر تھانے آ گیا۔

میں نے یہ جو قبرستان کا خفیہ دورہ کیا تھا اس کے بارے میں میرے تھانے کا عملہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں آج

123

122

سپنس ڈائجسٹ

اکتوبر 2013ء

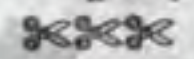
WWW.PAKSOCIETY.COM

حسب معمول تھانے سے اٹھ کر اپنے سرکاری کوارٹر میں آیا تھا اور پھر آدھی رات کے وقت حسب وعدہ قبرستان پہنچ گیا۔ میں جیسے چپ چاپ کوارٹر سے نکلا ویسے ہی خاموشی کے ساتھ واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح میں کچھ چارپائی پر لیٹے لیٹے میں کافی دیر تک حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ میں اس سے پہلے عذاب الہی کے ایسے تین چار واقعات دیکھ چکا تھا۔

میرا دھیان بار بار نیلی آگ اور قبر میں سے خارج ہونے والی کراہنے کی آوازوں کی طرف جارہا تھا۔ میرے نزدیک اس بات میں کوئی دورائے نہیں ہو سکتی تھیں کہ حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا تھا وہ عذاب الہی کی ایک قسم تھی مگر میں اس نکتے کو نہیں سمجھ پایا تھا کہ آگ نارنجی یا سرخ ہونے کے بجائے نیلے رنگ کی کیوں تھی؟

یہ بہت اہم سوال تھا جس کا کافی سوچ بچار کے بعد بھی میرے ذہن میں کوئی جواب نہ آ سکا۔ تھک ہار کر میں نے نیند کی آغوش میں سر رکھ دیا۔



اگلی صبح بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔

میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک کانشیل نے میرے کمرے میں آ کر بتایا کہ گورکن منج سے میرے انتظار میں بیٹھا ہے۔ میں نے کانشیل سے کہہ کر گورکن خیر دین کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔

وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے پوچھا۔ ”ہاں بھی خیر دین! خیریت تو ہے نا۔ صبح تمہاری آمد مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی ہے۔“

”گہری تشویش“ والے الفاظ میں نے اس کے چہرے پر بچے ہوئے بارہ کو دیکھ کر کہے تھے۔ جواب میں اس نے بتایا۔ ”تھانے دار صاحب! میں پوری رات سو نہیں سکا ہوں۔“

”کیا حفیظ جٹ کی قبر سے دوبارہ نیلی آگ نکلنے لگی تھی؟“ میں نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ”رات تو ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن صبح جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”ایسا کیا دیکھ لیا تم نے خیر دین؟“ میں کہنیاں میز پر ٹکا کر آگے کوچک آیا۔

”رات بھر تو میں نیلی آگ کے بارے میں سوچ

سوچ کر جاگتا رہا تھا۔“ وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”صبح بھی میرے ذہن میں حفیظ جٹ کی قبر کا خیال تھا لہذا میں اجالا ہوتے ہی اس کی قبر پر چلا گیا اور..... وہ ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا۔

”تم حفیظ جٹ کی قبر پر پہنچے پھر کیا ہوا؟“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”وہاں تم نے ایسا کیا دیکھ لیا جو کہیں اتنا خوف محسوس ہو رہا ہے۔“

”جناب! اس کی قبر کھلی پڑی ہے۔“ اس نے سر اسیسہ لہجے میں بتایا۔ ”حفیظ جٹ کا کفن اور لاش سب کچھ جل کر خاک ہو چکا ہے اور..... اور..... قبر کے اندر موجود ہر شے نیلے رنگ کی نظر آرہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نیلی آگ نے اندر کی ہر چیز کو جلا کر نپلا کر دیا ہو۔“

یہ واقعی حیرت انگیز اور توجہ طلب تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ حفیظ جٹ قبر کے عذاب میں مبتلا رہا تھا۔ کسی نیک، پارسا اور بے گناہ انسان کا یہ حشر بھی نہیں ہوتا۔ ضرور اس بندے نے زندگی میں کوئی ایسا گناہ کیا ہوگا جس کا یہ نتیجہ تھا۔ چیزیں عموماً جیسی نظر آتی ہیں، ضروری نہیں کہ وہ ویسی ہی ہوں گی۔ اگر حفیظ جٹ گاؤں والوں کی نظر میں ایک نمازی، پرہیزگار اور شریف انسان تھا تو پھر اس کے مردے کو عذاب قبر سے کیوں گزرنا پڑا۔ میری سماعت میں وہ اذیت ناک کراہنے کی آواز ابھی تک تازہ تھی جو پچھلی رات میں نے حفیظ جٹ کی قبر کے بالکل قریب پہنچ کر سنی تھی۔ صرف میں نے ہی نہیں، درو میں ڈوبی ہوئی یہ آواز گورکن خیر دین نے بھی سنی تھی۔

”تم قبرستان میں پہنچو.....“ میں نے خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں، میں بھی آ رہا ہوں۔“

”کیا اس واقعے کے بارے میں، میں حفیظ جٹ کے گھر والوں کو اطلاع کروں؟“ خیر دین نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں، ضرور.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اب اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اب تو بتانا لازمی ہو گیا ہے۔“

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا تو میں نے کانشیل مراد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مراد علی کا تعلق موضع حسین آباد ہی سے تھا۔ اس کی ساری زندگی اسی تھانے میں گزری تھی اور یہ لوگ پچھلی تین نسلوں سے حسین آباد میں رہ رہے تھے۔

مراد علی میرے پاس آیا تو میں نے اسے بیٹھنے کے

لے کہا۔ جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔ ”مراد! تم حفیظ جٹ کو جانتے ہو نا.....؟“

”جس کا ابھی آٹھ دس دن پہلے انتقال ہوا ہے، آپ اسی کی بات کر رہے ہیں نا؟“ اس نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ”ہاں..... میں اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔“

”جی ملک صاحب! میں حفیظ جٹ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ میں تو حسین آباد کے ایک ایک بندے کو اچھی طرح ہی جانتا ہوں۔“

”فی الحال، میں حفیظ جٹ کے بارے میں جانتا چاہتا ہوں“ میں نے کبھی لہجے میں کہا۔ ”تم اس کے کردار کے بارے میں کیا جانتے ہو..... وہ کس قسم کا انسان تھا؟“

”میری معلومات کے مطابق تو حفیظ جٹ ایک بھلا انسان تھا ملک صاحب!“ مراد علی نے جواب دیا ”اپنے کام سے کام رکھنے والا، نماز روزے کا پابند ایک نیک انسان جس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔“

مرحوم حفیظ جٹ کے بارے میں کچھ اسی قسم کے تاثرات کا اظہار گورکن خیر دین نے بھی کیا تھا اور یہی بیانات میری الجھن کا باعث بھی تھے۔ میرا ذہن یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ کسی نیک و پارسا آدمی کو قبر کا عذاب بھی ہو سکتا ہے۔

”مراد! حفیظ جٹ کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟“ میں نے کانشیل سے سوال کیا۔

”جب سے وہ حسین آباد میں ہے..... مطلب یہ کہ..... تھا!“

”تو کیا وہ کہیں اور سے آ کر یہاں آباد ہوا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں نے سنا ہے، حسین آباد آنے سے پہلے یہ لوگ چک جھمرا میں رہتے تھے۔“

”حسین آباد وہ کتنا عرصہ پہلے آئے تھے؟“

”کوئی پانچ سال پہلے۔“ کانشیل نے جواب دیا۔

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”ملک صاحب! خیریت تو ہے نا.....!“ مجھے خاموش ہوتے دیکھ کر مراد علی نے مجھس انداز میں استفسار کیا۔

”آپ اچانک حفیظ جٹ میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لینے لگے ہیں اور وہ بھی گورکن خیر دین کی آمد کے بعد..... وہ دو دن سے روزانہ صبح تھانے میں بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہوتا

ہے.....؟“

”تو کیا تم نے گورکن سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت پوچھا ہے لیکن اس نے کچھ بتایا نہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں بتاتا ہوں.....!“ میں نے کہا۔

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کانشیل مراد کو، حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتا دیا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری بات سن رہا اور میرے خاموش ہونے پر وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے ملک صاحب.....؟“

”یہ ہو چکا ہے اور..... پچھلی رات تو میں نے اپنی آنکھوں سے نیلی آگ کا نظارہ دیکھا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کی اذیت ناک آوازیں بھی سنی ہیں۔“

”حفیظ جٹ تو بہت ہی نیک بندہ تھا جناب!“ وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو بالکل ہی یقین نہیں آ رہا۔“

”تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ قبرستان چلو گے مراد علی!“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر شاید تمہیں یقین آ جائے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے، حفیظ جٹ کو پیش آنے والے واقعات کی خبر میرے تھانے کے عملے میں سرایت کر گئی۔

مجھے امید تھی کہ دوسری جانب حسین آباد میں بھی یہ سنسنی خیز خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہوگی کیونکہ میں نے گورکن کی زبان پر پڑے مصلحت کے تالے کو اپنے ہاتھوں سے کھول دیا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ ادھر قبرستان میں خاصی بھیڑ سے واسطہ پڑے گا۔

میری توقعات سو فیصد درست ثابت ہوئی تھیں۔ جب میں کانشیل مراد علی کے ساتھ قبرستان پہنچا تو وہاں لگ بھگ دو درجن افراد حفیظ جٹ کی قبر کا نظارہ بہ الفاظ دیگر قبر کا تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھے۔

پولیس کی آمد کے پیش نظر کچھ لوگ تو خود ہی پیچھے ہٹ گئے اور کچھ کو مراد علی نے ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹا دیا تو میں حفیظ جٹ کی قبر کے عین اوپر پہنچ گیا۔ پھر میں نے وہاں جو کچھ دیکھا، وہ انتہائی عبرت ناک اور دل ہلا دینے والا تھا۔

گزشتہ رات میں نے اسی قبر کے اندر سے وحشت ناک اور مہربوز آوازیں ابھرتی محسوس کی تھیں جیسے کسی انسان کو اذیت ناک انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو اور

اس کے ساتھ ہی مذکورہ قبر کو نئی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں بھی دیکھا تھا اور اب..... خدا کی پناہ! رات کو یہ قبر آگ میں جل تو رہی تھی مگر وہ دیکھنے میں صحیح سلامت نظر آتی تھی اور اب یہ مکمل طور پر کھلی پڑی تھی۔ محاورہ اس کے لیے ”قبر کا پھٹنا“ جیسے الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔ قبر کے اندر کی ہر شے کا رنگ نیلگوں دکھائی دیتا تھا حتیٰ کہ اندرونی مٹی بھی گویا نیل چڑھی نظر آرہی تھی۔ حقیقت جٹ کی لاش جل کر کوئلہ بن چکی تھی اور اس پر کفن کا نام و نشان نہیں تھا۔ لاش کے برائے نام باقیات میں بھی نیلا ہٹ پائی جاتی تھی۔ الغرض یہ ایک عبرت اثر اور روئے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔

وہاں موجود لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی جاری تھیں۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق تبصرہ کر رہا تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ اس آواز میں حد درجہ حیرت تھی۔ ”حقیقت جٹ تو اللہ کا نیک بندہ تھا پھر اس کی قبر کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہوا۔ مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔“ ”کیسی سازش بھائی؟“ دوسرے نے پوچھا۔ ”میں سمجھتا ہوں، کسی نے گاؤں والوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے یہ چکر چلایا ہے۔“ پہلا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

تیسرے نے پوچھا۔ ”کوئی سازشی شخص حسین آباد کے باسیوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کیوں کرے گا؟“ ”تا کہ ہم لوگ قبرستان سے دور رہیں.....“ ”ہم لوگ قبرستان سے دور رہیں گے تو اس میں اس سازشی شخص کا کیا فائدہ ہے؟“ یہ استفسار کسی چوتھے شخص کی طرف سے آیا تھا۔

”تم لوگوں کو دو سال پہلے والا واقعہ تو یاد ہوگا۔“ پہلا اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے پورا زور مار رہا تھا ”جب کچھ لوگوں نے بڑے پراسرار انداز میں قبریں کھود کر مردوں کی لاشیں اور ہڈیاں چراتا شروع کر دی تھیں.....“

”ہاں، ہاں.....“ سب نے اثبات میں گردن ہلائی اور بیک زبان ہو کر بولے۔ ”اس واقعے کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔“

”مجھے یہ اسی سلسلے کی کڑی نظر آتی ہے۔“ پہلا گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ہو سکتا ہے، وہ لاش اور ہڈی چور گروہ دوبارہ متحرک ہو گیا ہو اور اپنی کارروائی سے پہلے ان لوگوں نے حقیقت جٹ کی قبر کا یہ حشر کر کے گاؤں والوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہو تا کہ لوگ قبرستان کا رخ کرتے

ہوئے سو بار سوچیں اور وہ اس بات کا فائدہ اٹھا کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں ورنہ.....“ وہ مقرر نما شخص تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ورنہ کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ حقیقت جٹ جیسے نمازی اور پرہیزگار شخص کی قبر کے ساتھ یہ حشر ہو۔ وہ تو اللہ کا نیک بندہ تھا.....“

ایک جانب سے ٹیکھا بیان آیا۔ ”نیتوں کا حال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم تو صرف انسان کے ظاہری اعمال ہی کو دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے، حقیقت جٹ اپنی بچپن سالہ زندگی میں کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہوا ہو جس کی سزا کے طور پر اللہ نے اسے اس عذاب میں مبتلا کر دیا ہے.....“

وہاں موجود سب لوگوں نے اس شخص کی جانب تاپسندیدہ نظروں سے دیکھا جس نے حقیقت جٹ کے گناہ گار ہونے کی بات کی تھی۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں ذرا دقت نہ ہوئی کہ حسین آباد میں بسنے والوں کی اکثریت مرحوم حقیقت جٹ کو اللہ کا نیک بندہ تصور کرتی تھی۔

میں نے اس شخص کو بہ غور دیکھا جس نے حقیقت جٹ کے خلاف اظہار خیال کیا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ عمر تیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ رنگت گندمی اور سر کے بال کھنکھریالے تھے۔ میں نے اس بندے کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرتے ہوئے یہ آواز بلند کہا۔

”اگر آپ لوگوں کے تبصرے ختم ہو گئے ہوں تو میں بھی اپنی کارروائی شروع کروں.....؟“

سب لوگ یکا یک خاموش ہو گئے۔ میں نے باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔ ”یہاں پر حقیقت جٹ کے گھر والوں میں سے بھی کوئی موجود ہے؟“

سب لوگ متلاشی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اس کی عمر اٹھارہ کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اس سے ملتی جلتی شکل کا ایک اور نوجوان نکل کر سامنے آیا۔ وہ بیس کے آس پاس نظر آتا تھا۔ پہلے والے نوجوان نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”جناب! ہم دونوں بھائی ہیں اور یہ ہمارے ابا جی کی قبر ہے.....“

وہ دونوں گویا بد نصیب مرحوم حقیقت جٹ کے بیٹے تھے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر پوچھا۔ ”تم دونوں کے نام کیا ہیں جو انو.....؟“

”امیر نام سلطان ہے۔“ نسبتاً چھوٹے نوجوان نے جیسے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا پھر دوسرے جوان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا بڑا بھائی ریحان ہے۔“

”ریحان اور سلطان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ”تم لوگوں نے اپنے باپ کی قبر کی حالت دیکھی ہے۔ اس حوالے سے کچھ کہنا چاہو گے.....؟“

”کیا کہیں جناب!“ ریحان نے بے چارگی سے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“

سلطان نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا اور بولا۔ ”آپ ہم سے کیا جانتا چاہتے ہیں تمہارے دار صاحب؟“ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ان میں بڑا بھائی ریحان طبعا سادہ تھا جبکہ چھوٹا بھائی سلطان تیز طرار اور چالاک نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں بتایا۔

”میں یہ جانتا چاہتا ہوں برخوردار..... کہ تمہارے والد کی قبر کے ساتھ یہ سب کیا ہوا ہے جبکہ کم و بیش ہر شخص کی زبان یہ گواہی دے رہی ہے کہ حقیقت جٹ ایک نیک اور پرہیزگار انسان تھا۔ مخلوق خدا کو اس سے کسی قسم کا گلہ شکوہ یا تکلیف پریشانی نہیں تھی پھر اس کی قبر عذاب الہی کا نشانہ کیوں بنی.....؟“

”تمہارے دار صاحب!“ سلطان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ابا جی بہت نیک اور عبادت گزار انسان تھے۔ وہ ہمارے لیے نہایت ہی مہربان اور مشفق باپ تھے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جنت میں ہوتا ہے۔ عذاب قبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ابا جی کی قبر کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کسی سوچی سمجھی اور گہری سازش کا نتیجہ ہے اور یہاں تک منظور سے کی بکواس کا تعلق ہے.....!“ اس نے لگائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”تو اس سلسلے میں، میں یہی کہوں گا کہ آئینے میں انسان کو اپنا ہی چہرہ نظر آتا ہے.....“

میں نے اپنی نگاہ کو سلطان کے اشارے کے تعاقب میں دوڑایا تو وہ اس گھونگر یا لے بالوں والے دہلے پتلے اور دراز قامت شخص پر جا کر رک گئی جس نے تھوڑی دیر پہلے حقیقت جٹ کے بارے میں اظہار خیال کیا تھا.....

”اچھا.....!“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو اس بندے کا نام منظور ہے؟“

”جی تمہارے دار صاحب! یہی ہے منظور علی عرف منظور پھل فروش!“ سلطان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”خود تو کبھی مسجد میں جانے کی توفیق ہوئی نہیں، جو جاتے ہیں ان کا مذاق اڑاتا رہتا ہے.....“

”میں اس کے کان کھینچوں گا.....“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”سلطان! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ”آئینے میں اپنا ہی چہرہ نظر آنے والی“ بات کی ہے، اس کا کیا مطلب تھا.....؟“

”بات دراصل یہ ہے جناب کہ منظور پھل کی تول میں بہت ڈنڈی مارتا ہے۔ اس سے ایک سیر پھل لو تو تین، ساڑھے تین یا وہی نکلتے ہیں۔ اس کے پاس تصدیق شدہ سرکاری باٹ بھی نہیں ہیں.....“ سلطان اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جو خود بے ایمان ہو اسے دوسرے بھی بے ایمان ہی نظر آتے ہیں۔“

”یہ منظور کس جگہ پھل فروخت کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ادھر حسین آباد کے مین بازار میں جناب!“ سلطان نے بتایا ”ہماری دکان کے سامنے ہی یہ پھل کا ٹھیلہ لگاتا ہے۔ ابا جی سے دو تین مرتبہ اس کی جھڑپ بھی ہو چکی تھی.....“

”اچھا.....!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم لوگوں کی کوئی دکان مین بازار میں ہے؟“

”جی، ہماری ادھر کپڑے کی دکان ہے۔“ سلطان نے جواب دیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”جب ابا جی زندہ تھے تو وہی دکان پر بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں بھائی ان کا ہاتھ بٹانے چلے جاتے تھے۔ اب تو ساری ذمہ داری ہم پر ہی آگئی ہے۔“

”میرا حسین آباد کے مین بازار کی طرف چکر لگا تو میں تم لوگوں سے ملنے بھی آؤں گا۔“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”اب میں تمہارے ابا جی کی قبر کو بند کروانا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ بات ختم کر کے میں نے باری باری دونوں بھائیوں کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

”نہیں جناب، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ ریحان

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے پہلی مرتبہ اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو، آپ اباجی کی قبر کو بند کروادیں، خواہ مخواہ مذاق بن رہا ہے۔“

”قبر کو آپ ضرور بند کروائیں جی!“ سلطان نے کہا۔ ”لیکن اس کے ساتھ ہی اس شریک کو گرفتار کر کے سزا دلوانے کی کوشش بھی کریں جس شیطان نے ہمارے اباجی کی قبر کا یہ حشر کیا ہے۔“

”اس سلسلے میں آپ دونوں بھائی بالکل بے فکر ہو جاؤ۔“ میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ”میں نے تحقیق اور تفتیش شروع کر دی ہے۔ انشا اللہ! بہت جلد میں اس شخص کو گرفت میں لینے میں کامیاب ہو جاؤں گا جس نے حقیقت جٹ کی قبر کی بے حرمتی کی ہے۔“

یہ بات میں نے شخص ان غم زدہ بھائیوں کا دل رکھنے کے لیے کہی تھی ورنہ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ حقیقت جٹ کی قبر کا جو حشر نشر ہوا ہے اس میں کسی انسانی ہاتھ کا عمل دخل نہیں۔ اگر میں نے گزشتہ رات خود اپنی آنکھوں اور کانوں سے وہ مناظر دیکھے اور سنے نہ ہوتے تو شاید میں بھی سلطان اور ریحان کے انداز میں سوچنے کی کوشش کرتا لیکن عذاب قبر کے جیتے جاگتے ثبوت دیکھ لینے کے بعد میں حتی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ لہذا میری رائے میں تبدیلی نہیں آ سکتی تھی۔

میں گورکن خیر دین کو ایک طرف لے گیا اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ان دونوں بھائیوں کی نگرانی اور مرضی سے حقیقت جٹ کی قبر کو اچھی طرح بند کر دو اور ایک بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو اس بات کا پتا نہ چلے، ہم نے پچھلی رات اس قبر کی کیا حالت دیکھی تھی۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب!“ وہ یقین دلانے والے انداز میں بولا۔ ”میں حقیقت جٹ کی قبر والے راز کو اپنے سینے میں دفن کر لوں گا۔“

”شباباش!“ میں نے سائنٹی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”دفن کرنے کا فن تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔“ وہ بے معنی انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”خیر دین! اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک کام بھی کرنا ہے۔“

اس کی بے معنی نظر میں سوال ابھر آیا۔ ”کون سا کام تھا نے دار صاحب؟“

”قبر تو ابھی بند ہو جائے گی۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن ابھی کچھ دن تک اس کی نگرانی بہت ضروری ہے۔“

”کہیں آپ بھی یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ۔۔۔۔۔“ وہ دزدیدہ

نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”حقیقت جٹ کی قبر کسی نے سازش کا نشانہ بنایا ہے؟“

”ایسا سوچنے اور سمجھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں نے پوری قطعیت کے ساتھ کہا۔ ”اس امر میں کسی شخص کی گنجائش نہیں کہ حقیقت جٹ عذاب قبر سے دو چار ہو ہے۔ اس بات کا پتا چلنا کہ وہ کوئی نیک و پارسا انسان تھا گناہ گار، یہ بعد کی بات ہے۔ وقت آنے پر میں اس معاملے کو دیکھ لوں گا۔“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں ابھی دو تین راتوں تک اس حوالے سے حقیقت جٹ کی قبر کی نگرانی کرنا ہے کہ کہیں اس قبر میں سے دوبارہ آگ تو نہیں نکل رہی۔ تم میری بات تو سمجھ رہے ہونا۔۔۔۔۔؟“

”بڑی چٹکی طراں سمجھ رہا ہوں سرکار۔۔۔۔۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے!“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔ ”اگر کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے اس کی اطلاع دینا نہیں بھولنا۔“

”جی۔۔۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

”میں نے کہا۔“ اب تم حقیقت جٹ کے بیٹوں کے حسب منشا اس قبر کو بند کر کے بالکل ویسا ہی بنا دو جیسی یہ پہلے سے پہلے تھی۔“

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں سلطان اور ریحان کے پاس آ گیا اور باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد اس راز تک رسائی حاصل کر لوں گا کہ آپ کے اباجی کی قبر کے ساتھ یہ افسوس ناک واقعہ کیوں کر پیش آیا ہے اور۔۔۔۔۔“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں کسی وقت گھر آ کر تمہاری امی سے بھی اس سلسلے میں بات کروں گا۔ بخت بی بی کو تسلی دلا سادینا بھی میرا فرض بنتا ہے۔“

وہ دونوں ممنونیت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں مراد علی کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میرے نزدیک یہ عذاب قبر کا ایک سنگین اور عبرت ناک واقعہ تھا۔ میں کسی قیمت پر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کسی شخص نے سازش کے تحت حقیقت جٹ کی قبر کو کھول کر اس کی لاش کی بے حرمتی کی ہوگی کیونکہ میں پچھلی رات خود اپنی آنکھوں سے اس قبر کو سپرد عذاب دیکھ چکا تھا اور میں نے اسی قبر کے اندر سے اذیت میں ڈوبی ہوئی انسانی آواز بھی سنی تھی جیسے کوئی خوف ناک تشدد سے گہرا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو لیکن یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ اگر حقیقت جٹ اپنے کسی گناہ کی یادداشت میں عذاب قبر میں مبتلا ہو بھی گیا تھا تو اس خدائی معاملے سے پولیس کا کیا واسطہ؟

یہ سوال آپ میں سے بھی بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں سر اٹھا رہا ہوگا۔ پہلے میں نے بھی سوچا تھا، جو ہوا سو ہوا۔ میں حقیقت جٹ کی قبر کو بند کروانے کے بعد اس معاملے سے الگ ہو جاتا ہوں لیکن پتا نہیں کیوں، میرے ذہن میں اس واقعے کے حوالے سے ایک چنگاری سی مسلسل حرارت اور جلن پیدا کر رہی تھی۔ چھٹی حس بار بار مجھے اس معاملے کی تحقیق پر مجبور کر رہی تھی۔ میں نے پیشہ دارانہ زندگی میں بھی اپنے اندر کی آواز کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس آواز نے ہمیشہ درست سمت میں میری راہنمائی کی تھی۔ میں اپنی اس خصوصیت یا صلاحیت کو عطیہ خداوندی سمجھتا تھا اور جہاں تک خدائی یا انسانی معاملے کا تعلق تھا تو میرے خیال میں ان دونوں معاملات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یا لو واسطہ یا بلا واسطہ انسان کا ہر معاملہ خدا سے اور خدا کا ہر معاملہ انسان سے جڑا ہوا ہے۔ اگر اس ذات باری کو اپنا یہ معاملہ مجھ سے چھپا کر اور غیر متعلق رکھنا ہوتا تو میرا ہر ایک، گورکن کو حقیقت جٹ کی قبر میں سے نیلی روشنی خارج ہوتی دکھائی نہ دیتی۔ نمبر دو، وہ اس خیر آمیز واقعے کی اطلاع مجھ تک نہ پہنچاتا۔ نمبر تین، میں گورکن کی اطلاع پر لعنت شب کو مٹی کی ایک تپتی ہوئی جس زندہ رات میں، قبرستان میں گھات لگا کر حقیقت جٹ کی قبر کا تماشا دیکھنے نہ پہنچ جاتا۔ نمبر چار، مجھے حقیقت جٹ کی قبر سپرد عذاب دکھائی دیتی اور نہ ہی اس قبر کے اندر سے مجھے اس کی کرب ناک آواز کی سنائی دیتی۔ نمبر پانچ، میرے سب کچھ دیکھ لینے کے بعد حقیقت جٹ کی قبر پھٹ کر اندر کی کہانی کو طشت از بام

نہ کرتی۔ گویا۔۔۔۔۔ قدرت نے مجھے پہلے حقیقت جٹ کی قبر کو نیلی آگ میں جلا دکھا کر اور اس کی اذیت ناک فریاد سنا کر اس کیس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اگر اس معاملے کو اول آخر قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھنا ہوتا تو پھر اس عجیب و غریب ”جلوہ نمائی“ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پتا نہیں، روزانہ کتنے مردوں کو روزانہ قبر کے عذاب سے دو چار ہونا پڑتا ہوگا لیکن قدرت اپنے اس تعزیری عمل کو منظر عام پر نہیں لاتی۔ کل ملا کر اس وضاحت سے یہ نتیجہ سامنے آتا تھا کہ قدرت کا مشا تھا کہ میں اس معاملے میں آستینیں چڑھا کر کود پڑوں اور۔۔۔۔۔ میں دل و جان سے کود پڑا تھا۔

تھانے پہنچ کر میں نے کالٹیل مراد کو اپنے کمرے میں بلا کر خصوصی ہدایات دیں۔ ”مراد۔۔۔۔۔!“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم حسین آباد کے رہنے والے ہو، اس لیے حقیقت جٹ کے بارے میں، تم سے زیادہ معتبر معلومات کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا۔ تم ابھی سے اس کام پر جت جاؤ۔“

”ملک صاحب! میں حقیقت جٹ کے بارے میں جو کچھ جانتا تھا وہ تو آپ کو بتا چکا ہوں۔“ وہ اطمینان زدہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کے آگے اور کیا بتاؤں۔۔۔۔۔“

”تم نے بتایا ہے کہ حقیقت جٹ کو پچھلے پانچ سال سے جانتے ہو کیونکہ اسے اور اس کی فیملی کو حسین آباد میں آباد ہوئے اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے یہ لوگ چک جھمرا میں رہتے تھے۔ تمہارے خیال میں مرحوم ایک بھلا انسان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ نماز روزے کا پابند ایک نیک انسان جس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔“ میں نے ایک ہی سانس میں مراد کی فراہم کردہ معلومات کو دہرا دیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس سے آگے کا احوال جانتا چاہتا ہوں مراد علی۔۔۔۔۔؟“

اس کے چہرے پر تذبذب ابھر آیا۔ ”ملک صاحب! میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”میں چاہتا ہوں، تم اس کھوج میں لگ جاؤ کہ حقیقت جٹ کی زندگی کا وہ کون سا گوشہ تھا جو لوگوں کی نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ یعنی۔۔۔۔۔ کوئی منقہ گوشہ۔۔۔۔۔!“

”ہوں۔۔۔۔۔!“ مراد علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

”یہ تو کبھی جانتے ہیں کہ مرحوم حقیقت جٹ بہت ہی نیک، پرہیزگار اور عبادت گزار تھا۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”حسین آباد میں کسی شخص کو اس سے کوئی

شکایت نہیں۔ وہ ایک اچھا شوہر اور مہربان باپ تھا لیکن پھر اس کے مردے اور قبر کا ایسا عبرت ناک حشر کیوں ہوا؟

”ملک صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ جو بھی کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ سے میری ایک عرض ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے مراد علی کی طرف دیکھا۔

”حفیظ جٹ اچھا تھا یا برا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حسین آباد کے کسی باسی کو اس سے کوئی تکلیف نہیں تھی۔“ وہ وضاحتی انداز میں بولا۔ ”اب وہ مرکب چکا۔ وہ جانے اور اس کا خدا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ گڑے مردے اکھاڑ رہے ہیں۔“

”گڑے مردے میں نہیں، قدرت اکھاڑ رہی ہے مراد علی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”حفیظ جٹ کی قبر کو سپرد عذاب کس نے کیا..... میں نے؟“ آج صبح اس کی قبر کو پھاڑ کر اندر کا احوال لوگوں تک کس نے پہنچایا..... میں نے؟ میرے سوالات کے جوابات میں تم ”نہیں“ کے سوا اور کوئی لفظ استعمال کر ہی نہیں سکتے۔“ میں نے لمحاتی توقف کر کے دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، قدرت کی جانب سے ہوا ہے۔ قدرت حسین آباد کے لوگوں کو حفیظ جٹ کے احوال واقعی کی جانب متوجہ کرنا چاہتی ہے اور اسی حسین آباد میں میرا تھا نا بھی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں جلد از جلد حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی اصلیت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا..... انشا اللہ!“

کانشیل مراد نے میرے سامنے مزید کوئی نقطہ اعتراض نہیں اٹھایا اور مجھے سلام کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

آئندہ روز میں تھانے میں فرصت دیکھتے ہوئے قبرستان کی طرف نکل گیا۔ وہ دوپہر سے تھوڑا پہلے کا وقت تھا لیکن مئی اپنی جولانی پر نظر آتا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، سورج سوانیزے پر اتر آیا ہو۔ میں درختوں کے سایے میں چلتے ہوئے خیر دین کے کوارٹر تک پہنچ گیا۔ میرے لیے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ آج وہ پچھلے دو دن کی طرح صبح ہی صبح تھانے میں آمو جو نہیں ہوا تھا جس کا واضح مطلب یہی سمجھ میں آتا تھا کہ گزشتہ رات خیر دین نے اور حفیظ جٹ کی قبر نے خیریت سے گزاری تھی۔

مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر ایک درخت کے نیچے بھی چار پائی کو اپنے رومال سے جھاڑتے

ہوئے بولا۔ ”آپ میں جی تھانے دار صاحب، تم رکھیں۔ میں نے آپ کو دور سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا چار پائی میں نے آپ کے لیے ہی بچھائی ہے۔“

میں نے مذکورہ چار پائی پر تشریف رکھ دی تو میرے سامنے ہی مٹی زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے ہر فور کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”خیر دین! تمہارے چہرے اور آنکھوں میں ہر اطمینان کے تاثرات دیکھ کر یہی سمجھ میں آ رہا ہے کہ رات قبرستان میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی.....؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تھانے دار صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سب امن و امان ہی رہا ہے۔ رات کو میں ایسی گہری نیند میں کہ آج صبح ہی آنکھ کھلی ہے۔“

”انسان کو گہری نیند اسی وقت آتی ہے خیر دین جب اس کے گرد و پیش کا ماحول خوشگوار اور پرسکون ہو۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہے، رات کو حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ کوئی نا خوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے جا کر حفیظ جٹ کی قبر کو دیکھا تھا۔ وہاں سب کچھ صحیح سلامت ہے۔ لگتا ہے پچھلی رات اس قبر کو نیلی آگ نے نہیں جلا یا.....!“

”میں سمجھتا ہوں، اب حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ کوئی اندوہناک واقعہ پیش نہیں آئے گا۔“ میں نے غصے میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”قدرت کا مقصد پورا چکا ہے۔ یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔“

”تھانے دار صاحب! میں آپ کی باتوں پر ایمان لے آیا ہوں۔“ وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین آ گیا ہے کہ آپ حفیظ جٹ کے بارے میں جس انداز میں سوچ رہے ہیں وہی درست ہے۔“

خیر دین نے یہ بات جس سنجیدگی اور گہرائی سے کہی تھی۔ اس کے پیش نظر میں یہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔ ”میرے کس ادا نے تمہیں ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے خیر دین؟“

”میں نے رات خواب میں سب کچھ دیکھ لیا۔“ تھانے دار صاحب! ”وہ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ ”حفیظ جٹ سے ضرور کوئی ایسا سنگین گناہ ہوا ہے جس سزا کے طور پر اس کی قبر پر اللہ کا عذاب نازل ہوا ہے۔“

نیلا جھوٹ

”تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے خیر دین؟“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جناب! میں نے دیکھا ہے کہ حفیظ جٹ نے سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کے ہاتھوں پر بھی کالک ملی ہوئی ہے۔“ وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”اچانک اس کے سامنے ایک گوری چٹی عورت آ جاتی ہے اور حفیظ جٹ اپنے کالک والے ہاتھ اس اجلی اور خوب صورت عورت کے چہرے پر مل دیتا ہے۔“

”خیر دین! تمہارا خواب تو خاصا متحی خیر ہے!“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”میں خوابوں کی تعبیر کا علم تو نہیں رکھتا لیکن اس خواب کو سننے کے بعد ذہن میں ایک ہی بات آ رہی ہے اور وہ یہ کہ حفیظ جٹ کے ہاتھوں سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا.....!“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اب اس الجھن کو میں ہی سلجھن میں بدلوں گا۔“

خیر دین ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”خیر دین! اپنے اس خواب کے بارے میں بھی کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ میں جب تک اس معصے کو حل نہیں کر لیتا، معاملہ جتنا محدود رہے، اتنا ہی اچھا ہے۔“

”میں آپ کی بات کو سمجھ رہا ہوں جناب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“

میں مزید دس پندرہ منٹ تک خیر دین کے پاس بیٹھا پھر قبرستان سے نکل کر حسین آباد کے مین بازار کی طرف آ گیا۔

دیہاتی زندگی میں مئی اور جون کو گرم ترین مہینے سمجھا جاتا ہے کیونکہ ان مہینوں میں کھیتوں میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہوتی ہے۔ قدرت فصل کو پکانے کے لیے آسمان سے آگ برساتی ہے۔ کھیتوں کھلیانوں میں کھڑا پانی اس آگ کی شدت سے ابل کر رہ جاتا ہے اور وہاں سے اٹھنے والے بخارات فضا میں بے تحاشا جس پیدا کر دیتے ہیں، پھر کچی ہوئی فصل کی ایک اپنی ہی مخصوص حرارت ہوتی ہے اور ستم بالائے ستم کہ ان دنوں میں ہوا بھی بہت کم چلتی نظر آتی ہے۔

میں پوچھتا پوچھتا منظور علی عرف منظور پھل فروش کے ٹیلے پر پہنچ گیا۔ وہ اپنے ٹیلے پر موسی پھل سجائے کھڑا تھا۔ میری آمد پر وہ اٹھن ٹھن ہو گیا اور فوراً اس نے اپنا اسٹول نکال کر مجھے پیش کر دیا۔

”بسم اللہ..... آپ میں جی، بیٹھیں.....!“ اس نے بڑے ادب سے کہا۔

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا منظورے!“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ”میں ادھر مین بازار سے گزر رہا تھا کہ تم نظر آ گئے۔ بس، تم سے دو چار باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا.....“

”آپ دو چار نہیں، دو چار سو باتیں کریں جی۔“ وہ بڑے احترام سے بولا۔ ”لیکن ادھر اسٹول پر آرام سے بیٹھ کر۔ آپ کھڑے رہیں گے تو میرے لیے شرمندگی کی بات ہوگی۔“

میں منظورے کے حسن اخلاق سے متاثر ہوا اور اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔

”کون سا پھل پیش کروں جی؟“

”منظورے! میں دعوت اڑانے نہیں، تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کل ادھر قبرستان میں حفیظ جٹ کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے.....؟“

”کیا کہہ رہا تھا جی.....؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”تم نے اس کے کردار اور اعمال کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔“ میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

”اچھا وہ.....!“ وہ اپنی گردن کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”تھانے دار صاحب! میں بات کرتا ہوں سچی اور کھری اسی لیے سب کو کڑوا لگتا ہوں۔ کچھ لوگ تو مجھے کافر اور پتا نہیں، کیا کیا کچھ کہتے ہیں لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ہر انسان کو مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ جو رات قبر میں ہے وہ باہر نہیں.....“

منظورہ خاصا بات تو نی ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”منظورے! میں تمہاری سچی اور کھری باتوں سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اس وقت ہم حفیظ جٹ کے کردار اور اعمال کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ تم کس بنا پر یہ سمجھتے ہو کہ اس کی قبر کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے وہ قدرت کی طرف سے اس پر ایک عذاب تھا.....؟“

”میں آپ کو وہی تو بتا رہا ہوں تھانے دار صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”فہ نیک اور پرہیزگار انسان کی عبادت ایک دکھاوا بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے زیادہ تو پتا نہیں مگر

اتنا ضرور جانتا ہوں کہ حفیظ جٹ کپڑے کی ناپ میں گڑبڑ کرتا تھا اس کے علاوہ کپڑے کا معیار کم اور قیمت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کے بیٹے تو اس معاملے میں دو چار ہاتھ آگے ہی ہیں۔ ان کی دکان سے خریدا ہوا کپڑا جب بھی درزی کے پاس پہنچتا ہے، ایک دو گرہ کم ہی نکلتا ہے۔ چوری ایک گرہ کی ہو یا ایک گز کی وہ چوری ہی کہلائے گی۔ خدا کی عدالت میں بعض اوقات ایک ذرے کی چوری بھی وبال جان بن جاتی ہے اور اگر وہ قادر مطلق چاہے تو بڑے سے بڑا گناہ بھی معاف کر سکتا ہے۔“

”منظورے! تم تو اچھے خاصے مقرر ہو۔“ میں نے تعریف بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون بے وقوف تمہیں کافر کہتا ہے.....؟“

”وہ جناب.....!“ وہ عجیب بے بسی کے انداز میں بولا۔ ”بس لوگ دکھاوے پر جاتے ہیں۔ دل کی دنیا تو بس خدا ہی جانتا ہے۔ کسی کی ناراضی اور غصے کی پروا کیے بغیر سچی بات منہ پر کہہ دیتا ہوں اس لیے لوگ مجھے منہ پھٹ، بد لحاظ، جھگڑالو اور پتا نہیں، کیا کیا کہتے رہتے ہیں۔“

”دنیا دکھاو تو واقعی کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور یہ بھی درست ہے کہ انسان کا ظاہری حلیہ اس کے نیک اور پرہیزگار ہونے کی سند نہیں ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن منظورے! اللہ کو یاد کرنے کے لیے تم بھی مسجد چلے جایا کرو۔ اس میں لو کی حرج بھی نہیں۔ وہ قادر مطلق نیتوں کا احوال یہ خوبی جانتا ہے.....“

”جی.....“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ ”تم واقعی ایک معقول انسان ہو۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”شکریہ جی!“ وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے تنکے لگا۔ ”منظورے! میں نے سنا ہے کہ تمہارا حفیظ جٹ سے دو تین بار جھگڑا بھی ہوا تھا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہیں تم اس وجہ سے تو اس کے خلاف نہیں بول رہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تھا نے دار صاحب!“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”یہ ایک حقیقت ہے کہ حفیظ جٹ کپڑے کی ناپ میں بے ایمانی کرتا تھا اور کم قیمت کپڑے کے زیادہ دام بھی وصول کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کون کون سے گناہ کے کاموں میں ملوث تھا، یہ تو مجھے نہیں پتا..... اس کی قبر کی

حالت کو دیکھ کر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

”تمہارے بارے میں حفیظ جٹ کے بیٹے سلیم سے میری تفصیلی بات ہو چکی ہے.....“

”اس نے آپ کو یہی بتایا ہوگا کہ میں نماز پڑھنے مسجد میں نہیں جاتا ہوں اور میں نے اس کے باپ سے بار جھگڑا بھی کیا ہے.....“ میری بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے کہا۔ ”یہی بات ہے نا جناب.....؟“

”یہ بات بھی ہے!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کے علاوہ بھی اس نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔“

”کیا کچھ جی.....؟“ وہ تھب خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”سلطان کا کہنا ہے کہ تم پھل کو توڑ

ہوئے ڈنڈی مارتے ہو۔ تم سے ایک سیر پھل خریدو تو وہ تیرے پاؤں سے زیادہ نہیں نکلتا اور تمہارے پاس اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے غیر سرکاری اور غیر معیاری ہاٹ ہیں..... وغیرہ وغیرہ!“ ”یہ تو الٹا چور، کو تو ال کو ڈانٹے..... والی بات ہوئی نا۔“ وہ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

”تم دونوں پارٹیوں میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں اس علاقے کا تھانے دار بن کر یہاں آیا ہوں تو چند روز میں تم لوگوں کی حقیقت تک پہنچ ہی جاؤں گا۔“

”چند روز تو بہت زیادہ ہو جائیں گے سرکار.....!“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟“ اس کے انداز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”منظورے! کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”اگر آپ کا حکم ہو تو میں ابھی اور اسی وقت خود کو ایک ایمان دار پھل فروش ثابت کر سکتا ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”ایک ایسا پھل فروش جس کی کمائی میں ایک ذرا بھی رزق حرام کا نہیں.....!“

اس کے دعوے نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے پوچھا۔ ”منظورے! تم اپنی بات کو کس طرح درست ثابت کرو گے؟“ ”آپ ایک منٹ رکیں.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے والی دکان کی طرف چلا گیا۔

میں نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی۔ سامنے ”فرید کریانہ اسٹور“ نامی ایک کریانے کی دکان تھی۔ منظور اسی دکان پر پہنچا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ داخل

جھلک رہی تھی۔ ”مگر نیت کے حال کا ان دوسرا آموں سے کیا تعلق ہے؟“

”بہت گہرا تعلق ہے سرکار.....!“ وہ جذب کے عالم میں بولا۔ ”میں نے خلوص دل سے یہ آم آپ کو تحفے میں پیش کیے ہیں تھانے دار صاحب!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”اور..... تحفے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، نہ ہی اس سے انکار کو اچھا تصور کیا جاتا ہے، دوسرے معنوں میں یہ تحفہ دینے والے کی ذات کی نفی ہوتی ہے، اس کی تحقیر ہوتی ہے.....!“

اس دیہاتی منظور نے مجھے کلین بولڈ کر دیا تھا۔ میرے نزدیک منظور بہت سے اللہ والوں سے زیادہ بہتر انداز میں اللہ کی ذات کا شعور رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے، آپ کی رائے مجھ سے مختلف ہو..... بہر حال، آپ اختلاف رائے کا حق رکھتے ہیں۔

میں نے منظور کے تحفے کو دل و جان سے قبول کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم خواب وغیرہ بھی دیکھتے ہو.....؟“ وہ اس اچانک اور غیر متعلق سوال پر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس، میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ہے، تمہیں خواب وغیرہ تو آتے ہوں گے؟“

”جی ہاں، خواب تو آتے رہتے ہیں مگر اکثر وہ اوٹ پٹانگ ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بھی کبھار ہی کوئی خواب ذہن میں آتا ہے اور سوچ کو پریشان کرتا ہے.....“

”پھر تم ذہن میں آگے ہوئے خواب کو کس طرح نکالتے ہو۔“ میں نے پوچھا۔ ”اپنی پریشانی کو کیسے دور کرتے ہو؟“

”جناب! اگر مجھے کسی خواب سے کوئی الجھن ہونے لگتی ہے تو میں مولوی صاحب کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ میری الجھن دور کر دیتے ہیں اور میں سکون سے گھر آ جاتا ہوں۔“

”مولوی صاحب کون.....؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”میں مولوی عمر دین کی بات کر رہا ہوں جی۔“ اس نے بتایا۔ ”مولوی جی، حسین آباد کی مسجد کے پیش امام ہیں۔“

”تمہارا بھی جواب نہیں ہے منظور نے!“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”نماز کے لیے تو تم مسجد کا رخ کرتے نہیں اور خواب کی تعبیر پوچھنے فوراً مولوی صاحب کے پاس پہنچ جاتے ہو.....؟“

”جی ہاں بات ہے تھانے دار صاحب!“

”ٹھیک ہے منظور نے!“ میں اسٹول سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تمہاری طرف سے میں بالکل مطمئن ہو گیا ہوں۔ اب تم مزے سے کھل پکھلاؤ اور میں چلتا ہوں.....“

”صرف ایک منٹ تھانے دار صاحب.....!“ وہ ترازو کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں سوالیہ نظر سے اس کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرنے لگا۔ اس نے ترازو کے ایک پلڑے میں دوسرا کا باٹ رکھا اور دوسرے پلڑے میں جن جن کر آم چڑھانے لگا۔ پھر وہ دوسرا آم تول کر اس نے ایک تھیلے میں ڈالے اور مذکورہ تھیلے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”پاکستان کے کسی بھی ترازو میں جا کر تول لیں تھانے دار صاحب۔ اگر سودا دوسرے کم نکل آئیں تو میری وہ سزا جو کالے چور کی۔ منظور اچھا کہتا ہے، وہ کر کے بھی دکھاتا ہے.....“

”منظور نے!“ میں تمہاری ایمان داری کو تسلیم کر چکا ہوں۔“ میں نے تھیلے کی جانب ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔ ”پھر تمہیں کیا پڑی ہے، مجھے ناپ تول کے چکر میں ڈالنے کی۔ اگر کہتو میں تمہاری دیانت داری کی سند لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔“

”جناب! مجھ غریب کو کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔“ وہ دعا مت بھرے لہجے میں بولا۔ ”یہ آم میں نے آپ کے لیے تھیلے میں بھرے ہیں۔ بڑے ریلے اور شرطیہ ٹھٹھے چونا آم ہیں۔ کھائیں گے تو یاد کریں گے.....“

”میں یہ آم ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”مگر میری ایک شرط ہے؟“

”کیسی شرط تھانے دار صاحب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے ان آموں کی رعایتی قیمت ضرور وصول کرو گے.....!“

منظور علی عرف منظور پھل فروش دیکھنے میں جاہل اور اجڑا سا لگتا تھا۔ لیکن پچھلے بیس پچیس منٹ کی گفتگو میں، میں نے سمجھ لیا تھا کہ منظور ایک جینس آدمی تھا۔ کسی بھی جینس میں جو میزہ ہوتی ہے وہ اس میں بھی تھی۔ چونکہ اس کا دماغ عام نہیں تھا اس لیے وہ عوام کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کو ”مس فٹ“ کہا جاتا ہے۔

اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ وہ میری بات کے جواب میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! سو ہمارا نیت کا حال جانتا ہے لیکن آپ نہیں.....!“

”میں یہ بات مانتا ہوں۔“ میرے لہجے سے الجھن

خود ساختہ پتھر کے باٹ کیوں رکھے ہوئے ہیں جس سے مختلف قسم کی غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں؟“

”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ.....!“ وہ بڑی رसान کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”کچھ عرصہ پہلے میرے ٹھیلے پر سے کسی نامراد چور نے سارے باٹ چالے لیے ہیں۔ میں انہیں ڈھونڈوں بھی تو کہاں ڈھونڈوں۔ سب باٹ ایک ہی جیسے تو ہوتے ہیں۔ کسی پر بھی کسی کا نام تو لکھ ہوتا نہیں۔ میں نے اپنا کام چلانے کے لیے فوری طور پر پتھر کے یہ باٹ تیار کر لیے ہیں۔ جب میرا سمندری کی طرف جانا ہوگا تو وہاں سے اپنے لیے نئے سرکاری تصدیق شدہ باٹ خرید لاؤں گا۔ جب تک میں انہی پتھر کے باٹوں سے گزارہ چلاؤں گا کیونکہ میرا دل اور ضمیر مطمئن ہے کہ میں کاروبار میں ہیرا پھیری یا بے ایمانی نہیں کر رہا اور جہاں تک سلطان کے الزام کا تعلق ہے.....“ وہ سانس بھرا کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یہ لوگ مجھ سے پھل خریدتے رہے ہیں اور کبھی انہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ جب سے حقیقت جٹ کے ساتھ میرا دو تین مرتبہ جھگڑا ہوا ہے نا، ان کے تہہ بدل گئے ہیں۔ انہیں مجھ میں اور میرے ناپ تول میں کیڑے نظر آنے لگے ہیں.....“

”حقیقت جٹ سے تمہارا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”بہت معمولی سی بات تھی تھانے دار صاحب۔“ وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ ”پچھلے دنوں میں گنڈیریاں لگا رہا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ گنڈیریاں بیچنے والے کو اپنے ساتھ ایک بالٹی میں پانی بھی بھر کر رکھنا پڑتا ہے اور یہ پانی والی بالٹی عموماً ٹھیلے کے ساتھ لٹکی رہتی ہے۔“

”ہاں..... میں نے ایسی بالٹی گنڈیریاں بیچنے والوں کے پاس دیکھی ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں شام سے پہلے جب اپنا کام ختم کر کے گھر کی طرف جانے لگتا تو بالٹی کے پانی کو دھول اڑاتے اس بازار میں چھڑک جاتا تھا اور میری اسی حرکت سے حقیقت جٹ کو تکلیف پہنچتی تھی۔ میں ان دنوں ”جٹ کلاتھ مرچنٹ“ کے بالکل سامنے ٹھیلہ لگاتا تھا۔ حقیقت جٹ کا خیال تھا کہ میں دھول مٹی اڑا کر اس کی دکان میں رکھی بزازی کو گندا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے دماغ کے بندے کے ساتھ میں روز روز تو جھگڑا کر نہیں سکتا تھا لہذا میں نے اپنے ٹھیلے کی جگہ ہی بدل دی..... بس

آگیا۔ وہ خالی ہاتھ گیا تھا مگر اب مجھے اس کے ہاتھ میں تین چار باٹ نظر آرہے تھے اور یہ سب کے سب سرکاری مہر والے تصدیق شدہ باٹ تھے۔ میں نے بغور دیکھا تو معلوم ہوا، وہ ایک پاؤ، آدھا سیر، ایک سیر اور دوسرا وزن والے باٹ تھے۔

اس زمانے میں ناپ تول کا ”گرام، میٹر، لیٹر“ والا نظام ابھی متعارف نہیں ہوا تھا اور ترازو بھی وہی روایتی استعمال ہوتا تھا، ڈنڈی والا۔ اس ڈنڈی کے عین وسط میں کاٹنا ہوتا تھا اور دونوں سروں پر رسیوں والے دو پلڑے لٹکتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک پلڑے میں باٹ ڈال کر دوسرے میں مطلوبہ جنس ڈالی جاتی تھی۔ آج کل بھی یہ روایتی ترازو کہیں کہیں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

”دیکھیں جناب! یہ تو ہیں سرکاری باٹ اور یہ رہے میرے بنائے ہوئے پتھر کے باٹ!“ وہ ترازو کو اٹھا تے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی آپ کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتا ہوں.....“

میں دلچسپی سے منظور کے کی کارروائی کو دیکھنے لگا۔ وہ ترازو کو فضا میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لیں جناب! اس کے دونوں پلڑے برابر ہیں نا.....؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس نے ایک پاؤ والے باٹ سے شروع کیا اور اس مظاہرے کو دوسرے والے باٹ تک لے گیا۔ ایک پلڑے میں وہ تصدیق شدہ سرکاری باٹ رکھتا اور دوسرے میں اپنا بنایا ہوا باٹ۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ منظور نے خود ساختہ باٹ والا پلڑا تھوڑا سا جھک جاتا تھا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ منظور کے ہر باٹ، تصدیق شدہ سرکاری باٹ سے چند گرام زیادہ وزن ہی کا تھا۔ اس نمائشی تجربے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے قاتحانہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔

”آپ ایک منٹ رکھیں۔ میں فریدے کے باٹ واپس کر آؤں ورنہ خواہو وہ چلانے لگے گا اور آپ سمجھیں گے، شاید میرا اس کے ساتھ کوئی جھگڑا اچھڑا ہے.....“

میرا جواب سنے بغیر وہ فرید کر یا نہ اسٹور کی جانب لپک گیا۔

جب وہ واپس اپنے ٹھیلے پر پہنچا تو میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خلوص دل سے کہا۔

”منظور نے! تم نے اپنی ایمان داری تو ثابت کر دی۔ اب لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ تم نے سرکاری باٹ کے بجائے یہ

”مطلب یہ کہ.....“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”آپ اپنی باتوں اور شکل سے اتنے سخت نظر تو نہیں آتے.....!“

”اسی لیے لوگ مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔“ میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”منظور ہے کہ ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ میں نے اس سے دو چار میٹھی میٹھی ادھر ادھر کی باتیں کیں اور دوسرے آں تموا لیے اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس کے آں میٹھے نکلے تو پیسے دوں گا ورنہ نہیں.....“

میں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ صورت حال کو سنبھال لیا تھا ورنہ سلطان تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میں نے یہ دوسرے آں منظور سے رشوت میں لیے ہیں اور اب میں اسے کسی قسم کا قانونی تحفظ فراہم کروں گا چنانچہ وہ بھی مجھے کوئی گفت شفت دے کر اپنے ہاتھ میں کرنا چاہتا تھا۔

میں مزید دس منٹ تک وہاں رکھا، ان دونوں بھائیوں سے حقیقت جٹ کی زندگی کے بارے میں مختلف سوالات کیے، ٹھنڈی بوتل ختم کی اور ان خیالات کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے نوجوانو..... تم لوگ اپنی دکانداری کو دیکھو۔ اب میں چلتا ہوں۔ آج یا کل کسی وقت میں تمہارے گھر کا چکر بھی لگاؤں گا تاکہ تم لوگوں کی امی سے بھی ملاقات ہو جائے.....!“ لہجائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور اس منظور سے پھل فروش پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ ناپ تول کے معاملے میں قصور وار نکلا تو ایسا فٹ کروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا۔“

میرے ان آخری کلمات سے ان دونوں بھائیوں، خصوصاً سلطان کے چہرے پر خوشی کے تاثرات چمکنے لگے۔ میں انہیں ان کے حال پر خوش چھوڑ کر دکان سے نکل آیا۔ سلطان کے ساتھ فی الحال یہی کیا جاسکتا تھا۔

اگلے روز میں کوشش کر کے ایک ایسے وقت بخت بی بی سے ملنے چلا گیا تھا جب اس کے دونوں بیٹے گھر پر نہ ہوں۔ مجھے یہ خدشہ تھا کہ وہ، خاص طور پر سلطان بار بار مداخلت کر کے گفتگو کا مزہ خراب کر دے گا۔

وہ دن کا وقت تھا اور بخت بی بی بھی اتفاق سے مجھے گھر میں اکیلی بی بی مل گئی تھی۔ فرزانہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔

بخت بی بی نے مجھے ہنسی میں بٹھایا اور میرے لیے لی پانی کا بندوبست کرنا چاہا لیکن میں نے اسے سختی سے منع

کیا ہونا ضروری تو نہیں۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”آخر آپ نے منظور سے آموں کا تحفہ بھی تو لیا ہے نا.....!“

وہ چونکا دینے والی باتوں کا کوئی ریکارڈ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا شاید اسی لیے ایک کے بعد ایک شکوفہ چھوڑ رہا تھا۔ سلطان کے رویے سے ایک بات تو مکمل کر سامنے آگئی تھی کہ وہ منظور سے کے لیے اپنے دل میں شدید نوعیت کی ناپسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ وہ چونکہ سلطان کی نظر میں تھا اس لیے منظور سے ہونے والی میری ملاقات کی تفصیل بھی اس سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ یہ تمام تر خیالات سینکڑے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزر رہے اور میں نے سلطان کی بات کے جواب میں کہا۔

”میں نے منظور سے سے دوسرے آں تمھیں میں نہیں لیے بلکہ اس سے میرا ایک خاص مقصد ہے.....!“

”مقصد..... کیسا مقصد تھا نے دار صاحب؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ”تم نے شکایت کی تھی نا کہ منظور اکم تول ہے اور اس کے پاس سرکار کے تصدیق شدہ باٹ بھی نہیں ہیں..... شکایت کی تھی یا نہیں؟“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ منظور سے کی ناپ تول کے حوالے سے اس کا اعتراض بے بنیاد اور خالی از وزن تھا۔ میرے سوال کے جواب میں وہ دیر سے بولا۔

”جی..... میں نے آپ سے ایسی شکایت تو کی تھی.....!“

”بس، تو پھر یہ آں تمہاری اسی شکایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔“ میں نے دنگ لہجے میں کہا۔ ”میں ان آموں کو کسی ایمان دار دکاندار کے ترازو پر جا کر تولوں گا۔ اگر دوسرے ایک بھی کم وزن نکلا تو منظور ا جائے گا سیدھا میرے تھانے کی حوالات میں..... کہاں جائے گا؟“

”تھانے کی حوالات میں!“ وہ ندامت آمیز انداز میں بولا۔

”تھانے کی حوالات میں نہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے تھانے کی حوالات میں اس سے تمہارے سامنے جوتے مارتے ہوئے یہاں سے لے کر جاؤں گا۔ کیا سمجھے.....؟“

”سمجھ گیا تھا نے دار صاحب.....!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ تو خاصے کڑک تھانے دار نکلا حالانکہ اسے لگتے تو نہیں.....“

”کیا نہیں لگتا؟“ میں نے سوال کیا۔

سلطان نے جواب دیا۔ ”ابا جی کی قبر صحیح سلامت ہے.....“

میں نے دانستہ اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں قبرستان کا چکر لگانے اور وہاں کی رپورٹ لینے کے بعد ادھر آیا ہوں۔ میں نے ان لوگوں کی ہمت بندھانے کی غرض سے کہا۔

”میں نے کل ہی سے تفتیش کا آغاز کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے، بہت جلد میں اس قند پرور شخص کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا جس نے حقیقت جٹ کی قبر کے ساتھ وہ سنگین مذاق کیا تھا۔“

اسی لمحے ریحان واپس آگیا۔ میں اس کے ہاتھ میں ٹھنڈی ٹھار بوتل دیکھ کر چونک پڑا۔ سلطان نے بڑے بھائی سے کہا۔

”ریحان! بوتل تھانے دار جی کو پیش کرو۔ یہ کتنی گرمی میں آئے ہیں۔“

”جی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی لیکن اخلاقیات میں نے کہہ دیا۔“ یہ تکلف کیوں کیا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈی لسی پی تھی۔“

”تھانے دار جی! اگر آپ نے تین چار گلاس لسی بھی پی ہو تو وہ پسینا بن کر آپ کے وجود سے خارج ہو چکی ہوگی۔“ سلطان نے ریحان کے ہاتھ سے بوتل لے کر بذات خود میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ پچھلے آدھے گھنٹے سے اس بکو اسی منظور سے کے ساتھ مغز ماری کر کے آرہے ہیں.....“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ تو گویا یہ شاطر میری نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابھی بتایا ہے نا..... میں نے کل ہی سے تفتیش شروع کر رکھی ہے۔ تم نے قبرستان میں کل منظور سے کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس کی روشنی میں یہ بندہ بھی میری نظر میں ہے۔ میں اسی سلسلے میں منظور سے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔“

”پھر آپ کو کوئی اہم بات پتا چلی.....؟“ سلطان نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی بوتل کو میرے ہاتھ کے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کوئی تکلف نہیں، ہماری محبت ہے تھانے دار صاحب۔ اسے حلق سے نیچے اتاریں ورنہ ہاتھ میں پکڑی پکڑی گرم ہو جائے گی۔ ابھی تو ہم نے آپ کو کوئی گفت وغیرہ بھی دینا ہے.....!“

”گفت.....؟“ میں نے ٹھنڈی بوتل پکڑتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ کس سلسلے میں سلطان؟“

”جناب! تحفے تحائف کے تبادلے کے لیے کسی سلسلے

”جناب! اب ایسا بھی نہیں کہ میں بالکل ہی بے نمازی ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں مسجد میں نہیں جاتا لیکن جب جی چاہتا ہے، نماز پڑھ لیتا ہوں۔“

”جی چاہتا ہے..... کیا مطلب؟“ میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”کیا تمہیں پتا نہیں، نماز ایک فرض عبادت ہے؟“

”جانتا ہوں جی۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”تھانے دار صاحب!“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جب یہاں سے.....“ اس نے اپنے سینے پر، دل کے مقام پر ٹھیک دی اور گویا ہوا ”یہاں سے تڑپ اٹھتی ہے تو میں بے اختیار خود کو اللہ کے حضور جھکا دیتا ہوں۔ ایسی نماز میں وہ مزہ آتا ہے..... وہ مزہ آتا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

”یہ دنیا کو دکھانے کے لیے انتہائی بددلی کے ساتھ نماز کی خانہ پری مجھے بالکل پسند نہیں۔ ہاں، آپ دعا کریں کہ دن میں پانچ وقت میرے دل میں اس کی جانب رجوع کی تڑپ پیدا ہو جائے تو پھر آپ مجھے پانچوں وقت مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے پائیں گے۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے دل سے کہا۔ ”میں تمہارے لیے ضرور دعا کروں گا۔“

اس نے میرا شکر یہ ادا کیا اور میں اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

”جٹ کلاتھ مرچنٹ“ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ میں نے سوچا، واپسی سے پہلے ذرا ادھر بھی جھانک لوں، میں نے دکان میں قدم رکھا تو دونوں بھائیوں نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ پیچھے کسی جگہ میں اس بات کا ذکر کر چکا ہوں کہ ان دونوں بھائیوں میں چھوٹا بھائی سلطان خاصا تیز طرار تھا جبکہ بڑا بھائی ریحان خاموش طبع اور سیدھا سادا تھا۔ گزشتہ روز قبرستان میں ان سے میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں منظور سے سے خاصے برگشتہ نظر آتے تھے۔

مجھے دکان میں داخل ہوتے دیکھا تو سلطان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ریحان کو کوئی اشارہ کیا اور وہ دکان سے باہر نکل گیا۔ میں سلطان سے بات کرنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم لوگوں نے آج قبرستان کی طرف چکر لگا کر اپنے ابا جی کی قبر کا جائزہ تو لیا ہوگا۔ وہاں دوبارہ کوئی گڑبڑ تو دیکھنے میں نہیں آئی؟“

”نہیں جی..... وہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“

کرتے ہوئے کہا۔

”اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے بخت بی بی۔ بس، میں تم سے حفیظ جٹ کے بارے میں دو چار باتیں کرنے آیا ہوں۔ تم بیٹھ جاؤ یہاں.....“

وہ بیٹھ گئی۔
بخت بی بی کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک عام سی، فرماں بردار اور خدمت گزار گھریلو عورت تھی۔ ابتدائی بات چیت میں، میں نے اس سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ بھی حفیظ جٹ کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے پر افسوس ظاہر کرنے لگی۔ میں نے کہا۔

”بخت بی بی! تم اس واقعے کا ذمہ دار کس کو سمجھتی ہو؟“
”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں جی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”وہ تو اتنے اچھے تھے کہ کسی کو ان سے دشمنی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جب سے وہ گئے ہیں، میں دن رات ان کے لیے پڑھتی پڑھاتی رہتی ہوں۔“

”وہ“ سے بخت بی بی کی مراد اس کا شوہر یعنی حفیظ جٹ کی ہی ذات تھی۔ ”یہ بات تو میں بھی مانتا ہوں کہ یہاں حسین آباد میں حفیظ جٹ کا کوئی دشمن نہیں تھا۔“ میں نے بڑے دھیمے انداز میں کرید کے عمل کا آغاز کر دیا۔ ”میں جس جس سے بھی ملا ہوں اس نے یہی بتایا ہے کہ وہ بہت نمازی اور پرہیزگار بندہ تھا۔“

”وہ بہت ہی نیک انسان تھے۔“ بخت بی بی نے پھر ائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کسی کو ان سے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہ سب کا خیال رکھتے تھے اور ہر وقت اللہ کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔ آخری دو تین ماہ تو ان کا کام میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ دکان پر بہت کم جاتے تھے۔ سارا کام سلطان اور ریحان ہی نے سنبھال رکھا تھا۔“

”پچھلے دو تین ماہ سے اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔“ میں نے اسی کے الفاظ زیر لب دہرائے پھر پوچھا۔ ”اس کی کوئی خاص وجہ تھی..... کیا وہ کسی معاملے میں پریشان رہنے لگا تھا؟“

”پریشانی تو انہیں کوئی نہیں تھی تھانے دار صاحب اور پریشانی ہوتی بھی کس بات کی.....“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے ہمارے پاس۔ دکان داری ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے، گھر میں بھی امن و امان اور پیار محبت ہے۔“

”پھر حفیظ جٹ کا کام سے دل کیوں اچاٹ ہو گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں سمجھتی ہوں، وہ اللہ والے ہو گئے تھے۔“ بخت بی بی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”دنیا داری کے کاموں سے ان کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ ہر وقت یاد الہی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں کٹتا تھا۔“

”یہ سب تو ٹھیک ہے بخت بی بی!“ میں نے رسائیت بھرے انداز میں کہا۔ ”اللہ سے لو لگنا بڑی اچھی بات ہے لیکن میرا ذہن جس چیز سے الجھن کا شکار ہے اس سلسلے میں مجھے کوئی اشارہ نہیں مل رہا.....“

اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا ”آپ کو کیا الجھن ہے تھانے دار صاحب؟“
میں نے اپنی الجھن بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا بخت بی بی..... کہ جب حفیظ جٹ ایسا ہی نیک و پارسا تھا تو پھر اس کی قبر کا یہ حشر کیوں ہوا؟“

”یہ تو آپ حشر کرنے والے سے جا کر پوچھیں.....!“ وہ بڑی سا دگی سے بولی۔
میں نے اس صورت حال کو ایک دوسرے زاویے سے وینڈل کرنے کی کوشش کی۔ ”بخت بی بی! تم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ نکالو۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تمہارے خاوند کی قبر کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کسی دوست کا کام تو ہو نہیں سکتا.....؟“

”میں آپ کو یا آپ کی بات کو غلط نہیں سمجھ رہی ہوں تھانے دار صاحب!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اگر میں ان کے کسی دشمن یا بدخواہ سے واقف ہوتی تو آپ کو ضرور بتا دیتی.....“
میں نے اپنے مطلب کی بات اٹھوانے کے لیے سوالات کا ایک نیازاویہ استعمال کیا اور بخت بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ لوگوں کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟“
”میری بیٹی فرزانہ اس وقت پچیس سال کی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ ہماری شادی کے دو سال بعد پیدا ہوئی تھی۔“
”اس کا مطلب ہے، تمہاری شادی کو لگ بھگ ستائیس سال گزر گئے ہیں۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ کافی طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ان سالوں میں تم نے حفیظ جٹ کی زندگی کا ہر روپ اور ہر رنگ دیکھا ہوگا.....؟“

”جی.....!“ اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔ میں نے استفسار کیا۔ ”کیا تم نے زندگی کے کسی مرحلے پر یہ محسوس کیا کہ حفیظ جٹ سے کوئی بہت بڑا گناہ

مرزد ہوا ہو..... اس نے اللہ کے قانون کو بڑی بے دردی سے روند ڈالا ہو.....؟“
”نہیں جی..... میں نے ان میں ایسی کوئی خامی نہیں دیکھی تھی۔“ وہ قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے شروع سے آخر تک انہیں ایک اچھا انسان ہی پایا تھا۔“

میرا ہر سوال بندگی کی دیواروں سے ٹکرا کر بے نیل و مرام واپس آ جاتا تھا۔ میں نے چند لمحات کی خاموشی کے بعد بخت بی بی سے پوچھا۔

”میں نے سنا ہے، تم لوگ پچھلے پانچ سال سے حسین آباد میں رہ رہے ہو۔ کیا یہ بات درست ہے؟“
”آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔“ وہ تصدیقی انداز میں بولی۔ ”یہاں آنے سے پہلے ہم لوگ چک جھمرا میں رہتے تھے۔“

”اور اس سے پہلے.....؟“
”اس سے پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہماری شادی ہوئی تھی اور زندگی کا زیادہ عرصہ وہیں پر گزرا ہے۔ چک جھمرا میں تو ہم دو سال رہے ہوں گے اور اب پچھلے پانچ سال سے سمندری کے اس گاؤں حسین آباد میں ہیں۔“

”بخت بی بی! تم کیا سمجھتی ہو.....!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اگر حسین آباد میں نہیں تو کیا چک جھمرا یا ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی حفیظ جٹ کا کوئی دشمن نہیں تھا؟“

”میں سمجھتی ہوں، نہیں تھا۔“ اس نے دو ٹوک الفاظ میں جواب دیا۔ ”اور اگر بالفرض کوئی تھا تو یہ بات میرے علم میں نہیں ہے.....“

”ہوں.....!“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد میں نے تحقیق و تفتیش کے عمل کو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا چک جھمرا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی حفیظ جٹ کڑے کی دکان ہی چلاتا تھا؟“

”نہیں جی، کپڑے کی دکان تو انہوں نے ادھر حسین آباد میں آ کر کی تھی۔“ بخت بی بی نے جواباً بتایا۔ ”چک جھمرا میں ہماری پرچون کی دکان ہوتی تھی اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تو اپنی زمین تھی دس کھ (ایکڑ)۔ ادھر تو یہ باپ بیٹے ل کر کھیتی باڑی کیا کرتے تھے.....“

”ابنی دس ایکڑ زرعی اراضی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں چھوڑ کر

لیلا جھوٹ

آپ لوگ چک جھمرا کیوں چلے آئے تھے؟“ میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ”کہاں زمین داری اور کہاں پرچون کی دکان؟“
”ہم ٹوبہ ٹیک سنگھ والی زمین چھوڑ کر نہیں بلکہ فروخت کر کے چک جھمرا آئے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ کہتے تھے، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور کھیتی باڑی میں دل نہیں لگتا۔ کہیں اور جا کر رہیں گے اور کوئی کاروبار کریں گے۔ پھر ہم چک جھمرا چلے گئے اور وہاں انہوں نے ایک بڑی پرچون کی دکان کھول لی تھی۔“

”پھر چک جھمرا میں بھی حفیظ جٹ کا دل نہیں لگا اور تم لوگ حسین آباد آ گئے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا بخت بی بی؟“

”نہیں جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”یہاں آ کر حفیظ جٹ نے مین بازار میں کپڑے کی دکان کھول لی اور دونوں بیٹوں کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔“ میں نے گفتگو کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہاں پر اس کا دل لگ گیا تھا؟“

”شروع میں تو مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ یہاں ان کا جی لگ گیا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن پھر وہ کچھ بے چین سے ہو گئے تھے اور آخری دنوں میں تو بالکل اللہ والے ہو گئے تھے.....!“

”وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بے چین ہوا تو چک جھمرا چلا گیا پھر جب وہاں بھی اسے قرار نہ آیا تو وہ یہاں حسین آباد میں آ کر آباد ہو گیا۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”بھی تم نے اپنے خاوند کی اس بے چینی اور بے قراری کا سبب جاننے کی کوشش بھی کی تھی بخت بی بی؟“

”میں نے کئی بار ان سے پوچھا تھا لیکن انہوں نے کبھی مجھے بتایا نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”جب سے وہ گئے ہیں، میں نے خواب میں بھی انہیں پریشان ہی دیکھا ہے.....!“

”کیا مطلب؟“ میں چونک اٹھا۔
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اپنے انتقال کے بعد وہ پانچ چھ رات تک مسلسل میرے خواب میں آتے رہے ہیں۔ میں نے انہیں بہت پریشان اور آرزو دیکھا ہے۔“
”کیا پچھلی دوراتوں سے حفیظ جٹ تمہارے خواب میں نہیں آیا؟“

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی نہیں.....!“

بخت بی بی کا جواب میرے خیالات کو تقویت دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے اپنی سوچ پر اور زیادہ پختہ یقین ہو گیا۔

گویا حقیقت جٹ ایک سوا ایک فیصد عذاب قبر میں مبتلا تھا اور قبر پھٹ جانے کے بعد اس کا زہنی عذاب ختم ہو گیا تھا۔ آگے اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا، یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا اور بخت بی بی مجھے سوچتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اب تم بالکل پرسکون ہو جاؤ بخت بی بی..... حقیقت جٹ تمہارے خواب میں نہیں آئے گا اور اگر آئے گا بھی تو وہ تمہیں پریشان اور آزرده نظر نہیں آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں، اس کا مشکل وقت گزر چکا.....“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانے دار صاحب!“ وہ تشکرانہ انداز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ”ایک بات تو بتاؤ بخت بی بی! تم لوگوں نے ابھی تک اپنے بچوں میں سے کسی کی شادی کیوں نہیں کی؟“ ”بہت کوشش کی ہے لیکن کوئی رشتہ ہی نہیں آتا۔“ وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔ ”مجھے سب سے زیادہ فرزانہ کی فکر ہے۔ پورے پچیس سال کی ہو گئی ہے۔ ماشا اللہ! خوب صورت اور جوان ہے پھر بھی پتا نہیں، اس کی قسمت کو کیا ہو گیا ہے۔ سلطان اور ریحان تو مرد ذات ہیں اور فرزانہ سے چھوٹے بھی ہیں۔ میں ان کی طرف سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوتی۔ بس، کسی طرح فرزانہ اپنے گھر کی ہو جائے تو مجھے بھی سکھ کی سانس لینا نصیب ہوگی۔“

”اب فرزانہ کا انشا اللہ! بہت جلد کہیں سے کوئی رشتہ آجائے گا۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور دونوں بھائی بھی زیادہ دیر تک کنوارے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ وہ نیلی چھتری والا ان سب کا کچھ نہ کچھ کر ہی دے گا۔“

”بے شک.....“ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہی سب کی بگڑی بنانے والا ہے۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بخت بی بی! میں اب چلتا ہوں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”چلتے چلتے تم میرے آخری سوال کا جواب دے دو.....“ وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”میں اب تک کی تفتیش کے مطابق تمہارے خاوند کے کسی دوست کو تو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں حسین آباد میں اس کا سب سے گہرا دوست کون تھا جس کے ساتھ اس کا زیادہ میل ملاپ رہتا ہو؟“

”پہلے تو ایسا کوئی بھی نہیں تھا۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن جب سے ان کا اللہ کی طرف دھیان بڑھا تھا،

وہ زیادہ تر وقت مولوی عمر دین کے ساتھ گزارتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ ظہر کی نماز کے لیے مسجد جاتے پھر عصر پڑھنے کے بعد ہی واپس آتے تھے۔ طرح طرح مغرب کے لیے جاتے تو عشا بھی پڑھ کر ہی لوٹتے تھے۔“ لکھائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتی ہوں، حسین آباد میں وہ اگر کسی پرہیز کرتے تھے اور اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے تو وہ شخص صرف اور صرف مولوی عمر دین ہے۔“

میں نے بخت بی بی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے گھر سے نکل آیا۔

رات کے دس بجے تھے اور میں اس وقت مولوی عمر دین کے روبرو بیٹھا تھا۔ میں نے ملاقات کے لیے جان بوجھ کر ایسے وقت کا تعین کیا تھا جب مجھے اور مولوی صاحب کو معمول کے کاموں سے مکمل فراغت حاصل ہوتا کہ اگر ہماری یہ ملاقات دراز ہونے لگے تو ہم دونوں میں سے کسی کے کام کا حرج نہ ہو۔

مولوی عمر دین کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ ڈاڑھی شرعی اور مہندی سے رنگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کو صحیح معنوں میں نورانی چہرہ کہا جاسکتا تھا۔ بول چال میں بھی وہ نہایت ہی شائستہ اور مہذب ثابت ہوا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ علاقے کا تھانے دار اس سے ملنے آیا ہے تو اس نے میرا پرتپاک استقبال کیا اور گھر کے اندر بٹھانے کے بعد بولا۔

”ملک صاحب! مجھے حکم کیا ہوتا، میں آپ کے پاس آجاتا۔ آپ نے خواجواہ زحمت کی.....!“

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے زحمت خواجواہ نہیں بلکہ ایک فطری اصول کے تحت کی ہے۔“ ”فطری اصول..... میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟“

سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”بہت سیدھی سی بات ہے کہ ہمیشہ پیاسا کنویں سے پاس آتا ہے، کنواں کبھی چل کر کسی پیاسے کے پاس نہیں جاتا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اس لیے چل کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ جب آپ کو مجھ سے کام پڑے گا، آپ تھانے تشریف لے آئیے گا۔“

”آپ تھانے دار ہیں یا کوئی فلسفی.....“ وہ حیرت

نیلا جھوٹ

بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے بڑی گہری بات کی ہے۔“

”مولوی صاحب! میں سب سے پہلے انسان ہوں۔“ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد پولیس والا یا اور کچھ..... میں نے تھوڑی دیر پہلے جو اصول بیان کیا ہے وہ انسانیت کے تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔“

”آپ کا وہ اصول منطق کے خانے میں فٹ ہوتا ہے۔“ وہ پر معنی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جب میں لاہور کے ایک مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کر رہا تھا تو عالم فاضل کے کورس میں صرف دھوکے علاوہ ہمیں فلسفہ اور علم منطق بھی پڑھایا گیا تھا لہذا آپ سے بات کرنے میں حرج آئے گا۔“

”میں بھی آپ کے لیے ایسے الفاظ ہی استعمال کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ آپ کوئی سطحی علم رکھنے والے ٹریڈ مارک مولوی نہیں ہیں بلکہ ایک جید عالم ہیں۔“

”اس ذرہ نوازی کا شکریہ ملک صاحب۔“ وہ رصانیت بھرے انداز میں بولا۔ ”حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مجھے ایک شخص نے بتایا ہے کہ آپ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی رکھتے ہیں؟“

وہ زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ”بس، تھوڑے بہت اندازے لگا لیتا ہوں۔“ پھر سوال کیا۔ ”آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟“

”پچھل فروش منظور علی عرف منظورے نے.....!“ ”اچھا وہ.....!“ اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

میں نے اس کے معنی خیز انداز کو دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”آپ منظورے کو کیا سمجھتے ہیں؟“

جواب دینے سے پہلے مولوی عمر دین چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سچ کج بتا دوں.....!“

”میں آپ جیسی شخصیت سے غلط بیانی کی توقع نہیں رکھتا۔“ میں نے کہا۔

”میری نظر میں منظورازندہ ولی ہے.....“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

”اگر اجازت ہو تو کچھ میں بھی عرض کروں؟“ ”ارشاد.....!“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ ولی، ولی کو پہچانتا ہے!“

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، جلدی سے بولا۔ ”آپ شاید کسی خواب کی تعبیر جاننے کے لیے میرے پاس تشریف لائے تھے.....!“

میں نے اسے کریدنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ”جی، بجا فرمایا آپ نے۔ میں ایک پراسرار اور پریچ خواب کی تعبیر جاننے کے لیے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔“

”تو اپنا خواب بیان کریں۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”یہ خواب میرا نہیں بلکہ کسی اور کا دیکھا ہوا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن تعبیر کی مجھے ضرورت ہے کیونکہ یہ خواب جس شخص سے متعلق ہے وہ میرے موجودہ کیس کا مرکزی کردار ہے۔“

”آپ کس شخص کی بات کر رہے ہیں؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”مرحوم حفیظ جٹ!“ ”اوہ.....!“ مولوی عمر دین ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے گورکن خیر دین کا دیکھا ہوا خواب سن و عن مولوی عمر دین کے سامنے بیان کر دیا۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

”آپ واقعی محض اس خواب کی تعبیر کے لیے میرے پاس آئے ہیں یا اس کے علاوہ بھی کچھ جاننا چاہتے ہیں؟“

”میں اس امر کی تصدیق کے بعد کہ حسین آباد میں حفیظ جٹ سب سے زیادہ آپ کے قریب تھا، یہاں آپ سے ملنے آیا ہوں۔ اب آپ اس کے بارے میں جتنا بھی بتانا چاہیں، یہ آپ پر منحصر ہے۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”میں حفیظ جٹ کے حوالے سے ایک مخصوص اور اٹل سوچ رکھتا ہوں جو کسی بھی صورت تبدیل نہیں ہو سکتی۔“

”میں خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے آپ کی اس مخصوص سوچ کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....؟“

مجھے چونکہ کوئی اعتراض نہیں تھا لہذا میں نے اول آخر سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا اور آخر میں اپنی حتمی رائے بھی بیان کر دی۔ ”میں سمجھتا ہوں مرحوم حفیظ جٹ سے زندگی میں کوئی نہایت ہی سنگین گناہ کا ارتکاب ہو گیا تھا جس

بہروپ

ساحر جمیل سید



کہیں بینائی دھوکا دیتی ہے کہیں دانائی نادانی کی غلامی میں ہوتی ہے... عجب منظر ہوتا ہے... ہر چہرے پر کتنے چہرے سجے ہوتے ہیں کچھ خبر نہیں ہوتی... پھر وقت اور حالات کے تناظر میں انسان پرت پرت کر کے باہر نکلتا ہے اور جب اپنے اصل روپ میں آتا ہے تو کتنی ہی آنکھوں میں حیرانی بھر دیتا ہے... کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی درپیش تھا... جو عزت کا بیوپاری تھا اس نے زندگی کے بدلے میں ایسا آخری سودا کیا کہ پھر کسی اور سودے کی تمنا نہ رہی... اور جس کا نفع آنے والے کل میں چھپا تھا۔

ظاہر اور باطن کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ اور... دنیا کی حیرانی

”ککڑوں کڑو ووں“

”علی... حیدر“

حسب روایت بانگ مرغ کے ساتھ ہی ”مچھل“ نے اپنی پاٹ دار آواز میں فلک شکاف نعرہ بلند کیا اور اماں کے ہاتھ سے چاولوں کی پلیٹ چھوٹ کر ان کے سامنے دری پر آ رہی۔ ”ہائے ہائے! خدا انہیں غارت کرے۔ جینا حرام کر کے رکھا ہوا ہے ان دونوں نے تو۔“ اماں نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا تو ہوا اور اسدوانت نکال کر ہنسنے لگے۔

کی پاداش میں اسے عذاب قبر سے دوچار ہونا پڑا.....“
”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”خیر دین کا خواب بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن میں آپ کو حقیقت جٹ کی زندگی کے راز سے اسی وقت آشنا کروں گا جب آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں گے..... سچا اور کھرا وعدہ!“
”کیسا وعدہ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ وعدہ کہ آپ حقیقت جٹ کے معاملے کی تحقیق کے سلسلے میں چک جھمر اور ٹوبہ فیک سنگھ کا رخ نہیں کریں گے۔ اس بات کو یقیناً ختم کر دیں گے۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو حقیقت جٹ نے اپنی موت سے قبل آپ کو اس گناہ کبیرہ کے بارے میں بتا دیا تھا جو اس کے لیے قبر کا عذاب بن کر سامنے آیا ہے۔“

”آپ غلطی پر نہیں ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”حقیقت جٹ نے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مجھے حقیقت حال سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور شخص مجھ سے یہی سوال کرتا تو یقیناً کریں، میں اسے کچھ بھی نہ بتاتا۔ حقیقت جٹ کا

اعتراف گناہ ایک راز کی طرح میرے پاس امانت ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک سمجھ دار، بردبار اور ذمے دار پولیس آفیسر ہیں۔ آپ کے ساتھ اس راز کو شیئر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ اس معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس بات کو یقیناً ختم کر دیں گے۔“

”میں آپ کے حسبِ مشاؤ وعدہ کرتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں مولوی عمر دین نے مجھے حقیقت جٹ کے بارے میں جو کچھ بتایا میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ میرے ساتھ ساتھ، کہانی کے اختتام پر آپ بھی حقیقت جٹ کے گناہ سے واقف ہو جائیں اور عبرت پکڑیں کہ انسان کو زندگی میں احتیاط کے دامن کو ہمیشہ مضبوطی سے تھام کر رکھنا چاہیے۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب حقیقت جٹ ٹوبہ فیک سنگھ میں ہوا کرتا تھا۔ وہ شادی شدہ تھا، تین بچوں کا باپ تھا لیکن اس کے قدم ڈمگ گئے۔ غزالہ نامی ایک لڑکی اس کی زندگی میں چپکے سے داخل ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے حواس پر چھا گئی۔ حقیقت جٹ اس کے ساتھ اتنا آگے چلا گیا کہ واپسی کا راستہ نہ رہا۔ غزالہ نے اپنا تن من نچا اور

کرنے کے بعد حقیقت جٹ سے شادی کا مطالبہ کر دیا کیونکہ

شادی کے وعدے پر ہی غزالہ نے تمام اخلاقی اور شرعی پھلاکتے ہوئے حقیقت جٹ کی نفسانی خواہش پوری کی تھی۔ غزالہ کے مطالبے نے حقیقت جٹ کو پریشان کر دیا اور وہ راتیں بے خوابی میں گزارنے لگا۔ غزالہ خاصی جذباتی اور بزدل لڑکی ثابت ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ حقیقت جٹ اس سے شادی پر آمادہ نہیں تو وہ اسے یہ دھمکی دے کر چلی گئی۔

”حقیقت! تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں اس معاملے کو اچھا کر اپنے والدین کی مٹی پلید نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اپنا کیس نیلی چھتری والے کی عدالت میں پیش کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی میں نیلا تھوٹا کھا کر اپنی جان لے رہی ہوں۔ میرے وجود کے اندر پلٹنے والا ایک نیا سا وجود بھی نیلی موت مرجائے گا اور تمہارے لیے میں یہی بددعا کروں گی کہ خدا کروٹ کروٹ تمہیں نیلا عذاب دے۔ میری اس بات کو نیلا جھوٹ نہیں سمجھتا۔ میں جو کہ

رہی ہوں وہ کر کے بھی دکھا دوں گی.....“

حقیقت جٹ نے غزالہ کی دھمکی کو ”نیلا جھوٹ“ سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب غزالہ کا غصہ اترے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا.....!

لیکن کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا۔ غزالہ ضد اور بات کی بڑی پکلی نکلی۔ اسی رات اس نے نیلا تھوٹا کھا کر جان دے دی تھی۔ حقیقت جٹ کے علاوہ کوئی اس کی موت کے سبب سے واقف نہیں تھا لہذا اس کی طرف ایک بھی انگلی نہ اٹھی مگر اس کا ضمیر اندر سے اسے کچھ لگانے لگا۔ وہ غزالہ کی موت کی حقیقت سے یہ خوبی آگاہ تھا اور یہی اس کی بے چینی اور بے

قراری کی وجہ تھی۔

وہ ٹوبہ فیک سنگھ سے چک جھمر پہنچا اور پھر سمندری کے اس گاؤں حسین آباد میں آکر آباد ہو گیا مگر ضمیر کی خلش نے ہر جگہ اس کا تعاقب کیا اور بالآخر مجبور ہو کر اس نے

مولوی عمر دین کو اپنے راز میں شریک کر لیا تھا۔ اس کے چہ ماہ بعد ہی وہ اس دار فانی سے اٹھ گیا۔

حقیقت جٹ کی قبر کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آیا تھا وہ یقیناً غزالہ کی بددعا کا نتیجہ تھا۔ حقیقت جٹ اس کے کہے کو ”نیلا جھوٹ“ سمجھا تھا جبکہ وہ سنجیدہ تھی۔

اس قسم کے واقعات انسان کی آنکھیں کھولنے کے لیے منظر عام پر آتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان سے سبق بھی حاصل کرتے ہیں۔ اکثر لوگ تو انہیں حقیقت جٹ کی طرح نیلا جھوٹ جان کر آگے بڑھ جاتے ہیں.....!

(تحریر: حسام بٹ)

”اماں! اب تک تو آپ کو بھی اس سب کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔“ حنا نے پہلے تو ہما اور اسد کو گھورا۔ پھر اماں کی طرف متوجہ ہوئی جو درری پر گر پڑنے والی پلیٹ اٹھا رہی تھیں۔

”بس اب اسے پڑا رہنے دیں۔ کھانا کھانے کے بعد اٹھالیں گے۔“ ٹھہریں..... میں آپ کے لیے اور لے آتی ہوں۔“ حنا نے جلدی سے کہا اور ہاتھ میں پکڑی پلیٹ نیچے رکھتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”کیسے عادی ہو جاؤں بیٹا! ان دونوں کے گلوں میں تو جانے کون سی ڈانگ پھری ہوئی ہے۔ کسی ٹرین کے انجن جیسی آوازیں ہیں۔“ اماں نے جیسے خود کلامی کی۔

”اماں! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مجھ کے ساتھ رہ رہ کر اس کا رستم (مجھ) نے اپنے مرنے کا نام رستم رکھا ہوا تھا) بھی پاگل ہو چکا ہے۔ جو وقت بے وقت اذائیں دیتا رہتا ہے۔“ ہما نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں نے دبے دبے سے لہجے میں فوراً اسے جھڑکا۔

”بس، بس چپ کر کے کھانا کھاؤ تم۔“

وہ سب اس وقت برآمدے میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے اور رانا مجھ کے گھر کی مشترکہ دیوار چار قدم ہی دور تھی اور مجھ کے نعرے نے بتا دیا تھا کہ وہ اس طرف دیوار کے ساتھ ہی چار پائی ڈالے بیٹھا ہے۔ اس لیے اماں نے فوراً ہی ہما کو جھڑک کر چپ کرادیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی آوازیں مجھ جیسے کینے بندے کے کانوں تک پہنچیں اور محلے میں ان کی رسوائی کا باعث بنیں۔

”گنگڑوں کڑو دوں۔“

”علی..... حیدر!“

بانگ مرغ کے ساتھ ہی مجھ نے ایک بار پھر نعرہ بلند کیا تھا۔ لیکن اس بار اماں بس زیر لب کچھ بڑا کر رہ گئیں۔ دن ہو یا رات، شام ہو یا سحر، مرغ کی ہر بانگ کے جواب میں ”علی حیدر“ کا نعرہ بلند کرتے رہنے کی تو جیسے اس نے قسم اٹھا رکھی تھی۔ ادھر مرغ بولا نہیں کہ چار کوس تک اس کے نعرے کی چٹکھاڑ جا گونجتی۔ چند ماہ پہلے جب وہ مرغا لایا تھا اس وقت شروع شروع میں تو اس کی چٹکھاڑ سے خود مرغا بھی بانگ دیتے دیتے گڑ بڑا کر چپ ہو جاتا تھا لیکن پھر چند ہی روز میں جیسے وہ عادی ہو گیا۔ بس ایک اماں تھیں جو تاحال عادی نہیں ہو سکی تھیں، وہ اس کی یہ چٹکھاڑ سن کر سوتے میں سے بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتیں۔

”یہ لیں! اماں، سنبھالیں۔“ حنا نے پلیٹ لاکر اماں کو تھمائی اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

کھانا سب نے خاموشی سے کھایا۔ اس کے بعد اسد تو باہر نکل گیا۔ ہما برتن سمیٹ کر کچن میں لے گئی۔ جو اسکول سے بچوں کی کچھ کاپیاں لے کر آئی ہوئی تھی، وہ کاپیاں چیک کرنے بیٹھ گئی اور اماں اپنی سلائی مشین کے سامنے جا بیٹھیں۔

اچانک باہر مجھ کے دروازے پر پہلے تو کسی نے دستک دی پھر کسی کی آواز بلند ہوئی۔

”اوئے رانا.....“

”کون ہے بے؟“ مجھ نے پکار کر پوچھا تھا۔

اماں اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

”اوئے! میں ہوں جگنو۔ گھر پہنچا ہے تو۔“

”نہیں! تیری ماں کی برات میں گیا ہوا ہوں.....“

اس نے ایک دہائیات گالی بکی۔ ”جب میں نے پوچھا ہے کہ کون ہے تو پھر تیرے اس سوال کا کیا مطلب ہوا بھلا؟“ آنے والا غالباً اندر آ گیا تھا، جو ابادہ بھی گالی دینے ہوئے بولا۔

”تو بڑا..... (ناقابل اشاعت)..... بندہ ہے، خود نواب بنارہتا ہے اور دوسرے چاہے جتنا خوار ہوتے پھریں تجھے پروا نہیں۔ اوپر سے جب منہ کھولتا ہے گند ہی بکتا ہے، دوسرے کو عزت سے بلانے کی تو ذرا تمیز نہیں ہے تجھے۔“

”اوئے! بس کر (ناقابل اشاعت) بڑا آیا تو عزت تمیز والا! میری..... کا تجھے پتا نہیں ہے اور مجھے سمجھا دے گا تو۔“

”مر گئے تجھے سمجھانے والے۔“ شاید اس کا اشارہ مجھ کے والدین کی طرف تھا۔ ”یہ لے سنبھال۔“ اس نے جیسے کوئی چیز مجھ کی طرف بڑھائی تھی۔

”ہاں۔ یہ ہوئی نا بات۔“ مجھ کی آواز میں یکدم ہی مسرت اور شیرینی آ گئی۔

”یہ کام کیا ہے نا تو نے عزت کروانے والا۔ چل میری جان اب اندر سے جگ گلاس بھی اٹھالا۔“

وہ دونوں آپس میں یک یک کر رہے تھے اور ان کی اس بے ہودہ اور شرمناک گفتگو پر، اماں مشین چلاتے ہوئے دل ہی دل میں تو بہر تو بہ کر رہی تھیں اور انہیں لعنت ملامت بھی۔ ساتھ ہی وہ کبھی بھی ترجیحی نظر سے ایک ذرا احتیاط کی طرف بھی دیکھ لیتیں جو ایک طرف لائق اور انجان کی بیٹھی پوری توجہ سے کاپیاں چیک کرنے میں مصروف تھی۔

بیٹ کی طرح اسے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن اماں جانتی تھیں کہ حقیقت میں ایسا ہے نہیں..... صبح سے شام تک اور شام سے رات گئے تک مجھ کے گھر میں یہی کچھ تو جاری رہتا تھا۔ دو لفٹنے آرہے ہیں تو دو جا رہے ہیں۔ کبھی جس کی محفل جی ہے تو کبھی شراب پی کر ہلڑ بازی ہو رہی ہے۔

پاش اور مرغوں کی لڑائیوں پر جو ابھی کھیلا جاتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ آپس میں جھگڑ پڑتے لیکن پھر کبھی کینے اکٹھے ہو بیٹھتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی ہمیشہ ایسی ہی غلیظ اور شرمناک ہوا کرتی، ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے گالیوں کا انتخاب وہ ہمیشہ یوں کرتے تھے جیسے سامنے والے کو کسی معبر یا محترم لقب سے نوازا رہے ہوں۔

ظاہر ہے کہ جیسا مزاج مجھ کا اپنا تھا ویسے ہی اس کے پاس آنے جانے والے اس کے یار تھے، آوارہ اور بد معاش.....

کافی عرصہ پہلے جب مجھ کے والدین کے بعد وکرمے اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہ رانا منصور نواز سے بھل بننے کے لیے پر پرزے نکالنے لگا تو ارد گرد کے ایک دو افراد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اپنے باپ دادا کی محنت و وقار کا کچھ خیال کرو۔ تمہاری حرکتوں سے وہ لوگ اب مرنے کے بعد رسوا ہوں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

بات کرنے والے کا مقصد تو یقیناً اچھا ہی رہا ہوگا۔ لیکن اس بے چارے کے اپنے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ مجھ نے اسے بری طرح دھتک کر رکھ دیا تھا پھر آئندہ دنوں میں تو جیسے اس نے ضد پکڑ لی۔ وہ روز اپنی بیٹھک کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر کھلم کھلا شراب پینے لگا۔ آئے روز گلی میں شور مچا رہا، ہنگامہ، گالم گلوچ..... ایک دو بار تو اسے پولیس والے بھی اٹھا کر لے گئے۔ لیکن چند دن بعد ہی وہ عذاب کی صورت پھر واپس آن موجود ہوتا اور اس کا مزاج بھی پہلے کی نسبت کچھ مزید بے باک اور نڈر محسوس ہوا کرتا۔

شہر کے آوارہ اور لفٹنے لوگ اس کے پاس گھر آنے جانے لگے۔ چند ایک بار پھر محلے میں اس کا جھگڑا ہوا اور اس نے دوبار اپنے مختلف حریفوں کو چھریوں سے شدید زخمی کیا۔ چند ایک ماہ جیل بھی کافی۔ موچیں یوں بڑھائیں گویا کوئی ہتھیار ہو کہ آئندہ جھگڑا ہوا تو اپنے حریفوں کو انہی موچوں سے پھانسی دے ڈالے گا۔

لڑائی جھگڑے، پولیس تھانہ، جیل سب ہو گزرا اور

منصور نواز الٹا محفل ہو گیا تو محلے والوں کو بھی اس بات کی سمجھ آ گئی کہ اس بندے کے ہمیشہ یہی چھن رہیں گے۔ اس سے کسی اچھائی کی توقع کرنا حماقت ہی ہوگی۔ یوں مجھ محلے محلے بھر کی ناپسندیدہ شخصیت بن گیا۔ ارد گرد والوں نے اسے نظر انداز کرنا اور اس سے کترانا شروع کر دیا۔ اب مجھ محلے میں ایک بد معاش کی حیثیت اور شناخت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ محلے میں کبھی عام لوگ تھے۔ مجھ کا تو آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ چمڑا چھانٹ..... نہ کوئی ذمے داری نہ مجبوری کمزوری جبکہ ارد گرد والے ایسے تمام سماجی معاملات کے ساتھ جڑے ہوئے تھے پھر بھلا کون مجھ جیسے ڈھیٹ اور ٹیڑھے آدمی پر معترض ہو کر اپنے اور اپنے پورے گھرانے کے لیے کسی قسم کی پریشانی کا باعث بننا پسند کرتا.....

سب کچھ دیکھتے سنتے ہوئے بھی ان سنی کر کے انجان بنے رہنا ارد گرد کے لوگوں کی مجبوری تھی اور ان سبھی کی نظر میں اس سارے مسئلے کا واحد بہترین حل بھی یہی تھا۔

لیکن اماں کی پریشانی صرف اتنی سی نہیں تھی۔ مجھ کے اس ہر وقت کے کج رخانے کو نظر انداز تو وہ بھی کرتی آرہی تھیں لیکن یہی تمام بے ہودہ اور شرمناک باتیں حنا اور ہما کے کانوں میں بھی اتر رہی تھیں..... اس رخ اور اذیت ناک پہلو کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی باعث ان سنی کرنے کے باوجود مجھ کے گھر سے بلند ہونے والی ہر آواز اماں کی سماعتوں سے کسی کوڑے کی طرح آ کر ٹکراتی اور ان کی روح تک کانپ اٹھتی۔

ان کے بس میں اور تو کچھ تھا نہیں۔ حنا اور ہما کو وہ ہر وقت روکتی ٹوکتی اور سمجھاتی رہتیں کہ ”ادھر نہیں بیٹھو، اونچا ہنسو نہیں، دھیمی آواز میں بات کیا کرو، صحن میں فضول جانے سے گریز کرو، برآمدے میں بیٹھو، اندر کمرے میں آ جاؤ۔“ وغیرہ وغیرہ۔

حنا تو سمجھدار ہو گئی تھی، گریجویشن کرنے کے بعد ایک قریبی اسکول میں ٹیچنگ کر رہی تھی۔ البتہ ہما کبھی بھی ان کی اس روک ٹوک پر چڑ جاتی تھی۔ وہ ابھی ایف۔ اے کر رہی تھی۔ عمر ایسی ہی تھی کہ طبیعت میں شوخی اور شرارت کا خاصا عمل دخل تھا۔ اسد آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا، وہ لڑکا تھا سو اس کی اماں کو اتنی فکر بھی نہیں تھی۔ ہاں حنا اور ہما کا سوچ سوچ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتیں اور مجھ کی ہمسائیگی کا خیال انہیں ہولائے رکھتا۔

حنا کو دیکھتیں تو ان کا دل جیسے مٹی میں آ جاتا۔ اس کی

شادی کی عمر ہو چکی تھی، مگر فی الحال اسے رخصت کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی وہ دکھ اور حسرت سے سوچا کرتی تھیں کہ اگر آج ان کا باپ زندہ ہوتا تو یقیناً حنا اب تک اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی اور ہمارے لیے بھی انہیں اس قدر فکر مندی اور پریشانی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا، لیکن وہ بھلا آدمی تو کئی سال پہلے ہی انہیں تنہا چھوڑ کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا تھا۔ ابھی یہ مقام شکر تھا کہ گھر بار اپنا تھا، بیچ بازار میں دو دکانیں بھی تھیں جن کا کرایہ آجایا کرتا تھا اس کے علاوہ اماں سلائی کڑھائی کا کام بھی جانتی تھیں۔ سو دوسروں کی محتاجی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ خود وہ ان پڑھ تھیں مگر حنا، ہمارا اور اسد کی تعلیم کو تو جیسے انہوں نے زندگی کا واحد مقصد بنا کر یہ ماہ و سال گزارے تھے۔ شوہر کی موت کے بعد بڑی ہمت اور حوصلے سے تینوں بچوں کو پروان چڑھایا تھا لیکن اب.....

اب انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی ہمت اور حوصلہ کم پڑتا جا رہا ہے۔ مچھل کا خیال ایک خوف بن کر اندر ہی اندر انہیں ہلانے لگا تھا۔ اس کا خیال، اس کی موجودگی اماں کے لیے ایک مستقل اذیت اور ہولناک پریشانی کا باعث بن چکی تھی۔

حنا، ہمارے قدیمت کو دیکھ دیکھ کر وہ خدا کے حضور عزت پر دے کی زندگی کے ساتھ ساتھ عزت و آبرو کی موت کے لیے دعائیں کرتے نہ تھکتی تھیں۔ پھر بھی اندر اطمینان سے خالی رہتا۔ طرح طرح کے اندیشے، واسے ان کی جان کھاتے رہتے اور ہر وقت دل کو عجیب سا دھڑکا لگا رہتا، راتوں کو معمولی معمولی آہٹ پر بھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کرتی اور خوف و گھبراہٹ سے باہر محسن میں..... اپنی اور مچھل کی مشترکہ دیوار کی سمت گھورتی رہتیں۔

ایسے میں اکثر وہ یہ دعا کیا کرتی تھیں۔
”خدا کرے کہ اس مچھل کو کسی کی آئی آجائے۔
اتنے بہت سے لوگوں کے ساتھ مخالفت ہے، کاش کوئی شیر جوان آکر اسے سوتے ہی میں ٹھنڈا کر جائے۔ ہمیشہ کی نیند سلا جائے۔“ انہیں یقین تھا کہ مچھل جیسے غلیظ اور کمینہ خصلت بندے کے نہ رہنے سے محلے کی عزتیں ایک مستقل خطرے سے محفوظ ہو جائیں گی۔

اتوار کا دن تھا سبھی اطمینان اور تسلی سے نیند پوری کر کے اٹھے تھے پھر اماں محسن میں جھاڑو لگانے میں مصروف ہو گئیں۔ حنا ناشا بنانے کی غرض سے کچن میں جا چکی اور اسد ہی لینے باہر چلا گیا۔

”آپ! آپ سے ایک بات پوچھوں اگر کچا بتائیں تو؟“
ہمارے کچن میں داخل ہوتے ہوئے حنا کو مخاطب کیا وہ ہاتھ روم سے سیدھی کچن میں آگئی تھی۔ ہاتھ منہ بھی نہیں دھوئے تھے اس نے۔
”کون سی بات؟“ حنا آٹا گوندھنے میں مصروف تھی۔

”آپ نے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں محسوس کی ہے..... میرا مطلب ہے وہ محبت جو لڑکے لڑکی کے درمیان ہوتی ہے؟“
حنانے ٹھٹھکتے ہوئے ہمارا گھورا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا! یہ صبح صبح کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”اس میں بکواس کی بھلا کیا بات ہے!“ ہمارے متعجب ہوئی۔ ”میں نے ایک سوال کیا ہے۔ آپ جواب دیں مجھے۔“

”ایسے فضول سوالوں کے جواب نہیں ہوا کرتے۔“ حنا دوبارہ آٹا گوندھنے میں لگ گئی۔

”جب سوال ہوتا ہے، تو پھر اس کا جواب بھی ہونا ہے۔“ وہ لپک کر حنا کے قریب آ بیٹھی۔ ”بتاؤ نا آپ! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی قسم سے۔“

”کیوں بلاوجہ بک بک کیے جا رہی ہو، تھپڑ کھا جا رہی ہو کیا؟“ حنا کو جیسے غصہ آ گیا تھا۔ اس نے ہمارا گھبراہٹ مگر آواز جیسی ہی رکھی کہ کہیں محسن میں جھاڑو لگاتی اماں کے کان تک نہ پہنچ جائے۔

”یہ جو تمہارے دماغ میں اس طرح کا فتنہ بھرا ہوا ہے نا! اس گند کو نکال پھینکو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا اور مجھے پتا ہے یہ سارا خناس تمہارے دماغ میں وہ علینہ اور فریال ہی بھرتی رہتی ہیں۔ کتنی بار منع کیا ہے کہ ان سے دوستی نہ کرو۔ وہ اچھی لڑکیاں نہیں ہیں مگر یہ بات تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آتی۔“

”کمال ہے آپ! آپ تو بلاوجہ ہی، شیطان کی دم بدمار لپیٹنے لگ گئی ہیں۔ میں نے تو ایک خواب کی وجہ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ میں نے رات خواب میں ایک لڑکے کو دیکھا، وہ.....“

”جا کر اماں کو سناؤ اپنا یہ خواب۔“ حنا نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ ”وہ تمہیں فوراً اس کی مکمل تعبیر بتا دیں گی۔“

”توبہ ہے!“ ہمارے کراٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آپ! آپ کو بے شک برا لگے لیکن سچ بھی ہے کہ آپ کو اب کسی سائیکسٹ کی ضرورت ہے۔ ہر وقت آپ جلتی کڑھتی رہتی ہیں۔ کبھی تو بندہ سیدھے منہ بات کر لیتا ہے۔“ وہ پاؤں پختی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی اور حنا کچن کے خالی دروازے کو گھورتی لگی، ہمارے الفاظ پتھروں کی طرح اس کی روح پر برسے تھے۔

یوں تو بہن بھائیوں میں اکثر تلخ کلامی ہو جایا کرتی تھی مگر آج..... آج تو ہمارا اس کی ذات کی ایک خالی کی نشاندہی کر گئی تھی۔ ایک خرابی، ایک بیماری کی اصلاح اور علاج کا مشورہ دے کر گئی تھی۔ اس مشورے کی صورت اپنے متعلق ہمارے خیالات جان کر حنا کو دکھ بھی ہوا تھا اور حیرت بھی۔ حالات و ماحول کی تلخیوں اور بد صورتیوں کو نظر انداز کرتے کرتے کب اس نے خود کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا خود اسے بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے تو مسکرائے ہوئے بھی شاید مہینوں ہی گزر گئے تھے۔ اماں کی ہر وقت کی روک ٹوک اور نصیحتوں نے اسے ایک خول میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اماں کی فکر مندی، پریشانی اور اندیشوں کی نوعیت کو چونکہ وہ بخوبی سمجھتی تھی اس لیے خود بھی اپنے اندر عدم تحفظ کا ایک بے مثل مگر مہلک خوف پالتی آئی تھی۔ وہ آٹا گوندھنے کے ساتھ ساتھ بے اختیار سوچنے لگی۔ آٹا گوندھنے کے بعد اس نے ہاتھ دھوئے اور چولہے کے پاس آن کھڑی ہوئی۔ ہمارے باتوں سمیت دیگر تمام سوچوں کو بھی اس نے ہمیشہ کی طرح سر جھٹکتے ہوئے نظر انداز کر دیا تھا۔

”باہر نکل او مچھل!“ اچانک باہر گلی سے ایک بھاری آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی کسی نے بری طرح مچھل کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

”کون کتے کا بچہ ہے؟“ اندر سے مچھل کی چنگھاڑ ابھرنی لگی۔

”باہر نکل.....“ کسی نے شدید غصے میں مچھل کو گالی دیتے ہوئے لکارا۔ حنا کا کیکڑا دھک سے رہ گیا۔

مچھل کے دروازے پر اس انداز میں آنے کی جرأت بھلا کون کر سکتا تھا..... یقیناً کوئی انجان آدمی تھا جو ٹھیک سے مچھل کو جانتا نہیں تھا یا پھر کچ میں کوئی غیرت مند اور بہادر جوان۔ بہر حال دونوں صورتوں میں اچھے خاصے بگاڑ کے امکان پیدا ہو گئے تھے۔

”بچے کو مار کر خود کو جوان اور بد معاش سمجھتا ہے تو..... باہر نکل..... آج تیری ساری بد معاشی تیری ناک کے رستے نہ نکال دی تو کہنا۔ کٹدی کھول دروازے کی۔“
باہر جو کوئی بھی تھا شدید غصے میں تھا۔ اسی لمحے حنا کو اپنے محسن میں کچھ سرگوشیاں سی محسوس ہوئیں تو وہ فوراً کچن سے باہر نکل آئی۔ خالہ عذرا اور اسد بیرونی دروازے کی طرف سے اندر آ رہے تھے۔ اسد کے ہاتھ میں دبی کی تھیلی تھی۔ یقیناً وہ دونوں ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے۔ اماں بھی جھاڑو ہاتھ میں پکڑے برآمدے کی طرف آ گئیں۔ کبھی کے چہروں پر ایک سنسنی کا تاثر تھا۔

”قسائیوں کے چھوکرے ہیں۔“ خالہ تیز اور سرسراتے ہوئے لہجے میں اماں سے سرگوشیاں انداز میں بات کر رہی تھیں۔
”میرے ساتھ ہی اس گلی میں داخل ہوئے ہیں۔ آج کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے مچھل نے ہونٹ پر ناشا کرتے ہوئے ان کے کسی لڑکے کو اتنی بری طرح مارا پیٹا کہ وہ بے چارہ اس وقت اسپتال کی ایمرجنسی میں پڑا ہے۔“
وہ سب برآمدے میں ہی کھڑے ہو گئے۔ اندر کمرے سے ہمارا بھی نکل آئی۔ مچھل کی طرف سے دوبارہ کوئی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔

”چار پانچ ہیں اور سبھی کے پاس چھریاں ہیں۔ بڑا فساد ہوگا، مجھے تو لگتا ہے کہ آج صبح میں مچھل کی آئی ہوئی ہے۔“
صورت حال کی سنگینی کے خیال ہی نے جیسے خالہ عذرا کو ایک گھبراہٹ میں مبتلا کر رکھا تھا۔

”خدا کرے عذرا۔“ اماں نے فوراً ہی جھاڑو پھینک کر دعا کے سے انداز میں اپنا دوپٹا پھیلا دیا۔

”خدا کرے کہ یہ مردود مارا جائے۔ یقیناً ایسے خبیث اور شیطان کوئل کرنے والا کسی کا کام کرے گا۔“
”کیاں چھپ کے بیٹھ گیا ہے اب کچر کی اولاد۔ باہر نکل بیچوے کہیں کے۔“ گلی سے ایک بار پھر یہ آواز بلند مچھل کو لکارا گیا تھا۔ یقیناً یہ لکارا درگزر کے کئی گھروں میں گونجی ہوگی۔

”بہنیں رک، کسی..... کی اولاد! آ رہا ہوں میں۔“
جواباً مچھل اندر کہیں کمرے میں سے دباڑا تھا۔ شاید وہ بھی اپنے لیے کوئی ہتھیار اٹھا رہا تھا۔
”ہائے ہائے! میرا تو دل گھبرانے لگا ہے۔ اسد پترا! پانی پلا مجھے!“ خالہ عذرا برآمدے میں کچھی دری پر بیٹھ گئیں۔
”میں لاتی ہوں۔“ ہمارے لپک کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”کڑووں..... کڑووں“ مچھل کے مرغ نے جیسے اعلان جنگ کیا تھا۔

”علی..... حیدر.....“ جواباً مچھل کا فلک شکاف نعرہ بیرونی دروازے کی طرف بھاگتا ہوا محسوس ہوا۔

پھر مچھل کی پاٹ دار لکار بلند ہوئی۔

”اوئے بچو اب..... (موٹی اور غلیظ گالی)“ وہ باہر گلی میں نکل گیا تھا۔

”پکڑو.....“

”تیری ماں.....“

وہ سب آپس میں بھڑگئے تھے۔ گالیاں، دھمکیاں، دھاڑیں۔ یکا یک ہی گلی میں ایک شور قیامت برپا ہو گیا۔

وہ چار تھے۔ مچھل اکیلا تھا۔ اس کے باوجود اس کی گرجدار آواز سے ایک ذرا اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ کا شکار ہے۔ بلکہ الٹا اس کی بلند آہنگ لکاروں سے ایک جوش اور ولولہ چھلکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ہمانے پانی کا گلاس لا کر خالہ عذرا کو تھمایا تو انہوں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ وہ تو گھبرائی ہوئی تھیں ہی۔ باقی سب بھی اپنی اپنی جگہ جیسے سن سے بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کی دھڑکنیں اوپر بیچے تھیں۔

گلی میں ایسا ہنگامہ برپا تھا جیسے قیامت نازل ہو چکی ہو۔ یوں لگتا تھا کہ ایک ساتھ کئی بھینسے پاگل ہو کر آپس میں لڑ پڑے ہیں۔

فضا میں ایک عجیب وحشت اور ہولناکی اتر آئی تھی۔ یہ سب تو اکثر ہوتا رہتا تھا، سبھی جانتے تھے آئے دن مچھل نے کسی نہ کسی سے سینگ پھنسا رکھے ہوتے تھے پھر آج اگر یہ سب ہو رہا تھا تو یہ کسی کے لیے کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔

ہاں البتہ ہنگامے کی شدت اور صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ارد گرد کے سبھی گھرانوں کو ہو گیا تھا اور سبھی نے یہی بہتر خیال کیا تھا کہ باہر لکھنا تو دور کی بات، جھانکنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ لہذا سب اپنے اپنے گھروں میں دیکر رہے اور گلی میں مچھل اور قسائیوں کے درمیان گھسان کارن پڑا رہا۔

تقریباً پندرہ منٹ تک یہ خونی معرکہ جاری رہا پھر شاید مچھل کے ایک دو دوست پہنچ گئے۔ آوازیں پھر سے تیز ہو گئیں۔ رکتے اور جھگڑا ختم کر دیے جانے کا کہا جانے لگا۔

ساتھ ہی دھمکیوں اور گالیوں کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ آنے والے افراد ان کے پیچ پڑ گئے۔ کچھ دیر تک شور شرابا، توںکار ہوتی رہی پھر جیسے معاملہ بن گیا۔ پہلے آوازیں تھوڑا دور ہوئیں

پھر شاید دونوں فریقین ہی اسپتال کی طرف منہ کر گئے۔

”لگتا ہے سبھی چلے گئے ہیں.....“ خالہ باہر کی طرف کان لگاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑیں۔

جبکہ وہ تینوں بہن بھائی اپنی اپنی جگہ گم سم سے بیٹھے رہے۔ اماں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ گلی میں ساہو پھیلا ہوا تھا۔ بس ایک دو دروازوں میں سے انہی کی طرف جھانک کر گلی کا جائزہ لیا جا رہا تھا۔

”ارے خدیجہ! یہ..... یہ گلی کا فرش تو دیکھ!“ خالہ کی لرزیدہ آواز پر اماں نے دھیان دیا تو ان کا کلیجہ کانپ اٹھا۔

گلی کے فرش ہر جا بجا موجود خون کے بڑے بڑے دھبے وہاں ہونے والے خونی معرکے کی شدت کا واضح پتہ دیتے تھے۔

”توبہ..... توبہ میرے مولا! توبہ!“ خالہ عذرا اس وحشت انگیز منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئیں۔

اماں نے بھی دوبارہ کٹڑی چڑھائی اور برآمدے کی طرف پلٹ آئیں۔

”میرے مولا! تو معاف کر۔ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھ اور ایسے ظالم لوگوں کو مات دے دے یا پھر دنیا ہی سے اٹھالے۔ ہائے میری توبہ۔ کم بختوں نے کس بے دردی سے ایک دوسرے کا خون بہایا ہے، میرا تو دل ڈوبنے لگا ہے۔ مجھے پانی پلاؤ۔“

خالہ عذرا نے دری پر آ کر بیٹھتے ہوئے کہا تو ہما ایک بار پھر گلاس اٹھا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”خون دیکھ کر تو لگتا ہے کہ ان میں سے ایک دو تو جان سے گئے۔“ اماں نے جیسے خود کلامی کی تھی۔

”ہاں، ایسا ہی ہے اور مچھل کو اس کے پار اٹھا کر لے تو گئے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اسپتال تک اگر زندہ سلامت پہنچ بھی گیا تو بھی بچے گا نہیں۔“

خالہ نے اماں کی تائید کرتے ہوئے اپنا اندازہ اور تجربہ بھی بیان کر دیا تھا۔

”ایسے لوگوں کا انجام بھی تو پھر ایسا ہی ہوا کرتا ہے!“ اس ایک مچھل کے کتنے لوگوں کے ساتھ جھگڑے پھڑے ہیں۔ بھائی نواز اور آمنہ کو خدا بخشے۔ وہ دونوں جتنے اچھے اور ہمدرد طبیعت کے مالک تھے۔ ان کا یہ ناہنجار بیٹا اتنا ہی کمینہ اور بد خصلت ثابت ہوا ہے، اسے کہتے ہیں ”ایک ہی انداز، وہ بھی گندا“ پتا نہیں ان نیک روحوں کے گھر یہ شیطان کیسے پیدا ہو گیا۔“ اماں کی آنکھوں کے سامنے مچھل کے اماں، ابا کے روشن اور نرم خو چہرے آشہورے۔ مچھل کے

والدین کا سوچ کر واقعی وہ ہمیشہ حیرت سے یہ بات سوچا کرتی تھیں کہ ٹھیک ہے، ماحول اور دوست اچھے نہیں ملے لیکن دودھ اور خون کی بھی تو اپنی ایک تاثیر ہوتی ہے۔ وہ مچھل میں بھی کہیں محسوس کیوں نہیں ہوئی..... اخلاق، تہذیب یا شرافت نام کی کوئی چیز تو جیسے اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔

”اچھا خدیجہ! میں اب چلتی ہوں، پھر کسی وقت آؤں گی۔“ خالہ عذرا اچانک اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم نے اپنی توسل نہیں، خیر سے آنا ہوا تھا؟“

”لو اب اس قیامت کے بعد کیا سناؤں۔ میرا تو دماغ ہی سن ہو کر رہ گیا ہے یاد ہی نہیں کہ کس کام سے آئی تھی۔ بہر حال یاد آئے گا تو پھر آ جاؤں گی۔ ابھی تو جا کر لیتی ہوں۔

ہائے اللہ! میرا تو بلڈ پریشر بھی لو (LOW) ہوا جا رہا ہے۔“ خالہ نے اپنے ماتھے پر ہتھیلی جماتے ہوئے فکر مندی سے کہا اور پھر اماں سے رخصت لیتے ہوئے واپس لوٹ گئیں۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر اماں معمول کے مطابق اپنی سلامتی مشین کے پاس آ بیٹھیں۔ ہما کی ذمہ داری برتن دھونے کی ہوتی تھی۔ سو وہ برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی۔

جتنا ایک ڈائجسٹ لے کر اماں کے قریب ہی چار پانی پر نیم دراز ہو گئی۔ اسد نے باہر جانا چاہا تو اماں نے سختی سے اسے منع کر دیا اور وہ منہ پھلا کر دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔

چاروں الگ الگ مصروف ہو گئے اس کے باوجود چاروں ہی کے ذہن میں کچھ دیر پہلے والا خونی واقعہ کلبلا تا رہا۔ اماں چپ چاپ بیٹھی کپڑے سیتی رہیں اور لاشعوری طور پر مچھل کی موت کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔ اس دوران جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کی غرض سے چند پولیس والے بھی آئے۔ وقوعے کے متعلق پوچھ گچھ کے سلسلے میں سب سے پہلے انہوں نے اماں لوگوں کا دروازہ ہی کھٹکھٹایا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے سے اماں نے ہی ان سے بات چیت کی۔

”ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہوتا اور ہم لوگوں نے صرف جھگڑے کی آوازیں ہی سنی ہیں۔ کون کون تھا؟ جھگڑا کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ ہمیں تو کچھ پتا نہیں جی!“ انہوں نے پوچھ کر ہی جھجک کے صاف اور دو ٹوک انداز میں کہا تو پولیس والے ان کے دروازے سے ہٹ کر خورشید کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔

اماں کو بے چینی تھی کہ جلد از جلد آج کے اس فساد کا نتیجہ معلوم ہو جائے۔ مچھل منحوس مرا یا بچ گیا۔ یہ پتا چل جائے لیکن اس روز تو جیسے محلے میں کوئی تھا ہی نہیں، آس

پڑوس سے نہ تو کوئی ان کے گھر آیا اور نہ ہی ان میں سے کوئی باہر نکلا۔ البتہ دوسرے روز ذاتی منظور اس اپنے پوتے کا سوٹ اماں کو سینے کے لیے دے کر گئی تو جاتے جاتے ذکر کر گئی کہ!

”میرا چھوٹا پتر یعقوب وہیں اسپتال میں ہوتا ہے۔ سائیکل اسٹینڈ کا ٹھیکا ہے نا اس کے پاس۔ وہ بتا رہا تھا کہ قسائیوں کے دو بندے بھی اچھے خاصے زخمی ہیں لیکن مچھل کی حالت زیادہ ہی پتلی ہے۔ کل سے اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ یعقوب کہہ رہا تھا کہ اس کی ڈاکٹروں سے بھی ہلکی چھلکی بات چیت ہوئی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی معجزہ ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ ہمیں تو امید نہیں ہے کہ مچھل زندہ بچے گا۔“

اماں کے دل میں ایک عجیب سا اطمینان مسکرایا۔ پتا نہیں کیوں مگر انہیں لگا کہ اب مچھل کبھی واپس نہیں آئے گا۔ آج نہیں تو کل وہ اسپتال کے بستر ہی ہر دم توڑ دے گا۔ اماں کو جیسے یقین ہونے لگا کہ خدا ان سب پر مہربان ہو گیا ہے۔ اسی نے مچھل کو اس کے اعمال کے نتیجے میں اس حال تک پہنچایا ہے اور اب لازماً وہ جلد ہی مچھل کو دنیا سے بھی اٹھالے گا۔

دو چار روز مزید گزرے اور مچھل کی ڈھنگ سے کوئی خیر خبر بھی نہ مل سکی تو اماں کا اطمینان کچھ اور گہرا ہو گیا۔ گویا گھٹ گھٹ کر جیتے رہنے کے دن گزر چکے تھے۔ اندیشے، دھڑک محن میں اٹھنے بیٹھنے اور ہنسنے بولنے لگے تھے۔

مچھل کے گھر میں ہر وقت ہلڑ بازی ہوا کرتی تھی اور اب ادھر سناٹا پھیلا رہتا تھا۔ بس ایک مچھل کا رستم تھا جو وقتاً فوقتاً اپنی بانگ بلند سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔

اماں بھی اسد کے ذریعے دیوار پر سے اس کے لیے دانہ دنگا پھنکوا دیا کرتیں۔ ایک دو بار وہ دیوار پھلانگ کر ان کے محن میں بھی اتر آکر ادھر ادھر چوچ اور پنچہ آزمائی کرنے کے بعد پھر واپس چلا گیا۔

اماں کا گہرا ہونا اطمینان تو پھر اس وقت گڑ بڑایا جب چھٹے روز ذاتی منظور اس کا آنا ہوا۔ اسی کے ذریعے اماں کو پتا چلا کہ بقول یعقوب کے دو روز پہلے مچھل اور زخمی قسائیوں کو پولیس والے لے گئے ہیں۔ بانی مضروب تو شروع ہی سے ہوش میں تھے مچھل کی حالت بھی سنبھل گئی تھی۔

”مچھل کی حالت سنبھل گئی تھی..... یعنی..... یعنی کہ

اس کے ساتھ مجزہ ہو کر اٹھا۔“
کچھ دیر کے لیے تو اماں بالکل ہی گم سم ہو کر رہ گئیں۔
انہیں جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
”اس مردود کو مزید زندگی دینے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔“ وہ گویا خدا کے حضور متعجب ہوئیں مگر انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔

”مچھل کی حالت سنبھل گئی تھی..... پولیس والے لے گئے۔“ پولیس والے تو اسے پہلے بھی کئی بار لے چکے تھے مگر وہ منحوس پھر آن موجود ہوتا تھا۔ یعنی اب پھر وہ کسی بھی وقت دوبارہ نازل ہو سکتا تھا۔

اماں کا دل جیسے ٹٹھی میں آ گیا۔ انہوں نے عجیب حسرت اور کرب سے حنا اور ہما کی طرف دیکھا۔ ان کی تمام پریشانیوں اور گھبراہٹوں کا صرف ایک حل تھا اور وہ یہ کہ حنا اور ہما دونوں کی شادی ہو جاتی۔ وہ عزت پردے کے ساتھ اپنے اپنے گھر کی ہو جاتیں تو پھر اماں مچھل کی مسابقتی کے باوجود گھر میں پورے اطمینان اور سکون سے رہتیں۔ پھر یقینی طور پر ان کے لیے ڈیریا اندیشے والی کوئی بات باقی نہ رہتی۔ مگر ان دونوں کی شادی ہی تو وہ پہاڑ تھا جسے اٹھا سکنے کی فی الحال اماں میں سکت نہیں تھی وہ چاہتی تھیں کہ دونوں بہنوں کی شادی ایک ساتھ ہو جائے۔ دونوں کا الگ الگ بھگتان کرنا تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ کب سے وہ ان کا جہیز تیار کر رہی تھیں پھر بھی بہت کچھ باقی تھا لیکن اب وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اس سے پہلے کہ خدا نخواستہ کسی بھی قسم کی کوئی انہونی جنم لے۔ جیسے تیسے بھی ہو جلد از جلد دونوں بیٹیوں کو بیاہ کر رخصت کر دوں۔ کم از کم آخری وقت سکون سے مرتو سکوں گی۔

یہی ایک سوچ آئندہ دنوں ان کے ذہن میں پلٹی رہی۔ ساتھ ہی انہیں مچھل کی واپسی کا بھی دھڑکا لگا رہتا کہ عذاب پلٹ کر اب آیا کہ اب آیا۔ اسی طرح قریباً بیس بائیس دن گزر گئے۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ پھر ایک دن اس معمول میں تبدیلی آئی۔ بہت زور کی آندھی تھی۔ گونج دیتی، شور کرتی ہوئی آندھی.....

اسد اور حنا نے بہ بھگت تمام صحن میں رسیوں پر جمو لٹے کپڑے سینے تھے۔ آدھے گھنٹے تک آندھی چلتی رہی اور وہ لوگ دھول مٹی سے بچنے کی غرض سے کھڑکیاں دروازے بند کیے کمرے میں بیٹھے رہے۔ اماں حسب معمول کپڑے سی رہی تھیں کہ بجلی بھی چلی گئی۔ پھر جب آندھی کا زور ٹوٹا اور آندھی کی جگہ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے رہ گئے تو اماں نے کمرے سے سلائی مشین اٹھا کر باہر برآمدے میں دری پر

لارکھی، وہ خود ابھی بیٹھی ہی تھیں کہ بیرونی دروازے پر نے دستک دی۔

”اسد! باہر دیکھو، ذرا کون ہے؟“
اماں نے اسد کو پکار کر کہا تو وہ کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف چلا گیا۔ باہر خالہ عذرا تھیں ان کے ہاتھ میں ایک شاپر بھی تھا۔ اسد نے دروازہ کھولا تو خالہ سیدھی اماں کے پاس چلی آئیں۔

”لے خدیجہ! یہ کپڑا دیکھ۔“ خالہ نے دری پر چڑھ کر ہوئے شاپر اماں کو تھا دیا۔

”تمہارے بھائی لائے تھے میرے لیے، مگر میں نے سوچا ہے کہ کلثوم کے لیے سلوا لوں، میں نے تو ابھی پہلے تین سوٹ سلوا لیے ہیں نا!“

”ہاں۔ کلثوم پر یہ رنگ سچے گا بھی خوب۔“ اماں نے کپڑا دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس پھر ناپ کا جوڑا بھی ساتھ ہی ہے۔ جیسے ہی وقت ملے سی دینا۔“

”خالہ چائے پیئیں گی آپ؟“ حنا نے کچن کی طرف جاتے ہوئے خالہ سے پوچھا۔

”اس میں پوچھنا کیا بیٹا، بنا لاؤ، میرے لیے بھی بنا لینا۔“ اماں نے جلدی سے کہا۔

”حنا! چینی تھوڑی کم ڈالنا پتر۔“ خالہ کی ہدایت سن کر حنا کچن میں داخل ہو گئی اور خالہ اماں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ہاں خدیجہ! اس کم بخت کی کچھ سناؤ۔“
”کس کی؟ کیا؟“ اماں کو ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی تھی۔

”ارے! اسی موئے مچھل کی۔ زندہ بھی ہے یا مر کھپ گیا کہیں۔ کوئی نئی خیر خبر ملی یا نہیں؟“

”ککڑووں..... ککڑووں۔“
”علی..... حیدر.....“

اس سے پہلے کہ اماں خالہ کو کوئی جواب دیتیں۔ دیواری کی اس طرف سے رستم اور مچھل دونوں کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں تو اماں اور خالہ دونوں ہی جیسے دل کر رہ گئیں۔ اسی وقت کچن میں سے کسی برتن کے گرنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ ہما اور اسد فوراً ایک کمرہ پر آ گئے۔ حنا بھی کچن کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”اماں..... یہ پھر آ گیا۔“ ہما کے لہجے میں سنسنی تھی۔
”تو پھر..... تم لوگوں کو کیا مسئلہ ہے؟ چلو اندر جا کے بیٹھو۔“ اماں کے خشک لہجے پر وہ دونوں واپس کمرے میں

چلے گئے اور حنا بھی دوبارہ سے کچن میں مصروف ہو گئی۔
”یہ تو کوئی پکا شیطان ہے خدیجہ! نام لیا نہیں کہ حاضر! میں تو سمجھ رہی تھی کہ اس کی اب کسی کو بھی کوئی خیر خبر نہیں ملے گی۔ لیکن یہ ڈھٹ تو صحیح سلامت آیا بیٹھا ہے۔“ خالہ نے جیسے لہجے میں اپنی حیرت و بے یقینی کا اظہار کیا۔

اماں یا گھر کے کسی اور فرد کو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ کس وقت واپس آیا ہے شاید کچھ دیر پہلے جب وہ آندھی کی وجہ سے کمرے میں بند ہوئے بیٹھے تھے۔ مچھل اسی وقت گھر آیا ہوگا۔ مگر نہ تو اس کے گھر کا دروازہ کھلنے کی آواز ہی پر انہیں اندازہ ہو جاتا کہ مردود پھر سے واپس لوٹ آیا ہے۔

”سپانے لوگ کہتے ہیں نا کہ برائی اتنی جلدی جان نہیں چھوڑتی پھر بھلا اس سے ہماری جان اتنی جلدی کیسے چھوٹ سکتی ہے۔“ اماں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر کوٹھکی کی تھی۔

”یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ خدا خود ہی ایسے لوگوں کی ری کو ڈھیل دیتا رہتا ہے ورنہ یہ بھی تو ایک عام سا انسان ہی ہے نا۔ کتنے جھگڑے فساد ہیں اس کے۔ اور یہ ابھی جو ہوئی تھی اس کے ساتھ موت کے منہ میں جا کر بھی واپس آ گیا ہے۔“

”اوائے رانے! میری جان! تو زندہ ہے ابھی!“ اسی وقت ایک کرخت سی مگر چمکتی ہوئی آواز جیسے مچھل کے صحن میں داخل ہوئی۔

”اوائے آج بھی مچھر پہلوان..... تجھے ادھر آنے کا خیال کیسے آ گیا ابھی؟“ مچھل کے لہجے میں گرجوٹی تھی۔

”لو پھر سے کچر خانہ آباد۔“ اماں نے خالہ کی طرف دیکھتے ہوئے تکی سے کہا۔ ”مہینا بھر یہ کتنا نہیں تھا تو سکون ہی سکون تھا۔ اب پھر سے ہر وقت جی جی جی لگی رہا کرے گی۔“

”خیال کیسے آ گیا کی کیا بات ہوئی یا رانے! میں تو یہاں قادی نہیں۔ دادا جی کی فوٹنگی پر رحیم یار خان گیا ہوا تھا۔ ان کے کفن دن سے لے کر چہلم تک وہیں رہا ہوں۔ آج ہی واپس پہنچا ہوں۔ گزار تائی سے تیرے اس پھڑے کا پتا چلا۔ اسی نے بتایا کہ کراس پرچے میں تم سب اندر ہو تو میں سیدھا تھا نے پہنچا مگر وہاں سے پتا چلا کہ تم لوگوں کے درمیان راضی نامہ ہو گیا ہے اور کچھ دیر پہلے ہی تمہیں چھوڑ دیا گیا ہے تو تھانے سے سیدھا یہاں چلا آیا ہوں۔ ابھی تو میں گھر بھی نہیں گیا اور تو اٹا طنز کر رہا ہے۔“ مچھر پہلوان کا لہجہ کٹھن تھا۔

”ہاں ہو گیا ہے راضی نامہ۔ وہ راضی نامہ بس تھانے

کی چار دیواری کے اندر تک تھا۔ تھانے سے باہر اب کوئی راضی نامہ نہیں ہے۔“ مچھل نے اس کے شکایتی لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے زہر خند سے کہا۔

”میرے دو چار زخم ابھی کچے ہیں۔ ذرا ٹھیک سے گوشت جم جائے۔ یہ پھالے قسانی کے چاروں بیٹے تو سمجھ کہ اب بس مہمان ہیں، کتوں کی موت ماروں گا چاروں..... کو۔“

”ویسے تو دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہا ہے۔ وہ گزار تائی تو یوں بات کر رہا تھا جیسے ان قسانیوں نے تجھے مار ہی ڈالا ہو۔“

”اوائے مر گئے رانا منصور نواز کو مارنے والے۔“ مچھل نے شدید حقارت سے کہا۔

”سوکتے مل کر بھی ایک کھلے شیر کا شکار نہیں کر سکتے۔ یہ تو پھر صرف چار تھے۔“

”انشا اللہ تو خود بھی کتے کی موت ہی مرے گا۔“ اماں نے زیر لب کہا، حنا چائے کے کپ انہیں پکڑا گئی تھی۔ انہوں نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”عقل کے دشمن آدمی! جب وہ چار بندے اکٹھے ہو کر آئے تھے تو تجھے یوں پاگلوں کی طرح ان سے اکیلے بھڑ جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ چھت سے ہو کر کچے سے کچے ہی نکل جاتا۔“

”تیرے ہونے پر ہی لعنت ہے اوائے! تو کیا مجھے..... سمجھتا ہے جو ایسی بات کہہ رہا ہے۔ جنگجو راجاؤں، مہاراجاؤں کا خون ہے ان رگوں میں۔ چار تو کیا چار سو بندے بھی بھی لڑنے آ گئے نا تو رانا منصور نواز کو پیچھے ہٹنا ہوا نہیں دیکھے گا تو، یاد رکھو میری بات۔“

”لے خدیجہ! یہ تو کسی مہاراجے کی اولاد ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اور ہم سب آج تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ بھائی نواز اور آمنہ کا بیٹا ہے۔“ خالہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جیسے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”دیکھ رانا! زندگی موت کا کوئی پتا نہیں ہوتا تو.....“
”اوائے! بس رہنے دے..... انسان۔“ مچھل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بیزارگی کا اظہار کیا۔ ”کیا تو مجھے سبق پڑھانے بیٹھ گیا ہے۔ زندگی موت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔“ مچھل نے جیسے اس کی نقل اتاری تھی۔ ”تجھے پتا نہیں ہوگا اپنی موت کا..... مجھے پتا ہے..... ایسے ہی موت آتی ہوتی تو رانا کب کا مر گیا ہوتا۔ میں کچھ کر کے مروں گا..... کوئی بڑا کارنامہ..... ایسے نہیں مرتا میں..... تو یہ فینشن چھوڑ

اور موہاں نکال کے ذرا بٹ یا خان کو کال کھڑکا۔ میرے پاس بیلنس نہیں ہے۔“

”کیا کہنا ہے نہیں؟“ مچھر پہلوان کی آواز ابھری تھی۔

”ان..... سے پوچھ کہ کہاں مر گئے ہیں۔“ تھانے سے میرے ساتھ ہی آئے تھے، رستے میں سے میں نے انہیں تاج کی طرف بھیج دیا تھا کہ دیسی یا انگریزی جوں جوں لے آؤ مگر وہ..... شاید وہیں بیٹھ کر پینے لگ گئے ہیں۔“

مچھل کی بات سن کر اماں کی فکر مندی اور پریشانی میں کچھ مزید اضافہ ہو گیا انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مچھل کے ہاں آج پھر شراب کی محفل جمعے گی۔ کئی ایک آوارہ اور بدکردار بندے وہاں جمع ہوں گے اور رات گئے تک ایک ہنگامہ، ایک شور بدتمیزی جاری رہے گا۔

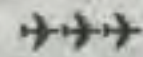
”چھوڑ خدیجہ! لعنت ڈال ان کمینوں پر۔ تو بتا سوٹ کب تک سل جائے گا؟“ خالہ عذرا کی آواز نے اماں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”پرسوں شام کو پتا کر لینا۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ خالہ عذرا نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کپ نیچے رکھا اور مٹھی میں دبی ہوئی پیسوں کی بتی سی اماں کے ہاتھ میں تھما دی ”یہ جو دو سو روپیہ رہ گیا تھا، اب پچھلا سارا حساب صاف۔ اس سوٹ کی سلائی میں پرسوں آتے ہوئے لیتی آؤں گی۔“ خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں ”اب میں چلتی ہوں۔ پرسوں ہی آؤں گی۔“ اس کے بعد خالہ عذرا چلی گئیں۔ اسد، ہما، حتاتینوں اندر کمرے میں تھے۔ مچھل کی مخصوص پاٹ دار آواز اماں کے کانوں میں ٹھوکریں مار رہی تھی۔

وہ فون پر بٹ اور خان کو انتہائی غلیظ گالیاں دینے میں مصروف تھا۔ اماں نے چائے کا گھونٹ بھرا اور کپ ایک طرف رکھتے ہوئے انتہائی دکھ اور حسرت سے سوچا۔

”شاید ہماری زندگی میں سکھ اور سکون کبھی نہیں آئے گا۔“



گھر کی فضا پھر سے اپنے پرانے رنگ میں ڈھل گئی۔

اماں نے بھاری سنجیدگی اوڑھ لی۔ حنا دوبارہ اپنے خول میں دبک گئی اور اسد، ہما اکتائے اکتائے، بیزار، بیزار سے رہنے لگے۔

مچھل کے بہ دستور وہی لچھن، وہی کرتوت تھے۔ چرس، شراب، جوئے کی محفلیں، گالم گلوچ، شور شرابا۔ اماں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ مصیبت یہ اذیت ہمیشہ اسی طرح ہمارے سر پر مسلط رہے گی۔ ہمیں بھی اس عذاب سے چھٹکارا

نصیب نہیں ہوگا۔ ہم ہمیشہ یونہی اندیشوں کی ہیبت سے سہم کر جیتے رہیں گے۔ اس سوچ نے ان کے اعصاب مسلسل اس قدر شدید رہاؤ کا شکار کیے رکھا کہ وہ چند ہی میں بیمار ہو کر بستر پر پڑ گئیں۔

اماں کے یوں صاحب فراش ہو جانے پر گھر کی زندہ فضا میں ایک آرزوگی اور اداسی بھی آ گئی۔ اسی باور ان سب نے رات کو جلدی سونا شروع کر دیا تھا۔

اس روز موسم بھی ابراؤد تھا اور شام کے وقت ہلکی بوند باندی بھی ہوئی تھی۔ عشا کی اذان کے بعد اسد اور ہما اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے تھے البتہ حنا اپنے بستر پر کچھ کل کے لیے لیسن پلان تیار کر رہی تھی۔ اس بات کا اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ اماں کتنی دیر سے کروٹ لے بل لیٹی خالی خالی نظروں سے اسی کو دیکھے جا رہی ہیں۔

اسے تو اس بات کا تیب پتا چلا جب وہ کتاب کر کے رکھتے ہوئے لیٹنے لگی تھی۔ اس نے بس سرسری انداز میں اماں کی طرف دیکھا اور پھر انہیں اپنی ہی جاں دیکھتے پا کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”اماں! کیسی طبیعت ہے اب؟“ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

”بہتر ہے.....“

حنانے ان کا ماتھا چھو کر دیکھا اور ان کے قریب چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ کھانا ہے تو لاؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“

”سوپ پڑا ہے۔ اگر نہیں تو وہ لادیتی ہوں۔“

”نہیں حنا! بالکل بھی کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔“

لگتا ہے جیسے ایک لقمہ بھی کھایا تو قے آجائے گی۔ اماں نے بددلی سے کہا۔

”ایسے تو پھر دوائی بھی ٹھیک سے اثر نہیں کرے گی۔ کچھ تو کھالیں۔“ فکر مندی حنا کا انداز تھی۔

”تم سوپ تھر ماس میں ڈال کر یہاں لا رکھو۔ پھر خود ہی رات کو کسی وقت لے لوں گی۔“

اماں شاید بحث سے بچنا چاہتی تھیں۔

حنانے ”ٹھیک ہے“ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔ سوپ

کر کے تھر ماس میں ڈالنے کے بعد اس نے تھر ماس اور اماں کی چار پائی کے ساتھ تپائی پر لا رکھا۔

”یہ لیں۔ یاد سے لے لیجیے گا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ بس اب تم بھی آرام کرو، سو جاؤ۔“

صبح اسکول بھی تو جانا ہے نا!"

"میں بس لیٹنے ہی لگی تھی۔" حنا اپنی چارپائی پر آ بیٹھی۔

وہ تو پھر کچھ ہی دیر میں سو بھی گئی۔ البتہ اماں بہت دیر تک جاگتی رہی تھیں، سوچیں اور اندیشے ان کے اندر خوف تخلیق کرتے رہتے تھے۔ وہ سوچتی رہیں اور ان کے کان مچھل کے گھر کی طرف لگے رہتے۔

"ابھی چار، چھ بج رہے ہیں..... ابھی دو تین کتے بھونک رہے ہیں۔ ایک تو ابھی بھی بیٹھا ہے....." پھر جب انہیں یقین ہو جاتا کہ اب گھر میں مچھل اکیلا رہ گیا ہے اور وہ بھی نشتے میں دھست ہونے کی وجہ سے لیٹنے ہی سویر جائے گا۔ تو پھر جیسے ان کی پلکوں پر بھی خود بخود غنودگی اترنے لگی تھی۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ مچھل کی طرف جب مکمل طور پر خاموشی چھا گئی تو ان کی آنکھوں میں بھی نیند ٹھکنے لگی اور پھر وہ کچھ ہی دیر میں سو بھی گئیں۔

انہیں سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک کھٹی کھٹی دہشت زدہ چیخ نے سوتے میں ہی ان کو لرزادیا۔ چیخ واضح طور پر ہماہی کی تھی۔ وہ بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھیں مگر ان کی چارپائی کے برابر کھڑے ایک اونچے لمبے دیو نے برق رفتاری سے جھپٹتے ہوئے اپنے چوڑے اور مضبوط ہاتھ سے ان کا گلا دبوچ لیا۔ انہوں نے تڑپ کر آزاد ہونے کی کوشش کی مگر گرفت بہت مضبوط تھی۔

یہ بھی فوراً ہی سمجھ آ گئی کہ انہیں دبوچنے والا شخص اکیلا نہیں ہے۔ کمرے میں اس کے اور ساتھی بھی موجود ہیں جنہوں نے غالباً ہما اور حنا کو بھی اماں ہی کی طرح دبوچ رکھا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کی کھٹی کھٹی آوازیں اماں کے کانوں میں پھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔

ان دونوں کو دبوچنے والے درندوں کی دہی دہی غراہٹیں بھی ان کے کانوں سے ٹکر رہی تھیں۔

"آواز نہیں۔"

"شور مت کرنا نہیں تو کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔" جس شخص نے اماں کا گلا دبایا ہوا تھا اس نے اپنا چہرہ ایک سیاہ کپڑے میں چھپا رکھا تھا جس میں سے صرف اس کی سرخ سرخ آنکھیں ہی اماں کو اپنی جانب گھورتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ اس خیال سے ہی اماں کی تو جیسے روح فنا ہو گئی کہ آخر ان کے بدترین اندیشے سچ ثابت ہوئے تھے۔ قیامت کی وہ گھڑی آنکھوں پر ہے جسے دیکھنے سے پہلے ہی وہ اپنے مرجانے کی دعائیں کرتی آئی تھیں۔

"ہوش کر مائی۔" جھانکتی ہوئی انگارہ آنکھیں چارپائی پر غرائی تھیں، ساتھ ہی اس شخص نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال اماں کی پیشانی پر رکھ دی۔

"اپنی اور اپنے بچوں کی سلامتی چاہتی ہے تو ہوش پکڑو جو کہا جائے وہ کر۔" غضب ناک آنکھیں کچھ اور جھک آئیں۔

اماں کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ ان کی کپٹیوں میں سنسنہا ہونے لگی تھی، غراہٹ کے جواب میں انہوں نے بولنا چاہا بس خرخر کر رہ گئیں۔

"آواز نہیں۔ شور نہیں مچانا ورنہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچے بھی قتل کروا بیٹھو گی۔" سرد اور سفاک غراہٹ نے انہیں دھمکایا تھا۔ اماں نے جلدی جلدی اشارات میں ہلایا۔ تو ان کے گلے کی گرفت قدرے نرم پڑ گئی۔ سانس ایک ذرا بحال ہوئی تو وجود میں جیسے زندگی کی ایک لہری اڑ آئی۔ سن ہوتے ہوئے حواس فوراً ہی بحال ہو گئے۔

"شور مچانے کی بے وقوفی مت کرنا۔"

ایک بار پھر تنبیہ کی گئی اور ساتھ ہی اس بھیڑیے نے اماں کا گلا چھوڑ دیا۔

اماں فوراً سر ہانے کی طرف سرکتے ہوئے تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔ بھی انہوں نے دیکھا کہ دو افراد نے حنا اور ہما کو بھی اسی انداز میں دبوچ رکھا تھا جیسے کہ خود انہیں قابو کیا گیا تھا اور وہ دونوں ان کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کے لیے بری طرح مچھل رہی تھیں جبکہ اسدا اپنی چارپائی پر بری طرح سہا بیٹھا تھا۔ وہ رو بھی رہا تھا مگر اس قدر دہشت زدہ تھا کہ اس کے حلق سے صرف سسکنے کی آوازیں ہی خارج ہو رہی تھیں۔ تینوں افراد نے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے اور تینوں ہی کے پاس پستول موجود تھے۔

"خ..... خدا کے لیے..... خدا کے لیے میری بچیوں کو کچھ مت کہو۔ چھوڑ دو انہیں تم..... تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے انہیں چھوڑ دو۔"

اماں ہاتھ جوڑتے ہوئے بری طرح گڑگڑا رہی تھیں۔ "چھوڑ دو دیں مگر..... ہم نہیں چاہتے کہ یہ شور مچائیں اور ہمارے ہاتھوں ماری جائیں۔" جس شخص نے حنا کو دبوچ رکھا تھا اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"نن..... نہیں شور مچائیں گی..... کک..... کوئی شہ نہیں مچائے گا، تم چھوڑ دو انہیں۔ حنا، ہما! تم شور نہیں مچانا۔ لوگوں کو قرآن کا واسطہ ہے۔ میری بچیوں کو کچھ مت کہو۔ چھوڑ دو انہیں۔"

اماں نے روتے ہوئے کہا، وہ بری طرح حنا

بات اور دہشت زدہ دکھائی دے رہی تھیں۔

"آواز نہیں رکھ۔" اماں کے قریب کھڑا شخص غرایا تھا۔

"جیل تیرے کہنے پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن اگر انہوں نے شور مچانے کی کوشش کی تو ہم گولی مار کر چپ کرائیں گے۔" ان دونوں سے ایک نے جیسے دھمکی دی اور پھر انہوں نے ہما اور حنا کو چھوڑ دیا۔

آزاد ہوتے ہی دونوں بہنیں تڑپ کر ان سے دور نہیں اور روتے ہوئے اماں کی طرف پسکی تھیں۔

"آواز نہیں۔"

"چپ..... چپ کر جاؤ۔" ان میں سے تیسرے بھیڑیے کی غراہٹ پر اماں نے فوراً انہیں رونے سے منع کرتے ہوئے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ دونوں بہنیں یوں اماں کے بازوؤں میں آکر دبک گئیں جیسے دنیا کی کسی محفوظ ترین پناہ گاہ میں پہنچ گئی ہوں۔ دونوں کے وجود خزاں رسیدہ چہروں کی طرح لرز رہے تھے۔ ننھے ننھے دل سینوں میں یوں سم کر رہ گئے تھے جیسے عقاب کو سر پر دیکھ کر چڑیا بہم جاتی ہے۔

"دیکھو، ہم ڈاکو ہیں۔ گھر میں جتنا کیش اور زیور ہے وہ شرافت اور سکون سے ہمارے حوالے کر دو تو ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چپ چاپ....."

ان میں سے ایک شخص ابھی بات ہی کر رہا تھا کہ اماں بے اختیار بول پڑیں۔ "لے جاؤ!..... ادھر..... نیچے والے ٹرنک میں ہے زیور بھی اور پیسے بھی اور بھی جو لے جانا چاہتے ہو لے جاؤ۔ بس ہمیں بخش دو۔ ہمیں کچھ مت کہو۔" اماں نے ایک طرف اوپر نیچے رکھے ہوئے لوہے کے تین ٹرنگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

اماں کی بات سن کر ان تینوں نے پہلے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان میں سے دو ٹرنگوں کی طرف بڑھ گئے، جبکہ ایک وہیں کھڑا رہا۔ اب تک تو بدحواسی میں اماں یہی خیال کر رہی تھیں کہ مچھل اور اس کے بدمعاش دوست دیوار پھاند کر ان کو بے آبرو اور رسوا کرنے کی نیت سے آن پہنچے ہیں، آج تک ان کے دل کو دھڑکا بھی اسی بات کا لگا رہا تھا۔ مگر اب اچانک جیسے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ یہ لوگ مچھل کے دوست وغیرہ نہیں ہیں۔

پھر پہلوان، بٹ، خان، خالد نیازی اڈے والا، مگو اور استاد پو کے علاوہ بھی مچھل کے جتنے یار دوست وہاں آئے جاتے تھے۔ ان سب کی آوازیں اور لب و لہجہ اماں کو اچھی طرح ذہن نشین تھے۔ جبکہ ان تینوں افراد کی

آوازیں ان کے لیے قطعی اجنبی اور سماعت نا آشنا تھیں۔

یقینی طور پر وہ تینوں ڈاکو ہی تھے۔

مال، جان اور عزت سے زیادہ اہم تو ہوتا نہیں۔ اسی لیے اماں نے انہیں اپنی برسوں کی جوڑی ہوئی جمع پونجی کی خبر دینے میں کسی حیل و حجت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"یہ کیا..... بس اتنا ہی!"

صندوقوں کے پاس سے پلٹتے ہوئے ایک ڈاکو کی قدر مایوسی سے بولا۔ اس کے ہاتھ میں اماں کی اب تک کی ساری جمع پونجی دبی ہوئی تھی۔ انہوں نے صندوق کا سارا سامان نکٹ کر مارا تھا اور ان میں سے ایک ساتھی اب دوسرے صندوقوں کی طرف متوجہ تھا۔

"میں بیوہ عورت ہوں، کمانے والا کوئی آدمی ہے نہیں۔ بس یہی تین تونے زبور اور چالیس ہزار کی رقم ہے گھر میں۔ یہ جمع کرنے میں بھی مجھے کئی سال لگے ہیں، تم لوگ لے جاؤ..... کوئی اور چیز لے جانا چاہتے ہو تو وہ بھی لے جاؤ ہمیں..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اماں جیسے گھٹکیاں تھیں۔

ان کے قریب آکر اس ڈاکو نے ہاتھ میں پکڑا ہوا زیور اور رقم پہلے سے وہاں کھڑے اپنے ساتھی کو تھما دی اور خود انتہائی سرد لہجے میں اماں سے مخاطب ہوا۔

"یہ مال کم ہے اور بتا کہاں کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"اور کچھ نہیں ہے، یہ..... یہی کچھ ہے۔ بس دو چار سو روپیہ اس جگہ میں پڑا ہوگا۔" اماں نے سامنے الماری میں دھرے ایک اسٹیل کے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھ مائی! سیدھی طرح سچ بتا دے کہ اور مال کہاں رکھا ہے ورنہ تم مشکل میں آ جاؤ گے۔" وہ اماں کو گھورتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"مم..... میں نے بالکل سچ کہا ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ گھر میں بس یہی زیور اور یہی رقم ہے، بس اور نہیں ہے۔"

وہ شخص پستول ہاتھ میں لیے کھڑا کچھ دیر اماں کو ایک ٹک گھورے گیا جیسے ان کے چہرے اور آنکھوں سے ان کے سچ جھوٹ کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اماں کو اس کی آنکھوں سے خوف آ رہا تھا۔

چند لمحے اماں کی آنکھوں میں جھانکتے رہنے کے بعد اس کی نظریں پہلے حنا کی طرف پھسلیں۔ پھر کچھ دیر کے لیے ہمار ٹک گئیں۔ پھر وہ اپنے قریب کھڑے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"جیب والی دولت کم ہے تو تھوڑی سی حسن کی دولت

لوٹ لیتے ہیں۔ اس کی تو یہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ چل اس چھوٹی والی کو دوسرے کمرے میں لے چل!“ اس نے ہما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اماں کی روح لرز کر رہ گئی، انہوں نے ہما اور حنا دونوں کو اپنی پوری قوت سے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”تمہیں تمہاری ماؤں بہنوں کا واسطہ۔ ہمیں کچھ مت کہو میں نے خدا کی قسم سچ کہا ہے، گھر میں اور زیور یا پیسا نہیں ہے..... جو تھا اس کا خود تمہیں بتا دیا ہے، یہ..... یہ لے جاؤ۔“ اماں نے بری طرح گڑ گڑانا شروع کر دیا۔

”دیکھو! زیادہ جیس پاں کی تو عزت کے ساتھ ساتھ جان بھی جائے گی۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ چپ چاپ تعاون کرو۔“ ان میں سے ایک نے آگے بڑھتے ہوئے اماں کو جیسے پچکارا اور ہما کو بازو سے پکڑ لیا۔

ہما کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

”اوئے! چپ..... خبردار جو آواز نکالی تو۔“ اس شخص نے دانت کچکچاتے ہوئے ہما کے بال مٹھی میں دبوچے تو وہ مارے درد کے ایک بار پھر چیخ اٹھی۔ دوسرے ڈاکو نے فوراً آگے بڑھ کر ہما کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہما، حنا اور اماں تینوں ایک دوسرے سے لپٹی دبی دبی آواز میں روئے جا رہی تھیں اور ان لوگوں کے منت ترے کرتے ہوئے ان کو طرح طرح کے واسطے بھی دے رہی تھیں۔ اسد بھی ہنوز اپنی جگہ خوفزدہ سا بیٹھا پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ عالم نیند میں ہی ان سب پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی، ان کے حواس ٹھیک طرح بیدار ہونے سے پہلے ہی بری طرح خوف و گھبراہٹ کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔

”کیا کاں کاں لگوا رکھی ہے یار! تو ایک ایک گولی ان کے پیچھے میں اتار دو اور قصہ پاک کرو۔“ ان کے تیسرے ساتھی نے ایک صندوق کی تلاشی لیتے ہوئے ان کی طرف گردن موڑ کر بیزاری سے کہا۔

”چل بھی! ان دونوں کو ٹھنڈا کر دے۔ اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔“ جس نے ہما کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اماں اور حنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا اور ہما کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

”چل ری! تو جینا چاہتی ہے تو میرے ساتھ، اٹھ۔“ اس نے جھٹکا دے کر ہما کو اماں کی بغل سے باہر کھینچ لیا۔ دونوں بہنوں سمیت اماں کا چہرہ بھی بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ ہما کے وجود میں تو جیسے جان ہی نہیں تھی۔ اس کا سارا بدن کسی لاش کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

”خدا کے لیے ایسا ظلم مت کرو۔“ اماں جی جان سے تڑپ اٹھی تھیں۔ ”تمہیں خدا کا واسطہ ہے بے شک ہم سب کو گولی مار دو مگر ایسا مت کرو..... مت کرو۔“ اماں چار پائی سے کھسک کر ان ڈاکوؤں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کی حالت اتنی ابتر اور دگرگوں تھی کہ انہیں کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا کہ ہما کو اس درندگی سے بچانے کے لیے کیا کریں اور کیا نہ کریں؟

غالباً رات کا آخری پہر تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں بے فکر پڑے گہری نیند سو رہے تھے۔ باہر مکمل ہو کا عالم تھا۔ اس لیے انہیں کسی قسم کی بیرونی مدد کی بھی کوئی توقع نہیں تھی۔

”ککڑوں..... کڑوؤں۔“ رستم نے جیسے اپنے بیدار ہونے کا اعلان کیا تھا۔

”علی..... حیدر.....“ اگلے ہی لمحے کمرے میں مجمل کی مخصوص بھاری اور پاٹ وار آواز گونجی اور کبھی کے کبھی بری طرح چونک پڑے۔ تینوں ڈاکو تو یوں اچھلے تھے جیسے ان کے قدموں میں کوئی بم پھٹ پڑا ہو۔

کبھی نے ایک ساتھ دروازے کی طرف دیکھا جہاں مجمل کھڑا اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے ان سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے میلی سی شلوار پر ڈھیلی ڈھالی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ دائیں ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی اور اپنا بایاں ہاتھ اس نے دروازے کی چوکت پر یوں ٹکا رکھا تھا جیسے سہارا لیے کھڑا ہو۔ یقیناً وہ کچھ دیر پہلے ہما کے چیخنے کی آواز سن کر متوجہ ہوا ہوگا اور پھر رات کے اس پہر وہی گھٹی آوازوں اور اماں لوگوں کی سسکیوں سے صورت حال کے متعلق مشکوک ہونے کے بعد دیوار پھلانگ کر ادھر چلا آیا تھا۔

”یہ تو بالکل غلط بات ہے بھئی!“ مجمل نے ناک سکیڑتے ہوئے جیسے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ”اپنی روزی روٹی کو بھول کر تم لوگ منہ کالا کرنے کے چکر میں پڑ گئے ہو۔ کوئی خاندانی ڈاکو تو ایسی کمینہ حرکت نہیں کر سکتا۔“

”خدا کے لیے ہم پر رحم کرو۔ ہمیں بخش دو۔“ اماں پھر سے گڑ گڑائیں مگر اس بار وہ کسی سے مخاطب نہیں تھیں۔ تینوں ڈاکو جو مجمل کے بلند آہنگ نعرے سے گڑ بڑا گئے تھے وہ بھی سنبھل گئے۔

”اوئے! چل یہاں منہ کے بل لیٹ.....“ اماں کے قریب کھڑا ایک ڈاکو مجمل کو گالی دیتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجمل پر اپنا مخصوص حربہ استعمال کرنے کی نیت رکھتا تھا کہ دو چار لٹی سیدھی ٹکا کر آنے والے کو بوکھلا ہٹ

اور گھبراہٹ میں جھٹلا کر کے قابو کر لیا جائے۔ مگر مجمل نے جیسے فوراً ہی اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ وہ خود ہی ایک قدم کمرے کے اندر آ گیا۔

”اوئے کھوتے کے پتر! کوئی عقل کو ہاتھ مار۔“ مجمل نے بوتل والا ہاتھ اس کی طرف اٹھاتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا تو وہ دوسرے قدم پر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

”اپنی ماں کے یار کو دوبارہ گالی بکی تو نہیں لٹا ماروں گا..... (نا قابل اشاعت)“

اماں لوگ اور وہ دونوں ڈاکو مجمل کے سامنے قدرے دائیں ہاتھ پارچہ قدم کے فاصلے پر تھے جبکہ تیسرا ڈاکو مجمل کے بائیں ہاتھ تقریباً چار قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔

تینوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستولوں کا رخ مجمل ہی کی طرف تھا مگر وہ کمرے کے دروازے کے سامنے یوں پرسکون اور بے فکری سے کھڑا تھا جیسے اسے ڈاکوؤں یا ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستولوں کی ایک ذرا بھی پروا نہ ہو۔

اس کی یہی بے خوفی اور بے پروائی ان تینوں کو تذبذب میں مبتلا کر گئی۔ تینوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا کہ یہ بندہ نشے میں اس حد تک دھت ہے کہ اس کے حواس ہی سن ہوئے پڑے ہیں اور یقیناً اسی باعث یہ صورت حال کی سنگینی کو سمجھنے کی حالت میں نہیں ہے۔

”میری بچیوں کو کچھ مت کہو، تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے۔“ اماں سسک رہی تھیں۔

”ہاتھ گردن پر رکھ کر منہ کے بل لیٹ جا۔“ اسی ڈاکو نے پستول کا اشارہ کرتے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”بکدھر؟“ مجمل نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی۔

”یہیں زمین پر لیٹ جا۔“

”تو بادشاہ! پہلے یہاں کوئی چٹائی شنائی تو بچھاؤ۔“ مجمل نے جیسے فرمائش کی تو ڈاکو کچھ مزید کرحت لہجے میں بولا۔

”جو کہہ رہا ہوں وہ چپ چاپ کرور نہ ماتھے میں سوراخ بنادوں گا۔“

”میری بھئی کو چھوڑ دو۔“ اماں اس ڈاکو سے مخاطب ہو کر کھٹکیاں جو ہما کو بازو سے پکڑے کھڑا تھا۔

”تمہاری اپنی بھئی کوئی بہن ہوگی۔ تمہیں تمہاری اسی بہن کا واسطہ ہے میری بھئی کو چھوڑ دو..... تم یہ زیور اور پیسے سہاؤ مگر میری بھئی کو بخش دو۔“

اماں کو صرف ایک ہی پریشانی، ایک ہی خوف تھا وہ جیسے صرف عزت و آبرو کے تحفظ کا اطمینان چاہتی تھیں۔

”او چاچی! تو تو چپ کر یار!“ مجمل نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی بیزاری سے کہا۔ ”دیکھ بھی رہی ہے کہ کوئی تیری بات سن ہی نہیں رہا پھر بھی کھپ ڈالے جا رہی ہے۔ اب ذرا کچھ دیر کے لیے تو اپنا یہ ریڈیو بند کر دے اور ہم لوگوں کو بات کرنے دے۔“

پھر وہ دوسرے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔

”اپنے اس نطفے کو کچھ سمجھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی نظر کچھ کمزور ہے۔ اسے یہ.....“ مجمل نے اپنی مونچھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ نظر نہیں آرہیں اسے..... اس بھتی کے کوہتا کہ اس کے سامنے مرد کھڑا ہے..... عورت نہیں۔“

آج سے پہلے ان لوگوں کا ایسی صورت حال سے کبھی واسطہ نہیں بڑا تھا۔ مزاحمت کا سامنا تو انہوں نے پہلے بھی کیا بار کیا تھا۔ مگر مجمل کا انداز اور اس کے تیور کچھ الگ ہی تھے۔ اس کا اعتماد اور بے فکری ان کے لیے قطعی غیر متوقع اور تقریباً ناقابل یقین ہی تھی۔ اسی باعث اس کے سامنے کے رخ کھڑے دونوں ڈاکو ہی ایک عجیب سے محسوس میں پھنس گئے تھے۔ البتہ اس کے بائیں ہاتھ کھڑا ڈاکو اچانک ہی لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے پستول کی نال مجمل کی ٹھوڑی سے لگائی اور دائیں ہاتھ کا ایک بھر پور تھپڑ اس کی گدی میں جھاتے ہوئے غرایا۔

”تیری..... لیٹ نیچے..... لیٹ۔“

تھپڑ پر مجمل نے ایک ذرا آگے کو جھول کھایا اور

ساتھ ہی اپنا بایاں ہاتھ اس ڈاکو کے پستول پر ڈالتے ہوئے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی شراب کی بوتل اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ بوتل کے ٹکڑے چاروں طرف بکھر گئے۔ ڈاکو کے منہ سے ایک کر بناک چیخ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑتے ہوئے بے اختیار نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

اس کا پستول مجمل ہی کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ مجمل نے ہاتھ میں رہ جانے والی بوتل کی گردن ایک طرف پھینکی اور پستول اپنے سیدھے ہاتھ میں کر لیا۔

ٹھیک اسی لمحے کمرے میں یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ اماں لوگوں کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں اور مجمل کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے کے عین بیچ اور پسلیوں میں دو گرم اور دھکتی ہوئی سلاخیں گھسیڑ دی ہوں۔ سنبھلنے کی لاکھ کوشش کے باوجود وہ لڑکھڑا کر دروازے کے بائیں طرف دیوار کے ساتھ قطار میں رکھی ہوئی کرسیوں

سے گمراہ اور بچے سر پکڑے بیٹھے ڈاکو ہی پر ڈھیر ہو گیا۔
پستول پھل کے ہاتھ میں آتے دیکھ کر باقی دونوں ڈاکو
بری طرح گھبرا گئے تھے اور اسی گھبراہٹ میں ان میں سے
ایک نے پھل پر فائر کر دیے تھے اس کے بعد وہ دونوں ایک
لمحے کی بھی تاخیر کیے بنا دروازے کی طرف لپکے۔ ان کا تیسرا
ساتھی بھی فائر کی آواز پر جیسے فوراً ہی اپنی ساری تکلیف
بھول گیا۔ پھل کے خود پر گرتے ہی وہ اسے دھکیلتا ہوا تڑپ
کر ایک طرف ہٹا اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔
پھل نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ مگر اتنی دیر
میں دو ڈاکو تو باہر نکل چکے تھے۔ البتہ بچے سر والا ابھی
دروازے ہی میں تھا کہ پھل نے فائر کر دیا۔ گولی اس ڈاکو کی
گردن کی ہڈی کو توڑتی ہوئی پار ہو گئی۔ وہ باہر نکلتے ہوئے
دروازے سے گمراہ اور برآمدے کے فرش پر گر کر رہ پڑے لگا۔
ہما پھر سے اماں کی بغل میں دیک چکی تھی۔ پھل
انہیں اور ان کی چیخوں کو نظر انداز کرتا ہوا چیتے کی سی پھرتی
سے دروازے میں آ پہنچا۔ باقی دونوں ڈاکو بیرونی
دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پھل نے ایک لمحہ بھی
ضائع کیے بغیر ان پر فائر کھول دیا۔ یکے بعد دیگرے اس
نے پورا میگزین خالی کر دیا۔

ایک ڈاکو بیرونی دروازے سے دو قدم ادھر ہی ڈھیر
ہوا تھا۔ جبکہ دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہی والا تھا کہ اس
کی کمر میں ایک ساتھ تین انگارے اترتے چلے گئے اور وہ
منہ کے بل دھڑام سے باہر گلی میں جا گرا۔
اس کے گرتے ہی پھل کی سکڑی ہوئی بھویں ڈھیلی
پڑ گئیں۔ جڑوں کی سختی کم ہوئی اور تکلیف کی شدت سے
بچنے ہوئے ہونٹوں پر ایک فتح مندانہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
اس نے اس خیال سے اپنے اندر اطمینان سا پھیلتا
ہوا محسوس کیا کہ ”چلو اگر مر رہا ہوں تو مردوں کی طرح تین کو
مار کر مر رہا ہوں۔ کسی ایک بھی کتے کو زندہ بچ کر تو نہیں جانے
دیا تا!“ اس نے ایک گہرا سانس لینا چاہا تو سینے اور پسلیوں
میں گڑی ہوئی سلاخوں کو جیسے کسی نے ایک جھکے سے بل دیا۔
تکلیف کی ناقابل برداشت لہروں نے اس کی ٹانگوں کو کپکپا
دیا۔ اسے خطرہ محسوس ہوا کہ میں لڑکھڑا کر گر پڑوں گا۔ ہاتھ
سے دروازے کا سہارا لیا تو سینے اور پسلیوں میں پھر سے
بجلیاں سی تڑپ اٹھیں۔
ٹانگوں کی بڑھتی ہوئی لرزش نے اسے احساس دلایا
کہ اب ایک قدم بھی آگے پیچھے کرنا ممکن نہیں۔ اس نے
دروازے کے ساتھ اپنی کمر لگائی اور آہستہ آہستہ وہیں

دروازے کے بچ ٹانگیں پسار کر بیٹھتا چلا گیا۔

ہما، حنا اور اماں تینوں ایک دوسرے سے لپٹی خور
ودہشت سے بچتی بچتی آنکھوں کے ساتھ پھل ہی کی طرف
دیکھ رہی تھیں، جس کے سینے اور پسلیوں سے پھل بھل خون
بہہ رہا تھا اور چہرے پر شدید تکلیف کے آثار پھیلے ہوئے
تھے۔ اس کے چہرے پر سٹ آنے والی سرخی اور پسینے کی نمی
بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت برداشت کے بل صراط سے
گزر رہا ہے۔ اس کی نظر اماں لوگوں پر پڑی تو اسے یوں
محسوس ہوا جیسے ان تینوں کی آنکھوں میں خوف اور وحشت
کے ساتھ ساتھ کچھ حیرت اور بے یقینی بھی کسمساری ہے اس
کے ہونٹوں پر ایک مضحکہ سی مسکراہٹ تڑپ کر رہ گئی۔
پھر شاید اس نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر منہ کھولا تو منہ سے
خون ابل پڑا۔ اس نے منہ میں بھر آئے والا خون ایک
طرف تھوکتے ہوئے کلائی کی مدد سے ہونٹ پونچھے پھر اماں کو
اشارے سے سمجھایا کہ بے فکر ہو جاؤ۔ تینوں مارے گئے
ہیں۔ اماں کے ساتھ ساتھ حنا اور ہما بھی بخوبی اس کی بات
سمجھ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر خون تھوکا اور اماں کو
اشارے سے اپنے قریب آنے کو کہا۔ اماں فوراً ہی اٹھ کر اس
کے پاس آ بیٹھیں جبکہ حنا اور ہما نے جا کر اپنے ڈرے سے
بھائی کو لپٹا لیا۔ دروازے کے ساتھ ہی اس طرف برآمدے
میں ایک ڈاکو کی لاش پڑی تھی۔ دوسری لاش بیرونی
دروازے کے قریب تھی اور تیسرے کا بے جان وجود باہر گلی
میں دروازے کے بالکل سامنے پڑا دکھائی دے رہا تھا۔
صورت حال کی موجودہ تبدیلی نے اماں کو جیسے گنگ
کر کے رکھ دیا تھا۔ عزت کے دشمن تینوں ڈاکو مردہ پڑے
تھے اور پھل..... جس کے حوالے سے اماں کو ہمیشہ یہ خدشہ
لاحق رہا تھا کہ یہ بد معاش کسی دن عزتوں کا لیرا بن کر دیوار
نہ پھلانگ آئے۔ وہ آج دیوار پھلانگ آیا تھا مگر لیرا بن کر
نہیں..... محافظ بن کر..... رحمت کا ایک فرشتہ اور خدا کی
طرف سے ان کے لیے غیبی مدد بن کر.....
اماں کے لیے جیسے خدا کی اس کار سازی پر یقین کرنا
مشکل ہو گیا تھا کہ اب سے چند گھنٹے پہلے تک جسے وہ دنیا کا
بدترین انسان اور اپنی بچیوں کی عزت و آبرو کے لیے سب
سے بڑا خطرہ تصور کرتی آئی تھی، وہی شخص..... اس وقت
ان کی عزت و ناموس پر اپنی جان قربان کیے بیٹھا تھا اور
اماں کی نظر میں وہ یک بہ یک بنی جیسے شیطان سے ایک
فرشتے کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔
اماں انتہائی عجیب اور متضاد احساسات کا شکار تھیں۔

آپنا فانی تو ہو کر راتھا۔ اب وہ پھل کے قریب آ کر
بیٹھتی تھی جس مگر فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم تھیں کہ فی
الوقت فوری طور پر انہیں کیا کرنا چاہیے؟
”پولیس آئے گی۔“ پھل بولا تو اس کے منہ سے
سانس کے ساتھ خون کا ایک باریک سا غبار خارج ہوا۔
”ساری کہانی..... صاف، صاف بیان کک.....
کر دینا۔ گھبرانا شہرانا بالکل نہیں۔ ہاں..... کچھ دن پریشانی
کا سامنا تو..... کرنا پڑے گا مگر تو پرے..... پریشان مت
ہونا۔ بعد میں پھر سکون..... ہی..... سکون۔“
اس نے خون تھوکا اور چہرے پر ایک مجروح سی
مسکراہٹ سمیٹتے ہوئے وحشی آواز میں بولا۔ ”میرا کاٹنا بھی
کل کہا اب..... پڑوس والے کچر خانے سے بھی تیری جان
چھوٹ گئی۔“

”م..... منصور بیٹا۔“ اماں سے کوئی بات نہیں بن
پائی۔ اندر سے آنسوؤں کا ایک گولا سا اٹھا اور ان کے حلق
میں آگھلا۔

”اوبس چاچی! رہ..... رہنے دے۔“ پھل نے
جلدی سے کہا پھر کلائی رگڑ کر ہونٹ پونچھے اور دوبارہ بولا۔
”کچھ مت کہہ، مجھے معلوم ہے کہ..... سب میرے
محقق..... کیا رائے رکھتے ہیں! مجھے..... کسی کی پروا
نہیں ہے۔ لوگوں کو کم..... میں برا اور بد..... بد معاش لگتا
ہوں تو ٹھیک ہے بد معاش..... ہی سہی مگر چا..... چچی! یہ
بد معاش بے..... غیرت نہیں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ
رانا من..... منصور نواز نے محلے کی کسی بہن..... بیٹی کو کبھی
سے..... میلی آنکھ سے دے.....“ اچانک ہی پھر اسے منہ
بمخون کی تے آئی اور اس کی حالت مزید ابتر ہو گئی۔ چہرے
پر شدید اذیت کے تاثرات اور پورے وجود پر رنج کی سی
کیفیت اتر آئی۔

اماں کا دل اچانک ہی بری طرح متلانے لگا اور وہ
فوراً ہی اٹھ کر پیچھے ہٹ گئیں، پھل پر کچھ دیر تک لرزہ
طاری رہا پھر اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے چلے گئے اور
مزید کچھ ہی دیر بعد وہ بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔ جس کی
سوت کے لیے وہ ایک عرصہ خدا کے حضور دن رات دعائیں
دیتی آئی تھی۔ وہ اس وقت ان کے سامنے مردہ حالت میں
پڑا تھا اور اماں اس کی سوت پر خوش ہونے کے بجائے الٹا
اواس اور طول کھڑی تھیں۔

پھل کے والدین کا خیال آ جانے پر وہ ہمیشہ حیرت
سے سوچا کرتی تھیں کہ ٹھیک ہے ماحول اور دوست اچھے

نہیں ملے لیکن دودھ اور خون کی اپنی بھی تو ایک تاثیر ہوتی
ہے، وہ پھل میں کبھی محسوس کیوں نہیں ہوتی۔

آج انہیں پوری شدتوں سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ
شاید اس خون اور دودھ کو کبھی ڈھنگ سے اپنا رنگ دکھانے
کا موقع ہی میسر نہیں آیا تھا یا پھر وہ تاثیر ایک عرصہ پھل کی
ذات کے اندر کہیں گہرائیوں میں خوابیدہ رہنے کے بعد آج
اچانک اور بالکل بروقت موقع پر تڑپ کر بیدار ہو آئی تھی۔
”کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رانا منصور نواز نے محلے کی کسی
بہن، بیٹی کو کبھی میلی آنکھ سے دیکھا ہے۔“

اماں کا لاشعور خود سے پھل کے ادھورے جلے کو مکمل
کر کے سوچے جا رہا تھا کہ واقعی یہ بات تو کبھی کسی نے نہیں
کہی تھی..... یہ بات تو وہ خود بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔

”گگڑوں..... گڑووں۔“ رستم اپنے مالک کو پکار رہا
تھا، مگر وہ اس کی پکار سننے یا اس کی پکار کا جواب دینے کی حد
سے بہت دور جا چکا تھا..... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

اس لمحے جیسے اماں پر حقیقی معنوں میں بد معاش اور
بد کردار کا فرق واضح ہوا کہ پھل بہ باطن بد کردار نہیں،
صاحب کردار تھا اور پھر ان کی آنکھیں جھلکلا اٹھیں۔

آج اس بھیانک اور اچل خیز رات کو سات سال
گزر چکے ہیں۔ ہما اور حنا کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ
دونوں اپنے اپنے گھر میں شاد ہیں۔

ہما کے دو بیٹے ہیں اور حنا کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔
اسد ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد پولیس میں بہ
طور اے۔ ایس۔ آئی ملازم ہو گیا تھا اور آج کل اماں اس کا
گھر بسانے کی فکر میں تھیں۔

رانا منصور نواز عرف پھل علاقے کے لوگوں کے
لیے ایک قصہ پارینہ بن چکا شاید ہی کبھی کسی کو اس کا خیال آتا
ہو۔ البتہ اسد، ہما، حنا اور اماں کو نہ تو کبھی وہ دہشت ناک
رات بھول سکی اور نہ ہی پھل۔

”ایسے ہی موت آتی ہوتی تو رانا کب کر مر گیا ہوتا۔
میں کچھ کر کے مردوں گا..... کوئی بڑا کارنامہ..... ایسے نہیں
مرتا میں۔“

پھل کے یہ الفاظ اکثر اماں کے کانوں میں گونجتے
ہیں اور انہیں یاد دلاتے رہتے ہیں کہ وہ واقعی اتنا بڑا
کارنامہ..... ان پر اتنا بڑا احسان کر کے مرا ہے کہ جس کا بدلہ
وہ کسی صورت کبھی نہیں چکا پائیں گی۔

محفل شہر و سخن

✽ ابرار وارث..... سندیلانوالی

ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں وفا کیسے مل دیتی ہیں

✽ عائشہ ثانی..... حیدر آباد

غیروں کا بھی غم رکھتے ہو تم دل میں ہمیشہ
کہنے کو تو تم میرے وفادار بہت ہو
ہر چند کہ اس دنیا نے برباد کیا ہے
پھر بھی اسی دنیا کے طلب گار بہت ہو

✽ نادریال..... کنڈیاں، میانوالی

ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں قرار
بس ایک ہی شخص کو محبوب بنا رکھا ہے

✽ توصیف احمد..... پٹھان کالونی، کراچی

پوری زندگی کی راہ میں چلنا پڑا ہمیں
غرض ہوئی کسی سے، سنبھلنا پڑا ہمیں

✽ تفسیر عباس بابر..... اوکاڑہ

عمر بس دید کی امید میں کٹ جاتی ہے
آنکھ میں لوٹ کے روٹھے ہوئے منظر نہیں آتے

جمع کرتا ہوں تو احباب نفی ہو جاتے ہیں
ضرب دیتا ہوں تو اعداد برابر نہیں آتے

✽ رانا محمد عامر شاد..... میاں چنوں

اسی لیے تمہیں چاند سے تشبیہ نہیں دی میں نے
اس پہ ہم خاک نشینوں نے قدم رکھے ہیں

✽ عاصم اقبال جہاں..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

کبھی عرش پہ بھی فرش پہ بھی ان کے در بھی در بدر
غم زندگی تیرا شکر یہ میں کہاں کہاں سے گزر گیا

✽ عون عباس بابر..... اوکاڑہ

لفظ جو منہ سے نکل جائیں پلٹ کر نہیں آتے
جس طرح آنکھ سے نکلے ہوئے لشکر نہیں آتے

اس روز رفیقوں کے رویے یہ قلع ہوتا ہے
جس روز میرے صحن میں پتھر نہیں آتے



✽ اظہر حسین بچار..... ہزاری، جتوئی

شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے
ہمیں بھی خبر ہے قاتلوں کے ٹھکانے کی

✽ وارث علی..... کوکمر شاہ

کاش وہ اک نیا طریقہ میرے قتل کا ایجاد کرے
مرجاؤں میں ہنگیوں سے مجھے اس قدر وہ یاد کرے

✽ قیصر اقبال کچہ..... بھکر

وہ رُت ہے کہ ہر سانس عذابِ رگ جاں ہے
اس پر بھی ستم یہ کہ جئے بن نہ رہا جائے

جب جب میں ہوا بن کے تیرے شہر سے گزروں
دستک ترے در پر بھی دیے بن نہ رہا جائے

✽ کنول زریں..... گلبرگ، لاہور

موم کی میز می پہ چڑھ کے چھو رہے تھے آفتاب
پھول سے چہروں کو یہ کوشش بہت مہنگی پڑی

✽ قیصر اعوان..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

زہش کر میرے بازو اڑان چھوڑ گیا
کس انتہا پہ میرا مہربان چھوڑ گیا

لہانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

✽ پرنس راجا ثاقب محمود جنوے..... جہلم

جیتی جاگتی بستی ہوئی کھنڈر کیسے
ہوا بکھیر گئی تیرے میرے گھر کیسے

جنہیں تھا زعم بہت اپنے ہوش و دانش پر
جکتے رہ گئے وہ لوگ عمر بھر کیسے

✽ رمضان سلیم کامریڈ..... کھاناں

مٹکتاتی ہوئی گھٹائیں ہیں
یا فقیروں کی التجائیں ہیں

جام وینا شراب پیانے
ہوش کی جاں فزا دوائیں ہیں

✽ ادیس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی

وفا کی راہ میں دشواریاں تو آتی ہیں
وفا کی راہ کو ہموار کرنا پڑتا ہے

✽ مہرین ناز..... حیدر آباد کینٹ

مٹکتاتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
شاید کوئی بدلی تیری پازیب سے ٹکرائی

✽ عادل عاصی خان..... ڈگر لڑی، کرک

حسرتیں زیست کو گھیرے میں لیے رکھتی ہیں
خستہ دیوار پہ چمٹے ہوئے جالوں کی طرح

زندگی خشک ہے، ویران ہے، افسردہ ہے
کسی مزدور کے بکھرے ہوئے بالوں کی طرح

✽ راحیلہ اعجاز احمد..... حیدر آباد

میرے آئین کا تحفہ ہے کچی مٹی کی خوشبو
یہ تحفہ وہ پائے گا جو ساون بن کے آئے گا

✽ احمد خان توحیدی..... پاکستان اسٹیل کراچی

تم نے کہا تھا اب نہ چلے گا محلوں کا دستور
سنے گا وہ قانون جو ہوگی بات ہمیں منظور

✽ محمد نوید ہاشمی..... ضلع قصور

ابھی لگے جو تم، سو ہم نے بتا دیا
نقصان یہ ہوا کہ تم معزور ہو گئے

✽ خان برادرز..... ڈیرہ بکھا

تجھے خبر ہے تجھے سوچنے کی خاطر ہم
بہت سے کام مقدر پہ نال رکھتے ہیں

تمہارے بعد یہ عادت سی ہو گئی اپنی
بکھرتے سوکتے پتے سنبھال رکھتے ہیں

✽ افتخار حسین اعوان..... مظفر آباد، آزاد کشمیر

ہم کے ٹھہرے دشت وفا کے وہ مسافر
کہ جن کا یقین ٹوٹ جائے پہنچ کر منزلوں کے ساتھ

بنایا ہے اس شہر میں اک شیشے کا گھر
آئے ہیں میرے چاہنے والے، پتھروں کے ساتھ

✽ حبیب احمد چنائے..... الگڈی، کرک

بکھر رہی ہے میری ذات اُسے کہنا
کبھی ملے تو یہی بات اُسے کہنا

وہ ساتھ تھا تو زمانہ تھا ہم سفر میرا
مگر اب کوئی نہیں میرے ساتھ اُسے کہنا

✽ گلغام ممتاز..... الہ آباد، ضلع قصور

صبح اٹھتے ہی آج صدقہ دیا!
محبت کر بیٹھے تھے جو خواب میں

✽ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور

اعضا اور بھی ہیں جسم میں احساس کے لیے
کجخت دل ہی درد کیوں محسوس کرنا ہے

✽ محمد نصیر طلحہ سیال..... سکھر

میرے ہی ہاتھوں پر میری تقدیر لکھی ہے
اور میری ہی تقدیر پر میرا بس نہیں چلتا

✽ محمد صفدر..... خانیوال

نہ ظاہر ہوئی ان سے
نہ بیاں ہوئی ہم سے

بس سنبھلی ہوئی آنکھوں میں
ابھی رہی محبت

✽ رضوان تنولی کرپڑوی..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

مجھے تقدیر سے کوئی گلہ تو نہیں ہے مگر
رو پڑے گا تو بھی جو اگر میرا مقدر دیکھے

✽ گلنا زریں..... گلستان جوہر، کراچی

پچھڑ بھی جائیں تو دل کو کوئی ملاں نہ ہو
بس اتنا رابطہ رکھو تمام لوگوں سے

احسان

تویریاض

دنیا میں ہر عمل کا رد عمل ضرور ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی پہنچنے والا نقصان بھی زندگی کا سب سے بڑا نفع بن جاتا ہے اور ڈنک مارنے والا اپنے ہی زہر کا شکار ہو جاتا ہے... کچھ ایسی ہی صورت حال یہاں بھی تھی... جب کسی کی معصومیت مکاری میں اور مظلومیت سفاکی میں ڈھل جائے تو اس کے پیچھے قدرت کے چھپے انتقام کو سمجھ لینا چاہیے... یہ بات بالآخر اس کی سمجھ میں آہی گئی تھی۔

ایک بددیانت حسن اور ایماندار احسان منہ کے درمیان معرکہ آرائی

کہتے ہیں کہ دولت کبھی جائز طریقے سے نہیں ملتی بلکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی جرم پوشیدہ ہوتا ہے۔ ریکن اسٹارم کو دیکھ کر لوگ سرگوشیوں میں یہ الفاظ دہرانے لگتے ہیں لیکن کسی میں ہمت نہیں کہ اس کے منہ پر کچھ کہہ سکے۔ وہ آج ایسے مقام پر ہے کہ کوئی اس کے بارے میں کھل کر ایسی بات کہنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ پورا ملک جانتا ہے کہ اس نے مسلسل تجربات کر کے جو کے بیچوں سے بیڑ کی تیاری کا نیا فارمولا ایجاد کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تیار کردہ بیڑ نہ صرف



محمد عقیل چٹھہ..... حافظ آباد

چاہتا ہوں میں منیر اس عمر کے اختتام پر ایک ایسی زندگی جو اس طرح مشکل نہ ہو

فہد، سعدیہ بخاری..... ضلع انک

شہر والوں کو کہاں یاد ہے وہ خواب فروش پھرتا رہتا تھا جو گلیوں میں غبارے لے کر

خواجہ محمد رفیع سیٹھی..... فیصل آباد

آپ نے کیوں حال دل پوچھا مرا مجھ کو رونے کا بہانہ مل گیا

جاوید شبیر، بربرہ..... علی پور، مظفر گڑھ

اس کو اپنا بنانے کی ضد میں اپنے بھی ہو گئے پرانے تو؟

شبیر نازش..... کراچی

کس کی صحبت کا رنگ لے بیٹھے آپ ایسے نہیں تھے پہلے تو

زودہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا دل مکمل کبھی تسخیر نہیں ہو سکتا

رحیمہ سرور..... ساہوواڑی، لاہور

خاک سے اٹھتا ہے تو خاک میں مل جاتا ہے کون کہتا ہے کہ انسان وفادار نہیں

ریاض بٹ..... حسن ابدال

خود اڑ گیا وہ ایئر گریزاں کے روپ میں محرومیوں کی دھوپ میں پھیلا گیا مجھے

جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

چھلک اٹھے میری آنکھوں کے جب بھی پیمانے وفا کا تاج محل پانیوں میں ڈوب گیا

محمد کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

تم بادشاہ وقت تھے کٹوا دیئے تھے ہاتھ اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے

حسنین عباس بلوچ..... سرگودھا

وہ پتھروں سے مالتے ہیں اپنی مراد! ہم ان کے اتنی ہیں جنہیں دیکھ کر پتھر بھی گدھے پڑتے ہیں

محمد اشفاق سیال..... شورکوٹ شی

عجیب فیض ہے آقا تیری محبت کا درود پڑھوں تجھ پر اور خود سنور جاؤں!

رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

شاید ادھر سے قافلہ رنگ و بو گیا خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

احسان سحر..... میانوالی

تو بے دیہات کی نوخیز ہواؤں جیسی میں تجھے شہر کے لوگوں سے چھپاؤں کیسے

محمد جاوید گل چندا..... چودھری والا، فیصل آباد

اک حد میں ساتھ تھے تو بے حد قریب تھے بے حد ہوئے قریب تو قصہ ہوا تمام

طالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل ملتان

محبوتوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا پچھڑ کے بھی ایک دوسرے کا خیال ہوگا یہ طے ہوا تھا

محمد اشفاق مغل..... ماڈل ٹاؤن، رحیم یار خان

نئے معنی ہے زیست میں افراد کا ہجوم مخلص اگر مل جائے تو کافی ہے ایک ہی

سعید عباسی..... بہاولپور

پھر نہیں بستے وہ دل جو ایک بار اجڑ جاتے ہیں وہی جنازے کو کتنا بھی سنوارو اس میں روح نہیں آتی

وحید عباسی..... بہاولپور

کوئی تعویذ ایسا لادو کہ میں چالاک ہو جاؤں بہت نقصان دیتی ہے مجھے یہ سادگی میری

نوید عباسی..... بہاولپور

سزا یہ دی کہ آنکھوں سے چھین لی نیندیں جرم یہ تھا کہ اس کی چاہت کے خواب دیکھے تھے

محفل شعر و سخن

کوین

برائے

شمارہ

نومبر

2013

نام:

پتا:

پورے ملک میں مقبول ہو گئی بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی برآمد ہونے لگی۔ سب جانتے ہیں کہ اس نے اپنی کمپنی اسٹارم ویڈیو لینڈ پانچ لاکھ کروڑوں سے شروع کی تھی اور یہ رقم اس کی خالہ نے اسے یہ طور قرض دی تھی۔ اس کے منافع سے حاصل ہونے والی رقم کی بدولت خالہ کا بینک بیلنس کافی بڑھ گیا لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ ساری دولت وصیت کے مطابق اسٹارم کو مل گئی، سب لوگ اس کا یا پلٹ پر حیران ہیں کہ اسٹارم جو بھی ایک معمولی سی ملازمت کرتا تھا، آج پورے یورپ کو سب سے زیادہ مقدار میں بیئر سپلائی کرتا ہے۔ اس کی کمپنی میں نو سو ملازمین کام کرتے ہیں اور وہ ایک بہت بڑے منافع بخش کاروبار کا مالک ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ اسٹارم کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا اور اگر انہیں معلوم بھی ہے تو اس کا اظہار نہیں کر سکتے، البتہ دے لفظوں میں یہ بات ضرور کہی جاتی ہے کہ اسٹارم جس کمپنی میں ملازمت کرتا تھا، وہاں اس نے بہت بڑی رقم کا فین کیا تھا اور خالہ سے ادھار لینے والی بات تو محض ایک بہانہ تھی۔

وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھے لیکن اصل حقیقت وہ بھی نہیں جانتے۔ اس سے صرف دو افراد ہی واقف تھے اور ان میں سے ایک میں ہوں۔ حالانکہ برسوں سے اس بارے میں جو افواہیں پھیل رہی ہیں۔ ان میں کوئی سچائی نہیں ہے اور لوگ جو کچھ سوچ رہے تھے، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، البتہ اس افواہ میں ایک سچ ضرور شامل ہے اور وہ یہ کہ اسٹارم کی خوش قسمتی کے پیچھے ایک جرم پوشیدہ ہے اور اس کے بغیر اسٹارم کی قسمت کا ستارہ نہیں چمک سکتا تھا لیکن یہ جرم اسٹارم نے نہیں کیا تھا بلکہ مجرم کوئی اور تھا۔

میرا نام کارل لارسن ہے۔ پانچ سال پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ میرے لیے ورثہ میں خاندانی کاروبار چھوڑ گئے۔ یہ شمالی ناروے کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں واقع لارسن فروٹ اینڈ ٹوبیکو کے نام سے چلنے والا اسٹور تھا۔ میں ویسے بھی مختلف کمپنیوں میں سیکرٹری کی ملازمت کرتے کرتے تنگ آ چکا تھا، اس میں بھاگ دوڑ زیادہ تھی اور تنخواہ بہت کم۔ کمیشن کے نام پر جو کچھ ملتا وہ سفری اخراجات اور کھانے پینے میں خرچ ہو جاتا۔ مجھے دکان پر بیٹھنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے شروع میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوا میں جانتا تھا کہ اس میں کچھ وقت لگے گا۔ میں پہلے بھی اس اسٹور سے بالکل ہی لاتعلقی نہیں تھا اور اکثر والد کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ اسی لیے میں سمجھ رہا تھا کہ اس کاروبار کے بارے میں جانتا ہوں۔

میں نے دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا اور جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ میں اسٹور کو اسی طرح چلا سکتا ہوں جیسے والد اور البتہ مجھے اتنی کم آمدنی کی توقع نہیں تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنی مدد کے لیے ایک کلرک رکھ لوں جو میری غیر موجودگی میں دکان پر بیٹھ سکے اور مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے کچھ وقت مل جائے، بس میں دکان بھال کی غرض سے دن میں ایک دو چکر لگایا کروں لیکن اتنی کم آمدنی کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ مجھے صبح بجے سے رات نو بجے تک دکان پر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود بس گزارنے لائق ہی آمدنی ہو رہی تھی۔

میرے لیے شام کا وقت گزرتا بہت مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ دوسری دکانیں پانچ بجے بند ہو جاتی تھیں جبکہ میں اپنے کاروبار کی نوعیت کی وجہ سے رات نو بجے تک دکان کھولے پر مجبور تھا۔ کہتے ہیں کہ موت اور گناہ کا کوئی بھروسہ نہیں سگریٹ اور پھلوں کے طلب گار کسی بھی وقت آ سکتے تھے۔ دوسری دکانیں بند ہونے کی وجہ سے سڑک سناں ہو جاتی تھی لیکن مجھے اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے میں اکیلا بیٹھا گاؤں کا انتظار کرتا رہتا۔ پانچ بجے کے بعد میرا زیادہ وقت ان دکان داروں کو دیکھنے میں گزرتا جو دکان بند کرنے کے بعد دن بھر کا کیش بینک کے لا کر میں جمع کروانے کے لیے آتے۔ جو بینک کے داخلی دروازے کے برابر میں ہی نصب تھا جبکہ میری دکان بینک کے بالکل سامنے واقع تھی اور میں اپنے کاؤنٹر پر بیٹھ بیٹھے وہاں کی تمام سرگرمیاں بآسانی دیکھ سکتا تھا۔

یہ روزانہ کام معمول تھا۔ وہ چابی کے ذریعے لا کر کھول کر لوہے کی دروازہ کو باہر کھینچتے اور اس میں خاکی رنگ کا لٹ سے بھرا ہوا لفافہ رکھ دیتے جس پر ان کی دکان کا نام اور ان کی مالیت درج ہوتی پھر وہ دروازہ کو اندر کی طرف دھکیل کر اندر کرتے اور اسے چابی کے ذریعے لاک کر دیتے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ دروازہ کو اپنی طرف کھینچ کر یہ اطمینان کر لیتے کہ لفافہ واقعی سیف میں گر گیا ہے، اس کے بعد وہ اطمینان سے گھر چلے جاتے اور میں کاؤنٹر پر بیٹھا اپنی قسمت کو دیکھتا رہتا۔ چار گھنٹے کے صبر آزما انتظار کے بعد میں بھی دکان بند کر کے بینک جاتا اور اپنا ہلکا سا لفافہ لا کر میں ڈال دیتا، ان دوران میں مجھے پراکتشاف ہوا کہ اسٹارم کا معمول دوسرے دکانداروں سے کچھ مختلف ہے۔

پہلے مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ وہ کس دکان سے آتا ہے۔ وہ ہر روز صبح کے قریب بینک

اس کی عریس کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ لمبے قد کا تھا لیکن آنے کی طرف جھک کر اس طرح چلتا جیسے کوئی اسے دھکیل رہا ہو اس کو دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ اپنی سوچوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ کوئی ذہین شخص ہے یا بے وقوف۔

میں اسے روزانہ لا کر کی طرف جاتے اور اس میں ایک بھاری بھر کم لفافہ ڈالتے ہوئے دیکھتا۔ لا کر کی دروازہ مضبوط نوا دی جاتی ہوئی تھی اور جب اسے بند کیا جاتا تو اس کے دونوں طرف لگے ہوئے قبضے کھل جاتے اور اس کا پچھلا حصہ نیچے کی طرف جھک جاتا اور اس طرح رقم کا لفافہ سیف میں چلا جاتا۔ اس لا کر کا ڈیزائن بہت سادہ لیکن قابل بھروسہ تھا اور دوسری بار دروازہ کو کھینچ کر دیکھنے سے معلوم ہو جاتا تھا کہ رقم کا لفافہ سیف میں چلا گیا ہے لہذا مجھے سمیت ہر دکان دار اس پر ضرور عمل کرتا تھا لیکن اسٹارم اس کا عادی نہیں تھا۔ میں اسے کئی روز تک دیکھتا رہا لیکن اس کے معمول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، جیسے ہی دروازہ بند ہونے کی آواز آتی وہ بینک سے چل دیتا۔ اس نے بھی دوبارہ دروازہ کو کھینچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

میں کئی ہفتوں تک اس کے معمول کا مشاہدہ کرتا رہا اور اس میں ایک مرتبہ بھی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر میرے دماغ میں ایک شیطانی خیال پروان چڑھنے لگا اور جیسے جیسے میں اس شخص کے بارے میں سوچتا گیا، اس کے خدو خال واضح ہوتے چلے گئے، یہ ایک فول پروف منصوبہ تھا جس کی کامیابی کے سوا فیصلہ امکانات تھے۔

میں نے اس شخص کے بارے میں مزید معلومات کیں تو بتا چلا کہ اس کا نام ریگن اسٹارم ہے اور وہ شراب کی دکان پر بیٹھتا تھا۔ یہ ایک ذمے دار پوسٹ تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کمپنی نے ایسے مجھول شخص کو یہ ذمہ داری کیوں سونپ دی ہے جو ہر وقت اپنے خیالوں میں گم رہتا تھا۔ اس شخص کی شہر میں اجارہ داری تھی اور وہ ادھار مال نہیں دیتے تھے۔ اس لیے ان کے اسٹور پر ہر روز خاصی بڑی مقدار کا نقد رقم جمع ہو جاتی تھی۔

میں نے بڑی رازداری سے لا کر کی اندرونی دراز کی کڑی کی بھی معلوم کر لی جو دس ضرب پندرہ ضرب بیس سینٹی میٹر کا تھا۔ میں نے اسی سائز کی ایک پتلی فولادی پلیٹ کافی اور اس کے وسط میں انگوٹھے کے برابر ایک رنگ ویلڈ کر دیا پھر اس کے ڈھانچے سے چار مربع شکل کے مقناطیس منگوائے انہیں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے مناسب وقت کا

دو ہفتے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھریلو

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سپینس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز 111 بحیثیت ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوریڈر، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انتظار کرنے لگا۔

میں نے اس کام کے لیے 23 جون کا انتخاب کیا۔ اس روز پورا شہر موسم گرما کی درمیانی شام منار ہا ہوتا ہے اور آدمی آبادی نشے میں چور آگ کے گرد قس کر رہی ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ شراب پیچھے والوں کی اس روز جاندی ہو جاتی ہے میں بے چینی سے چھہ بچنے کا انتظار کر رہا تھا لیکن گھڑی کی سوئیاں بہت سست روی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ بازار کی رونق ماند پڑ چکی تھی اور سڑک پر وہی چند مخصوص دکان دار نظر آ رہے تھے جو گھر جاتے ہوئے دن بھر کاکیش لاکر میں جمع کرواتے۔ میں ان کے معمول سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ کون کس وقت آتا ہے۔ اس بھیڑ کے چھٹ جانے کے دس منٹ بعد اسٹارم کو آنا تھا۔ سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا اور میرے لیے اپنے آپ کو اندھیرے میں چھپانے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسٹارم کے آنے سے کچھ دیر قبل میں اپنی دکان سے نکلا۔ اس وقت میں نے ایک ڈھیلا ڈھالا اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ دکان کا دروازہ کھلا چھوڑ کر میں نے تیزی سے سڑک پار کی اور لاکر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے لاکر میں چابی گھمائی اور دروازہ کو باہر کھینچ لیا پھر میں نے کوٹ کی جیب سے وہ چاروں مقناطیس نکالے اور انہیں دروازے کی اندرونی دیوار کے چاروں کونوں پر رکھ دیا پھر میں نے وہ پلیٹ نکالی اور اس کے رنگ میں ہک پھنسا کر اسے احتیاط سے چاروں مقناطیس پر رکھ دیا پھر میں نے دروازہ کو اندر کی جانب دھکیلا، چابی سے لاکر دوبارہ کھول کر دروازہ کو باہر کھینچا اور پھر اسے واپس دھکیل دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں لاکر سے چابی نکال رہا تھا کہ اسٹارم آ گیا۔

میں اسے دیکھ کر مسکرایا جیسے ہمارے درمیان کوئی خاص تعلق ہو۔ اس نے میری جانب کوئی توجہ نہیں دی اور جیب سے دو پھولے ہوئے لفافے نکالے اور میں ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا تاکہ وہ میری موجودگی کو محسوس نہ کر سکے پھر میں نے اپنے عقب میں دروازہ کھینچے اور اسے اندر دھکیلنے کی آواز سنی۔ اس لمحے اچانک مجھے خیال آیا کہ آج اس کے پاس معمول سے زیادہ رقم ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ خلاف معمول دروازہ دوبارہ کھینچ کر یہ اطمینان کرے کہ دونوں لفافے سیف میں گر گئے ہیں لیکن میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق دوبارہ دروازہ چیک کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور لاکر کو بند کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے چند منٹ بعد تک میں نے کوئی حرکت نہیں کی اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کافی دور جا چکا ہے اور اب اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تو میں تیزی سے لاکر کی طرف لپکا۔ اسے کھول کر دروازہ باہر نکالی۔ وہ دونوں پھولے ہوئے لفافے وہاں موجود تھے، میں نے جلدی سے انہیں پتلون کی جیبوں میں رکھا۔ ہک کی مدد سے پلیٹ باہر نکالی اور چاروں مقناطیس بھی اٹھا لیے۔ اب دروازہ اپنی اصلی حالت میں واپس آ چکی تھی۔ میں نے اسے بند کیا اور اطمینان سے اپنے اسٹور میں آ گیا۔

میں نے دکان کا دروازہ بند کیا اور رقم گنتے بیٹھ گیا۔ گزشتہ چند ہفتوں سے دکان جلدی بند کر رہا تھا لہذا اگر سیدھا گھر چلا جاتا تو کسی کو شک نہ ہوتا۔ میں نے لفافے کھول کر وہ رقم گنتی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ کل ملا کر پانچ لاکھ ایک ہزار تین سو پچپن کروڑ تھے جو میری توقع سے بہت زیادہ تھی۔ اس رقم سے میں ایک نئی زندگی شروع کر سکتا تھا میں نے وہ سارے نوٹ ایک خالی بوتل میں بھر دیے۔ لفافوں کو آگ لگا دی اور سیدھا چرچ کے قبرستان چلا گیا۔ میں نے اس بوتل کو اپنے باپ کی قبر کے برابر میں دفن کر دیا۔ یہ جگہ میری قبر کے لیے مخصوص تھی اور جب تک میں زندہ تھا، کوئی بھی وہاں کھدائی نہ کرتا۔ پھر میں گھر چلا گیا اور اگلے دن سہ پہر تک لمبی تان کر سوتا رہا۔

اس بارے میں اخبار میں کوئی خبر آئی اور نہ ہی کسی کوئی الزام عائد کیا گیا۔ البتہ افواہیں تیزی سے پھیلنا شروع ہو گئیں۔ پولیس اپنے طور پر تحقیقات کر رہی تھی اور اپنی کی انتظامیہ نے اسٹارم کو فوری طور پر اس کے عہدے سے معطل کر دیا تھا۔ پولیس والے میری دکان پر بھی آئے اور ایک گھنٹے تک مجھ سے سوالات کرتے رہے لیکن انہیں مجھ سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔

بہت جلد سارا الزام اسٹارم کے سر آ گیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی غائب دماغ واقع ہوا تھا۔ اس لیے یہی سمجھا گیا کہ اس نے رقم کے لفافے کہیں چھینک دیے ہیں کیونکہ اس کا گزشتہ ریکارڈ بے داغ تھا اور پوری ملازمت کے دوران اس سے کوئی بے قاعدگی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا، اگر اس نے رقم کاغذیں کیا ہوتا تو دوسرے روز کام پر نہ آتا بلکہ فرار ہو کر کسی دوسرے شہر چلا جاتا۔ کام حاضر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا اور اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ پہلے تو وہ یہی کہتا رہا کہ اس نے دونوں لفافے لاکر کی دروازہ میں ڈالے تھے لیکن اس کے پاس اس

سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ پھر وہ رقم کہاں چلی گئی۔ پولیس کے بار بار پوچھنے پر وہ بھی پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کہیں واقعی اس نے وہ لفافے کہیں چھینک دیے۔ بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑا کہ شاید اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس پوری فحشیت کے نتیجے میں کمپنی کی انتظامیہ، پولیس اور بینک والوں کو یقین ہو گیا کہ اسٹارم کی نیت جرم کرنے کی نہیں تھی بلکہ اس نے بے دھیانی میں وہ لفافے کہیں چھینک دیے لہذا کیس داخل دفتر کر دیا گیا۔ البتہ اسٹارم کو فراکش سے غفلت برتنے کے الزام میں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد تک میں نے اسٹارم کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ وہ پلیٹ کر دوبارہ اس علاقے میں نہیں آیا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے پھر اخبار میں اس کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ اسٹارم نے بیڑ کی ایک نئی قسم متعارف کروائی ہے اور اس کی تیاری کے لیے اس نے ایک پرانی فیکٹری کرایہ پر حاصل کر لی ہے۔ اخبار میں اسٹارم کے ساتھ ساتھ اس فیکٹری کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ابتدا میں کسی کو یقین نہیں آیا کہ اسٹارم جیسا غائب دماغ شخص کوئی ایسا کام بھی کر سکتا ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے اس کا کام چل نکلا۔ اخبارات میں مسلسل اس کی فیکٹری اور پروڈکٹ کے بارے میں ایسے مضامین شائع ہونے لگے جن سے اس کے کاروبار کی ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس کے ملازمین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور وہ مقامی طور پر بیڑ سپلائی کرنے کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کر رہا تھا۔ اس نے پرانی فیکٹری کے بجائے ایک نئی عمارت میں اپنا کاروبار منتقل کر لیا تھا اور خود ایک عالی شان دفتر میں بیٹھ کر کاروبار کی نگرانی کرنے لگا۔ اس کی یہ شاندار ترقی دیکھ کر لوگوں کو ایک بار پھر باتیں بنانے کا موقع مل گیا اور سب کو یقین ہو گیا کہ اسٹارم نے واقعی پانچ لاکھ کروڑ کاغذیں کیا تھا اور اس وقت اپنی معصومیت یا اچھے ریکارڈ کی وجہ سے فحشیت کاروں کو چمکے دینے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے دن کام پر آ کر بھی اس نے ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اگر وہ فرار ہو جاتا تو اس کی تلاش زور و شور سے شروع ہو جاتی اور وہ بھی نہ بچتا جاتا۔ کام پر آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ جیل جانے سے بچ گیا صرف نوکری ہی گئی۔

اسٹارم نے ایک اخباری انٹرویو میں دعویٰ کیا تھا کہ اس نے کاروبار شروع کرنے کے لیے اپنی خالہ سے ادھار لیا تھا بعد میں ان کا انتقال ہو گیا اور وصیت کے مطابق ان کا

داماد کی ہمیشہ سسرال میں عزت کی جاتی ہے اور اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے کیونکہ سسرالی عزیز جانتے ہیں کہ یہی وہ عظیم شخص ہے جس نے ان کے گھر کی مصیبت اپنے سر لے لی ہے۔

*** ** ***

میاں بیوی سو رہے تھے اچانک بیوی خواب میں زور سے بولنے لگی۔ ”بھاگو! بھاگو! میرا شوہر آ گیا ہے۔“ اگلے ہی لمحے شوہر نے کھڑکی سے کود کر گلی میں چھلانگ لگائی اور ”یہ جاوہ جا۔“

سارا اثاثہ اسٹارم کو مل گیا، کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آیا اور سب یہی سمجھے کہ وہ زمین کو چھپانے کے لیے یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس افواہ کی بازگشت کافی عرصہ تک گونجتی رہی اور لوگ اسٹارم کو ایک چور کی حیثیت سے جانتے رہے۔

میں نے بھی ایک سال تک اس مدفون رقم کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن ایک وقت ایسا آیا جب مجھے اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس دکان سے مجھے اتنی آمدنی نہیں ہو رہی تھی جس کی توقع تھی چنانچہ بینک کا اوور ڈرافٹ بڑھتا گیا اور ایک وقت ایسا آیا جب بینک والوں نے مزید رقم دینے سے انکار کر دیا چنانچہ میں کسی دوسرے کاروبار کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا لیکن میرا سارا وقت اس دکان کی نذر ہو رہا تھا چنانچہ میں نے ایک کلرک کو رکھ لیا جو دوپہر سے شام چھ بجے تک دکان پر بیٹھتا تھا۔ اب میرے پاس اتنا وقت تھا کہ کسی اچھے موقع کی تلاش کر سکتا۔ میں نے وہ مدفون خزانہ نکالا اور ایک فرم میں شراکت اختیار کر لی جو غیر ملکی شراب درآمد کرتی تھی لیکن نا تجربہ کاری کے سبب نقصان اٹھانا پڑا۔ میرے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اپنے آپ کو شراب کے نشے میں غرق کر لیا اور کسی دوسرے کاروبار کی تلاش ترک کر دی۔

بینک میں جو رقم بچ گئی تھی۔ اس سے چار سال بڑے آرام سے گزر گئے لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ میں نے جو طرز زندگی اپنایا تھا، اس میں تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جاتا چنانچہ وہ وقت بھی جلد ہی آ گیا جب بینک نے مزید اوور ڈرافٹ دینے سے انکار کرتے ہوئے مجھے دیوالیا قرار دے دیا اور اس بارے میں اخبار میں بھی نوٹس جاری کر دیا۔ اس شام میں اسٹور کے عقبی کمرے میں بیٹھا اپنا

سامان سینے میں مصروف تھا۔ یہ اس دکان میں میرا آخری دن تھا۔ دوسری صبح مجھے چابیاں بینک کے حوالے کرنا تھیں جو اس دکان کو تیلام کر کے اپنا قرضہ پورا کرتا۔ اس وقت میں گلی سڑی ہوئی سبزیاں اور پھل علیحدہ کر رہا تھا کہ مجھے دکان کا بیرونی دروازہ کھلنے اور کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک سیکنڈ کے لیے میرا سانس رک گیا اور میں سوچنے لگا کہ یہ کون ہو سکتا ہے جبکہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں کچھ دیر دم سادھے قدموں کی آہٹ سن رہا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ آنے والا کوئی چور نہیں ہے تو کمرے سے نکل کر اسٹور کے بیرونی حصے میں آ گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے ریگن اسٹارم کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہمدرد بن کر آیا تھا یا دشمن لیکن اس کے انداز سے مجس فیک رہا تھا۔ اس نے عمدہ تراش خراش کا بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور سر کے بال سلیقے سے جے ہوئے تھے۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی غائب دماغ اسٹارم ہے جو اپنی سوچوں میں گم سڑک پر نظریں جھکا کر چلتا تھا۔

”تم!“ میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”تم ریگن اسٹارم ہی ہوتا؟“

”گڈ ایوننگ!“ اس نے شائستگی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ میری فرم اور شراب کی درآمد کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا تھا کہ میرے زخموں پر نمک چھڑکنا چاہتا ہے جبکہ میں اس موضوع پر کسی سے بات کرنے کا روادار نہ تھا۔ بینک مجھے دیوالیہ قرار دے چکا تھا اور میرے ہاتھ بالکل خالی تھے پھر میں کس حیثیت میں اس سے بات کرتا۔ پھر بھی میں نے اپنے اندرونی خلفشار پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم پہلے بھی نہیں ملے۔“

”شاید ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”لیکن تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں بالکل بھول گیا کہ ایک کمال شخص ہوں اور میرے سامنے کروڑپتی شخص کھڑا ہے۔

”تم یہ جاننا چاہ رہے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ بڑی سیدھی سی بات ہے۔ اب یہ اسٹور بینک کی ملکیت ہے اور شاید تمہیں معلوم ہوگا کہ میں گزشتہ برس وہ بینک خرید چکا ہوں۔“

”ہاں، میں نے بھی سنا تھا۔“

”اس وقت تم کیا کر رہے تھے؟“

”ناکارہ اشیا کو شہکارنے لگا رہا تھا۔“

”اچھا!“ اس نے اس طرح کہا جیسے میرا مذاق اڑ رہا ہو۔ ”ناکارہ اشیا!“

میں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا، میری پتلون کی جیب سے تین سگار جھانک رہے تھے جنہیں میں نے پندرہ منٹ پہلے ہی جیب میں رکھا تھا۔ میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں کوئی معقول بہانہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔

”نہیں تم اپنے پاس ہی رکھو۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہرائی ہے، کبھی المیہ اور کبھی کامیڈی کی صورت میں۔“

میں اس کے الفاظ کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا اور وہ بھی جان گیا تھا کہ میں اس کی بات سمجھ گیا ہوں چنانچہ اس نے وضاحت کرنے کی زحمت محسوس نہیں کی۔ وہ مڑا اور کھڑکی میں سے بینک کی طرف دیکھنے لگا، اس کی نظریں لا کر پرچی ہوئی تھیں۔ میرے پورے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سب کچھ جان گیا ہے، میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”یہ محض تمہارا اندازہ ہے یا تم اسے ثابت بھی کر سکتے ہو۔“

مجھے احساس ہوا کہ شاید بولنے میں جلدی کر گیا ہوں۔ پہلے اس کی بات سن لینی چاہیے تھی۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا ہو لیکن تیرکمان سے نکل چکا تھا اور اب میں اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

”ہاں، میں اخلاقی طور پر اسے ثابت کر سکتا ہوں لیکن شاید جوہری کے سامنے نہیں کیونکہ عدالت، گواہوں اور ثبوت کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتی اور تم نے کوئی ایسا ثبوت نہیں چھوڑا جس سے تمہارے جرم کی نوعیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ حالانکہ پولیس کو تم پر ہمیشہ سے ہی شک تھا کیونکہ تمہاری دکان بالکل بینک کے سامنے ہے اور تم اسٹور میں بیٹھے بیٹھے ہر وقت بینک کے لا کر اور وہاں آنے والوں پر نظر رکھ سکتے ہو۔ اگر میں نے وہ رقم نہیں چرائی یا مجھ سے کم نہیں ہوئی تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص باقاعدگی سے میری آمد و رفت کا جائزہ لیتا رہا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں رقم دراز میں رکھنے کے بعد دوبارہ اسے باہر نکال کر چیک نہیں کرتا لیکن پولیس کو ایسا کوئی نشان نہیں ملا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ کسی نے میری اس عادت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔“

اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”میرا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب تم نے گزشتہ مہینے بینک سے اپنا اور درافت بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ تم جوئے گارنر کو تو جانتے ہو گے۔ وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ اس نے جب تمہارا اکاؤنٹ چیک کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چند سال قبل تمہارے حساب میں بہت بڑی رقم جمع کروائی گئی تھی جس سے تم نے شراب کی کمپنی میں شراکت اختیار کی بلکہ بعد میں بھی اس رقم سے عیش کرتے رہے۔ شاید تمہارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوگا کہ تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی اور اس کہانی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس رقم کی مالیت بھی وہی ہے جس کے گم ہونے کی پاداش میں مجھے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے۔“

”کیا تم میرے خلاف شکایت درج کراؤ گے؟“

”نہیں، کیونکہ جس کمپنی سے مجھے نکالا گیا تھا، اسے میں خرید چکا ہوں اور پولیس میں شکایت درج کروانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ وہ ثبوت مانگے گی جو میرے پاس نہیں ہے۔“

”پھر بھی وہ وہی کریں گے جو تم کہو گے۔“

”شک ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تمہیں گرفتار کر لیں۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں تمہاری آڑ لے کر اپنا پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان کی زبان کون روک سکتا ہے، پہلا سوال تو یہی سامنے آئے گا کہ میں نے چار سال پہلے تمہارا نام کیوں نہیں لیا تاکہ تم اسی وقت گرفتار ہو جاتے اور رقم بھی برآمد ہو جاتی اور اب میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ امیر اور طاقتور ہو چکا ہوں اور اپنے اثر و رسوخ کی بنیاد پر تمہیں گرفتار کروا سکتا ہوں لیکن ثبوت کہاں سے لاؤں گا۔ کبھی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ رقم مجھ سے آئی ہوئی یا میں نے چرائی تھی۔ اب اس معاملے میں میں کیوں کھسیٹ رہا ہوں۔“

”ہاں۔ وہ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ تم کس کس کی زبان بند کر دے؟“ اس کی باتیں سن کر میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا اور میں پہلے کے مقابلے میں اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ سب کچھ جان لینے کے باوجود ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔

اسٹارم کچھ کہنے والا تھا لیکن اچانک ہی رک گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کچھ شرمندہ نظر آ رہا ہے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کہا شروع کیا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں کوئی اور اس کی

بات نہ سن لے۔ ”میں ایک اور وجہ سے بھی پولیس کو اس معاملے میں شامل کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں تمہارے سامنے اس کی وضاحت کرنا چاہ رہا تھا لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہیں وہ وجہ بتا دوں۔“

اس نے اپنا گلا صاف کیا اور رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”بچ پوچھو تو ملازمت سے برطرف ہونا میرے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔ میں بہت پہلے اپنی بیئر کے فارمولے پر اہم تجربات مکمل کر چکا تھا لیکن مجھ میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کام کو شروع کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ملازمت چھوڑ دوں لیکن مجھ میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اگر تم وہ رقم نہ چراتے تو میں آج بھی اسی اسٹور میں منیجر کے طور پر کام کر رہا ہوتا اور اپنا کام شروع کرنے کا خواب ہی دیکھتا رہتا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں نے تم پر احسان کیا؟“

میں نے خوشی سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں، شاید اس سے بڑا احسان اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ”میں تم سے مصافحہ تو نہیں کر سکتا لیکن جاننے سے پہلے ایک مشورہ ضرور دینا چاہوں گا۔ تم اس پر عمل کرتے ہو یا نہیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یقیناً تم میری بات پر کوئی توجہ نہیں دو گے۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں پسند نہیں کرتا لیکن تم بہت نیچے چلے گئے ہو۔ جس طرح چار سال پہلے میرے ساتھ ہوا تھا۔ تم بھی میری طرح موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے حالات بہتر کر سکتے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا، اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا اور تھقبے لگانے لگا۔ میں چور نہیں تھا لیکن قسمت کی مہربانی سے چوری کرنے پر مجبور ہو گیا اور میری اس حرکت نے ایک شخص کی زندگی بدل دی اگر یہ ہو سکتا ہے تو اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ اسٹارم نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا کہ بھیجی قسمت پر بھروسہ کرنا نہ چھوڑو، کون جانے کب تمہاری کایا پلٹ جائے۔ جب میری ہنسی رکی تو داپس عقبی کمرے میں چلا گیا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر ایک سگار سلگا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بار قسمت میرا ساتھ دے گی اور میں کوئی نیا کاروبار شروع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اسٹارم نے مجھے پولیس کے حوالے نہ کر کے احسان کا بدلہ چکا دیا تھا اور اب مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔





مسافر

گل و گزار سے راہ پر خاریک ایک مسافر بے نوا کی رو و ادحیات
قسط نمبر : 20

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں... کبھی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کبھی آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پر ادل، پر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لڑش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کنھنایوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ میرا نام شہر یار ہے پیار سے شہر کہتے ہیں۔ میرا گھرانا حالی نپ غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والدہ ام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں میں پھوٹی کبری بھی رہتی تھی جنہوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ لے کر دیا تھا۔ میں نے لٹان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال و دیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر واپس آ گیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی مشقی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی دیکھ بھال کرتا تھا، جبکہ میرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے شخص، لیکن بڑے مگر کچھ قوی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان کی بیٹی اس کے یکطرفہ عشق میں جلا ہو گیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے علاوہ اس کا کزن ویرام خان

اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلک رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اس کی بیوی
 خراب ہوئی تو ہر کارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور وریام خان چونکہ ایک ختم مزاج شخص تھا اس لیے
 نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالانے اسے ناکام بنا دیا۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے
 کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رتھ مجھے کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھجوا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک
 سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہار الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب ہٹ کر
 پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چھبی اور میرا سارا جسم مفلوج ہو گیا۔ اسی دوران کھالابھی وہاں پہنچ گیا، غلط فہمی میں اس نے مجھے
 چاہا مگر حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد
 سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ یہ معاملات جاری تھے
 کھالے نے بتایا کہ اس نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا۔ اس سے ملاقات
 کے دوران لمبے بالوں والا نوجوان وہاں آ گیا اور ان دونوں کے درمیان کئی بات چٹائی شروع ہو گئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران
 کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موٹی کال ہو گیا۔ کھالو تو بھاگ نکلے میں کامیاب ہو گیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میں
 ملاقات مخصوص لب و لہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میر شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑ والے کی اور ہوا ابھی نہیں، میڈم نے
 نے مجھے چھڑو لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم ٹھیکہ تو قلع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر و رسوخ بہت تھا۔ میں
 نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی۔ یہاں سے فوراً
 ہو کر تھوڑے پورے پانچ تو ایک سانچہ میرا اختر تھا۔ چاہتا رہتا ہوا کہ پروین غائب ہے۔ میں میڈم ٹھیکہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ
 میڈم کی راہنمائی میں، میں نے دل جیت سے باز پرس کی۔ ایک خون ریز لڑائی میں اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے
 مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان بھی۔ ایک دن میڈم کے اڈے پر
 نے ایک کمرے میں اس کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا، اسی دوران اس کے اڈے پر
 ہوا۔ اس وقت وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ وہ میرا جگر دوست کھالو تھا
 استاد بیلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالو اس کی قید میں آ گیا
 میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اس کو انوارا کر لیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں نے
 تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالو اس کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ آخر کار طے یہ ہوا کہ ہم
 راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ بیانی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں
 حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوش کی حالت میں انوارا کر کے ڈیرے
 لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کر کے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود
 ہلاک کر کے پروین، عاشر اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ اس دوران ہمارے گھر
 نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچ
 اور بیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ البتہ موجود کو لے آیا۔ ہم اس جزدی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حد
 میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالو بہرہ پر بدل کر تھوڑے پورے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمہ داری مجھ
 ڈال دی گئی تھی جانکاد کی خاطر، بخت خان پھولی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے قارم ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک
 خوریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ کھالو امیر اساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم ٹھیکہ
 نے مجھے اس کو اس کے خریدار، حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کر کے رقم وصول کرنے کی ذمہ داری دی اور ایک شخص کو میرے ساتھ
 دیا۔ ہم اس کو لے کر جب دلبر حسین کے گھر گئے رگھو قسانی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ وہی تو میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں
 نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش تھی۔ اس نے رگھو قسانی
 کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا۔ وہاں سے واپسی پر چاکلک مجھے انوارا کر لیا گیا۔ مجھے انوارا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موٹی کا دوست
 زور آور تھا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کر چکا تھا، کئی خوریز معرکوں اور آنکھ بھولی کے بعد میں اس کی قید سے رہا ہونے میں کامیاب
 ہو گیا۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشر کے عاشق شاہد سے ہو گئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہد نے
 کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو حقیقت چاچا کی جانکاد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑا کہ
 چونکہ اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین بھیا نے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہر حال میں نے
 کر کے وہ کاغذات سنبھالے اور میرے رابطہ کیا۔ میڈم کو ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کر دی میں نے
 کر کے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندہ ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے
 باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خوریز معرکہ ہوا اور جیرو ماچھی خنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس پر
 پا کر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ جو ہما کی دسترس سے دور نکل گیا تھا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا
 ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پا کر عالیہ نے اسے اپنے
 مظلوم لڑکی کی بیٹیہ پلٹ گئیں کی کہانی سنائی جو اپنے بچاؤ ڈیرے اور زخمی اور قاتل جی کے قلم کا شکار بھی بنا وہی در خواست پر میڈم نے ساتھ دیا اور مجھے

مسافر

تھے۔ اسی پر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کر رہے تھے کہ پیر و ماچھی نے
 ہمیں روک دیا۔ وہاں آچکا تھا اور ملاح دینا کے کہیں میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس
 سے اپنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے انوارا کر لیا تھا۔ میرے لیے
 یہ سب کچھ تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے فوراً پور جا کر یارن خان کے بارے میں
 سب کچھ جاننے کی ذمہ داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیت اب دیا اور میں اس سوانگ میں
 اور پٹھان کھالو مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں
 لڑکی کی تصویر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہو گیا۔ وہیں ایک بندے سے میری
 ملاقات ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کر کے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ
 غزالہ زادی کی تھی۔ پرویز پر قابو پانے کے بعد میں نے غزالہ کا ہاتھ تلاش کیا۔ غزالہ نے برکت سح سے مذہب پھیر ہوئی اس سے سخت تک و دو کے
 بعد غزالہ کی ماں جی اور سیو کے بارے میں دریافت کیا اس کے مطابق وہ دونوں آغا نورن کے پاس تھے۔ یارن خان کے سلسلے میں ناکامی ہوئی وہ
 غزالہ کے پاس کامیاب ہو گیا باہر پولیس نے گھیرا ڈال لیا تھا یہاں برکت میرے کام آیا میں خانزادی کو لے کر ایک سرنگ کے ذریعے باہر آ گیا۔ خانزادی کو
 میں کھالے کے حوالے کیا اور ماں اور سیو کی تلاش میں نورن آغا کے ٹھکانے پر پہنچا۔ اسے بے ہوش کر کے ان دونوں کو ساتھ لے کر میڈم کے پاس پہنچا
 مگر میڈم میری توقع کے برخلاف ناراض تھی۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی لیکن میڈم نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔ اور ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میرے
 ماں باپ کے قاتل رگھو قسانی کو اس نے اٹھو لیا تھا۔ کھالے نے بتایا کہ حیدر خان سخت پریشان ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے میڈم سے مشورہ
 کر کے اسے ہوش میں ملاقات ملے کرنی۔ حیدر خان یارن کی بیٹی کو اٹھو لیا چاہتا تھا۔ میں نے میڈم کی مرضی کے مطابق دو کروڑ میں سودا ملے کیا۔ اسی ہوش
 نے کر کے میں میڈم میری خسر تھی۔ پھر عینیں و رعین لکھات کے دوران میڈم ٹھیکہ نے اپنے ماضی کے اوراق سے پردہ اٹھایا کہ وہ ایک امیر زادی کی
 باہر لاوا تھی اور ایک چوکی پر دریا میں بہتی ہوئی ٹھیکہ کے گانمن کے پاس پہنچی اور اس نے اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا۔ امیر زادی کو بھی اس کا علم ہو گیا اور
 اس نے اس کی تعلیم کی خواہش کا اظہار کیا۔ گانمن نے اسے اسکول میں داخل کر لیا اور اس کو چند ماہی کے نام سے پکارنے لگا۔ جوان ہونے پر میرا نظریہ
 حیات کے بڑے عمر حیات نے اس سے چھوڑ چھاڑ کی کوشش کی جس کی شکایت اس کے باپ سے کی گئی صدے سے اس کا ہارٹ ٹل ہو گیا عمر حیات اس
 کو سردار گانمن اور چند کوٹھہرا تا تھا اور انتقام پر بند تھا اسی کوشش میں اس نے گانمن کو قاتل کر کے زخمی کر دیا۔ مجبوراً چند اس کے ساتھ جانے پر راضی
 ہو گیا یہاں اس نے اسے مارا بیٹھا پھر شرمندہ ہوا اور اسے واپس چھوڑ گیا لیکن اب گانمن اور اس کا گھرانہ چند سے سخت ناراض تھا۔ عمر حیات نے اسے
 اپنے گھر لایا اور اسے کورٹ میرج کے لیے ساتھ لے گیا اور دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے تھے کہ عمر حیات کی ماں اپنی بیٹیوں کے ساتھ آڈے آ
 گیا یہاں کچھ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس کی ماں ان دونوں کی شادی پر راضی ہو گئی اس شرط کے ساتھ کہ پہلے چند اپنی تعلیم مکمل کر لے گی حویلی میں
 وہ حویلی میں آ کر اس نے تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور میٹرک میں پورے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران عمر حیات کا ماسوں رضوان ان کے
 ساتھ آ کر کوششیں اور دین دار شخص تھا۔ اس نے چند کے مستقبل کے بارے میں تشویش ناک اور حیرت انگیز پیش گوئیاں کیں۔ پھر ایک غلط فہمی کے نتیجے
 میں عمر حیات نے چند پر تشدد کیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اسے لینے آیا لیکن چند نے انکار کر دیا اسی دوران ملک
 آرمی کی گاڑی وہاں سے گزری جو کہ ایک بد معاش اور عیاش آدمی تھا اس نے عمر حیات کو گولی مار دی اور چند کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر
 لے آیا جہاں اس کے کمرے میں چند کو یارن خان کے ہاتھ فروخت کرنے کا پلان بنایا اور رات کی تاریکی میں شراب کے نشے میں اس کے پاس پہنچ
 گئے۔ ہاتھ اور لالو نے باری باری اسے پامال کیا اور پھر ستوار کر یارن خان کے کارندے رگھو کے حوالے کرنے کی کوشش کی، اسی دوران جانو نے لالچ میں
 لالہ لالہ کو روایا لیکن رگھو جو لالو کا دوست تھا اسے بھی جان سے مار دیا۔ یارن خان کے بعد حیدر خان کے پاس سے ہوتے ہوئے چند میاں دلبر حسین کے
 ہاتھ پہنچے۔ اس کے ساتھ ایک ہی سلوک کیا جس کے باعث وہ حاملہ ہو گئی، دلبر حسین نے اسے اپنے نوکر مظہر کے حوالے کر دیا۔ وہاں فرار کی کوشش
 کے بعد مظہر کو چند نے قتل کر دیا۔ یہاں ڈاکٹر شاہ جی نے اس کی مدد کی اور اس کے بچے کو اپنا نام دینے کے لیے پناہ کے ساتھ ہی شادی پر بھی تیار ہو گیا۔
 یہ سب صرف کاغذی حد تک۔ اسی دوران اس کے بیٹی پیدا ہوئی جسے ڈاکٹر نے چند کی مرضی سے اپنے دوست کے حوالے کر دیا پھر پلان کے مطابق اس کو
 قاتل سے گرفتار تک ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ جہاں اس کی ملاقات جوزفین سے ہوئی جس نے اسے اجمل گیلانی کے متعلق بتایا جو مالدار آدمی تھا اور قریب
 لاکھ لاکھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ چند کی اجمل گیلانی سے شادی کے بعد ساری جائیداد اس کے نام منتقل ہو جاتی ہے لیکن اس کے انتقال کے بعد عمر حیات
 کے خلیفہ پولیس کو لے کر آ جاتی ہے اور اپنے بھائی عمر حیات کے قتل کے الزام میں چند کو گرفتار کراتی ہے جہاں انسپٹر بدر داس بے عزت کرنے
 کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اسے قتل کر کے نکل جاتی ہے اور مشکلات سے گزرتی ہوئی اجمل گیلانی کا گینگ سنبھال لیتی ہے اور چند سے ٹھیکہ بننے کی کہانی ختم
 ہو جاتی ہے۔ پھر میڈم رگھو قسانی میرے حوالے کر دیتی ہے۔ ایک سنسنی خیز مقابلے کے بعد رگھو مات کھا جاتا ہے اور مجھے میرے باپ کے قتل اور قاتلوں کے
 قاتل کا نام ہے۔ میرے ماں باپ کو یارن خان نے حیدر خان اور میاں دلبر کے تعاون سے قتل کروایا تھا اس انکشاف کے بعد میں نے رگھو قسانی کو جہنم
 بھیج دیا۔ میڈم نے مجھے گھینے کے ہمراہ نوروز بھٹی اور اس کے خاندان کی تباہی کی ذمہ داری سونپی۔ ایک خوریز معرکہ کے بعد نوروز کے بیٹوں کو ہلاک
 کر کے میں کامیابی ہوئی۔ اسی دوران گھینے شدید زخمی ہو گئی میں اسے زخمی حالت میں کسی اسپتال میں لے جا رہا تھا پولیس تعاقب کر رہی تھی کہ ایک صحت
 مند شخصہ نوروز کے پر میری اس سے ملاقات ہو گئی۔

دل کی طرح زندگی کے موسم بھی غیر یقینی ہوتے ہیں۔ دھوپ میں بارش برتی ہے اور بریلی ہوا میں بدن کے مسام میں سے پینا نکال سکتی ہیں۔ اس کا علم مجھے زندگی کی اس کھڑی میں ہوا تھا۔

میری گزشتہ زندگی کی سب سے بڑی طلب میری نگاہوں کے سامنے تھی اور میں بہت زیادہ خوش ہو کر رقص کرنے کے بجائے خالی الذہنی کی سنگین کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ نگینہ سرد فریٹ پر، میرے پیروں میں، چت پڑی تھی۔ پہلے بے ہوش تھی، اب کراہنے لگی تھی، گویا ہوش میں آنے لگی تھی مگر مجھے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔ میرے سامنے کھلے دروازے کو تھامے پروین ساکت کھڑی تھی..... میری پیٹو..... جسے نور پور سے اخوا کر کے میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا گیا تھا اور قسمت نے مجھے عام سے دیہاتی بودوباش سے نکال کر دنیا کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے دل کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی خوشی کے اس عظیم اور جاں مسل لمبے سے میری طرح ہی خالی الذہنی کی کیفیت میں ڈوب کر گزر رہی تھی۔ میرے لبوں سے اجنبی سی آواز برآمد ہوئی۔ ”پیٹو! تو؟“

اس کے ہونٹ لرزے۔ آنکھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ وہ ایک جھٹکے سے بڑھی اور میرے اور اپنے درمیان فرش پر پڑی ہوئی نگینہ کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے سینے سے لپک گئی۔ وہ دیوانہ وار مجھے بانہوں میں کس رہی تھی اور رورہی تھی۔ اس کا بدن جھٹکے لے رہا تھا۔ وہ ایک ہی جملہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ”اللہ حمید! بہوں بہوں شکر اے..... میں اپنے ویر کوں جیندا جاگدا دیدھی پی آں!“

(اے اللہ! تیرا بہت بہت شکر ہے کہ میں اپنے بھائی کو زندہ وسلامت دیکھ رہی ہوں)

میں نے اسے بہ وقت خود سے علیحدہ کیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ایسے ہی وقت میں نگینہ ذرا زور سے کراہی۔ پروین نے چونک کر اُسے دیکھا، بولی۔ ”یہ کون ہے بھائی؟ اُسے کیا ہوا ہے؟“

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نگینہ کی حالت اس جھٹکے کی متحمل نہیں تھی جو اسے فرش پر گرنے کے سبب لگا تھا۔ میں نے جبکہ کر نگینہ کو اٹھانے کی کوشش کی تا کام رہا۔ اس کا وجود بھاری ہو گیا تھا یا میری توانائیاں کمزور پڑ گئی تھیں۔ پروین نے میری مدد کی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم ٹھیک ہونا؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں بھائی! میں ٹھیک ہوں۔ تم اسے“

اندر لے آؤ۔“

اس کی آواز جذبات کی شدت سے بھرائی ہوئی تھی۔ میں نے نگینہ کو سنبھالا۔ ایسے ہی وقت میں پولیس کے ہونڈ کی آواز قریب آگئی۔ میں جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ پروین نے میرے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بھائی! خیر تو ہے؟ تم اس حال میں کیوں ہو؟“

اس کا اشارہ ایک ہی وقت میں میرے خون سے ز لباس اور نگینہ کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف تھا۔ میں نے اسے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ”کیا یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟“ میری کم بختی یہ تھی کہ پروین، جس کو پانے کی آرزو ہر وقت دل کو بے چین رکھتی تھی، اس موقع پر پئی تھی کہ اس سے گزشتہ مرحلوں، جن سے وہ گزر کر اس دور افتادہ اسپتال کے کوارٹر میں پہنچی تھی، کی تفصیل بھی پوچھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وقت بہت کم تھا۔ مجھے نہ صرف نگینہ کو فوری طبی امداد دینی تھی بلکہ اپنے پیچھے لگی ہوئی پولیس سے بھی چھپنا تھا۔

پروین میرے پہلو سے نکل کر میرے آگے آئی۔ ہاتھ سے کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اے ادھر لے آؤ۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں موجود ہیں۔“

ہونڈ کی تیز آواز نہایت قریب پہنچ کر رُک گئی۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس کی موبائل وین اسپتال کے گیٹ پر آن پہنچی تھی۔ میں نے ایک بار کی قدم بڑھائے۔ جس دروازے کی طرف پروین نے اشارہ کیا تھا، وہ بند تھا۔ میں نے پاؤں کے دباؤ سے دھکیلا تو کھل گیا۔ کمرے کے اندر روشنی کم تھی مگر ایسی بھی کم نہیں تھی کہ اپنے سینے سامنے کھڑے ڈاکٹر شاہ جی کو پہچان نہ پاتا۔ چونکہ نگینہ کی پریشانی کی بدولت میں نے پروین کے سیاق و سباق اور اس غیر متوقع محل وقوع کے بارے میں کچھ سوچا تھا اور نہ ہی کچھ دریافت کیا تھا، اس لیے ڈاکٹر منور علی شاہ کو کریدتی نظروں کے ساتھ اپنے سامنے پا کر حیرانی کا دوسرا اوجھکا لگا۔ میرے پاؤں تھم گئے۔

”دش..... شاہ جی آپ؟“

چونکہ پروین نے دروازہ کھولا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ہلکی آواز میں تھوڑی سی گفتگو بھی ہوئی تھی، اس لیے شاہ جی کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف جانے لگا تھا۔ بھی میرے دروازہ کھولتے ہی سامنے دکھائی دی بولا۔ ”شہر یار تم! ابھی یہ تو بڑی حیرانی اور خوشی کی بات ہے۔ میں اس دوران حیرت کے ابتدائی جھٹکوں سے سنبھل چکا تھا، بولا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی! یہ..... یہ نگینہ ہے۔ اس کے“

مسافر

شاہ جی ہے۔ حالت خراب ہے۔ پلیز! اس کا کچھ کیجیے۔“ ڈاکٹر شاہ جی کے تھمے ہوئے جسم نے کوئی حرکت نہ کی بلکہ اس کی کریدتی ہوئی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ ”مجھے پیچھے پولیس بھی آئی ہے؟“

میں نے جلدی سے سر ہلایا۔ ”جی سر!“

”کوئی واردات کر کے آئے ہو؟“ اس کا لہجہ سخت تھا۔ ”میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتا دوں گا ڈاکٹر شاہ جی! پہلے اس کو طبی امداد دیں ورنہ یہ مر جائے گی۔ بہت برا نقصان ہو جائے گا۔“ ڈاکٹر شاہ جی کے سخت رویے کے سبب میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔

ایسے ہی وقت میں بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ میں قدرے بلند آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر صاحب! باہر پولیس آئی ہے۔ گیٹ پر۔ کیا گیٹ کھول دوں؟“

ڈاکٹر شاہ جی کے چہرے کے گھمبیر تاثرات میں کوئی حیرانی رونما نہیں ہوئی۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا، پھر اپنے بائیں ہاتھ سے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم اسے ادھر لانا دو اور..... پروین! اپنے بھائی کو اندر لے جاؤ۔ دوسرے کمرے میں۔“

میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر شاہ جی نے دل ہی دل میں میری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر نگینہ کو چارپائی پر لٹا دیا۔ اس دوران ڈاکٹر شاہ جی کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جونہی میں نے نگینہ کو اٹھایا، اس نے آنکھیں کھول دیں، کراہتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”سر! ہم..... میں مر رہی ہوں..... درد..... ہائے!“

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ آہستگی سے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ اب تم ڈاکٹر کے پاس پہنچ چکی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں بچالے گا۔“

ایسے ہی وقت میں میرے کندھے پر پروین نے ہاتھ رکھا۔ ہولے سے کہا۔ ”بھائی! تم ادھر سے ہٹ جاؤ۔ آؤ! تمہارے ساتھ..... دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔“

میں نے سر اسیکی آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی نگینہ پر نگاہ ڈالی، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی اور پروین کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر گیلری میں آ گیا۔ پروین گیلری کے آخری کمرے کی طرف چل دی۔ ڈاکٹر شاہ جی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تھا۔ میں گیلری میں آ گیا۔ سوچا کہ مجھے دروازے سے جھانک کر باہر دیکھنا چاہیے۔ مگر ڈاکٹر شاہ جی کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو گیا ہو۔ اس کی تلاش کے تحت میں پلٹ کر کوٹھی کے بیرونی دروازے

تک آیا۔ تھوڑا سا کھول کر درز بنائی اور جھانکا۔ گیٹ اور اسپتال کی مرکزی عمارت کے عین درمیان میں اینٹوں کے سولنگ پر پولیس کی موبائل وین کھڑی تھی۔ ایک وردی پوش اہلکار ڈاکٹر شاہ جی کے سامنے کھڑا تھا جبکہ دو تین سپاہی وین سے نکل کر ارد گرد جھانکنے تاکنے میں مشغول تھے۔

ڈاکٹر شاہ جی کی سخت آواز میرے کانوں پڑی۔ ”میں نے تم سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی نہیں آیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی نہیں آیا۔ کوئی آئے گا تو میں تمہارے سامنے اطلاع کر دوں گا۔ ایک بار کہنا بھی وہی ہے، دس بار کہنا بھی وہی..... جاؤ! اپنا کام کرو۔ اپنے مطلوبہ افراد کو اسپتال کے باہر تلاش کرو۔“

وردی پوش کا چہرہ میری جانب تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا خوفناک چہرہ..... وہ قدرے مودبانہ لہجے میں بولا۔ ”سر جی! اسپتال کے باہر چند لوگوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ایک شخص ایک زخمی عورت کو اٹھائے اسپتال میں داخل ہوا ہے۔ ہمیں ان کی تلاش ہے۔ وہ قتل اور ڈکیتی کی واردات کر کے بھاگے ہیں۔ آپ ہمیں اسپتال کی تلاشی لینے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟“

ڈاکٹر کا ہاتھ فضا میں لہرایا، بلند آواز سنائی دی۔ ”اوئے کرم علی! کیا اسپتال میں کوئی آیا ہے؟ کوئی مریض یا زخمی؟“ کرم علی اسپتال کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ فی الفور جواب دہ ہوا۔ ”نہیں سر جی! میں نے تو ادھر کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ چند مریض آئے بیٹھے ہیں۔ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان میں تو مجھے کوئی بھی عورت زخمی دکھائی نہیں دیتی۔“

ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ اپنے مخاطب سے کہا۔ ”جوان! یہاں تمہارا مطلوبہ کوئی شخص چھپا ہوا نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس نے زخمی عورت کو اٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے، جلد یا بدیر، وہ یہاں آئے گا۔ ایسی صورت میں اسے ٹریسٹ دینے سے پہلے میں تمہارے اطلاع کر دوں گا۔ اپنا نمبر کرم علی کو نوٹ کروا دو۔ شاباش! اب جاؤ اور اپنا کام کرو۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

پولیس والا جو شانوں پر لگے پھولوں کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا، تلاشی لینے پر مصر تھا مگر ڈاکٹر شاہ جی کے سامنے اس کی دال نہیں گل رہی تھی۔ اس کے مقابل اگر کوئی عام شہری ہوتا تو وہ دھونس بجا کر اسپتال میں گھس آتا مگر وہ ڈاکٹر شاہ جی کے اختیارات اور اس کے اسکیل کی طاقت سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ آن ڈیوٹی ڈاکٹر کے ایما کے بغیر وہ اسپتال کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی ہانکنے کے

بعد مایوس ہو کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کرم علی کو اس کا فون نمبر نوٹ کرنے اور اسپتال کا مین گیٹ بند کرنے کا حکم دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوشی میں آ گیا۔ مجھے گیلری میں کھڑا دیکھ کر غیر محسوس مسکراہٹ اس کے لبوں پر تیر گئی، بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ پچھلے کمرے میں جاؤ مگر تم یہاں کھڑے ہو۔ اگر وہ سب اسپیکٹر ادھر آ جاتا تو.....“

میں جھجک کر خاموش رہ گیا۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”یہاں تمہارے لیے ایک حیرت کدہ سجا ہوا ہے۔ ہر قدم پر تمہیں حیرانی ملے گی۔ سر دست تم اپنی زخمی سانس کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کون ہے؟ تم اسے اس علاقے میں کیوں اس طرح اٹھائے پھر رہے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”شاہ جی! لمبی کہانی ہے۔ ذرا سانس لے لوں۔ تفصیل سے سب ماجرا کہہ سناؤں گا۔“

اس دوران ڈاکٹر منور علی شاہ لوہے کے پائپ والی چارپائی پر جھجک چکا تھا جس پر نگینہ چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے پیشہ وارانہ انداز میں نبض چیک کی، دل کی دھڑکن محسوس کی اور زخم کا جائزہ لینے لگا۔ میں دھڑکتے دل سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سیدھا ہوا اور فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ”شہر یار! جب تک گولی نہ نکالی جائے، تب تک اس کی حالت بہتری کی طرف نہیں آ سکتی۔ خون بھی زیادہ مقدار میں بہہ چکا ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”تو ڈاکٹر صاحب! آپ گولی نکال دیں۔ خون کی ضرورت ہے تو میں دینے کو تیار ہوں۔“

ڈاکٹر منور علی شاہ کا لہجہ بڑا سرد تھا۔ میرے بدن میں چیونٹیاں سی رہ گئیں۔ میں نے بے وجہ ادھر ادھر دیکھا۔ پروین کے خوفزدہ چہرے پر نگاہ دوڑائی، کہا۔ ”مگر میں اسے کہیں پھینک نہیں سکتا ڈاکٹر صاحب! وہ..... وہ.....“

میری سوئی ناگاہ آ نک گئی۔ ابھی میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا کہ میں میڈم شکیلہ اور اپنے شب و روز کے معمولات کے بارے میں شاہ جی کو کچھ بتاؤں گا یا نہیں۔ میں نے چہرے لمحے سوچا پھر شاہ جی سے کہا۔ ”کیا میں اسے ملتان لے جا سکتا ہوں؟“

”ہاں! بشرطیکہ تمہارے پاس گاڑی ہو۔“ ڈاکٹر منور علی شاہ نے غلٹ میں کہا۔ ”یار! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ کسی بھی لمحے مرنے والی ہے۔ اس کے مرتے ہی قیامت پھا ہو جائے گی۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو؟“

میں نے تھوک نکالا۔ خود کو سنبھالا دینے کی کوشش کی، کہا۔ ”شاہ جی! آپ اسے فرسٹ ایڈ دیں۔ اگر اسے مرنا ہی ہے تو خیر سلا..... میں آپ پر کوئی آج نہیں آنے دوں گا۔ پلیز! کوشش تو کریں..... اور کیا یہاں فون ہے؟“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ ابھی تک اپنے معمولات پر قائم تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا عملے کے کسی آدمی کے پاس بھی موبائل فون نہیں ہے؟“

میں نے کچھ تھا مگر وقت نہیں تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ لمبی سانس پھینکوں میں اتاری اور ترسان سے کہا۔ ”یہو! ایک ذرا نگینہ کی طرف سے دل کو سکون ہو جائے، پھر بہت سی باتیں کریں گے۔“

ڈاکٹر شاہ جی موبائل تھا سے لوٹے۔ میں نے جلدی سے فون لیا۔ میڈم کا نمبر ملایا۔ خوش بختری سے فوراً رابطہ ہو گیا۔ وہ خاصی متشکر تھی، بولی۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میڈم! وہ میرے ساتھ ہے۔ اسے بولی گئی ہے۔ حالت بہت خراب ہے۔“

”تم ہو کہاں؟“ میڈم مزید متشکر ہو گئی۔ ”میں اس وقت ایک سرکاری اسپتال میں ہوں۔ پولیس ہمارے تعاقب میں یہاں پہنچی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی نے انہیں فی الحال رخا دیا مگر یقیناً نا کام لوٹنے والے سب اسپیکٹر نے کئی قریب ہی مورچہ بنا رکھا ہوگا.....“

”کیا کہا؟ ڈاکٹر شاہ جی..... کیا تم نے ڈاکٹر منور علی شاہ کا ذکر کیا ہے ابھی؟“ میڈم کی تعجب سے معمور آواز میرے کانوں پر گئی۔

رک گیا۔ مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”تم اپنی بہن کو سنبھالو، میں تمہاری ساتھی کو سنبھالتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھیوں کے آنے تک زندہ رہ جائے۔“

میں نے کہا۔ ”میں آپ کی مدد کروں سر؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور کمرے میں چلا گیا۔ میں نے طویل سانس لی اور امید و بیم کے احساسات میں ڈوب کر پروین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ”چل بھائی! کمرے میں چل.....“

میڈم شکیلہ سے فون پر رابطہ ہو جانے اور ڈاکٹر شاہ جی کی طرف سے نگینہ کو فرسٹ ایڈ دینے کی ہامی بھر لینے پر مجھے ایک ذرا قرار آ گیا۔ امید بندھ گئی۔ میڈم کے اسپتال سے ایسولینس کو یہاں پہنچنے میں لگ بھگ پون گھنٹا لگ سکتا تھا۔ اس دوران اگر اللہ کی طرف سے نگینہ کی سانسوں کی مالا بندھی ہوئی تھی تو وہ بچ سکتی تھی۔ ڈاکٹر شاہ جی کی مہارت کا میں پہلے سے ہی قائل تھا۔

محافلہ محض میڈم کی مجھ پر عائد کی ہوئی نگینہ کی ذمہ داری کا ہوتا تو میں اسے اطلاع دینے کے بعد بالکل آزاد ہو چکا ہوتا مگر ایک رات کی ہنگامہ خیز ہمراہی کی وجہ سے مجھے نگینہ سے شدید نوع کی ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طرح کا احساس ندامت بھی میرے ذہن میں کچھ کے لگا رہا تھا کہ دو افراد پر مشتمل مختصر سی ٹیم کا اچھا سربراہ ثابت ہونے میں نا کام ثابت ہوا تھا۔ مشن کے آغاز میں ہی میرے بودے پن کی وجہ سے وہ مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ باوجود کہ وہ پیشہ ور فائر نہیں تھی اور نہ ہی نہایت نامساعد حالات سے نہر آ زمائی کے لیے تربیت یافتہ تھی، وہ نہ صرف حالات سے مردانہ وار لڑی تھی بلکہ اس نے غیر معمولی طویل دورانیے پر مشتمل درد کی کٹیلی ٹیسس نہایت ثابت قدمی سے برداشت کی تھیں۔

پروین مجھے آہستگی سے اپنی جانب کھینچ رہی تھی جبکہ میں اپنے پیروں پر کھڑا سوچ رہا تھا۔ پھر بے جان انداز میں کھینچتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لائی۔ یہاں اس کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ لوہے کے پائپوں والی دو چار پائیاں جڑی پڑی تھیں۔ دونوں پر عام نوع کے بستر لگے ہوئے تھے۔ دیوار پر چوبی کھوتی نصب تھی جس پر دو تین مردانہ اور اتنی ہی تعداد میں زنانہ سوٹ لنگ رہے تھے جو پروین کے علاوہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے تھے۔ چارپائی پر بیٹھے ہی دل میں ایک کانٹا سا

چھ گیا۔ شک کی کیشلی اور زہر خند لہر ذہن میں پیدا ہوئی اور آن واجد میں پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ پروین کمرے میں اکیلی نہیں رہتی تھی۔ اس بات کا احساس کمرے میں پڑی ہوئی مردانہ استعمال کی اشیا کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی کا سامان اس کے کمرے میں موجود تھا جس میں وہ اس وقت گلینڈ کو ابتدائی طبی امداد بہم پہنچا رہا تھا۔ تو پھر اس کمرے میں پروین کے ساتھ کون مرد رہتا تھا؟

چند لمحے قبل دل کو ملنے والی عظیم خوشی دم توڑتے ہوئے میری زخم خوردہ غیرت کے پیروں سے لپٹنے لگی، سسکنے لگی۔ میں نے اپنے ہونٹ زبان سے گلے کیے اور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ پروین میرے سامنے کھڑی بغور مجھے دیکھ رہی تھی۔ نظروں ہی نظروں میں میرے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نہ سمجھ پائی تو متفکر انداز میں پوچھنے لگی۔ ”تمہیں کوئی زخم تو نہیں لگا ہوا نا؟ بالکل ٹھیک تو ہونا تم؟“

میں اس کی پریشانی کا سبب فی الفور بھانپ گیا۔ میرا لباس خون آلود تھا اور اس کی آنکھیں خون کے بڑے دھبوں پر ثبت تھیں۔ ایسے میں مجھے اپنے زخم کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی گولی کا درد جاگ اٹھا جسے گلینڈ کی زندگی کے سوال نے محو کر رکھا تھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے زخم پر جاٹکا۔ ایک طویل سانس حلق سے خارج ہوئی۔ شکست خوردہ سے انداز میں کہا۔ ”پیتو! تیکو پتا اے جو بھر غیرت دے سرنا نویں نال جیندن..... دل ڈسا! اتھ کون رہندے جیڈے کٹھے؟“

(پیتو! تم جانتی ہو کہ بھائی غیرت کے عنوان کے ساتھ زندہ رہتے ہیں۔ پھر بتاؤ! تمہارے ساتھ یہاں کون رہتا ہے؟)

وہ مجھے دیکھ کر خوشی میں اپنی پوزیشن بھول بیٹھی تھی۔ اس لیے میرے لہجے سے ہویدا تشکیک اور سرد مہری نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ ارد گرد دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بھائی! تم بیٹھ تو جاؤ۔ میں سب کچھ بتا دیتی ہوں۔“

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“ میرا لہجہ ایک دم درشت ہو گیا۔

اس نے آنکھیں چراگئیں۔ چہرہ خنجر ہوا۔ ایک قدم بے اختیار پیچھے ہٹی۔ میرے سمجھنے کے لیے یہی بہت کچھ تھا۔ سبھی دل دھک سے رہ گیا۔ اپنی آواز کسی گہرے کنویں سے برآمد ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”پپ..... پانی..... میکون پانی پوا!“

(پپ..... پانی..... مجھے پانی پلاؤ!)

وہ کمرے کی ٹکڑ میں دھری ہوئی چوبی میز کی طرف بجلی کی سی تیزی سے گئی، پانی کا گلاس بھر لائی۔ میں نے ایک ہی سانس میں ٹھنڈا پانی حلق سے اتارا مگر سینے میں لگی ہوئی آگ نہ بجھ پائی۔ بدستور بھڑکتی رہی۔ اپنی لافانی بہن کو سرد نظروں سے دیکھا، پوچھا۔ ”یہاں کون رہتا ہے تمہارے ساتھ؟“

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند لمحے مجھے شاکی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر سسکنے لگی۔ ایک ایک کر بولی۔ ”ہاں! میں تمہاری عزت ہوں، غیرت ہوں۔ کتنا عرصہ مصلے پر بیٹھ کر پانچوں وقت رو کر خدا سے تمہاری سلامتی کی دعا کیں مانتی رہی۔ اس لیے..... اس لیے..... کہ جب تم مجھے نظر آؤ تو تمہاری آنکھوں میں میرے لیے شک ہی شک بھرا ہوا ہو۔ تمہاری غیرت میری محبت کو نگل چکی ہو..... اور..... اور تم مجھ سے پوچھو کہ میں کس کے ساتھ یہاں رہتی ہوں..... ہے نا؟“

میرا سر جھک گیا۔ آگ کی لپٹیں سینے میں بدستور اٹھتی رہیں۔ سانسوں کی دھونکی غیر محسوس انداز میں تیز ہو گئی تھی۔ جی چاہا کہ اسے بڑھ کر سینے سے لگا لوں۔ جی بھر کر پیار کروں۔ جو ہوا، اسے بھول جاؤں اور اسے سہارا دے کر زندگی کا احساس دلاؤں مگر اپنی عزت کے نادیہ بت میں جیسے ہوئے کانٹوں کی فکر لاحق رہی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”بھائی! تم تو مجھے ان بے غیرتوں کے چنگل سے نہیں نکال سکے تھے نا..... بلکہ تم لوگوں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ میں کسی کے ساتھ منہ کالا کر گئی ہوں۔ جس طرح آج تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں کسی مرد کے ساتھ رہ رہی ہوں، گناہ کر رہی ہوں ایسے ہی پہلے بھی گناہ کرنے نکل کھڑی ہوئی تھی..... ہے نا؟ تم سب لوگ یہی سوچتے رہے اور وہ..... اور وہ..... مجھے تلاش کرتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ اپنے گھر بار، خاندان اور ماں باپ کی فکر کے بغیر ایک ہی میری تلاش میں نکلا تھا۔ اس سے میرا خون کا رشتہ بھی نہیں تھا..... اور پھر وہ خود بھی مجھے ان کتوں کی قید سے نکالنے کی کوششوں میں پکڑا گیا۔ میرے ساتھ باندھ دیا گیا۔ کینہ حیدر خان اسے سمجھاتا رہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اس اوٹھلی میں سر نہ دو ورنہ سر جاتا رہے گا۔ وہ کہتا رہا کہ سر تو ڈال بیٹا ہوں۔ سر جاتا ہے تو جائے، میں نہیں جاؤں گا۔ زندگی اس دہلیز پر ڈال جاؤں گا مگر اکیلا نہیں جاؤں گا۔ پری کو لے کر ہی جاؤں گا۔ ہاں بھائی! سبھی مجھے پیتو کہتے تھے۔ ایک ہی تھا جو مجھے پری کہتا تھا۔ وہ ضد کا پکا ٹکڑا۔ آخر مجھے وہاں سے

نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے لیے اپنا گھر بار، وطن، پارٹی سب چھوڑ کر آیا تھا اور مجھے ہر صورت میں قبول کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ ہاں بھائی! وہی میرے ساتھ اس کمرے میں رہتا ہے۔“

بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا۔ ”کون؟“

”بیاتی ہوں..... پہلے بن تو لو جو میں کہہ رہی ہوں۔“

”دور دے روتے چپ ہوئی تھی۔ مجھ سے چند فٹ دور کھڑی بڑے اعتماد سے بولنے لگی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب وہ ہنسی نہیں رہی تھی۔ پھر پور عورت بن چکی تھی۔ اپنا مدعا بیان کرنے کا ہنر سیکھ چکی تھی۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے تھما رہا تھا جبکہ آنسوؤں سے غم آنکھوں میں نامانوس سی جگ ابھر آئی تھی، بولی۔ ”وہ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس لے آیا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ مجھے اور اسے ڈاکٹر شاہ جی کے علاوہ دنیا میں کوئی پناہ نہیں دے گا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ہماری خاطر نور پور چھوڑ دیا اور بڑی سفارشوں کے بعد یہاں تبادلہ کروالیا۔ ہمیں یہاں لا چھایا۔ پھر ڈاکٹر شاہ جی نے ہم دونوں کو مجبور کیا کہ ہم شادی کر لیں۔ وہ نہیں مانا۔ وہ کہتا تھا کہ شہرے کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھائے گا۔ ہاں! مگر تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ تم سے ڈرتا تھا؟ نہیں

بھائی! جو شخص حیدر خان جیسے درندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہو، وہ تم سے کیوں ڈرے گا۔ اس کی فطرت میں ڈر کا رتی بھر عنصر بھی شامل ہوتا تو وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر نہ نکل کھڑا ہوتا اور میری خاطر اپنے خاندان سے یوں دیوانہ وار نکرانہ کیا ہوتا۔ ہاں! وہ ڈرتا نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ میرے راستے میں کوئی کاٹنا نہ رہے۔ پھر جب ہم سب نے، حتیٰ کہ میں نے بھی اسے مجبور کیا، سمجھایا تو وہ مان گیا۔ پھر شاہ جی ہمیں ملتان لے گئے جہاں ہم نے کورٹ میرج کر لی۔“

وہ پیچھے ہٹ کر میز پر ٹک گئی۔ ہانپنے لگی۔ سانس برابر کر کے، سر جھکا کے بولی۔ ”اب وہ میرا گھر والا ہے۔ میرا سائیکل ہے۔ میں اس کے ساتھ رہتی ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے اپنے جڑوں کے اعصاب کو حرکت دیتے ہوئے پوچھا۔ اس لمحے مجھے اپنی ذہنی کیفیت کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا چاہ رہا تھا اور کیا نہیں۔ حتیٰ کہ یہ سدھ بھی نہیں تھی کہ میں اس صورت حال پر غمزہ تھا یا مطمئن۔

”امیر نواز.....“ وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی، بولی۔ ”چاہے حیات خان کا بیٹا..... وہی مجھے بے غیرت حیدر خان

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ستمبر 2013ء کے شمارے کی ایک جھلک

بیادے ● سیاست کی دھندلچے مہوں کا دلخراش لڑنے خیر کھیل... پروین زبیر کا قلم

گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ

جواہری ● احمد اقبال کے شریں قلم سے ایک ناول فراموش تہلکہ خیز سلسلے کا آغاز

مغرب کے نالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیبی ماحول کی عکاسی اور محبت کی پڑوہ ناول قلم فرماتے کہانیاں



سرواز کی کہانیاں

● پہلی کہانی: بچھتاؤں کی نسلوں اور غفلت کی آگ میں جھلنے تڑاؤں کی چشم کشا داستان

● دوسری کہانی: طوفان لاوا ہلال میں مٹا لستے لگے ہوتے ہیں احتیاط کے لہجے والے بھلے جلتے ہیں اور.....

جلد نکلتی جلد نکلتی

پہلے کے نمبر سے... شکاری تین... کتھائیں

میں نے سر تسلیم خم کیا۔ ”آپ نے جو کیا، اچھا ہی کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی قوت فیصلہ مجھ سے کہیں بہتر ہے۔“

”اوکے!“

”جی سر! اس کا نام گنینہ ہے۔“

”زندہ ہے۔ یہ دیکھنے میں امریکن یا یورپین لگتی ہے۔“ ڈاکٹر شاہ نے دروازے میں ایک ذرا رک کر کہا۔ ”جبکہ نام ویسی ہے۔“

”جی! کینیڈا میں پلی بڑھی ہے۔ اس لیے ایسی دکھائی دیتی ہے۔ اُردو بول اور سمجھ لیتی ہے۔“

”وہ تو میں دیکھ ہی چکا ہوں۔“ ایسے ہی وقت میں سفید اپرن والا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت کوشی میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھیوں نے جدید طرز کا اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے ڈاکٹر شاہ کے کمرے میں جانے کا کہا اور اپنے پاس رکنے والے گنجنے سروالے شخص کی طرف متوجہ ہوا، اس نے پوچھا۔ ”مسٹر شہر یار؟“

میں نے ’نیں‘ کہا۔ وہ تعجبی انداز میں سر ہلاتے ہوئے پلٹا۔ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق زخمی عورت کو اسٹریچر پر منتقل کرو۔ ہری آپ!“

پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ ”میں ڈاکٹر یوسف امیر ہوں۔ میڈی کپلیکس سے آیا ہوں۔ ڈاکٹر ظہور اختر صاحب کے انڈر کام کرتا ہوں۔ یہ ایسوی لینس میڈی کپلیکس کی ہے۔“

میں نے تعجبی انداز میں سر ہلایا۔ وہ مزید بولا۔ ”آپ کے لیے ڈاکٹر ظہور اختر نے، میڈم شکیلہ صاحبہ نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ ایسوی لینس میں ہمارے ساتھ ملتان چلیں گے۔“

میں چونکا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اپنے تئیں میں نے سوچ رکھا تھا کہ گنینہ کو ایسوی لینس میں منتقل کرنے کے بعد میں فارغ ہو جاؤں گا اور چند دن یہاں رہوں گا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور پروین سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا اور آئندہ کالکچر عمل تیار کروں گا۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ سنا اور کہنا تھا۔ دو تین دن بعد امیر نواز واپس آنے والا تھا۔ اس کا شکر یہ ادا کرنا تھا۔

پروین پر گزرے ہوئے کڑے لمحات کی روداد بھی امیر نواز سے سننا تھی۔ کیونکہ میں وہ تمام غیرت پاش قصہ پروین سے سن نہیں سکتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے شاید بھول گیا تھا کہ میں

آزاد شخص نہیں تھا بلکہ میڈم شکیلہ کا ملازم تھا۔ اس کے علم پر پابند تھا۔ وہ یہ بتانے کی پابند بھی نہیں تھی کہ اس نے میرے لیے یہ حکم کیوں صادر کیا تھا۔

میں نے ایک ذرا سہارا لیا۔ ”مگر ڈاکٹر صاحب امیر آپ لوگوں کے ساتھ جانا ضروری بھی تو نہیں ہے۔ میں باہر میں آ جاؤں گا۔“

اس نے کندھے اُچکائے۔ ”آپ کا میرے ساتھ جانا ضروری ہے یا نہیں، آپ بعد میں آئیں گے یا نہیں یہ میرا کیس نہیں ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو ساتھ لانا ہے۔ آپ ساتھ چلیں گے تو ٹھیک وگرنہ میں جا کر ڈاکٹر صاحب سے کہہ دوں گا کہ آپ نے آنے سے انکار کر دیا ہے وہ جانیں، میڈم صاحبہ جانیں یا آپ۔ یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس کے سامنے ڈاکٹر شاہ جی کی رہنمائی میں گنجنے اسٹریچر پر لادے کمرے سے برآمد ہوئے۔ میں نے گنجنے دیکھا۔ اس کا چہرہ پیلا ہٹ پکڑ چکا تھا۔ جسم میں خون کی رنگت کو متحیر کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ اسٹریچر تھامنے والے گیلری میں رکے بغیر باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر شاہ جی نے ڈاکٹر یوسف امیر کو انگریزی میں کہا۔ ”گولی جسم کے اندر ہی ہے۔ کافی گہرائی میں، لگ بھگ چار انچ۔ میں نکال نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے کوشش ہی نہیں کی اسے نکالنے کی۔ البتہ اینٹی سپٹک لوشن لگا دیا ہے۔ ممکنہ حد تک زخم کی صفائی بھی کر دی ہے۔ بی بی کی کم ہے۔ راستے میں گاہے چپک کرتے رہے گا۔ امید ہے کہ آپریشن ٹیبل تک پہنچ جائے گی۔“

ڈاکٹر یوسف نے رکی انداز میں اس کا شکر یہ ادا کیا اور مجھے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کوشی سے نکل گیا۔

ڈاکٹر شاہ بولا۔ ”تو پر اہم! اگر تم اپنے لوگوں میں چاہتے ہو تو جاؤ۔ فارغ ہو کر یہاں آ جانا۔“

مجھے اپنے خون آلود لباس کا خیال آیا، کہا۔ ”اپنے جاؤں گا تو راستے میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤں گا۔“

نے آنکھوں سے اپنے لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ ایسوی لینس میں اپرن موجود ہے۔ پہن لیتا۔ سب کچھ چھپ جائے گا۔“

میں نے سر ہلایا۔ بھاگ کر پروین کے کمرے میں آیا۔ وہ دروازے میں کھڑی ہماری باتیں سن چکی تھی۔ مجھ سے

مسافر

کہنے لگی، کہنے لگی۔ ”بھائی! یہ کیا۔ ابھی آئے اور ابھی جانے لگے۔ ابھی تو میں نے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔“

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، سمجھایا۔ ”وہم نہ کرو۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔ دل کو قرار آ گیا۔ تمہارا ٹھکانا رکھ لیا۔ لوٹ کر یہاں آؤں گا۔ امیر نواز سے بھی ملوں گا۔ اسے بتا دینا کہ وہ میرا محسن ہے۔ میں اس سے ناراض نہیں ہوں اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جلد آؤں گا۔“

پروین کو دلا سا دینے میں کچھ دیر ہو گئی۔ ایسوی لینس کے ڈرائیور نے تاخیر کا احساس دلانے کے لیے ہارن بجایا۔ میں نے پروین پر الوداعی نظر ڈالی اور کوشی سے باہر آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی برآمدے میں کھڑا تھا۔ قدرے بے رخی سے ہاتھ ملا کر بولا۔ ”شہر یار! جلدی کرو ڈاکٹر صاحب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ جلد اسپتال پہنچنے کی کوشش کرو ورنہ یہ لڑکی اپنی زندگی کی بازی ہار جائے گی۔“

میں ایسوی لینس کے عقبی پورشن میں گنجنے کے اسٹریچر کے قریب سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ بائیں ہاتھ پر ڈاکٹر یوسف امیر بیٹھا تھا۔ وہ گنجنے کا ٹیبلٹ پر لے رہا تھا۔ نوٹ کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس سے اپرن مانگا۔

انہوں نے نکال دیا۔ سفید رنگ کا بڑا سا اپرن پہننے پر انہوں نے آلود لباس کافی حد تک چھپ گیا۔

ایسوی لینس اسپتال سے نکل کر سنگل روڈ پر گاڑن ہو گئی۔ چند لمحوں بعد فرائٹ بھرنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آتے ہوئے آپ کو راستے میں پولیس پارٹی ملی تھی؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا، پھر پوچھا۔ ”کوئی خطرہ ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! ہم دونوں پولیس کی نظروں میں آئے۔ ہماری تلاش میں ایک سب انسپکٹر پولیس باری نے اسپتال آیا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے اسے شہلا دیا۔ ممکن ہے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر دے، مڈ بھیڑ ہونے کا خطرہ ہے۔“

اس نے گنجنے کی نظروں میں سر ہلایا۔ قدرے بلند آواز میں ادا کر دیا۔ ”انور! پولیس روکے تو ہوڑا آن کرنا۔ بریک نہ لگانا۔ اوکے؟“

”نہیں سر!“

میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔ ”وہ موبائل وین پیچھے بھی لگا رہے۔“

ڈاکٹر یوسف نے کہا۔ ”شہر یار! آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا معمول ہے۔“

وہ میڈم شکیلہ کے گینگ کا تربیت یافتہ رکن تھا۔ نجانے کب سے میڈم کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے دعوے پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی اس لیے میں نے سیٹ سے کمر نکالی اور آنکھیں بند کر کے تن آسان ہو کر بیٹھ گیا۔ اس علاقے کے دور افتادہ اسپتال میں غیر متوقع طور پر ملنے والی عظیم خوشی کے بارے میں سوچتے لگا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا جس نے پروین اور امیر نواز کو زندہ و سلامت مجھے ملا دیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب میں بہت حد تک پروین کی بازیابی کے معاملے میں مایوس ہو چکا تھا۔

میں اس سڑک پر پہلی مرتبہ گزر رہا تھا۔ اس میں جاہ جاہ موڑ تھے۔ کئی ایک جگہوں پر بڑے بڑے گڑھے بھی پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر یوسف نے میرے استفسار پر بتایا کہ ہم شجاع آباد کی طرف نہیں بلکہ شجاع آباد کے پہلو سے نکل کر مظفر گڑھ جانے والی بڑی سڑک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آتے ہوئے یا اب واپسی کی راہ جاتے ہوئے کہیں پولیس سے ہماری مڈ بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد اچانک گنجنے کے جسم نے اسٹریچر پر جھٹکے لینے شروع کر دیے۔ ڈاکٹر یوسف امیر نے نہایت سرعت سے اس کو دیکھا بھالا اور سلیڈز رکاوٹوں کو کھول کر آکسیجن ماسک اوڑھا دیا۔ ٹرے میں تیار کر کے رکھا ہوا ایک انجکشن بھی اس کی رگوں میں انڈیل دیا۔ چند منٹوں کی تگ و دو کے بعد وہ پرسکون ہو گئی۔ میں نے ازراہ گفتگو پوچھا۔ ”اس کی حالت کیسی ہے؟“

ڈاکٹر یوسف نے کہا۔ ”حالت اچھی نہیں ہے مگر میرا خیال ہے کہ خطرے میں بھی نہیں ہے۔“

میں ایک بار پھر گنجنے کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا سوچوں میں غم ہو گیا۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد کافی دیر سے ہو رہا تھا۔ جب میں پروین کے کمرے میں بیٹھا تھا، تب بھی میرا سر بھاری بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ میں اس درد کی وجوہات سے واقف تھا۔ میرا معدہ گزشتہ شام سے خالی تھا، مسلسل بے آرامی درپیش تھی۔ بارہ بورگن کے کارتوس کا ایک چھرا میرے دائیں بازو میں لگا تھا۔ زخم خطرناک نہیں تھا۔ بڑا بھی نہیں تھا مگر اب دکھ رہا تھا۔ گنجنے کی فائر کی ہوئی گولی بھی دائیں بازو کا ماس پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ کافی خون بہہ گیا تھا۔ خون بہنے سے کمزوری ہونے لگتی ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا اور کمزوری کی بدولت سر میں اب دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ گولی کے بارودی ذرات

خاصے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ میں نے بے پروائی برتتے ہوئے ڈاکٹر شاہ جی سے زخم دھلوا یا نہیں تھا، اس لیے بارودی ذرات کا زہر بھی جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ بھوک، زخم اور بے سکونی کے سبب سر درد لاحق ہوا تھا جس میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خونریز مشن میں کامیابی، پروین سے ملاقات اور سانس لیتی گینہ کو میڈیم تک پہنچانے کی خوشی کے مقابلے یہ تکلیف بہت معمولی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ میڈی کپلیکس پہنچ کر اپنے زخم کی بینڈج بھی کرا لوں گا تا کہ زخم خراب نہ ہونے پائے۔

میری توقع کے مطابق ڈرائیور نے محض چالیس منٹ میں میڈی کپلیکس کے اندرونی گیٹ پر پہنچا دیا۔ ایسولینس رک گئی۔ ڈاکٹر یوسف امیر کے دونوں ماتحتوں نے برق رفتاری اور عین پیشہ وارانہ انداز میں گینہ کا اسٹریچر نکالا اور میکائیکی انداز میں دوڑتے ہوئے اسپتال میں داخل ہو گئے جب کہ ڈاکٹر یوسف وہیں رُک رہا۔

ان کے جانے کے بعد اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”شہر یار کو میڈیم کی کوٹھی پر پہنچا کر جلد واپس آ جاؤ۔ دوسری ایسولینس موجود نہیں ہے۔ کسی بھی وقت ایمر جنسی کال آ سکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! مجھے فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔“

وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟ آپ زخمی ہیں؟“ میں نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ادھر گولی لگی ہے۔“

”اوہ نو!“ ڈاکٹر یوسف کے ہونٹ سکڑ گئے۔ تاسف آمیز لہجے میں بولا۔ ”بھلے آدمی! پہلے بتا دیا ہوتا۔ ایسولینس میں فرسٹ ایڈ کا مکمل سامان موجود تھا۔ خیر! اندر ایمر جنسی وارڈ میں چلیں۔“

میں نے اس کی معیت میں اسپتال میں قدم رکھا۔ چند لمحوں بعد میں ایمر جنسی وارڈ میں تھا جبکہ ڈاکٹر یوسف ایک جوان العمر ڈاکٹر کو میرے چیک آپ اور علاج کی ہدایات دیتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر کی میز پر اس کے نام کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ اس کا نام ظفر اقبال تھا۔ کچھ تو اس کی عمر شبابی تھی، کچھ چہرے پر غیر معمولی معصومیت کا راج تھا جس سے وہ ڈاکٹر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ میڈیم شکیلہ کے اس سیٹ آپ میں کسی انارڈی شخص کی کوئی منجائش نہیں تھی۔ وہ یقیناً اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا۔ بازو پر خون جم چکا تھا جس کی وجہ سے کوشش کے باوجود ڈاکٹر میری آستین اوپر نہ کر سکا۔ میرے

کہنے پر اس نے قینچی سے قمیص کا بازو والا حصہ کاٹ دیا۔ اس کے باوجود زخم عریاں کرنے کے لیے اسے ہائیڈروجن پراکسائیڈ کی دو بوتلیں انڈیلنا پڑیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے مشینی انداز میں میرے بازو کا معائنہ کیا، بولا۔ ”دو زخم ہیں۔ ایک پر کھرنڈ جم گیا ہے۔ دوسرا بڑا زخم ہے۔ گولی بازو پر بھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے ورنہ کام بگڑ جاتا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے ایک اوپریٹر نرس اور ڈسپنسر کی مدد سے زخم کی صفائی کی۔ ماہرانہ انداز میں بینڈج کی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سر میں شدید درد ہے۔ اس نے انجکشن دینا چاہا تو میں نے جلدی سے اس پر واضح کر دیا کہ سر کا درد بھوک کی شدت کی وجہ سے ہے۔ خالی پیٹ انجکشن ری ایکشن بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ رُک گئے۔ پھر اس کے حکم پر نرس کیمٹن سے چائے اور بسکٹ لینے کے لیے چلی گئی۔

میں کوئی نصف گھنٹا کے قریب اسپتال میں رہا۔ اس دوران سر کا درد تو کم نہیں ہوا البتہ بازو کی تکلیف میں اضافہ کیا۔ میں نے اُسے کرید اور چاہا کہ مجھے گینہ کی حالت بار سے آپ ڈیٹ کر دے مگر وہ لاعلم تھا۔ اپنے کام سے رکنے والا شخص تھا۔ میڈیم کے گینگ کی یہ روایت بہت عجیب تھی کہ ہر آدمی اپنے کام پر توجہ دیتا تھا۔ کوئی بھی گینگ ممبر کی دوسرے کے کام میں ناگنگ نہیں اڑاتا تھا۔ دو انجکشن لگوانے کے بعد دواؤں کی پوٹلی اٹھائے اسپتال سے باہر آیا۔ ایسولینس کا لبا ترنگا ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُسے شاہ ڈاکٹر یوسف امیر نے میرا انتظار کرنے کا حکم دیا تھا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب میں میڈیم کی کوٹھی کا گیٹ عبور کر چکا تھا۔ میڈیم سے ملاقات میں خاصی تاخیر حائل تھی۔ اس لیے اپنے دیکھے بھالے گیٹ روم میں جا کر فراغت سے نہایا اور ہنگامی ضرورت کے پیش نظر رکھے ہوئے ملبوسات میں سے ایک سوٹ منتخب کر کے زیب تن کیا۔ اپنا خون آلود لباس کلف کرنے کے لیے اوپر بھجوا دیا۔ اس دوران کھانا سے کھانا آ گیا جسے بڑی رغبت سے کھا کر میں بیڈ پر درازہ گیا۔ شب بھر کی ٹھکن، بے آرامی اور تکلیف جھیلنے کے بعد لمبی نیند کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

☆☆☆

رات آٹھ بجے میں میڈیم کے کمرے میں تھا۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر براجمان تھی۔ بھینسی بھینسی مسور کن خوشبو کے ہالے میں گم اس کا وجود اپسرا کی مخلوق کی چٹائی کھار رہا تھا۔ وہاں میں گزرنے والی اس قیامت آگیں شب کی تمام تر جولا جلا

برقی کیموں میں ایک پل کو ابھرس مگر میڈیم کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر جو ہو گئیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گیا تھا۔ وہی تھی۔ میں کمرے کے وسط میں کھڑا بیٹھنے کی ہمت کا انتظار کر رہا تھا، وہ بولی۔ ”کیسے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”خند رست ہوں۔“

”رپورٹ دو۔“ میں نے اُسے مشن کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ قدرے غمی سے بولی۔ ”کیا اس طرح ٹیم کو لپٹا جاتا ہے؟“

مجھے اس سے اس سوال کی توقع تھی۔ جواب سوچ چکا تھا۔ ”جی میڈم! وہ واقعی بہت الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھے مارنے کے بعد وہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس لیے اس نے یہ ظاہر احسان کیا، لیکن حقیقت میں اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے اپنا اندازہ بیان کیا۔

میڈیم نے بڑی آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”نہیں شہر یار! وہ ایسے سودوزیاں کو خاطر میں لانے والی سرشت کا مالک نہیں ہے۔ در پردہ کوئی اور ہی وجہ رہی ہوگی اس کے اس طرح سرینڈر کرنے کی۔ خیر! آج نہیں توکل، سامنے آ ہی جائے گی۔“ جواب میں، میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ بولی۔ ”تم نے ایک اجنبی نمبر سے مجھے کال کیا تھا۔ کال منقطع ہونے کے بعد تم نے اس سل فون سے میرا نمبر مٹا دیا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”گذا! تم نے فون پر ڈاکٹر شاہ جی سے ملاقات کی بات کی تھی۔ کیا یہ ڈاکٹر منور علی شاہ ہی تھے؟“ اس کا انداز شخص یاد دلانے والا تھا۔ جذباتیت نام کو بھی لہجے میں شامل نہیں تھی۔

میں نے جواب دیا۔ ”میں میڈم! نہ صرف میری اس سے ملاقات ہوئی بلکہ میں اپنی بہن پروین سے بھی مل آیا ہوں۔ وہ خیریت سے ہے۔“ ”کیا وہ ڈاکٹر شاہ کے پاس ہے؟“ اس کا لہجہ پُر استعجاب تھا۔

”جی میڈم! اُسے امیر نواز نے سردار حیدر خان کی تحویل سے نکالا تھا اور فی الفور ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر شاہ جی نے دونوں کی کورٹ میرج کروادی ہے۔ اب

براہ راست ہماری کہیں نہ بھیج نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ زور آور کے بیانات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ویسے میں نے اسے ڈاج کرایا تھا کہ میں اور گینہ اکیلے نہیں ہیں بلکہ ہمارے ساتھ کئی اور لوگ بھی موجود ہیں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید وہ میرے ساتھ تعاون پر مائل نہ ہوتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”زور آور بہت ٹیڑھا انسان ہے۔ حیرت ہے کہ وہ اتنی جلدی تمہارے ساتھ تعاون پر کیوں مائل ہو گیا؟“ اس نے سوچتے ہوئے اپنی پیشانی سہلائی۔

”جی میڈم! وہ واقعی بہت الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھے مارنے کے بعد وہ میرے ساتھیوں کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جائے گا۔ اس لیے اس نے یہ ظاہر احسان کیا، لیکن حقیقت میں اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے اپنا اندازہ بیان کیا۔

میڈیم نے بڑی آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”نہیں شہر یار! وہ ایسے سودوزیاں کو خاطر میں لانے والی سرشت کا مالک نہیں ہے۔ در پردہ کوئی اور ہی وجہ رہی ہوگی اس کے اس طرح سرینڈر کرنے کی۔ خیر! آج نہیں توکل، سامنے آ ہی جائے گی۔“ جواب میں، میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ بولی۔ ”تم نے ایک اجنبی نمبر سے مجھے کال کیا تھا۔ کال منقطع ہونے کے بعد تم نے اس سل فون سے میرا نمبر مٹا دیا تھا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”گذا! تم نے فون پر ڈاکٹر شاہ جی سے ملاقات کی بات کی تھی۔ کیا یہ ڈاکٹر منور علی شاہ ہی تھے؟“ اس کا انداز شخص یاد دلانے والا تھا۔ جذباتیت نام کو بھی لہجے میں شامل نہیں تھی۔

میں نے جواب دیا۔ ”میں میڈم! نہ صرف میری اس سے ملاقات ہوئی بلکہ میں اپنی بہن پروین سے بھی مل آیا ہوں۔ وہ خیریت سے ہے۔“ ”کیا وہ ڈاکٹر شاہ کے پاس ہے؟“ اس کا لہجہ پُر استعجاب تھا۔

”جی میڈم! اُسے امیر نواز نے سردار حیدر خان کی تحویل سے نکالا تھا اور فی الفور ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر شاہ جی نے دونوں کی کورٹ میرج کروادی ہے۔ اب

ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کوٹھی پر رہتے ہیں۔“

اس نے خوشی آمیز حیرت کے ساتھ صوفے کی ٹیک چھوڑ دی۔ ذرا آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھ پر اپنی نظرس مرکوز رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس معاملے پر تفصیل سے بات کرو۔ میں سننا چاہتی ہوں۔“ شاید میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اپنی خوشی کو اس پر آشکار کرنا چاہتا تھا۔ جس طرح کسی دکھ یا تکلیف کے عالم میں انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ دکھ کو کسی پر عیاں کرے۔ اسے درون خانہ ہمدردی کے چند بولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے ہی خوشی کے موقع پر بھی آدمی کسی کو اپنا روضہ دکھانا چاہتا ہے۔ اپنا آپ کھول کر دکھانا چاہتا ہے۔ میں بھی یہی چاہ رہا تھا۔ مجھے جو چند ایک باتیں پروین نے بتائی تھیں، میں نے من و عن میڈم کے گوش گزار کر دیں۔ وہ تعجب بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ خاموش ہونے پر بولی۔ ”تمہاری بہن دیکھنے میں کیسی لگ رہی تھی؟ خوش یا ناخوش؟“

میں نے کچھ سوچا۔ باوجود کہ میں جتنی دیر اس کے پاس رہا تھا، وہ روتی رہی تھی، مگر میرا دل اس کے روم روم سے پھوٹنے والی خوشی کو محسوس کر آیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”وہ بہت خوش اور مطمئن تھی۔“

”تم دیہاتی ہو۔ دیہاتی مرد بہت غیرت مند ہوتے ہیں۔ دونوں کی شادی تمہیں ہنسن ہوگئی؟“ اس کا لہجہ بڑا کڑا تھا۔ میرا از خود سر جھک گیا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا تو میں نے کہا۔ ”میری غیرت زندہ ہے۔ میں ہر اس شخص کو تلاش کر کے نیست و نابود کر دوں گا جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پروین کو اغوا کرنے میں کوئی کردار ادا کیا تھا۔ رہی بات امیر نواز اور پروین کی شادی کی..... تو اس میں میرا خیال ہے بے غیرتی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی بہت اچھا انسان ہے۔ فرشتہ ہے۔ وہ غلط فیصلہ نہیں کرتا۔ اگر اس کی جگہ پر میں ہوتا تو شاید یہی کچھ کرتا۔“

”یعنی تمہیں یہ بات قبول ہے کہ تمہاری بہن کسی کو پسند کرے اور اس سے شادی کرنا چاہے؟“

”جی میڈم! میرا مذہب مجھے یہی کہتا ہے۔“

”ہم سب کا مذہب ایک ہے۔“

”جی! مگر..... عمومی طور پر عورت کے لیے مردوں کا رویہ اور سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ میں بھی گنوار تھا۔ مگر اب نہیں ہوں۔ آپ سے بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔ اگر مجھے اپنی پسند کی شادی کا حق حاصل ہے تو میری بہن کو بھی ہے۔“

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کیا جب تم نور پور میں رہتے تھے، تب بھی ایسا ہی سوچتے تھے؟“ وہ مجھے گہری نظروں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ”کہا تو ہے کہ میں پہلے ایسا نہیں تھا..... ڈاکٹر شاہ جی کی صحبت نے میرا زندگی کو دیکھنے کا انداز کسی حد تک بدل دیا تھا۔ پھر آپ کی باتوں نے نیا رخ دکھا دیا۔“ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر شاہ جی کی باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ میں اس سے پڑھا کرتا تھا۔ بہت کچھ سنا کرتا تھا۔ ان سنی ہوئی باتوں میں ایک بات یہ بھی تھی کہ مذہب اور قانون عورت اور مرد کے لیے ایک جیسی حدود رکھتا ہے۔ ان حدود کا احترام کرنے میں ہی معاشرتی بقا پنہاں ہے۔“

”کیا تم نے آج ڈاکٹر شاہ جی کو بدلا ہوا پایا؟“

”نہیں..... وہ بالکل ویسا ہی تھا، جیسا میں نے نور پور میں آخری مرتبہ دیکھا تھا۔“

”کچھ تو بدلا ہوگا؟“

”میں بخور نہیں دیکھ پایا کیونکہ میں نگینہ کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔“

”ہوں.....“ وہ کچھ سوچنے لگی۔ پھر پوچھنے لگی۔ ”بدلنے والی مٹی کا بنا ہوا نہیں ہے۔ پتھر ہے۔ اور ہاں! تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مقصد اپنی اغوا شدہ بہن کا حصول تھا۔ وہ مل گئی۔ اب تم بہت شانت ہو گے؟“

”جی میڈم! یوں لگتا ہے جیسے میرے سینے پر پڑی ہوئی بھاری سل ہٹ گئی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ یعنی اب تم زیادہ یکسوئی سے کام کرو گے۔ کیا خیال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں میڈم! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ چوبیس گھنٹے کی بے چینی سے نجات پانا اچھا بہت لگا ہے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

”تم نے ڈاکٹر شاہ جی کو میرے بارے میں بتایا؟“

”مثلاً کیا؟“ میں چونکا۔

”یہی کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہو؟“

”نہیں میڈم! موقع نہیں ملا۔“

”اگر تم اسے کچھ بتاتے تو تمہارے خیال میں اس کا عمل کیا ہوتا؟“ اس کی دلچسپی کھلنے لگی تھی۔

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”سوری میڈم! وہ بہت آدمی ہے۔ جہاں کچھ نہیں کہنا چاہیے، وہاں وہ کچھ بھی کہتا ہے۔ جہاں بولنا ہو، وہاں وہ خاموش رہ کر حیران کر سکتا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اپنے موبائل فون کسی سے رابطہ کرنے لگی۔ کال ملنے پر بولی۔

”صاحب! نگینہ کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دیں۔“

پھر سر جھکا کر بیٹھ گئی اور دوسری طرف سے دی جانے والی رپورٹ سنتی رہی۔ رپورٹ سن کر بولی۔ ”ٹھیک ہے..... اس کا خصوصی خیال رکھیے گا۔ اور ہاں! اُسے پوسٹ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا ہے نا؟“

دوسری طرف سے دیا جانے والا جواب سن کر مطمئن ہو گئی۔ کال منقطع کر کے مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”نگینہ کا کامیاب آپریشن ہو گیا۔ اب وہ بہت بہتر حالت میں ہے۔ ڈاکٹر ظہور اختر بتا رہا تھا کہ اُسے خون کی دو بوتلیں دی گئی ہیں۔ چند دنوں میں ہی چلتے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔“

شہر یار! تم نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا جو اُسے پیچک نہیں دیا بلکہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ساتھ چٹائے رکھا۔ اگر اس کی حالت دیکھ کر مایوس ہو جاتے اور راستے میں کہیں ڈال دیتے تو وہ یقینی موت کا شکار ہو چکی ہوتی۔“

مجھے اپنی تحریف پر خوشی ہوئی۔ اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے جواب نہیں دیا بلکہ کسی سوچ میں مستغرق ہو گئی۔

ایک ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ ”کیا میں بیٹھ جاؤں؟“

میرا پوچھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ ”اب تم میں کھڑے رہ کر تھک بھی گیا ہوں۔ اس نے صوفے کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ وہ بہ دستور اپنی دامن میں گن رہی۔ میں نے بھی اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھتے رہنا بھی بہت مشکل تھا۔ آنکھوں سے گزر کر اس کا حسن سر چڑھ کر

بولنے لگتا تھا اور خود پر اختیار لہجہ بہ لہجہ کمزور پڑنے لگتا تھا۔

ایسے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میڈم نے ”نہیں کم! ان! کہا۔ دروازہ کھلتے ہی زرینا کا چاند جیسا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھ لائی تھی۔

شاہ میڈم نے اُسے پہلے سے حکم دے رکھا تھا کیونکہ میری موجودگی میں اس نے زرینا کو ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی۔ زرینا کو دیکھتے ہی مجھے سونیا یاد آئی۔ اس کوٹھی میں

پڑنے والی پہلی رات میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، لان میں۔ اور وہ رات کو میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔ پھر خانزادی اس کا کوجب اغوا کر کے کوٹھی میں لایا گیا تو

میں سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ میری ثابت قدمی آزمائے کے لیے میڈم نے اس کی تیش انگیز جوانی کو چارہ بناتے ہوئے

میرے سامنے رکھا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی۔ پھر میرے دیکھتے

لگا دیکھتے اس کا جیتا جاگتا حسن اس کی غداری کے سبب

خاک میں مل گیا۔ میرا شاہ نے بڑی سنگ دلی سے اُس کے لیے موت کی سزا تجویز کی تھی۔

زرینا نے سر ہلا کر مجھے سلام کیا۔ ایک زندہ سکرابٹ سے نوازا، پوچھا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“

میں نے درست ہوں! کہا۔ میڈم نے اُسے چائے رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی ساکھی لڑکیوں کے بارے پوچھا۔

اس نے بتایا کہ رضوانہ ڈیٹ پر تھی جبکہ اس کی روم میٹ زیب النساء عرف زہبی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تین چار دنوں سے کمرابند ہوئی پڑی تھی۔

میڈم نے شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”زرینا آج فارغ ہے..... تمام رات..... تم اگر چاہو تو یہ تمہیں گیسٹ روم میں لے جا کر سلا سکتی ہے۔“

میں میڈم کا عندیہ بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”شکریہ میڈم! میں ایسا بھی تھکا ہوا نہیں ہوں کہ زرینا کو زحمت دوں۔“

زرینا شرارت آمیز انداز میں بولی۔ ”آپ ماس کے نہیں، پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔“

میں نے ذرا جھینپ کر چائے کا کپ اٹھالیا۔

”میرا شاہ نہیں آیا..... تم نے اُسے فون کر دیا تھا نا؟“ میڈم نے اُسے مخاطب کیا۔

”جی میڈم! میں نے اُسے آپ کا حکم سنایا تھا فون پر مگر ابھی تک نہیں آیا۔ شاید تھوڑی دیر میں پہنچ جائے۔“

”کہیں بگڑا نہ بیٹھا ہو؟“ میڈم کے لہجے میں ایک ذرا ناگواری اور شکایت کا عنصر شامل تھا۔

”جی میڈم! وہ ہے تو ایسا ہی..... پڑکھ رہا تھا کہ رات کو آ جاؤں گا۔“

”او! تم جاؤ..... ضرورت پڑی تو تیل دوں گی۔“

میڈم نے چائے کا کپ اٹھالیا، بغیر گھونٹ بھرے تپائی پر رکھ دیا اور موبائل فون سے الجھنے لگی۔ وہ کسی نمبر پر کال کرتی تھی، پھر فوراً ہی کال ڈیتی تھی..... وہ کسی سے بات کرنے کی خواہش رکھتی تھی مگر نامناسب خیال کرتے ہوئے اپنے ہاتھ روک لیتی تھی۔

ابھی زرینا کو کمرے سے نکلے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ میرا شاہ کی چٹختی ہوئی آواز میرے کالوں میں آئی۔ ”اڑے حسن کی دیوی..... جراثیم تو..... ایک آدھ غما (غمزہ) تو دیکھ لینے دیوت ناں اس سالے میرا شاہ کو..... تیرا کیا جاوت گوری..... چل اندر ماڑی رانی کے پاس.....“

میڈم نے ہونٹ جھنجھک کر مجھے دیکھا۔ بیک وقت ہم

دونوں مسکرائے۔ لمحہ بھر بعد زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ میں بے سبب ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ دیکھا۔ میرا شاہ آج بہت مختلف حلیے میں میرے سامنے تھا۔ اس نے جینز کی سیاہ رنگ کی تنگ سی پینٹ اور شوخ سرخ رنگ کی بوائے اسٹائل شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال تیل میں چڑرکھے تھے اور سیدھی مانگ نکال رکھی تھی۔ مجھے ہنسی کا دورہ پڑتے پڑتے رک گیا کیونکہ اُس نے بیروں میں اونچی نوک والا 'چیکو کھٹہ' پہن رکھا تھا جبکہ سر پر وکٹورین طرز کا ہیٹ۔ اس کا حلیہ کبھی بھی 'جائز' نہیں ہوتا تھا مگر آج تو اس نے حد کر رکھی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے میڈم کی طرف دیکھا جس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے میرا شاہ! ایسے کمرے میں داخل ہوا جاتا ہے؟" میڈم کا لہجہ خاصا برہم تھا۔ میرا شاہ نے زمین کی کلائی تمام رکھی تھی اور اُسے باقاعدہ کھینچتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ زمین کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی مگر میرا شاہ کی گرفت خاصی سخت تھی۔ میڈم کے قریب لا کر بولا۔ "جرمنا! جراثیدھر رکت..... بھاگ نہ لیوت۔ مہارانی بھی کمال کرتا ہے بڑے کمرے میں ایک آدھ تھوک دان بھی رکھ لیوت تو کیا کج (غضب) ہووت....."

اس نے زمین کا ہاتھ چھوڑ کر اُسے وہاں رکنے کا حکم دیا اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکلا۔ وہ گیلری میں پان تھوکنے گیا تھا۔ چند لمحوں بعد پھر مسخروں کے سے انداز میں اچھلتا ہوا زمین کے سر پر پہنچ گیا۔ میڈم کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھ مہارانی! جرمنا کو میرا شاہ نے اک گھڑی رکنے کا بولت پڑ یہ خزا دکھاوت..... بولے ٹیم نہ ہووت میرے پاس! کیا سالے میرا شاہ کی دو ٹکے قیمت بھی نہ ہووت اس شیش محل میں ایب کے؟"

میڈم نے ایک لمبی سانس سینے میں اتاری۔ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ "زمینا! کیا بات ہے؟" وہ ہونٹ بھیج کر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔ "یہ مجھے چھیڑتا رہتا ہے۔"

"تو.....؟" میڈم نے پوچھا۔ "تو کیا..... بس ایسے ہی۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میرا شاہ نے پھر اُس کی کلائی تمام لی۔ "بول کیوں نہ دیوت..... آگے بول دیوت ناں! کیا ایسے ہی....." ماڑے کو چٹا لگ جاوت کہ سالی یہ سمجھ لیوت کہ ادھر مال شال نہیں ہووت....."

"اس کا ہاتھ چھوڑ دو میرا شاہ۔ جانے دو۔" میڈم نے سختی کا مظاہرہ کیا۔ میرا شاہ ہنستے سے اکھڑ گیا۔ اونچی آواز میں داویلا کرنے لگا۔ اس کی لمبی چوڑی بیان بازی کا خلاصہ یہی تھا کہ اب میڈم کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی اس لیے اپنی دو ٹوکوں کی ملازماؤں سے اس کی بے عزتی کرواتی ہے۔ اس نے اپنی مخصوص اچھل کود کے ذریعے جب اپنا احتجاج ریکارڈ کروالیا تو میڈم نے قدرے بے پردائی سے زمین سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ایسے ہی سہی۔ تم میرا شاہ کو چھیڑنے دو۔ نہیں! بلکہ خود چھیڑو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ میرا شاہ کتنا بڑا سوراہا ہے۔"

"بہیں؟" زمین کے حلق سے کراہتی ہوئی آواز نکلی۔ "بس! کم آن!" میڈم نے ہاتھ لہرایا۔ زمین نے ٹرے تپائی پر رکھی۔ پلٹی۔ میرا شاہ اس کا ارادہ بھانپ گیا۔ کلائی چھوڑ کر پھدکتا ہوا بیڈ کی دوسری جانب چلا گیا۔ دونوں ہاتھ لہرا کر بولا۔ "آپ چلی جاوے تو..... ماڑے کو نمٹنا آوت ہے ایسے کچے پنچوں سے..... ابھی مہارانی تماشا دیکھنا مانگت پڑ تو چل بھاگ ایدھر سے....."

زمین میڈم کا اشارہ پا کر ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میڈم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بس میرا شاہ! بہت جلد پھوک نکل جاتی ہے تمہاری۔ نہ چھیڑا کر ان بے چاریوں کو۔ اگر میں نے انہیں اجازت دے دی تو یہ تمہارا ناطقہ بند کر دیں گی۔"

"ہاں! ہاں! ماڑے کو اندا جا (اندازہ) ہووت ان پھوکٹ ماریوں کے کرتوتوں کا۔ خیر! ان سے تو بعد میں میرا شاہ نمٹ لیوے گا اب اپنی رانی کے چرن چھووت..... اڑے غنچے! ماڑے لاڈے! ماڑی رانی کے پہلو سے چٹا بٹھت..... اڑے واہ! بڑی قسمت ماڑے شیر جوان کی!" میں نے ہنستے ہوئے سلام کیا۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر درباری انداز میں جواب دینے کے فوراً بعد ہی میڈم کی طرف مڑ گیا، بولا۔ "ہائے! یہ سالا میرا شاہ کجور (کمزور) نہ ہووت تو اس صوفے پر راتاں بھر چٹا رہوت۔ رانی! ماڑے لاڈے سے دل بھر جاوت تو اس کو پھوکٹ نہ جان لیوت..... ماڑی جان ہے اس غنچے میں....."

میڈم کے لیوں پر بے ساختہ مسکراہٹ تیر گئی، بولی۔ "ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔ خدا جانے تم صبح صبح کیا کھا کر گھر سے نکلتے ہو۔ شام تک تمہاری بوتلی بند نہیں ہوتی۔ بولتے بولتے تھکتے بھی نہیں ہو۔"

"بولن ہی رہ گیا سالی جندگی (زندگی) میں۔ کرن کو تو چھریا مانگے سالی جوانی....." اس نے میری طرف اشارہ کر کے بڑے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ "بول دے رانی! کیوں بلا یا ماڑے کو ایدھر؟ کیا ماڑے کو اپنی عاشقی معشوقی کا تماشا دکھانا ہووت؟"

"بکو اس نہ کرو۔ خاموش رہو۔" میڈم نے ڈانٹا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا شاہ پر میڈم کے غصے اور ڈانٹ پر ہلکا سا مطلق اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جب تک میں نے میڈم کی رام کہانی نہیں سنی تھی، مجھے اس کے رویے اور میڈم کی دی جانے والی غیر معمولی رعایتوں پر حیرانی ہوتی تھی۔ وہ منہ پھلکا کر بیڈ کی ٹکڑ پر ٹک گیا۔ میرا جی چاہا کہ میرا شاہ سے اس کے نئے حلیے کے بارے دریافت کروں مگر میڈم کو سنجیدہ دیکھ کر خاموش رہا، وہ بولی۔ "شہر یا راپنا مشن مکمل کر آ یا ہے۔ تم کہو! اس کے پیچھے شجاع آباد تھانے میں کیا کارروائی ہوئی؟"

اس کا موڈ خراب تھا۔ بگڑے ہوئے لہجے میں اس نے بتایا کہ پولیس کے ہاتھ بھی خاندان کی حویلی سے سوائے لاشوں کے کچھ نہیں لگا تھا۔ نوروز بھی کے دونوں بیٹوں اور ہیرے داروں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے بعد پولیس ادھر ادھر ٹانگ ٹوئیاں مارنے میں مصروف تھی۔ مقدمے کا اندراج نہیں ہوا تھا کیونکہ کوئی مدعی سامنے نہیں آیا تھا۔ میرا شاہ نے یہ بھی واضح کیا تھا کہ وہ شجاع آباد سے آج لو بجے ملتان کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ نو بجے کے بعد وہاں کون سے گل کھلے، کیا پلان بنائے گئے، کیا کارروائی ہوئی، اُسے علم نہیں تھا۔

میڈم نے کہا۔ "کیا تھانے میں تمہاری علیک سلیک والا کوئی بندہ نہیں ہے؟"

اس نے جوش میں اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ذرا زور سے پڑ گیا۔ 'اوف' کی آواز نکال کر چھانی سہلانے لگا۔ منہ بنا کر بولا۔ "ہائے جوانی! غارت کر دیجو ماڑے کو..... دو سالے ہووت میرا شاہ کے ادھر تھانے میں۔ پر ماڑے سے یہ کیوں پوچھتے لاڈی رانی؟"

"رابطہ کر کے اپنی معلومات آپ ڈیٹ کرو۔" میڈم نے حکمانہ انداز میں کہا۔

"اڑے واہ رانی! کیا انگریزیاں (انگریزیاں) بولت میرا شاہ سے..... جندہ باد! یہ لو..... ایک دم بات کر لیوت اپنے سیکریٹ ایجنٹ سے۔" میرا شاہ نے سیکریٹ ایجنٹ کچھ اس انداز سے کہا کہ میں اور میڈم بے ساختہ

نہیں پڑے۔

اس نے فون نکالا۔ کوئی نمبر تلاش کرنے لگا۔ بڑبڑانے لگا۔ "ماڑی انگریجی پر کھی کھی کر لیوت رانی جی! پڑ ماڑے سوا کوئی دل والا دکھائی نہ دیوت جالم دنیا میں تیرے کو..... کدھر گیا سالا سیکریٹ ایجنٹ..... ادھر چھپا بیٹھا ہووت..... چل بات کر ماڑے سے....."

اس نے کال کی۔ رابطہ ہونے پر اپنے 'ایجنٹ' سے رپورٹ طلب کی۔ دو تین منٹ تک سنا رہا پھر اُسے اپنے مخصوص انداز میں ڈانٹنے پھٹکنے کے بعد فون بند کر کے میڈم کو بتانے لگا کہ دوپہر کو نوروز بھی تھانے پہنچ گیا تھا اور اس نے اپنے چند رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ تمام لاشیں وصول کر لی تھیں۔ اس نے نگینہ بھی اور اس کے چھٹا معلوم ساتھیوں کے خلاف ابتدائی رپورٹ درج کروادی تھی۔ اس خوریز واردات کی عینی شہادت اس نے اپنی اور دو ملازموں کی لکھوائی تھی۔ حسب دستور زمانہ اس نے حقیقی واقعات کے ساتھ برابر آمیزش کرتے ہوئے ایف آئی آر میں واردات کی نئی کہانی پیش کی تھی اور نگینہ کو بد چلن قرار دیتے ہوئے وجہ عناد یہ لکھوائی تھی کہ وہ اور اس کے دونوں بیٹے اپنی چچا زاد نگینہ کو آوارگی اور بد چلنی سے منع کرتے تھے، اس لیے وہ ایک رات گھر سے بھاگ گئی اور گزشتہ رات اپنے آوارہ ہمراہیوں کے ساتھ حملہ آور ہوئی تھی۔ اس نے نگینہ کے کئی اسٹیپ شارٹ بھی تھانیدار کے حوالے کر دیے تھے تاکہ اس کی تلاش میں آسانی رہے۔

میرا شاہ کے منہ سے تفصیل سننے کے بعد میڈم نے کہا۔ "یہ تصویروں والا معاملہ خراب ہے۔ پولیس ان تصویروں کو مستہر کر دے گی۔"

"کب؟" میرا شاہ کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ "چھ مہینے لاگت ہیں پولیس کے لاڈوں کو جوڈیشل فائل تیار کرن میں..... پھر سمن سمن..... سال بعد عدالت اشتہار کا حکم دیوت..... نہیں جانت کیا؟"

"میرا شاہ! تم ٹھیک کہتے ہو مگر عدالتی کارروائی سے قبل پولیس مکمل ریکارڈ اور تصاویر رپورٹ اتھارٹی کو دے سکتی ہے۔ ای سی ایل میں اس کا نام درج کروا سکتی ہے۔" میڈم نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ "اس صورت میں نگینہ کینیڈا کیسے جائے گی؟ رپورٹ پر دیکھتے ہی گرفتار کر لی جائے گی۔"

میرا شاہ نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ میں نے کہا۔ "مگر میڈم! آپ کے خدشات قبل از

وقت ہیں۔“

”امکانات کو سامنے رکھ کر لائحہ عمل تیار کرنا ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔

میر و شاہ نے سٹ پٹا کر کہا۔ ”ماڑے کو یہی خطرہ ہووے تو تھارانی جی! اس لیے تو روکت تھا کہ بدیشی لونڈیا کو ایدھر ادھر ڈال دیوت۔ یہ قدم نہ اٹھاوت..... پھر سالامیر و شاہ شکل سے ہی چغدا لگت ناں! ماڑی بات بھی نہ مانت ہے رانی..... اب بھگت لیوے ناں جان کا عجب (عذاب)!“

”تو کیا میں اسے ایسے ہی جھٹک پھینکتی؟“ میڈم نے برہمی سے کہا۔

”وہ لونڈیا کیا تیری خالہ جاد (خالہ زاد) لاگت ہووے؟“ میر و شاہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”حرام جادی کے لیے دُلھا ڈھونڈ ڈالہنیا بناوت اس کے بچے کھلاوت..... ماڑے کو سن لیوت کہ جرورت کیا ہووے اس کے اتے تاج (ناز) نخرے اٹھانے کی.....“

میڈم نے ہاتھ لہرا کر اسے خاموش کرایا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ پھاڑ کھانے والی آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ بیچ بیچ میں مجھ پر بھی سلگتی ہوئی نگاہ ڈال کر سمجھا دیتا کہ میں نے اس سے پوچھے بنا اتنا بڑا قدم اٹھا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اسے میرا یوں خطرے میں کود جانا ہضم نہیں ہوا تھا۔

میڈم بولی۔ ”خیر! اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ جب وہ اسپتال سے ڈسچارج ہوگی، سوچوں گی کہ اسے کیسے ملک سے نکالا جاسکتا ہے۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ پیاجی نے کیا رپورٹ دی ہے؟“

میر و شاہ نے بتایا کہ پیاجی زور آور کی جاسوسی پر مامور ہے۔ اس نے رپورٹ دی ہے کہ زور آور کمن سے ملتان آ گیا ہے۔ ابھی اپنے گھونسلے میں ڈبکا بیٹھا ہے۔

میڈم نے کچھ بھی انداز میں سر ہلایا۔ پھر سخی محمد کے بارے استفسار کیا۔ دونوں کی باہمی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ میڈم نے سخی محمد کو سردار حیدر خان کی نگرانی پر تعینات کر رکھا تھا۔ وہ اس کی محتاط نگرانی کرتے ہوئے اس کے معمولات نوٹ کر رہا تھا۔ مجھے میڈم کی شیطانی کھوپڑی پر حیرانی ہوئی۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی محاذ کھولے رکھتی تھی اور کسی بھی جانب سے غافل نہیں رہتی تھی۔ چوکھی جنگ لڑنے کا ہنر جانتی تھی۔ شاید اس کی بے تحاشا کامیابیوں کا سہرا اس کے اسی وصف کے سر جاتا تھا۔

میں محویت سے دونوں کے درمیان ہونے والی سنسنی خیز گفتگو سن رہا تھا۔ میڈم نے یہ کہہ کر بحث کی بساط سیٹ

دی۔ ”میر و شاہ! تمہیں زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ میں نے یارن خان کی بیٹی عافیہ خان کی سپاری پکڑ رکھی ہے۔ دو کروڑ کی۔ ایک کروڑ روپے سخی محمد نے وصول کر کے مجھے تنگ پہنچا دیے ہیں۔ باقی رقم کام مکمل ہونے پر ملتی ہے۔ میں نے ڈیلنگ کی آدھی رقم میں یہ سپاری زور آور کو دے رکھی ہے۔ اس نے ابھی اس پروجیکٹ پر کام شروع نہیں کیا۔ اب وہ ہی صورتیں ہیں۔ یا تو زور آور کو میدان میں اترنے پر مجبور کیا جائے یا پھر سردار حیدر خان کا کائنات نکال دیا جائے۔ ابھی یارن خان، میاں دلبر اور حیدر خان تینوں زندہ و سلامت دندناتے پھرتے ہیں۔ میں جلد از جلد اس کھیل کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔“

میر و شاہ نے اپنے مخصوص انداز میں میڈم کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔ ”ماڑے کو تو اتنا پتا ہووے کہ ماڑی رانی خوش رہوے..... دنیا گئی پھوکت میں..... بھاڑ میں..... چند روج (روز) میں پھیلی پر سروسوں جہاد کھاوت میر و شاہ۔ فکر نہ کرت، انتظار (انتظار) کرت۔“

وہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میڈم پر الوداعی نظر ڈال کر میری جانب آیا۔ میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے کندھے پر اپنا سخی سا ہاتھ مار کر بڑے مزاحیہ انداز میں بولا۔ ”کیوں بے لاڈے! دیکھت..... کیسا لاگت ہے سالامیر و شاہ اس تھری پیس میں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے اس کا ”تھری پیس“ سوٹ ملاحظہ کیا۔ تعریف کی، کہا۔ ”ایک دم فرسٹ کلاس!“

میڈم کھلکھلا کر ہنسی۔ میر و شاہ پلٹے بغیر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ”سالی جل بھن جاوت ہے میر و شاہ کی ٹور شپادیکھ کر..... ماڑی غلطی ہووے کہ اس سالی کو رانی..... نہیں مہارانی بنا کر سر پر بٹھالیوت.....“

میڈم نے اس کے ریمارکس کا برا نہیں منایا بلکہ صوفے کے سائڈ ڈیک پر پڑا ہوا سگریٹ کیس اٹھایا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم سے کون جیلنس نہیں ہوتا میر و شاہ!“

وہ منہ بنا کر، مجھ سے ہاتھ ملا کر بازو لہراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اپنے پیچھے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر گیا۔ گیلری میں اس کے چیخنے کی آواز گونجی۔ ”اڑی جرمینا..... حرام جادی! کدھر چھپ جاوت ہے۔ بڑا چھینڑ مانگ ماڑے کو..... جراسا منے آوت ناں ایب کے..... جراسا (ذرا) درشن تو دیوت سالی میر و شاہ کو۔“

میڈم کے لبوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ تیر گئی۔ مجھے ایک نظر دیکھنے کے بعد بولی۔ ”شہر یار! بہت تھوڑا عرصہ باقی ہے۔ بلکہ چند سانسوں کا فاصلہ ہے تینوں سو رماؤں کا مجھ سے۔ میں اب اس پوزیشن میں ہوں کہ ان سے نمٹ سکتی ہوں اور نمٹنے کا فوری ارادہ بھی رکھتی ہوں۔ کیا خیال ہے؟“

میری دلی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ان لوگوں پر زندگی مختصر کر دی جائے۔ انہیں نشانِ عبرت بنا دیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان تینوں میں سے سردار یارن خان پر ہمیں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ وہ بہت تیز طرار شخص ہے۔“

”میاں دلبر بھی اُس سے کم نہیں ہے۔“ میڈم نے لمبا کش پھینچڑوں میں اتارتے ہوئے کہا۔ ”البتہ حیدر خان ترنوالہ ہے۔ پہلے میں نے ارادہ کیا تھا کہ عافیہ خان کو اغوا کر کے یارن اور حیدر خان کو آپس میں لڑا دوں گی۔ یہی ہاتھ میاں دلبر سے کروں گی۔ اب سوچ رہی ہوں کہ اتنا لمبا چکر چلانے کے بجائے ڈائریکٹ ایکشن کر کے ان کا ٹیٹا نکال دوں۔“

”کیا زور آور عافیہ خان کو اغوا کر سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں! وہ بہت شاطر انسان ہے۔ موبی اس کے دم پر شہر پر راج کرتا تھا۔“

”کیا زور آور آپ کا گروپ جوائن نہیں کرتا؟“

”میں نے اس پر کام نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ پرکشش آفر پر ادھر آ ہی جائے مگر میں اُسے لانا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟“

”وہ بہت اڈیل اور منہ زور ہے۔ راز دان بننے کے بعد کسی موقع پر بگڑ گیا تو بہت نقصان پہنچائے گا۔“

مجھے میڈم کی بات سے اتفاق ہوا۔ میڈم کی سگریٹ ختم ہو گئی۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے تیل دی۔ زرینا آ گئی۔ اسے ٹھنڈی چائے اٹھانے اور ہاٹ کافی لانے کا حکم دینے کے بعد گنگنانے لگی۔ ”چھو لے چھو لے، آ مجھے چھو لے۔“ اس کی آواز اس کی طرح دل کے تاروں کو چھیڑنے والی تھی۔ میں بڑی محویت سے اُسے دیکھتا رہا۔ سنا رہا۔ جی چاہا کہ وہ شب بھر ایسے ہی بیٹھی گنگناتی رہے، میں دیکھتا رہوں، سنا رہوں مگر ایسی خواہشیں پوری نہیں ہوا کرتیں۔ زرینا کافی کا گک اٹھائے وارد ہوئی۔ میرا شاہ کی شکایت کر کے واپس چلی گئی۔ میڈم کافی کے گھونٹ بھرتی رہی، سوچتی رہی۔ کافی ختم ہونے کے بعد بھی اس کی سوچوں کے تانے بانے چمڑے رہے۔

دس منٹ ایسے ہی گزر گئے تو میں نے اکتا کر اسے مخاطب کیا۔ ”کیا آپ ڈاکٹر شاہ جی کے بارے میں سوچ رہی ہیں؟“

”آں..... ہاں..... نہیں تو..... اسے سوچ کر کیا کروں گی۔“ وہ چوکی۔ ”میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔“

”اگر مناسب ہو تو مجھ سے شیئر کر لیں۔“

اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ جان لیا مسکراہٹ کے سنگ بولی۔ ”شہر یار! میں ایک ہی وقت میں تمہارے، نگینہ اور ڈاکٹر شاہ کے بارے سوچ رہی ہوں۔ تم کر گزرنے والا ذہن رکھتے ہو جبکہ مجھے ہر قدم پر بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ نگینہ، جسے میں پانچ دس دنوں میں کینیڈا روانہ کرنا چاہتی تھی، اب اسے شاید مبینا بھر سے زیادہ وقت یہاں رہنا پڑے گا۔ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتی، اسے یہاں رکھنا میری مجبوری بن گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھٹی خاندان کی طرف سے اس پر براہِ راست مقدمہ درج کر دیا جائے اور ای سی ایل لسٹ میں نام شامل کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں اسے کینیڈا بھیجنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ زور آور نے غیر متوقع انداز میں پینترا بدلا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس نے ایسا کیا سوچ کر کیا ہے؟ اس کے در پردہ مقاصد کیا ہیں؟ اور وہ آئندہ کیا کر دکھائے گا؟..... ڈاکٹر شاہ جی کی طرف میرا دل مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ اس کا وجود میرے لیے بہت مبارک ہے۔ کیا مجھے اس کی طرف لوٹنا چاہیے..... یا نہیں؟..... میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ اب جبکہ تمہیں تمہاری بہن مل چکی ہے، ماں باپ کے سرکاری قاتل کو تم ٹھکانے لگا چکے ہو تم کب تک میرے ساتھ چلو گے؟ کس وقت ہاتھ کھڑے کر جاؤ گے؟..... میرا شاہ کی سرگرمیاں ایک مرتبہ پھر نہ سمجھ میں آنے والی ہو گئی ہیں۔ وہ جاتا ہے تو لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ زیادہ خرچے دکھانے لگا ہے۔“ وہ صوفے سے سر نکا کر، آنکھیں بند کر کے قدرے بھاری آواز میں بولی رہی تھی۔ میں ہمت نہ گوش تھا۔ ”دیکھو شہر یار! زندگی سہل بھی نہیں ہوتی۔ اس کے موسم بدلنے رکتے ہیں۔ ہر موسم کے لیے مختلف لباس خریدنا پڑتا ہے۔ ہر موسم کی غذا مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے دھندے کی طلب بھی بدلتی رہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ درست کہہ رہی ہیں مگر اپنی پریشانیوں میں سے ایک پریشانی کم کر دیجیے۔ میں جب تک آپ کے ساتھ ہوں گا جب تک آپ کو میری ضرورت رہے

گی۔ ویسے بھی ابھی تو سردار حیدر خان، یارن خان اور میاں یارن زندہ ہیں۔ فریدن بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔ رگو قسانی وغیرہ کے مت جانے پر میرا کام مکمل نہیں ہو گیا۔ میرے اصل دشمن یارن خان اور حیدر خان ہیں۔ جب تک وہ زندہ ہیں، مجھے جین لکس آ سکتا۔ رہی بات بہن کے ملنے کی، تو وہ ایک خوشگوار واقعہ ہے۔ چونکہ مجھ پر ابھی میری چچا زاد بہنوں اور بھائی کا بوجھ لدا ہے، اور آپ کی ملازمت کے علاوہ میرا کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں، اس لیے میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! میں خوش فہمی کا شکار تھا کہ آپ مجھے محبت کرنے لگی ہیں۔ ہر انسان خوش فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ میں بھی ہو گیا تھا۔ یہ بڑی بات نہیں ہے مگر مجھے یہ افکار حاصل ہے کہ آپ جس چیز کو اہمیت دیتی ہیں، جس سے محبت کرتی ہیں وہ میری آنکھ پر ثبت ہے۔ وہ آنکھ میری ہے۔ وہ تنہا سائل میرا ہے۔ اگر یہ واقعتاً آپ کی خوش بختی کا سامان ہے تو ہمیشہ آپ کے پاس رہے گا۔“

میڈم کو میرے مضبوط لہجے نے تقویت دی۔ آنکھیں کھول کر مسکرائی۔ اٹھ کر ایک ادا سے چلتی ہوئی میرے پہلو سے آئی۔ جڑ کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”تم بہت اچھے ہو شہر یار!“

”مگر آپ سے کہیں کم.....“

”اگر میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہوں تو؟“ اس کی آنکھوں کی چمک خیرہ کرنے لگی۔

”جی.....“ میرا دل اس بری طرح دھڑکا کہ میری زبان بولنا بھول گئی۔ میں اسے حیرت پاش نظروں سے دیکھنے لگا۔

”میں نے کیا پوچھا ہے؟“ اس نے اپنی انگلی اٹھا کر ہونٹ پر رکھی۔ مخصوص انداز میں سر کا کر ہونٹوں کے گوشے سے لے لی۔

”مجھے زندگی میں ملنے والی سب سے بڑی خوشی یہی ہو چکی۔ میں نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ تب مجھے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ جواب دیا تھا۔“

”میرا ساتھ دینے والے کو ہر گھڑی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لیتی پڑتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی تم ایسا کہہ رہے ہو؟“

”جی میڈم! میں اس مرحلے سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی بھی گولی باز کی طرح میرا سینہ بھی چاٹ

سکتی ہے مگر سینہ آباد بھی تو آپ کے نام سے ہی ہے ناں!“

میں نے کہنے کو کہہ تو دیا مگر یوں لگا جیسے میرا وجود ایک دم کھوکھلا ہو گیا تھا۔ میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی میڈم شکیلہ کا چاہ و جلال اپنی جگہ پر قائم تھا مگر میری آنکھوں کے سامنے ہونٹ میں گزاری جانے والی رات کی رانی چندوماہی کا گدازلس بس گیا تھا۔ چندوماہی ایک سادہ دل دیہاتی لڑکی تھی۔ میڈم شکیلہ سادہ دل نہیں تھی۔ ایک خون آشام گینگ کی لیڈر تھی۔ اس نے میرے کندھے پر اپنا رخسار رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کئی لمحے ایسے ہی بے خودی میں گزار کر ہوئے سے بولی۔ ”شہر یار! میں تھک گئی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا مطلب؟ کیا اس تیز رفتار زندگی سے اکتا گئی ہیں یا.....“

”جو تم ’یا‘ کے بعد کہنا چاہتے ہو، وہی معاملہ ہے۔“

اس کی آواز میں کئی اسرار پنہاں ہو گئے۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ ’یا‘ آپ کی جوانی بے لگام ہو رہی ہے..... اس نے دل کی بات زبان کی نوک سے پکڑ کر مجھے مجھے کا شکار کر دیا تھا۔ میں نے اس کا تنہا سا گلابی ہاتھ نہایت دھیرے سے تھام لیا۔ سرور کی ایک سر پھری لہر پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ ایسے میں وہ گھڑی یاد آ گئی جب میڈم کے فارم ہاؤس میں ایک شب اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس گھڑی اس نرم و نازک سے ہاتھ کی حشر سامانیوں نے مجھے بے دم اور نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی سخت جانی مجھے دریائے چناب کے پیلے میں بھی نظر آئی تھی۔ وہ دیکھنے میں گلاب تھی۔ بھٹکتے میں لوہے کا چٹا تھی۔ اس کی ذات میں موجود اتنے بڑے تضاد کو کیا نام دیا جاسکتا تھا؟..... میں نے چند لمحے اس کا ہاتھ سہلایا پھر اپنے تشنہ لبوں سے لگا لیا۔ کن آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی محویت اور احساسِ نقاخر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس طرح مجھو بانہ انداز میں دیکھتی ہوئی دل میں اُتر گئی اور میں نے بے اختیار ہو کر ہاتھ چھوڑا اور اسے ہاتھوں میں بھر لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی بلکہ کھلکھلاتے ہوئے پیش قدمی کی اجازت دینے لگی۔ پھر ایک ذرا توقف کے بعد بڑے جارحانہ انداز میں میرے وجود کی بھول بھلیوں میں سے زندگی کے روشن پہلو تلاش کرنے لگی۔ پیش رفت کرنے لگی۔ چندوماہی کا زخمی زخمی وجود کہیں پیچھے..... بہت پیچھے رہ گیا جبکہ میڈم شکیلہ دلیرانہ انداز میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے میں مگن ہو گئی۔ ایسے میں کسی بے خود مگر مددگار کے آہنگ گنگنانے لگی..... ”اے محبت! تیری قسمت کہ تجھے

مفت ملے، ہم سے دانا جو کمالات کیا کرتے تھے.....“
وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔ اس کی گنگناہٹ بھی لرز کر جذبات کی سوختہ ترجمانی کرنے لگی۔ ایسے میں گلاب کی لچک دار لمبی کی طرح کچھ زیادہ جھک کر مجھ پر لہرائی۔ گلاب ٹوٹ کر میری جھولی میں بکھر گیا۔ جو اس جہان آشفہ سری میں بکھرنے پہ آئے، وہ بکھرتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں نے اس کا ہیز کلپ نہایت آہستگی سے کھول دیا۔ ریشم ریشہ ریشہ بکھر گیا اور میرے آدھے وجود پر سایہ فگن ہو گیا۔ میں اس جواں سال ریشم کی سرسراہٹوں میں کھو کر حسن فتنہ انگیزی پرستش میں سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ نجانے کس ذہنی روکی پر فعال بن بیٹھی تھی کہ بند آنکھوں کے پیچھے میری تمام سخی سخی جساتوں کو قبول کرتی گئی۔

اگر شہر کی زندگی کے تابندہ طلسم کے پیچھے چھپے ہوئے میڈم شکیلہ کے اصل روپ، چندو ماہی کے کردار سے مجھے شناسائی نہ ہوئی ہوتی تو شاید کبھی اتنی ہمت مجھ میں پیدا نہ ہوتی۔ میں اپنی کم مائیگی اور احساس کمتری سے مغلوب رہتے ہوئے دلیر کے پار کھڑا ہی دم توڑ دیتا یا سرد آہ بھر کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اظہار محبت کے کارجنوں نے چند لمحوں میں کئی صدیوں کا سفر طے کر لیا۔ اس کے رخساروں کی پیش اور بند آنکھوں کی پرگداز اجازتوں نے جو نمی میرے ہونٹوں کو جلانا شروع کیا اور میری سانسوں کی پیش بڑھی وہ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہو گئی۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے جادو کی بساط کو سینے لگی۔ اس کے گال اور آنکھوں کے حلقے دھک رہے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کا ارتعاش اس کے اندر کے مدوجذری خبر دے رہا تھا۔ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تم نے تو چند ہی لمحوں میں مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ پورا رویری کر یزی.....“

میں نے اپنے دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھا۔ ایک ذرا سنبھلاؤ دیا مگر اس گھڑی دل کم بخت کہاں سمجھے اور سنبھلنے والا تھا۔ پہلو میں احتجاج کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”آپ قریب ہوتی ہیں تو دل پر اختیار نہیں رہتا۔ کہیں آپ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں تو..... کیا منانے کا ہنر آنا چاہتے ہو؟“

سمیٹ لیا۔ مانا کہ وہ بہت خوب صورت تھی..... مگر اس گھڑی..... اس کا بے ساختہ تعجب اس کے حسن کی بازی مات کر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکیلا۔ میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ وہ مٹھیاں بٹھپے کھڑی حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اپنا پہلو ٹٹولا۔ کچھ ہوا تھا؟ سوچ میں پڑ گیا..... ایسا کیا دل پر گزر گیا تھا؟..... سچ کہتے ہیں عشق میں پانے کا سوال نہیں صرف کیے کی جہت ہوتی ہے۔ میں نے کیا سیکھا تھا؟..... آگ سے ٹکرانے کا ہنر..... یا برف میں آگ لگانے کا سلیقہ؟..... وہ شعلہ نوخیز بنی کئی ثانیوں تک کھڑی گھورتی رہی۔ ایک ذرا حوصلہ دامن گیر رہا کہ اس کی آنکھوں میں حوصلہ شکنی کا عنصر نہیں تھا۔ بجا کہ حوصلہ افزائی بھی نہیں تھی کچھ اور ہی تھا۔ میں اسی کچھ اور کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ اُس نے چٹکی بجاائی۔ انگلی کا اشارہ الماری کی طرف کیا، بولی۔ ”وہ نکال لاؤ.....“

میں سمجھ گیا۔ وہ پٹا چاہتی تھی۔ پی کر بہکتا یا بہلتا چاہتی تھی۔ میں نے لمبی سانس پھینچوڑوں میں اتاری اور اٹھ کر الماری کی طرف بڑھ گیا۔

”سنگل پیگ بنا دو۔ برف نہ ڈالنا۔ صرف پانی۔ سوٹ پیگ بنانا آتا ہے ناں؟“

اس نے یہ کام بھی سکھا رکھا تھا۔ میں نے اثبات میں ہلایا اور اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے شیشے میں آگ بھر کر پیش کر دی۔ وہ گلاس ہاتھ میں تھام کر چند لمحوں کھڑی رہی، پھر بیڈ پر چلی گئی۔ ایک گھونٹ بھر کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ خود نیم دراز ہو گئی۔ کروٹ بدل کر بانہوں میں چہرہ چھپا گئی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ سر اٹھا کر بولی۔ ”شہر یا نا محبت کیا ہوتی ہے؟“

میں گڑبڑایا۔ کیا بتانا..... میں محبت کے دشت میں سفر کرنے والا کوئی فلسفی نہیں تھا۔ عام سی سوچ رکھنے والا دیہاتی شخص تھا۔ دیہات میں محبت کے اظہار کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ لڑکیاں شرمناک اس لفظ سے پردہ کرتی ہیں۔ لڑکے اس شجر ممنوعہ کو چھیڑ لیتے تھے مگر اپنے ہم عمروں میں باتیں از بر تھیں مگر یہاں کرنے کی نہیں تھیں۔ بے بسی سے کندھے اچکا کر بولا۔ ”آپ بہتر جانتی ہیں۔“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں! میں بہتر جانتی ہوں کیونکہ میرا دل زندہ ہے۔ اس گھڑی جاگتا ہے جب اسے جاگنا ہوتا ہے۔ مگر..... تم کیوں نہیں جانتے؟..... کیا تمہیں کسی سے محبت نہیں؟ اگر نہیں تو پھر تم اپنی مگلیتر کو یاد کیوں کرتے

تھے..... جھلا سا نام تھا اُس کا..... ہاں!..... غزالہ۔..... یعنی ہرنی کے جیسی..... ہے ناں؟ پر..... تمہیں محبت نہیں، کچھ اور ہی ہوا ہوگا مگر مجھے محبت ہی تھی۔ میرا وہ عمر حیات ہے..... اُسے دیکھ کر میں دینا کو بھول جاتی تھی۔ سوچا کرتی تھی کہ اگر اس نے مجھے نہ اپنا یا تو میں مر جاؤں گی۔ پر نہیں مری..... کیوں؟..... کیونکہ..... صرف فاح تھا۔ مجھے فح کرنا خواب تھا اس کا۔ فح کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ میں کوئی ایسی افسرانہ سلطنت نہیں ہوں..... اور جب مجھے ڈاکٹر منور شاہ نے سہارا دیا..... اپنے گھر میں رکھا اور تربیت کی تب میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ مگر آہ اودہ سنگ دل تھا۔ مجھے سہارا دے کر پڑے ہٹ گیا۔ تب میں نے سوچا تھا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی کیونکہ میں اس سے محبت کرنے لگی تھی اور محبت یا تو رومی رکھ دیتی ہے یا مار دیتی ہے..... پر نہیں۔ وہ محبت نہیں تھی..... ٹرانس فیریشن تھی جو کسی بھی افسر اور ماتحت میں برپا کرتی ہے۔ کسی بھی استاد اور شاگرد کے درمیان ہو جاتی ہے۔ محبت کے جیسی ہی ہوتی ہے..... اور میں نہیں مری..... بلکہ نئی زندگی لے کر اٹھی..... پھر اجمل گیلانی میری زندگی میں سخت کا سورج بن کر طلوع ہوا اور محبت کی کالی رات جان کر سو گیا۔ میں تب بھی نہیں مری۔ مرنا تو درکنار، لڑی بھی نہیں..... پھر محبت کیا ہے؟“

اس نے ابھی پی نہیں تھی مگر بیکنے لگی تھی۔ شاید جوانی کا شہرہ..... کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آپ فضول سوچ رہی ہیں۔ محبت مارتی نہیں ہے بلکہ انسان کو طاقت ور کر دیتی ہے۔“

”ہاں! شاید ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ..... توڑنے والوں نے کس نہیں چھوڑی..... جوڑنے والوں نے بھی اپنی کڑک کھائی اور میں اس حال میں زندہ ہوں کہ کئی زندگیوں کو کس کر سکتی ہوں۔ مگر ایک بات تو بتاؤ.....“

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ تپائی پر سے گلاس اٹھایا۔

ہوں؟ کیا تمہارے پاس ان سوالوں کا جواب ہے؟“
میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”نہیں میڈم! میں کچھ نہیں جانتا۔“
”تو پھر تم غزالہ کی زندگی میں مجھ سے کیوں محبت کرنے لگے ہو؟“ اس نے گلاس لبوں سے لگا کر روک دیا اور اسے آہستہ آہستہ گھمانے لگی۔ مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ”وہ مر گئی ہوتی، بے وفائی کر کے کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ گئی ہوتی، تب تم کوئی اور راستہ دیکھتے۔ کسی اور منزل کی طرف قدم بڑھاتے۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اگر میری محبت کا دم بھر رہی تھی تو اس کے پاس مضبوط جواز موجود تھا۔ اس کے دو محبوب راہی عدم ہو گئے تھے۔ ایک نے جھٹک کر اپنے آپ سے جدا کر دیا تھا۔ مگر میری غزالہ نے نہ تو مجھے چھوڑا تھا، نہ کوئی اور درکھٹھایا تھا اور نہ وہ مری ہی تھی..... میں نے ایک لمبی سانس خارج کی، کہا۔ ”غزالہ کس وقت مجھ سے جدا ہو گئی، میں آپ کا کیسے ہو گیا، یہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ اس گھڑی، اس لمحے میں آپ کا ہوں اور آپ کا رہنا چاہتا ہوں۔ بس!“

”کیا محبت بلا وجہ ہوتی ہے؟“
”ہاں..... شاید!“ میں نے بہم جواب دیا۔

”بلا وجہ کیسے جانے والا کوئی کام اہم نہیں ہوتا۔ یعنی محبت بھی غیر اہم ہے؟“

”نہیں..... ہاں..... شاید!“

وہ ایک دم کھٹکھٹا کر ہنس دی۔ اوپر تلے دو تین ننھے ننھے گھونٹ بھر کر تادیر ہنستی رہی۔ اچانک سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ ”شہر یار! تمہاری سنائی ہوئی کہانی میں ایک جھول ہے۔ پتا ہے کون سی؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں میڈم!“ میں چونکا۔

”ہاں! بتاتی ہوں۔ یہ شراب ہے۔ لوگ اسے آگ کہتے ہیں۔ عجیب آگ ہے کہ معدے میں اترتے ہی وہ باتیں سوچنے لگتی ہیں جو عقل مندوں کو نہیں سوچھ پاتیں۔ تم ڈاکٹر شاہ جی اور پروین سے مل آئے۔ امیر نواز کے بارے میں پوچھ آئے۔ مگر وہ..... وہ پولیس آفیسر سلیم شہزاد کا بیٹا..... کیا نام تھا اس کا؟ ہاں..... شاہد سلیم..... وہ تمہیں بھول گیا۔ اس کی محبوبہ کو تم بالکل بھول ہی گئے۔ وہ بھی تو پروین کے ساتھ ہی تھی۔ تمہارے اور تمہارے دوست کھالے کے بیان کے مطابق.....“

”اوہ نوا!“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ میں واقعی

اتنے اہم کردار کو بھول گیا تھا۔ میں نے پروین سے اس کے بارے میں نہ پوچھا تھا اور نہ میرا اس کی طرف دھیان ہی گیا تھا۔ میں نے قدرے شرمساری سے کہا۔ ”واقعی میڈم! میں اسے بھول گیا تھا۔ اسے یقیناً وہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔“

”کیا مظفر گڑھ میں ہونے والی ملاقات کے بعد شاید نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا؟“

”نہیں..... شاید اس کے سر سے عشق کا بھوت اتر گیا ہے۔“

”نہیں..... میں اسے جانتی ہوں۔ وہ عشق سے دست بردار ہونے والوں میں سے نہیں لگتا تھا۔“

”تو پھر..... اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”کچھ بھی ممکن ہے۔“

”مثلاً؟“

”اس کے باپ کا تہا دلہ کسی دور دراز کے ضلع میں ہو سکتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کی زبردستی شادی کر سکتے ہیں۔ وہ دیوانہ ہو کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو سکتا ہے اور اس کا باپ اسے کسی مینٹل ہاسپٹل میں داخل بھی کر دے سکتا ہے۔“

اس نے شوخی سے کہا اور خالی گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگے تھے جو دہرے خمار کے عکاس تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر اپنا موبائل اٹھا کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد بولی۔ ”یہ وہ نمبر ہے جس سے تم نے مجھے کال کیا تھا۔ کیا یہ ڈاکٹر شاہ جی کا نمبر ہے؟“

میں نے بتایا۔ ”نہیں..... یہ اس کے ڈسپنسر کرم علی کا فون نمبر ہے۔ ڈاکٹر شاہ جی کے پاس موبائل فون نہیں ہے۔“

”لو..... اسے کال کرو۔ اگر وہ اسپتال میں ہی رہتا ہے تو ڈاکٹر شاہ جی سے بات کروا سکتا ہے۔“

اس نے اپنا موبائل فون میری طرف اچھال دیا۔ میں نے نمبر پر نظر ڈالی پھر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر کرم علی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! کون؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کا دوست ہوں اور اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

وہ بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب اس وقت گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ میرے جگانے پر برا مانجیں گے۔ آپ کل کسی وقت کال کیجیے گا۔“

میں نے ماؤتھ ہول پر انگلی رکھی، میڈم کو اس کے جواب سے مطلع کیا۔ وہ بولی۔ ”اسے کریدنے کی کوشش

کرو۔ پتا کرو کہ ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں ایک عورت مقیم ہے یا دو..... کچھ تو واضح ہو ہی جائے گا۔“

میں نے میڈم کی ہدایت کے پیش نظر کرم علی کو ٹھونسنے کی کوشش کی مگر وہ سیانا شخص نکلا۔ فوراً ہی مجھ کو پیتر ایدل کیا بولا۔ ”نہیں صاحب! میں ڈاکٹر شاہ جی کی نجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ خود ہی ان سے علی الصبح بات کر لیجیے گا۔ اللہ حافظ!“

اس کے ساتھ ہی اس نے کال منقطع کر دی۔ میں نے مایوسی سے میڈم کو دیکھا۔ وہ ہنسی بولی۔ ”تم ابھی اتاری ہو۔ ایسے پوچھا جاتا ہے بھلا؟ کوئی بات بناتے، کوئی داؤ پیچ آزماتے..... تو بابا! نو..... دنیا اتنی سیدھی سادی نہیں ہے۔ ہر نارگٹ آسان نہیں ہوتا۔ ہر منزل ٹھنکی میں سمٹنے والی نہیں ہوتی بابا!..... ایک پیگ اور بنا لاؤ..... دنیا گول ہے۔ گھومتے گھومتے انسان جہاں سے چلتا ہے، وہیں آن رکتا ہے۔ یہ دیکھو..... کرا گھوم رہا ہے..... میں بھی گھوم رہی ہوں..... تم بھی گھوم رہے ہو..... ہے ناں؟“

میں سمجھ گیا کہ اس کی کھوپڑی گھوم گئی تھی۔ پیگ بناتے ہوئے میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے پہلا پیگ بہت لائن رکھا تھا۔ وہ پینے کی عادی تھی۔ اتنی سی شراب پی کر بکنے والی نہیں تھی۔ سمجھ آئی کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہی ہے۔ مگر کیوں؟ یہ سمجھ میں نہ آنے والا عقدہ تھا۔

دوسرا پیگ پکڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی، بولی۔ ”ڈر گئے ناں..... نہیں..... میں بہکی نہیں۔ اتنی سی آگ پر کون جل سکتا ہے۔ میں تھا گنہ گار اسے چومتا رہا تا تب نے اس کو دیکھ لیا اور مر گیا۔“ اس نے انگلی مخصوص انداز میں کینٹی پر گھمائی، بولی۔ ”اور میں ابھی آؤٹ بھی نہیں ہوئی مگر ہونا چاہتی ہوں۔ ادھر آ جاؤ۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے پلاؤ۔ پینے کا لطف اور ہے..... پلانے کا مزہ اور.....“

وہ بن رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں مجھے بھی بننا تھا سو بن گیا۔

☆☆☆

میرے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ پروین کے مل جانے کی خوشخبری سننے کے بعد دونوں لڑکیاں اور موجود خوشی سے پھولے نہیں سارے تھے۔ شانو نے پروین کا سر صدقہ اُتارا۔ فرزانہ نے زروہ چاول پکانے کا اہتمام کر دیا۔ زرد رنگ کے بیٹھے چاول ہم دیہاتیوں کے گھروں میں ہر خوشی کے موقع پر پکائے جاتے ہیں۔ چاولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آنگن سے خوشی کی خبر اٹھا کر اطراف کے گھروں میں

پھیل جاتی۔ چونکہ گلی بھر میں صرف ہم دیہاتی تھے اور اطراف کے تقریباً سبھی مکانات دو اور تین منزلہ تھے، اس لیے سرت بردار خوشبو میرے آنگن میں ہی چکراتی رہی۔

شانو نے مخصوص سرانجی رہن بہن کے مطابق پروین کا ہاتھ پکڑ لیا اور دریاقت کیا۔ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جب تک تینوں پروین کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیں گے، مطمئن نہیں ہوں گے۔ پروین کو دیکھے عرصہ ہو گیا تھا۔ اب جب اس کی خبر مل گئی تھی، صبر کرنا بہت مشکل تھا۔ میں نے چند مجبور یوں کا حوالہ دے کر انہیں صبر آزمائی پر مائل کر لیا تھا مگر جانتا تھا کہ میرا ٹال مٹول زیادہ عرصے تک کام آنے والا نہیں تھا۔

میں نے جب انہیں بتایا کہ اس نے امیر نواز سے شادی کر لی ہے تو دونوں لڑکیوں نے اس خبر کو اتنی اہمیت نہیں دی یا اپنے دلی تاثرات کو مجھ سے کامیابی سے چھپا لیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انہیں بھی امیر نواز اور پروین کے درمیان راز داری سے ملے ہونے والے معاملات کا پہلے سے علم تھا۔ مجھے ایک لڑاؤ دکھ ہوا۔ سبھی کو علم تھا مگر کسی نے مجھے بروقت نہیں بتایا تھا۔ پھر سوچا۔ اگر مجھے علم ہو بھی جاتا تو میرا رد عمل کیا ہوتا؟..... کیا میں اپنی خاندانی روایات کے مطابق غیرت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں کو قتل کر دیتا؟

یہ ایک لائٹل سوال تھا جس سے میں نے سر جھٹک کر ہٹکارا حاصل کیا کیونکہ جو ہو گیا تھا بہتر تھا۔ اگر امیر نواز پروین سے محبت نہ کرتا تو وہ کبھی اس کے پیچھے خوار نہ ہوتا اور جب تک میں پروین تک پہنچتا، وہ شاید زندہ ہی نہ ملتی یا لادندوں کے ہاتھوں بری طرح شکستہ بدن ہو چکی ہوتی۔

مجھے کرم علی کا فون نمبر یاد رہ گیا تھا۔ جونہی میں نے نیا موبائل فون خریدا، بارہا کوشش کی کہ میرا ڈاکٹر منور علی شاہ سے رابطہ ہو جائے اور میں اس سے عشرت عرف عاشی کے بارے میں استفسار کروں مگر کرم علی نے میری کوئی کال نہیں کی۔ میں نے اپنی خواہش کو ایس ایم ایس کی شکل میں ٹائپ کر کے کرم علی کو بھیجا جس کا جواب نہیں ملا۔ ڈاکٹر شاہ کی عادات کے پیش نظر یہ بعید نہ تھا کہ اس نے کرم علی کو منع کر رکھا ہو کہ وہ کسی بھی شخص کی اس سے بات نہ کرائے۔ دل میں عجیب سا جھج بھرنے لگا۔ مجھے نور پور سے آئے اسے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ جب بھی وہاں گیا، نامساعد حالات میں گیا۔ ایک مرتبہ گھر لیا اشیائے صرف پہنچنے والے پٹھان سیزمین کے سوا تک میں گیا تھا۔ تب ایک نظر غزالہ کو دیکھا تھا۔

نور پور کی یاد بے چین کرنے لگی۔ غزالہ کے ساتھ جتے ہوئے ماہ و سال، کھالے کی رفاقت، سردار بخت خان کی حویلی اور ملکہ، امیر نواز کی بہکی بہکی باتیں، دیوانے شاعر کا کلام..... سب کچھ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ نور پور کی گلیاں پکارنے لگیں۔ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ فون پر میڈم سے رابطہ کیا اور اس سے نور پور جانے کی اجازت طلب کی۔ اس نے پوچھا۔ ”مگر تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟“

میں نے بتایا۔ ”میں کھالے اور امیر نواز سے ملنا چاہتا ہوں۔ یارن خان کی سرگرمیوں سے واقف ہونا چاہتا ہوں اور.....“

”اور..... اور اپنی غزالہ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے میری بات کاٹ کر اپنے انداز میں مکمل کر دی۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ جلدی سے بولا۔ ”نہیں میڈم! میں نور پور جا کر اس سے ملوں گا ضرور مگر اس وقت میرے رخ نظر میں اس سے ملنا نہیں ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ ہنسی۔

”اگر آپ حکم کریں گی تو میں اس سے ملے بغیر واپس آ جاؤں گا۔“

”اسے دیکھو گے بھی نہیں؟“

”سامنے آگئی تو دیکھوں گا ورنہ خاص طور پر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

”دیکھ لو؟“

”دیکھ لیا میڈم!“ میں نے پروتوق انداز میں کہا۔ دل میں غزالہ کی شبیہ ابھری۔ لمحہ بھر کے لیے دکھ کی ایک لہر بدن میں سرسرائی۔ میں میڈم کی شکل کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا مگر میرے اندر خوابیدہ محبت ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی۔ اس کی توانا مزاحمت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ”دیکھ لیا میڈم! میں اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ملوں گا مگر آپ کو پتا نہیں چلنے دوں گا۔“

”او کے..... تو پھر جاؤ..... یاد رکھنا کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم غزالہ سے نہیں ملو گے۔ اور ہاں! اس وقت تم پر تھانہ چوک قریشی میں کوئی مقدمہ موجود نہیں ہے۔ جو درج کرائے گئے تھے، انہیں میرا شاہ نے خارج کر دیا تھا۔ یعنی اگر تم چاہو تو کھلے عام بھی جا سکتے ہو مگر تمہارے علاقے کے فرعون اتنی قوت رکھتے ہیں کہ کسی جرم کے اندراج کے بغیر تمہیں حوالات کی یا ترا کرادیں۔ وہ تم پر براہ راست حملہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم میک آپ میں وہاں جاؤ۔ او کے؟“

”ہمیں جلد یا بدیر یارن خان کی گردن مانی ہے۔ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے اس کے معمولات کا جائزہ لیتا۔“

میں نے جی بہتر میڈم کہا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ دس پندرہ منٹ بعد پیاجی نے فون پر رابطہ کیا اور میک آپ کرانے کے لیے مجھے اپنے ہاں بلایا۔ مجھے میڈم شکیلہ پر پیار آیا۔ اس نے میری کال کے فوراً بعد ہی پیاجی کو میرے میک آپ کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ پیاجی نے مجھے دیکھ کر ہانپ کھول دیں۔ ہم یوں بغل گیر ہوئے جیسے صدیوں بعد ملے تھے حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔

وہ مستفسر ہوا۔ ”یو لو! کیا بتاؤں؟“

”گلاب خان!“ میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”نہیں..... میرا دل کسی نئے تجربے پر مائل ہے۔ اگر کہو تو تمہیں میڈیکل ریپ بنا دوں؟“

میں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں پیاجی! گلاب خان کے گیٹ آپ میں مجھے کوئی پہچان نہیں پایا تھا۔ سوائے کھالے کے۔ کھالے نے بھی محض اس لیے پہچان لیا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھوں کے اس اعجاز کو جانتا تھا۔“

نہ جانے کیوں پیاجی مجھے پٹھان کا روپ دینے سے گریزاں تھا مگر میرے اصرار پر ناچار اس نے کام شروع کر دیا۔ حسب سابق اس کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں حرکت کرنے لگے۔ اس نے میرے سر کے بالوں پر تیز بودالا اسپرے کیا جس سے میرے بال سرخی مائل بھورے ہو گئے تھے۔ پلاسٹک کے دو ننھے ننھے اسپرنگ میرے نختوں میں فٹ کیے اور میری اچھی خاصی ناک کا حلیہ بگاڑ کر مجھے پھینٹا کر دیا۔ لمبی اور گھنی ڈاڑھی چسپاں کرنے اور مونچھوں میں اضافی لمبے بال چپکانے کے بعد اس نے میرے سر پر ٹوپی رکھی جس کے اوپر بڑی سی پلودار پکڑی مخصوص انداز میں جما دی۔ میرے یاد دلانے پر اس نے میری آنکھوں میں سبز لینز بھی فٹ کر دیے۔ پھر اپنے ہاتھ ٹشو پپر سے صاف کرتے

ہوئے مسکرایا ”لو..... میں نے تمہیں دوپٹی بنا دیا ہے۔ آگوں تیرے بھاگ لپچھے۔“

(آگے تمہارا مقدر)

”میں اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ نور پور میں کوئی مانی کالال مجھے پہچان نہیں سکتا۔ پیاجی تمہارے ہاتھوں میں ہنر نہیں، جادو ہے۔“ میں نے سنا کی انداز میں اس کی تعریف کی۔

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ بے پردا اور لالہ ابالی طبیعت رکھنے والے پیاجی کی مسکراہٹ میں عجیب سا کرب شامل ہو گیا تھا جسے ہر دست کوئی عنوان نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ہر انسان کی زندگی عیاں ہوتے ہوئے بھی خاصی پیچیدہ اور مخفی معاملات کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ موجود تھا جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو شہر یار؟“ اس نے میری دلچسپی بھانپ لی۔

میں ششکا، بولا۔ ”پیاجی! مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اپنا کوئی غم یا اداسی چھپانے کی کوشش میں ہنس کھیل رہے ہو۔ تمہاری ہنسی مجھے کھوکھلی سی لگ رہی ہے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟“

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھ پر اپنی آنکھیں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔“

”کافی عرصے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ آج پہلے جیسے نہیں لگے، اس لیے تمہارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تمہیں کوئی دکھ ہے؟“

”نہیں تو!“ اس کا انداز بے ساختہ تھا مگر مصنوعی سا محسوس ہوا۔

میں نے کندھے اُچکائے اور الیکٹرونکس کا سامان خریدنے بازار کی طرف نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دروازے تک میرے ساتھ آیا۔ کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شہر یار! چند دنوں سے میرا دل مسلسل ہول کھانے لگا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ طبیعت کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو رہا ہے؟“

میں نے انکار کیا۔ وہ پیشانی سہلاتے ہوئے بولا۔

”مجھے لگتا ہے کہ ہمارا گروپ ٹوٹنے والا ہے۔“

اس نے بڑے عام سے انداز میں بہت بڑا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ میں غمگین ہوا۔ اسے حیرت بھری نظروں دیکھنے لگا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”کیا تمہیں ایسے آثار دکھائی دے رہے ہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پیاجی! میڈم شکیلہ کے نیٹ ورک کو دیکھتے ہوئے یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اتنا بڑا سیٹ آپ ختم کرنے میں بھی زیادہ نہیں تو دو چار سال کا عرصہ لگ جائے گا۔“

”نہیں یار! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ یہ سارا کھیل تماشا میڈم شکیلہ کے دم ختم سے ہے۔ وہ ایک ایکڑ کیٹو آرڈر کے تحت سارا نظام تحلیل کر سکتی ہے۔“

”مگر مجھے تو ایسی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی جس سے پتا چلتا ہو کہ میڈم اپنے نیٹ ورک کو توڑنے کا سوچتی ہو۔“

”یہ ظاہر ایسا ہی لگتا ہے۔“ اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ اس کی آنکھوں نے فی الفور مجھ سے اختلاف کر دیا۔

”پیاجی! ٹھیک سے بتاؤ، کیا بات ہے؟“

”میرے پاس کچھ بتانے کے لیے نہیں ہے۔“

”تو پھر تم نے اتنی بڑی بات کیسے سوچ لی؟“

”شہر یار!“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ”میں میڈم شکیلہ اور میرا شاہ کا حکم بجالاتا ہوں۔ کچھ سوچے اور اختلاف کیے بغیر..... مگر انسان ہوں۔ سوچتا بھی ہوں۔ دیکھتا بھی ہوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے گروہ کی تمام تر کلیدیں یہ ظاہر میڈم شکیلہ کے ہاتھ میں ہیں مگر درحقیقت ہائپر مائنڈ میرا شاہ ہے۔ میڈم اس پر ہمارے سامنے رعب نہاتی ہے مگر کرتی وہی کچھ ہے جو میرا شاہ کے لبوں سے نکلتا ہے۔ کیا تم میری آبروروشن سے اختلاف کرو گے؟“

میں نے میڈم اور میرا شاہ کے باہمی تعلق کے بارے میں سوچا۔ میڈم کی سناکی ہوئی کہانی پر غور کیا۔ نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں پیاجی! تم درست کہہ رہے ہو مگر اس بات کا نیٹ ورک کے ٹوٹنے سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ تو بتا رہا ہوں۔“ پیاجی کی آنکھیں متحرک انداز میں کھل گئیں، بولا۔ ”جب سے تم اور میڈم بیٹھ سے واپس آئے ہو تب سے میرا شاہ کا رویہ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ وہ بہت مضطرب ہے دل و دماغ کا شخص ہے مگر گزشتہ چند دنوں میں وہ کام انتہائی سرعت اور بے خونی سے سرانجام دینے پر تلا ہوا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ گینگ کے تمام افراد کے ذاتی کاغذات بھی تیار کروا رہا ہے۔ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ..... یہ درست ہے کہ وہ بہت اچھا کر رہا ہے۔ ہم سب لوگوں پر ان گنت مقدمے بنے ہوئے ہیں۔ ہم جیسے کے بل پر ہر رکاوٹ سے گزر جاتے ہیں مگر قانون کے ایکٹر ہمارے وجود پر بول پڑتے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ میرا شاہ یا میڈم شکیلہ ہمیں کیوں صاف دامن

بنانے میں مصروف ہیں؟“

”اس میں قباحت بھی کیا ہے؟“ میں اس کی بات میں چھپی ہوئی ہولناکی کو کچھ نہیں پارہا تھا۔

”اوہ..... ہو..... تم کچھ نہیں رہے ہو۔“ وہ تھوڑا سا زچ ہوا۔

”شہر یار! اگر ہم سب صاف دامن ہو جائیں تو ایک طرح سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔ اس وقت گروپ کے چالیس فیصد لوگ محض اس وجہ سے میڈم کے حکم پر موت کی اوکھلی میں سر ڈال دیتے ہیں کہ وہ زندہ یا مردہ قانون کو مطلوب ہیں۔ سوائے میڈم کے شیڈ کے، انہیں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں مل سکتی۔ اگر انہیں علیحدہ شناخت مل گئی، ان کے پاپ دھل گئے تو وہ لحظہ بھر دیر کے بغیر گروپ سے نکل جائیں گے۔ جس کا جدر منہ آئے گا، ادھر چلا جائے گا۔ میرا شاہ بہت چالاک آدمی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اتنا بڑا اقدام کرتے ہوئے اسے اس حقیقت کا ادراک نہ ہو۔

یہی بات سمجھ میں نہ آنے والی ہے۔“

پیاجی اس گینگ کا مرکزی کردار تھا۔ کافی عرصہ سے یہاں کام کر رہا تھا۔ میں اس کے مقابلے میں نوآموز اور نا تجربہ کار تھا۔ اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا، پوچھا۔ ”میں اب بھی نہیں سمجھا کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو..... ہو سکتا ہے کہ میرا شاہ اور میڈم نے کچھ مختلف سوچ رکھا ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا، بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرا شاہ جھک گیا ہے۔ اس مارا ماری سے اکتا گیا ہے۔“

”ایسی صورت میں اس اکیلے کوریٹائرمنٹ لینے چاہیے ناں کہ بنا بنا یا کھیل ہی اجاڑ دے۔“ میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”اس کے بغیر یہ گینگ نہیں چل سکتا۔“ پیاجی نے حتی انداز اختیار کیا۔

”کیا مطلب؟“ میں چونکا۔ ”کیا ہم سب نا کارہ ہیں؟“

”ہاں شاید..... شہر یار! وہ بہت بڑا شکاری ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں محض مسافر ہیں جو سفر کر رہے ہیں۔ اس کی شیطانی کھوپڑی تو منصوبہ گھر ہے۔ وہ نہ صرف دشمنوں کو، بلکہ ہمیں اور قانون کے رکھوالوں کو بھی کاٹنا چنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ سچ شہر یار! ابھی اس مخالفے میں نہ پڑنا کہ ہم اس جیسے ہیں، اس کے برابر ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہم سب مل کر اس اکیلے کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھو بھی میڈم شکیلہ ہم پر وہ بھروسہ نہیں کرتی جو میرا شاہ پر کرتی ہے۔“

میں نے اپنے ہاتھ کی دو اٹھیوں کو جوڑ کر اس کی

آنکھوں کے سامنے لہرایا..... "اتنا سا ہے میرا شاہ کا جسم..... وہ کسی کا گریبان پکڑنے کی ہمت نہیں رکھتا اور تم اسے بہت بڑا شکاری کہہ رہے ہو۔"

میرا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔ پیاجی نے عجیب نظروں سے مجھے گھورا، کہا۔ "یہی غلط نہیں ہے۔ سانڈ جیسے جسموں کو ایک ذہنی چال چت کر دیتی ہے۔ وہ لڑتا نہیں۔ لڑاتا ہے۔ لڑا کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔ ہم کیا؟ ہمارے جیسے سیکڑوں لوگ اس کی انگلیوں پر تپتے ہیں۔ کیا تم اس کا گریبان پکڑنے کی جرات کر سکتے ہو؟..... نہیں..... پولیس کا ڈی آئی جی بھی اس سے ڈب کر بات کرتا ہے۔"

میں نے میرا شاہ کی شخصیت پر غور کیا۔ لحظہ بھر میں ہی فیصلہ کر لیا کہ پیاجی نے درست کہا تھا۔ بجز کہ وہ بہت سختی وجود کا مالک تھا مگر اس کے ہاتھوں کی رسائی بہت دور تک تھی۔ میں نے کہا۔ "پیاجی! میں ابھی تک تمہاری رام کہانی سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے میرا کندھا تھپتھپایا، کہا۔ "میں خود بھی کوئی فیصلہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہوں۔ کیا ہونے والا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہیں بتانے کا مقصد صرف یہی ہے کہ تم میڈم شکیلہ کے بہت قریب ہو۔ تم اس خیال کو ذہن میں رکھ کر اسے ٹٹولنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کوئی گلیول جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری سوچیں محض میرے خیال کا شاخسانہ ہوں اور حقیقت میں کچھ بھی ایسا نہ ہو۔ میرا شاہ ہم سب کے ڈمی پیرز کی اور مقصد کے تحت بنوا ہوا۔"

میں نے اس کی باتوں کو ذہن میں سمیٹا اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے ٹھکانے سے نکل آیا۔ حسین آگاہی کے مصروف بازار میں مجھے چائنا کا تیار کردہ سستا الیکٹرونکس کا سامان خریدنے میں دو گھنٹوں سے زیادہ وقت لگ گیا۔ جب رکشے میں بیٹھ کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہوا، سہ پہر کے تین بج گئے۔ میں شام تک نور پور پہنچ سکتا تھا۔

تمام راستے پیاجی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ وہ بہت ذمے دار شخص تھا۔ اس نے اگر یہ اندیشے محسوس کیے تھے تو بلاوجہ نہیں کیے تھے۔ کچھ نہ کچھ تھا ضرور جو سر دست سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہی سوچوں میں غلطیاں پاؤں جیسے کے لگ بھگ چوک قریشی پہنچا۔ امیر نواز کے باپ حیات خان کی وین دکانی نہیں دی۔ اس کی مخصوص جگہ پر ایک اور سبز

رنگ کی ہائی ایس کھڑی تھی۔ میں کندھے پر سامان کی بڑی گھڑی لٹکائے، ہاتھ میں قدرے چھوٹی گھڑی تھامے وین کے قریب پہنچا۔ جونہی ہونٹ کے ایک ہمارے پر شید کنڈیکٹر کو دیکھا، دل خوشی سے بھر گیا۔ ایک اپنا دکھائی دیا تھا۔ دوسرے بھی دکھائی دینے والے تھے۔

میں اس کے قریب چلا گیا، پوچھا۔ "اؤئے خوجا! وین کدھر جاتا ہے؟"

اس نے مجھے سر تاپا بہ غور دیکھا۔ شناسائی کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں ابھری پھر معدوم ہو گئی۔ چائے کا کپ پرچ میں رکھ کر بڑی نخوت سے بولا۔ "اؤئے خان! تم پھر ادھر آ گیا اے؟"

چونکہ میرا گیٹ آپ وہی تھا جو پچھلی مرتبہ ادھر آئے ہوئے میں نے کر رکھا تھا، اس لیے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں! تو کیا ام دوبارہ ایدھر نہیں آ سکتی اے؟" وہ بولا۔ "جم جم آؤ سوہنا..... جم جم آؤ..... پر اس سامان کا کرایہ دگنا لگے گا۔"

میں نے منہ بنا کر کہا۔ "اؤئے خوجا! ام سے بے ایمانی مت کرو۔ یہ کوئی اتنا بھاری نہیں اے۔"

اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے، کہا۔ "بھاری ہے یا نہیں..... کرایہ دگنا لگے گا۔ پورے اسی روپے!"

وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ شریر اور نٹ کھٹ۔ اب پختہ کار کنڈیکٹر بن چکا تھا۔ آنے والے وقت میں جب وہ وین کا اسٹیرنگ ویل سنبھال لیتا، اسے بھی استاد شیدو کا خطاب ملتا تھا۔ اس گھڑی مجھے اس کی بے ایمانی بھی اچھی لگی۔ اندازہ تھا کہ میری مسکراہٹ میری گھنی مونچھوں تلے چھپ گئی ہو گی، کہا۔ "ام پوچھتی ہے کہ یہ کدھر جائے گا؟"

"نور پور..... جاؤ گے؟"

میں نے احمقانہ انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ "آج ریش بہت ہے۔ چھت پر جگہ ملے گی۔" میں نے سبز رنگ کی ہائی ایس کی طرف دیکھا۔ اس کی چھت پر باریک پائپ والا جٹکلا نصب تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ پچیس تو نہیں جائے گا؟"

"ویکین ہے۔ اصلی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔" وہ ہاتھ بٹھا کر بولا۔ اڈے پر موجود کئی ڈرائیور میرا اور شیدو کا مکالمہ سننے کے لیے آس پاس اکٹھے ہو گئے۔ یہ اڈے کا پرانا وتیرہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ام کو تیرا کالا استاد نظر نہیں آئی اے۔"

میں نے ہمارے کے پائے کے ساتھ زمین پر اپنا سامان ڈھیر کر دیا اور دودھ پتی چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا تھا۔ شیدو نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ استاد کھالے نے ڈرائیوری چھوڑ دی ہے اور نوکر ہو گیا ہے۔ نوکر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اسے کوئی ملازمت مل گئی تھی۔ پتا چلا کہ اس کے ڈرائیونگ چھوڑ جانے کے بعد اڈے کا کوئی ڈرائیور عیات خان کی کھنارا وین کو چلانے پر تیار نہیں تھا۔ وہ کھالے کا دم ہی تھا جو اس کے ساتھ نباہ کر رہا تھا۔ حیات خان نے بہتری کوشش کی مگر جب کوئی ڈرائیور بھی آمادہ نہ ہوا تو اس نے وہ تاریخی وین کبائڑے کے ہاتھ فروخت کر دی اور قدرے بہتر حالت کی ٹویوٹا ہائی ایس خرید لی۔ وہ اگر چاہتا تو اتنی رقم میں بیڈ فورڈ بس یا ڈبا خرید سکتا تھا مگر نور پور جانے والی سواریوں کی تعداد کم ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے بس کا پور نہیں ہوتا تھا۔ ہائی ایس کی عقبی اسکرین میری لگا ہوں کے سامنے تھی جس پر ری فلیکٹڈ ٹیپ سے 'جیوے سردار حیات خان' لکھا ہوا تھا۔ نیچے چھوٹے حروف میں 'دیمان زن آؤٹ' بھی چمک رہا تھا۔ یہ لفظ پڑھ کر میرے بالوں پر تاریکی سے معمور مسکراہٹ تیر گئی اور دیمان زن آؤٹ یاد آ گیا۔

دیمان زن آؤٹ کے گھر والوں نے اس کا نام فلم اسٹار ندیم سے متاثر ہو کر ندیم رکھا تھا۔ اس کی ماں تنور پر روٹیاں لگاتی تھی جبکہ باپ سردار حیدر خان کے کھیتوں میں کام کاج کرتا تھا۔ میرا ہم عمر تھا۔ جب کرکٹ کے گراؤنڈ میں پہنچا تو قلیٹ فیٹ ہونے کے باعث اکثر رن آؤٹ ہونے لگا۔ ہر ٹچ میں اس کے ساتھ یہی واقعہ پیش آتا تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں نے اس کا نام دیمان زن آؤٹ رکھ چھوڑا تھا۔ آج بھی اس کے ہم رکاب چل رہا تھا۔

جائے پی لینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میں نے خواہ ناواہا اتنا وقت یہاں بیٹھ کر ضائع کر دیا ورنہ میں چاہتا تو اس فراغت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سامان اٹھائے استاد کے گھر کی گلی کا چکر لگا سکتا تھا جس میں عاشی کا گھر واقع تھا۔ عاشی کی ماں اور اس کے بھائی وحید کو مل سکتا تھا۔ باتوں باتوں میں اندازہ کر سکتا تھا کہ عاشی گھرونی ہے یا نہیں۔

ویکین کی روانگی کا وقت ہو گیا۔ معمول کے مطابق وین کا یہ آخری پھیرا تھا مگر مجھے پتا چلا کہ یہ آخری پھیرا نہیں تھا۔ شیدو نے مجھے چھت پر جگہ عنایت کی۔ ریش بہت تھا۔ وہ لوگ بھی وین پر سوار ہوئے تھے جن کو وین کے آخری ٹائم پر کبھی بھی طرح نور پور کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ چوک

قریشی اور اطراف کی بستیوں کے باشندے تھے۔ ان لوگوں کی باہمی گفتگو سننے کے بعد میری حیرانی رفع ہو گئی بلکہ دل میں عجیب سی حسرت جاگزیں ہو گئی تھی کیونکہ نور پور میں سائیکس جگ جیت کے مزار پر سالانہ میلہ لگا ہوا تھا۔ یہ سبھی لوگ میلے کی شبانہ رونقوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے نور پور جا رہے تھے۔ میلے کے دنوں میں وین مقررہ اوقات کے بغیر چلتی رہتی تھی۔ ایک آدمی نے مجھے مخاطب کیا۔ "او خان! ادھر میلہ لگا ہوا ہے۔ تم کیا لینے ادھر جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ام بھی میلہ دیکھے گا اور اپنا سودا بھی بیچے گا۔"

"سودا خاک بکے گا۔ وہاں پہلے ہی بہت سی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔" ایک دیہاتی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"او بابی! یہ نصیب کا بات ہے۔ جو امارے نصیب میں لکھا ہوا ہے، امیں ملے گا۔ ام بھی میلے میں اپنا سودا بیچے گا جا کر۔"

ایک آدمی زیادہ سانا تھا، بولا۔ "وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب پر ادھر میلے کا ٹھیکیدار تمہیں پھیری نہیں لگانے دے گا۔"

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ حیرانی سے دریافت کیا۔

"کیوں؟ ام کوئی غیر قانونی شے بیچتا ہے؟"

"غیر قانونی ہے یا قانونی..... یہ ہمیں علم نہیں ہے مگر ٹھیکیدار اپنے آدمیوں کے علاوہ کسی کو وہاں دکان نہیں بنانے دیتا۔" اس نے مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بتایا۔

میں نے بھی انداز میں سر ہلایا۔ اسی اثنا میں دیمان زن آؤٹ بدست ہاتھی کی طرح چلتا ہوا، سگریٹ کے مرغولے اڑاتا ہوا آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ وہ پہلے سے موٹا ہو گیا تھا۔ جونہی انجن اسٹارٹ ہوا، پتا چلا کہ وین یہ ظاہر اچھی حالت میں تھی مگر اس کا انجن پرانی کھنارا وین کے کچھ مختلف پوزیشن میں نہیں تھا۔ وزن زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بڑی مشکل سے اڈے کی غیر ہموار زمین پر رینکتی ہوئی سڑک پر ٹنگی اور جھومتی ہوئی نور پور کی طرف روانہ ہوئی۔

ابتدائی شب کے اندھیرے میں ہائی ایس کی چکرانی ہوئی بیم لائٹس کے جلو میں، میں نور پور میں داخل ہوا۔ لاؤڈ اسپیکروں سے برآمد ہوتی چٹختی چٹکھٹائی آوازیں اور فلمی گیتوں کا ملا جلا شور سنائی دے رہا تھا اور نور پور کے پار روشنیوں کا رقص دکھائی دے رہا تھا۔ شاید میرے اندر بہت سارے تغیر رونما ہو چکے تھے کہ مجھے سب کچھ نیا نیا لگ

رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس کنویں سے باہر کی اجلی اور خیرہ کن دنیا دیکھ آیا تھا۔ کچھ سواریاں حیات خان کے دارے کے سامنے اتریں۔ شیدو کی چٹینی ہوئی آواز کانوں پر پڑی۔ ”میلے وچن آ لے بیٹھے رہن..... وچن توڑ دربار تائیں ویسی!“

(میلے میں جانے والے لوگ بیٹھے رہیں۔ وچن دربار تک جائے گی)

میں نے بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ رات نور پور کو اپنے احاطے میں لے چکی تھی، اس لیے میرا یہاں اترنا بے سود تھا اور میلے کی کشش بھی سوانھی۔ سو میں چھت پر بیٹھا رہا۔ شیدو نے ”چل اُستاد کانرہ لگایا اور دروازے میں لٹک گیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اوئے دوںبر پٹھان! میلا دیکھنا ہے کیا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، کہا۔ ”آمارے سینے میں دل اے۔ اُم نہیں دیکھ سکتا کیا؟“

”ڈانڈا تپا بیٹھا اے مچھل پٹھان تاں!“ شیدو نے برا سامنے بنا کر کہا۔ ”کھاؤن کوں آندے..... سلام خان جی!“ اس نے بے یک وقت مجھے ریمارکس سے نوازا اور شفیع محمد کے گھر کی کڑ میں کھڑے بہرام خان کو سلام بھی ٹھونس دیا۔ بہرام خان کے ساتھ مراد بخش دیوانہ کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کی کم وزنی شال کاندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ جب بھی اسے کسی مشاعرے پر جانا ہوتا تھا، یہ شال اس کے کندھوں پر نظر آتی تھی۔ یعنی آج وہ یا تو کسی مشاعرے پر جا رہا تھا یا موع میں تھا۔

وچن امیر نواز کے ڈیری فارم اور میرے سیاہ بام وور والے گھر کے درمیان سے گزرتی ہوئی پلی کی طرف بڑھی۔ اپنی ویران حویلی دیکھ کر دل پر گھونسا سا لگا۔ ان سوختہ دیواروں سے چٹنی ہوئی سیکڑوں یادیں بھی سیاہی کی چادر اوڑھ گئی تھیں۔ افسر علی کے گھر سے ملحقہ کھال عبور کر کے وچن دائیں طرف مڑی اور چند گھنٹوں بعد سائیں جگ جیت کے مزار کے سامنے رُک گئی۔ شیدو نے ہائی ایس کی ڈکی کھول دی۔ سواریاں اترنے لگیں۔ دیماں زن آؤٹ اپنا کاک پٹ کھول کر مزار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باندھے، کانوں کو ہاتھ لگایا پھر ہتھیلیاں جوڑ کر دل ہی دل میں کوئی دعا کرنے لگا۔ میلا دیکھنے کے لیے آنے والے افراد کی زیادہ تعداد ایسے ہی مزار کے سامنے کھڑی ہو کر دعا گو ہوا کرتی تھی۔

میں نے اپنا سامان اتارا۔ شیدو کو اشارے سے قریب

بلایا۔ مزار کی دیوار کے قریب لے جا کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔ ”ام کو ایدھر سونے کے واسطے جگہ مل جائے گا؟“ اس نے آنکھ دبا کر۔ لہجہ دھیمارکھ کر کہا۔ ”استاد! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم شہرے خان ہوناں؟“

اس کی نظر قیامت کی تھی۔ میں نے چونک کر کہا۔ ”اوئے شیدے! تم نے کیسے پہچانا مجھے؟“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کان قریب کرنے کا کہا۔ کان میں بولا۔ ”اللہ کی قسم! اُکا پٹھان لگدا اپنیں.....“

(اللہ کی قسم! بالکل پٹھان لگ رہے ہو)

”پر تم نے کیسے پہچان لیا؟“ مجھے یہ خیال دہلایا تھا کہ اگر مجھے شیدے نے پہچان لیا تھا تو پھر مجھے کوئی بھی شخص پہچان سکتا تھا۔

”تم پچھلی مرتبہ اسی حلیے میں آئے تھے۔ مجھے استاد کھالے نے بتایا تھا۔ پر تم ڈرو مت میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ کوئی تمہیں پہچان نہیں سکتا۔ پر تم ہو تو شہرے خان ہی ناں؟“ اس کی آواز میں تشکیک کا عنصر غالب تھا۔

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ سامان بے وجہ ادھر ادھر کیا تاکہ کوئی مجھے شیدو کے پاس کھڑا دیکھ کر خشک میں مبتلا نہ ہو۔ پوچھا۔ ”ہاں یا ر شیدیا! میں شہرا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کھالا کہاں ہوگا اس وقت؟“ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا ورنہ مجھے اس کی خوشی سے دکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیتیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا، بولا۔ ”وہ تو عاشقی مشوقی میں پڑ کر کسی کام کا نہیں رہا۔ ادھر، اپنی بے بے کے ساتھ، حیدر خان کی کوشی پر ہوگا اس وقت۔ تمہیں پتا نہیں؟ اس نے حیدر خان کی نوکری کر لی ہے۔ وہ خان زادی کا ڈرائیور بن گیا ہے، باڈی گارڈ بھی۔ بڑا سا پستول کچھ (بغل) میں دبائے گھومتا پھرتا ہے۔ موجاں! می موجاں میں آوندیاں!“

(اس کی موجیں ہیں)

یہ خبر میرے لیے نئی اور حیرانی کا سبب تھی۔ میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ حیدر خان کوئی موقع نکال کر کھالے کو ٹھکانے لگاتے ہوئے اپنی بدنامی کے گواہ کو صفحہ ہستی سے غائب کر دے گا۔ میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے گھر میں داخل کر لے گا اور گیدڑ کو خربوزوں کی رکھوالی پر مامور کر دے گا۔ میں نے آنکھیں نمچائیں۔ شیدو بہت شرارتی طبع تھا۔ اس نے خانزادی اسما کو کھالے کی بے بے قرار دیا تھا۔ مقامی زبان میں لفظ بے بے ماں یا بوڑھی عورت کے

لے استعمال ہوتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں دیے رن آؤٹ کی آواز بھری آواز سنائی دی۔ ”اوئے شیدیا! اڈے مر.....“

بوجھ مارے سواریاں کو بھل مار.....“

(اوئے شیدیا! ادھر آ اور سواریوں کو ادھر بلا)

”استاد کھالے کے گھر چلے جانا۔ میں کسی نہ کسی طرح اسے قہارے آنے کی خبر کرتا ہوں۔“ شیدے نے مجھے کہا اور جست بھر کر وچن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حلق پھاڑ کر بولا۔ ”اولالہ..... وڈی امڑی..... چونک کر بیٹھی چلتا ہے.....“

بوجھ مارے سواریاں کو بھل مار.....“

(آخری ناٹم ہے بھاگ کر آؤ)

وہ سواریوں کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے سامان اٹھایا اور میلے کی طرف چل پڑا۔ اس سال میلے کے لیے خالی کی گئی جگہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ دربار سے پڑتک دو ایکڑ کا فاصلہ حائل تھا۔ کانوں میں مختلف آوازیں پڑ رہی تھیں۔ میں فصلوں کے بیج پگڈنڈی پر چلتا ہوا پانچ دس فٹوں میں اس موج میلے بھری دنیا میں پہنچ گیا۔ وہی آب و تاب، وہی بے ہنگم جھوم، کان چیرتا ہوا شور اور دیہاتیوں کے دھتکتے ہوئے چہرے..... ان لوگوں کی واحد تفریح یہی تھی جو سال بعد میسر آتی تھی۔ سرکس، موت کا کواں، بولے، تھیر اور تھیروں کا رقص..... جلیبی، خشک مٹھائی اور بیہوشات سے بھری ہوئی دل لپانے والی عارضی دکانیں خوشبو کے بجائے اڑاتے ہوئے سموسوں، پکڑوں کے اسٹالز اور رنگ رنگ چوڑیوں اور سستے کاسمیٹکس پر غورتوں اور لڑکیوں کے ٹھنڈے..... سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میں نے یہاں منعقد ہونے والے بھی میلے دیکھے تھے۔ ہر بار دل خوشی سے جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ آج بھی کیفیت ویسی ہی تھی مگر کوئی سب سا غلا دل میں جا گزیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی گلی بہت ہی جیتی شے اسی میلے میں رکھ کر بھول گیا ہوں اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تلاش کیے جا رہا ہوں۔ میں بے ہوش تھیر تھیر قدموں سے چل رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں، میں نے میلے کے لیے مختص کی ہوئی تمام جگہ کو کنگھال ڈالا۔ تلاش کے باوجود میں اپنا سامان بیچنے کے لیے آواز نہ اٹھا سکا۔ ایک بڑے سے ”پڑ“ کے سامنے آ کر رکا۔ بڑا سا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے بیئر ز آویزاں تھے جن پر کربار حیدر خان، وریام خان اور حیات خان کے نام بڑے بڑے حروف میں درج تھے۔ بیئر ز کی مکمل عیارت پڑھ کر مجھے یہاں محفل موسیقی منعقد ہونے والی تھی جس کے کھانا خصوصی خانزادے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں رکا

رہا۔ ایک سرخ مفلر والا اجنبی میرے قریب آیا اور کریدی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”اوئے! تم کون ہو؟“ اس کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ میں ہتھے سے اکھڑنے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے اپنی پوزیشن کا خیال آ گیا۔ مجھے یہاں لڑائی بھڑائی سے اجتناب کرنا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں میلا دیکھنے آیا ہوں۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم یہ سامان بیچتے ہو؟“

”ہاں! مگر اُم نے ایدھر کچھ نہیں بیچا۔“ میں نے عاجزی دکھائی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ایک طرف کھینچا۔ ”چلو! ٹھیکیدار کے پاس چلو۔ وہی تمہارا فیصلہ کرے گا۔“

میں نے کہا۔ ”آمارا فیصلہ..... اُم نے کیا جرم کی اے؟“ اس نے میرے واویلے پر دھیان نہیں دیا اور بے وردی سے کھینچتا ہوا سرکس کے پہلو میں لگے ہوئے ایک سرخ رنگ کے بڑے خیمے میں لے گیا۔ وہاں ایک بڑی موچھوں والا موٹا شخص لوہے کے پائپ والی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ دو پست قامت بیچنے والے اس کی پنڈلیاں دبارے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر خشونت سے بولا۔ ”اوئے جیلے! اہ کنوں پھڑ لیا یا ایس؟“

(اوئے جیلے! یہ کسے پکڑ لائے ہو؟)

اس کا لہجہ خالص لہوری تھا۔ آنکھوں میں درشتی رچی ہوئی تھی۔ حلیے سے چھٹا ہوا بد معاش نظر آتا تھا۔ جیلے نے اسے بتایا کہ میں میلے میں الیکٹرونکس کا سامان بیچنے کی غرض سے آیا ہوں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں بائی! یہ جھوٹ مارتی اے..... اُم صرف میلا دیکھنے آئی اے۔ ایدھر کچھ بیچتا نہیں اے۔“

ٹھیکیدار نے مجھے گہری نظروں سے گھورا۔ پھر جیلے کو دیکھا۔ جیلے بولا۔ ”یہ جوڑے کے ٹھپے پر کھڑا تھا۔ میں اسے پکڑ کر ادھر لے آیا ہوں۔“

”جوڑے کا دھندا کیسا ہے؟“

”ایک دم زبردست ہے۔“

”پر وہ تو کہتا ہے کہ مال نہیں بن رہا۔“

”وہ بھاڑا کم کرانے کے چکر میں ہوگا۔“

”گلوکارہ آئی ہے؟“ ٹھیکیدار کی آنکھوں میں شوق سا بیدار ہوا۔

”ابھی تو نہیں آئی مگر آنے والی ہے۔ خان صاحب نے اپنی گاڑی بھیجی ہوئی ہے اسے لانے کے لیے۔“ جیلے نے بتایا۔

”پھر تو وہ ضرور آئے گی۔“ ٹھیکیدار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں! کیا تم نے اس بے وقوف پٹھان کو میلے کی حدود میں اپنا مال بیچتے ہوئے دیکھا ہے؟“ ٹھیکیدار کی دہشت ناک آواز خیمے میں گونجی۔

”دیکھا تو نہیں ہے ٹھیکیدار جی! پر یہ ادھر مال بیچنے کے لیے آیا ہے۔“ بھیلے نے جھٹ سے کہا۔

”نہیں ٹھیکیدار! ام ایڈھر مال نہیں بیچتی اے۔ ام صرف تماشا دیکھتی اے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں معاملہ خراب ہو۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ بھنگ ادھر کونے میں ڈال دو اور موج میلا دیکھو۔ جب تماشا دیکھ لو گے، آ کر اپنا مال اٹھا کر یہاں سے چلتے بنو گے۔“ ٹھیکیدار نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اوئے خبیث! ٹانگیں دباؤ۔ تمہارے ہاتھ کیوں رک گئے ہیں؟“

دونوں لونڈے ہاتھ روک کر ہماری باتیں سن رہے تھے۔ ٹھیکیدار کی ڈانٹ سن کر ان کے ہاتھوں میں بجلی کوند گئی۔ میں نے کندھے اُچکائے اور سامان رکھنے کے لیے خیمے کی ٹکڑ کی طرف بڑھا جس طرف ٹھیکیدار نے اشارہ کیا تھا۔ سامان رکھ کر پلٹا تو ٹھیکیدار نے کہا۔ ”اوئے پٹھان! کیا تم میلے میں مال بیچنا چاہتے ہو؟“

میں نے اپنے انداز میں معصومیت رچاتے ہوئے کہا۔ ”اتنا بڑا بڑا دکانوں کے ہوتے ہوئے امار مال کدھر بکتی اے ٹھیکیدار!۔۔۔۔۔“

اسے یقین آ گیا کہ میں محض میلاد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنی چار پائی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ جیلے کو ہاتھ کے اشارے سے دفع کیا۔ وہ دفع ہو گیا تو ٹھیکیدار مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کس علاقے سے آیا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں درہ پیزو کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ اس نے آنکھیں پھیلایں۔ ”فرٹیر سے آئے ہو؟“

”ہا۔۔۔۔۔ ہا! ایڈھر کاروبار کرتا اے۔“

وہ بولا۔ ”تمہارے پاس اور سودا بھی ہوتا ہے؟“

اس نے آنکھ دبا کر مجھ سے پوچھا۔ میں سمجھ گیا، بولا۔ ”نہیں ٹھیکیدار! ایک نمبر مال نہیں ملتی۔ دو نمبر مال بہت اے پر ام اس کا وند نہیں کرتی اے۔“

”آخر ایک نمبر مال بھی تو ہو گا ہی۔۔۔۔۔ کہیں نہ کہیں۔۔۔۔۔ تلاش کرنے پر تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“ ٹھیکیدار نے مجھے کریدا۔ میں نے کہا۔ ”خدا تو آرجگہ پر اے، اس لیے مل جاتا اے۔ مال نہیں ملتا۔“

اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ جس مانگتا تھا یا پھر بدنام زمانہ دوائی سلاجیت کا طلب گار تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سے جان چھڑائی۔ اس دوران اس نے کمال فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے چائے پلائی اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ یہ آفر بھی کی کہ میں اسے میلے کا بازار دے کر اپنا مال بیچ سکوں ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میری میں میری دکانداری نہیں چل سکتی۔

میں اپنا سامان اس کے خیمے میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ ایک طرح سے مجھے فائدہ ہوا تھا کہ اس کم بخت بھاری بھر کم بوجھ سے نجات مل گئی تھی۔ یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ وہ چوری شکل والا ٹھیکیدار میری عدم موجودگی میں سامان کی تلاشی لے گا اور چرس، خشیش یا سلاجیت ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرے گا۔ اس کوشش میں ناکامی پر وہ کسی اور شے پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایک آدھ ڈبے کی پھٹی لگا بھی لیتا تو مجھے پروا نہیں تھی۔

میلے کی رونق عروج پر تھی۔ انسانوں کے اس جھوم میں نور پور کے تقریباً سبھی شاساچرے نظر آئے۔ افسر علی، ولی محمد، جمیل ڈونہ، مولا داد، دلاور، قطب دین، علم دین پٹواری، شریف چکی والا، بدر دین۔۔۔۔۔ اور ان کی اولادیں۔۔۔۔۔ ہر شخص کو دیکھ کر میرا دل اس سے بغل گیر ہونے کے لیے مچلتا تھا۔ بہت کم عرصے میں مجھ سمیت میرے خاندان کے کتنے چہرے نور پور کے منظر نامے سے اوچھل ہو گئے تھے۔ ایک ٹھکر جل گیا تھا۔ میرے دل میں کک جاگی کہ کسی بھی چہرے پر ملال ثبت نہیں تھا۔ کسی کو میرا دکھ نہیں تھا۔ دل کو سمجھایا۔ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جو سامنے ہوتا ہے، وہی سب کچھ ہوتا ہے۔ جو اوچھل ہو جاتا ہے، وہ کسی کا نہیں رہتا۔ یہ بڑی بات نہیں تھی کہ نور پور کے لوگ، جن سے جدا ہو کر میں ہر وقت اپنے آپ کو ادھورا خیال کرتا تھا، وہ اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ میلا کشاں کشاں تھا۔ رستے رواں دواں تھے۔ لوگ کھاپی رہے تھے۔ شادیاں کر رہے تھے۔ رقص کر رہے تھے۔ کسی کو شہر یا یاد نہیں تھا۔ چراغ دین اور اس کا خاندان کسی کے دھیان میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر منور علی شاہ کو بھی سب بھول چکے تھے۔ اور تو اور۔۔۔۔۔ دیوانے اور کھالے نے بھی حالات سے مفاہمت کر لی تھی۔ وہ جو مجھ سے جدا ہو کر ایک دن گزار نہیں سکتے تھے، اب مہینے گزارنے کے لائق ہو گئے تھے۔

میں نے پکڑے خریدتے ہوئے ایک طویل سانس حلق میں اتاری اور بڑبڑایا۔ ”ہاں بھی شہرے ایسا ہی ہوتا

میں نور پور سے ملتان گئے تو یہاں کی ڈوریں تمہارے لئے لگ گئیں۔ ملتان سے لوٹو گے تو وہاں تمہیں یاد نہیں آئے گا۔ دنیا کا چلن ایسا ہی ہے۔“

میں ایک ایک چہرہ دیکھتا ہوا رات گزارتا رہا۔ شور لحوہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک بلند چوٹی تخت پر بیچڑوں کا رقص جاری تھا۔ میں زمین میں گڑے ہوئے ایک موٹے بانس سے ایک لگے کھڑا ہو گیا اور انہماک سے رقص دیکھنے لگا۔ رقص میں بیچڑے بھرپور اور جواں سال لڑکیاں دکھائی دے رہے تھیں۔ میں اور کھالا اسی مغالطے میں جانے لگی تھی کہ یہاں کھڑے مجھ کو تماشا رہتے تھے۔ پھر جب میں نے دور بین کی مدد سے ایک خوبصورت لڑکی کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا تو مجھ پر راز کھلا تھا۔ وہ دور بین کھالے نے چاکر میرے ہاتھ فروخت کی تھی۔ اس دور بین سے میری کی یادیں جڑی ہوئی تھیں جو اس گھڑی مجھے ستا رہی تھیں۔ جب جیب خالی ہوتی تھی مگر دل خوشی کے انجذاب کی بھرپور توانائی رکھتا تھا۔ ہر چیز خریدنے کو جی چاہتا تھا جب خرید نہیں سکتا تھا۔ بس دیکھ دیکھ کر خوش ہو جایا کرتا تھا۔ آج جیب بھری ہوئی تھی مگر تمنائی پہلو خالی تھا۔ کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی خواہش دل میں پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

میں رات گزارنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک ایک چہرہ دیکھ لیا مگر مجھے غزالہ یا پھوپھی دکھائی نہیں دیں۔ وہ آج نہیں آئی تھیں۔ خانزادوں کی خواتین وفد کی شکل میں آیا کرتی تھیں۔ ان کے چاروں طرف اسلحہ بردار پہرے دار ہوا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ آنکھ اٹھا کر انہیں دیکھ لے۔ آج وہ بھی نہیں آئی تھیں۔ بے نیل مرام چکراتے ہوئے میں نصف شب کا سفر طے کر آیا۔ بارہ بج گئے۔ ایسے ہی وقت میں جب میں ایک اسٹال پر بیٹھا پیٹ پوجا کے بعد آنکھ چائے پینے میں مشغول تھا، شور اٹھا۔ اپنی مخصوص ڈگر پر کامزن میلے میں گویا بھونچال سا آ گیا۔ لاؤڈ اسپیکر چیخ اٹھے۔ لوگ جوڑے کے پھنے کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے کان لگائے۔ پتا چلا کہ جوڑے کے پنڈال میں گلوکارہ آئی تھیں۔ اناؤنسر بیجان خیر آواز میں لوگوں کو بتا رہا تھا۔ میں نے اسٹیج پر آویزاں بیوروں پر گلوکارہ کا نام پڑھا۔ فہم پر دین نذر۔ وہ سرائیکی کی مقبول عام فن کارہ تھیں۔ کسی ایسا فنکارہ شہر سے آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھی۔ نور پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ میں نے اُسے ایک مرتبہ اسی میلے میں سنا تھا اور آج تک اس کی مدھر آواز کو اپنے جلو میں سرگرداں پایا تھا۔

میرے قدم خود کار انداز میں جوڑے کے پنڈال کی طرف بڑھنے لگے۔

پنڈال پر میلے میں شریک تمام افراد اندھا دھند ٹوٹ پڑے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں ٹکٹ لینا پڑے گا مگر یہ دیکھ کر حیرانی کی انتہا نہ رہی جب وہاں ہر خاص و عام کو بغیر ٹکٹ، بغیر روک ٹوک گھستے دیکھا۔ میں بھی بانسوں کی بنی ہوئی دیوار پھلانگ کر پنڈال میں پہنچ گیا اور لوگوں کو دھکیلتا ہوا، راستہ بناتے ہوئے اسٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ اسٹیج پر سازندے اپنے آلات کو چھیڑ رہے تھے۔ ان کی چھیڑ چھاڑ بھی بڑی مسحور کن تھی۔ میں اگلی قطار میں بیٹھ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر شریف چکی والا اپنے پوٹے منہ کو ہلار رہا تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر ایک اجنبی نوجوان براجمان تھا۔

پندرہ بیس منٹ کے اعصاب شکن انتظار کے بعد اچانک پنڈال کے منتظمین نے عین وسط میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اٹھانا شروع کر دیا۔ پتا چلا کہ خان زادے پنڈال میں تشریف لارہے تھے۔ ان کے لیے راستہ بنایا گیا۔ چند لمحوں بعد سردار حیدر خان اپنے کروفر کے ساتھ پنڈال میں داخل ہوا۔ اس کے دائیں بائیں وریام خان اور حیات خان جبکہ عقب میں بہرام خان اور دیوانے سمیت تین چار افراد چل رہے تھے۔ پانچ چھ گن بردار پہرے داروں نے انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ حیدر خان کو دیکھ کر میری آنکھوں میں چند انگارے سے سلف اُٹھے۔ یکبارگی جی چاہا کہ لوگوں کی پروا کیے بغیر اس پر شعلہ جوالا بن کر ٹوٹ پڑوں اور اسے عبرت کا نشان بنا دوں۔ وریام خان کی طرف بھی میرے کچھ حساب کتاب نکلتے تھے۔ میں نے بہ وقت خود کو سنبھالا اور اپنے خون کے پیاسوں کو ملنے والے غیر معمولی پروٹوکول کو دیکھتا رہا۔ اسٹیج پر مائیک تھام کر اعلان کرنے والے شخص کو میں نہیں جانتا تھا۔ وہ میلے کی انتظامیہ کا ہی کوئی شخص معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سردار حیدر خان کی شان میں خوب بڑھ چڑھ کر قصیدہ گوئی کی اور کئی مرتبہ بتایا کہ اس پنڈال کے انعقاد میں حیدر خان کی ذاتی کوشش کا عمل دخل ہے ورنہ اتنی بڑی گلوکارہ کو میلے میں لانا آسان کام نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی بتانا ضروری سمجھا کہ بڑے خان نے اپنی گرہ سے گلوکارہ کی فیس ادا کی ہے۔ اس اثنا میں خانزادے اسٹیج پر پہنچے ہوئے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ خان کے اسلحہ بردار باڈی گارڈز صوفے کے عقب میں کھڑے ہو کر شکرے جیسی نگاہوں سے پنڈال کو دیکھنے لگے جبکہ مراد بخش دیوانہ ایک طبلہ نواز کے پہلو میں ڈبک کر بیٹھ

کیا۔ سچ پہرے داروں کی وہاں موجودگی محض عوام پر حیدر خان کی دہشت جمانے کے لیے بھی ورنہ یہاں اس کی جان کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں تھا۔

کچھ دیر تک خانزادوں کی مدح سرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر فن کارہ کی آمد کی اطلاع نشر کی گئی۔ پنڈال نے کھڑے ہو کر پروین نذر کا استقبال کیا۔ اسے دوسری مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ملکوتی حسن کی مالک نہیں تھی مگر اس کی سنجیدگی اور سادگی نے خاصا جاذب نظر بنا رکھا تھا۔ عمومی لوگ فن کاروں سے مختلف تھی۔ اپنے فن سے گہرا لگاؤ رکھتی تھی۔ اس کے اسٹیج پر بیٹھتے ہی دیہاتیوں نے اس کے سامنے فرمائشوں کے انبار لگا دیے۔ وہ مسکرا کر سب کی محبت پاش نظروں کا جواب دیتی رہی پھر بڑے خان کی اجازت سے سازندوں کو ہدایات دینے لگی۔

وہ بہت بڑی فن کارہ تھی۔ اس کی آواز کی بچ اور نے غیر معمولی حسن کا شاہکار تھی۔ جونہی اس نے سر چھیڑے، یوں لگا جیسے پورا پنڈال ویران ہو گیا ہو اور لوگوں نے گویا سانس لیتا پھر کسی وقت پر موقوف کر دیا ہو۔ میرا دھیان خانزادوں کی طرف سے ہٹ کر اس کی طرف مبذول ہو گیا تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کا کامدار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جو اس پر بہت بچ رہا تھا۔ سانولا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا مگر بھلا لگ رہا تھا۔ خانزادوں کے چہروں پر خوشی کی غماز جھللا ہٹیں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ لوگ جوق در جوق رقص کرتے اسٹیج کی طرف آتے اور گلوکارہ پر ٹوٹ نچھاور کر کے اپنی اپنی جگہوں پر ٹوٹ جاتے۔ اس نے ابھی ایک ہی گیت گایا تھا کہ اسٹیج ٹوٹوں میں چھپ گیا۔ وہ کمال بے نیازی سے، ٹوٹوں کی طرف توجہ دے بغیر، ہاتھ سے ہارمونیم سے ہٹاتی رہی، گاتی رہی۔ اس کا انہماک دیدنی تھا۔

ایسے ہی وقت میں مراد بخش دیوانے کو حیدر خان نے بلایا۔ وہ مؤدبانہ انداز میں خان کے کان لگا۔ پھر پروین نذر کے پاس آ کر جھکا۔ چند بڑے ٹوٹ اس کے قدموں میں رکھے اور سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خان کو دیکھا اور ہاتھ مارتے پر رکھ کر شکر یہ ادا کیا۔ میں سمجھ گیا۔ خان نے کسی گیت کی فرمائش کی تھی۔ اسی گھڑی مجھے کھالا دکھائی دیا۔ وہ پہلی قطار کے آخری سرے پر بانس سے چٹ کر کھڑا تھا۔ اس کی نظریں ارد گرد کچھ تلاش کرنے میں محو تھیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا رابطہ شیدو سے ہو گیا ہے اور وہ مجھے اس جہوم میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا

ہے۔ میرے دل کو ایک ذرا تسلی ہوئی۔ اس کے گھر کے علاوہ میں بھرے نور پور میں کہیں رات گزار نہیں سکتا تھا کیونکہ ایک وہی میرا راز دار تھا جس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف جانے کے ارادے سے اٹھنا چاہا۔ ایسے ہی وقت میرے کانوں میں پروین نذر کی شوق اور مدھر آواز پڑی اور یوں لگا جیسے میں پورے کا پورا اس آواز کے سحر میں جکڑا گیا ہوں۔ اس نے ایک ایسا گیت چھیڑ دیا تھا جس کا لفظ لفظ جذبات سے گندھا ہوا تھا۔ "چن تے بیڑی، بیڑی وچ پک پھل رتا جیا..... مل کے وت و وچھروں، ایہا چن منگوں دعا....." اس کی آواز زندگی کی آس سے بھر پور تھی اور اس سرائیکی لوک گیت کے شعلے بھرے بول پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لے گئے تھے۔ میرا دھیان کھالے سے ہٹ کر گیت کی طرف مبذول ہو گیا اور میں ساکت نظروں سے، سینے میں سانس کی طمانیں تمام کر، پروین نذر کو دیکھنے لگا۔ ہمارے سرائیکی وسیب کا یہ سرخیل لوک گیت اپنے اندر امانوں کی اتنی بڑی آزمائش اور اظہار سموئے ہوئے ہے کہ انسانی ذہن جتنا غور کرتا ہے، اتنا ہی اس میں الجھ جاتا ہے۔

موسیقی بھر پور تھی۔ گیت کا آخری بول ختم ہوا۔ لوگوں نے داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بڑے خان نے پھر کچھ ٹوٹ دیوانے کے ہاتھ اس کی خدمت میں پیش کیے۔ اسی گیت کو پھر گانے کی فرمائش کی۔ فرمائش مان لی گئی۔ جب تیسری مرتبہ خان نے فرمائش کی تو پروین نذر نے آہستہ سے گردن موڑی۔ پلٹ کر بڑے خان کو دیکھا۔ ہولے سے کچھ کہا۔ خان کے چہرے کے تاثرات سے پتا چلا کہ پروین نے فرمائش پوری کرنے سے انکار کیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پروین تیسری مرتبہ گیت نہیں دہرائے گی۔ اٹھا اور کھالے کی طرف چلا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی فضا میں گیت کا ابتدائی دوہڑا مرتعش ہوا، میں کھالے کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتا چلا کہ اس نے پہلی نظر میں ہی مجھے پہچان لیا تھا۔ قدرے بلند آواز میں بولا۔ "اؤئے خان! کیا بات ہے؟"

میں نے چند ایک استحقاقہ ڈائلاگ ادا کیے پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں اسے بارے بتانا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں کامیاب رہا۔ وہ اب گاہے بگاہے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جگہ تلاش کر کے بیٹھ گیا اور موسیقی کی

میں لفظ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ پروین نذر کی آواز کا عزم تھا۔ مجھے فطرت کی آواز پر پنڈال کچھ دیر کے لیے ہلکا ہوا۔ بادل ناخواستہ کھیتوں میں نکل آیا۔ میرا تمام تر دھیان پروین کی آواز کی طرف تھا، اس لیے فصل میں کافی آگے تک نکل آیا۔ موسم اچھا تھا۔ شبنم رات کے دامن کو بھگو رہی تھی۔ میں نے کیلی فصل پر ہاتھ پھیرے۔ ہاتھ نرم ہو گئے۔ اوس اچھی لگی۔ جی چاہا کہ اپنا چہرہ گیلہ کروں پھر یاد آیا کہ ایسا کرنے سے میک اپ خراب ہو جائے گا۔ ناچار عوامی رو کرنا پڑی۔ ماحول میں پروین کی شوق آواز گونجی۔ "ہر دیلے تانگھاں یار دیاں بیٹھی رو رو کاٹک ڈاراں....."

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اس نے میرا پسندیدہ گیت چھیڑ دیا تھا۔ خواجہ فرید کے کلام سے سراٹھایا تھا۔ میں تیز قدموں سے چلتا ہوا پنڈال میں آیا۔ اس نے گیت گایا۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ اس نے کتنے گیت گائے، گائے بھی یا نہیں۔ میری سماعت کی سیراپاں وہیں رکی ہوئی تھیں۔ میں جب اپنے حواس میں آیا جب محفل کے اختتام کا اعلان ہوا اور پروین نذر اسٹیج پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے اسٹیج پر بکھرے ہوئے ٹوٹ سمیٹنا شروع کر دیے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے خانزادے اور پروین نذر اسٹیج کے قریب راستے سے باہر نکل گئے۔ میں جلدی سے باہر آیا۔ ایک دو کے بعد ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ بے اختیار پروین نذر کے سامنے پہنچا۔ فوراً عقیدت سے اس کا ہاتھ تھاما اور جوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ وہ فرط تفاخر سے مسکرائی، میں نے کہا۔ "اے بہن! تو بہت اچھا گاتا ہے....."

اپنے جذبات کو اپنے گیت آپ کی آواز دینے کے لیے میں نے کتنے مشکل مراحل سے گزرا تھا۔ اس کی فضا سے خفا لانا نظر مجھ پر پڑی۔ مسکرائی اور آہستگی سے اٹھ کر آگے چلی گئی۔ میں وہیں رکا رہ گیا۔ ایسے میں اس کے کندھے پر کھالے نے ہاتھ رکھا۔ اپنی طرف موڑ کر مجھے پتا تھا..... تم باز نہیں آؤ گے۔ ادھر آؤ۔"

میں خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اس کے ساتھ چلتا ہوا پہلے کی حدود سے نکل آیا۔ ہم کچھ فاصلے پر فصلوں میں گھسے ہوئے کھال کے بنے پر پہنچ کر بڑے جذباتی انداز میں نکل کر گھر ہوئے پھر وہیں بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ "یار! اسے اتھو صورتی خدا کی دین ہے۔ کسی کو قتل کرنے والی مسکرت دے دیتا ہے تو کسی کو مژدوں میں جان ڈال دینے والا آواز بخش دیتا ہے۔ مجھے ابھی بھی یوں لگ رہا ہے جیسے

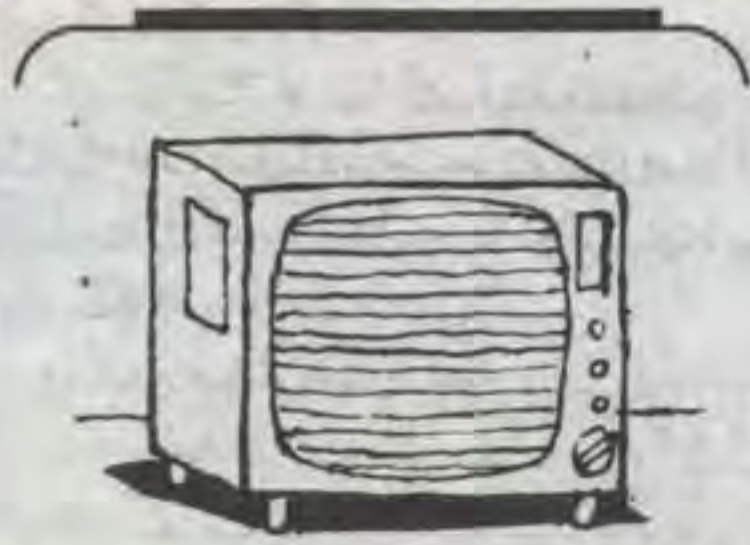
پروین گارہی ہے اور پورا زمانہ اُسے سن رہا ہے۔ میں نے ہی حیدر خان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ میلے میں پروین نذر کو لے آئے۔ پورے پچاس ہزار روپے لیے ہیں اس نے!" مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ اگر دس لاکھ بھی لیتی تو کم تھے۔ میں نے ایک بھر پور سانس سینے میں اتاری اور کہا۔ "کھالے! شیدو نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"ہاں! مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں مطلع صاف ہے۔ تم اگر اپنے حیلے میں بھی آ نکلتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔"

"کیا حیدر خان مجھے کچھ نہ کہتا؟" مجھے تعجب ہوا۔ "اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ تمہارے گناہوں کی فہرست خانزادوں کی دانست میں بہت لمبی ہے۔" اس نے بغل والی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی۔ "تم سناؤ۔ تمہاری میڈم کیسی ہے..... میرا شاہ کا کیا حال ہے؟"

اس نے فردا فردا سب لوگوں کے بارے میں استفسار کیا۔ پھر میں نے بھی اس سے نور پور کے کمینوں سے سرائیکی احوال لیا۔ اس نے امیر نواز کے بارے میں بتایا کہ وہ کچھ دن پہلے نور پور آیا تھا اور دو دن رہ کر چلا گیا تھا۔ اس کی ملاقات کھالے سے نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ پروین کی بابت امیر نواز سے دریافت کرنے والا کوئی مدعی نور پور میں باقی نہیں تھا، اس لیے پروین کا قصہ یاری نہ ہو گیا تھا اور سب لوگ پروین اور شہرے خان کو بھول گئے تھے جیسے کبھی رجواہر سوہنے کو لوگوں نے ذہنوں سے محو کر دیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یارن خان ان دنوں حویلی آیا ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بخت خان ان دنوں کھل کر سردار حیدر خان کی مخالفت پر اتر ا ہوا تھا۔ اس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں وہ بڑے خان کے مقابلے میں کھڑا ہوگا۔ نور پور کے لوگ اس نئی محاذ آرائی سے خاصے خوفزدہ تھے۔ کھالے کو مراد بخش دیوانے نے یہ بتا کر مزید سراسیمہ کر دیا تھا کہ سردار یارن خان نے سردار بخت خان کی حمایت کا اعلان کر کے نیا محاذ کھول دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ نور پور میں اگر کسی نے بخت خان کو ووٹ نہ دیا تو وہ اپنا سامان اونٹوں پر لا کر رکھے۔ چونکہ ابھی انتخابات میں سال بھر کا عرصہ بڑا تھا، اس لیے اس موضوع پر زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے تین بج گئے تھے۔ رات اپنے پر سینے لگی تھی اور اب تب میں پو پھٹنے کو تھی۔ میں نے کہا۔ "یار کھالے! اگر مجھے کچھ دیر سنانے کا موقع مل جائے تو میں دن بھر پھیری لگا سکوں گا۔"

"اوہ ہاں! باتوں باتوں میں بہت سادقت گزر گیا



بولاً۔ ”غزالہ کا خیال دل سے نکال دو شہرے خان! وہ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے مایوس ہوگئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیوں؟ کیا میں مر گیا ہوں جو وہ مایوس ہوگئی ہے۔ وہ میری ہے۔ بس! میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ آج نہیں تو کل..... آخر بھی تو مجھے نور پور لوٹنا ہی ہے۔ اگر نہ بھی لوٹ سکا تو اسے وہاں لے جاؤں گا جہاں میرا دانتہ پانی لکھا ہوگا۔ تم یہ بتاؤ وہ کیسی ہے؟“

اس نے کندھے اچکائے، کہا۔ ”ویسی ہی ہے۔ اس نے کیا تبدیل ہوتا ہے جو پوچھ رہے ہو۔“

مجھے اس کے بے نیازانہ رد عمل پر غصہ آیا مگر وہ میری پروا کیے بغیر بولا۔ ”شہرے! بہتر یہی ہے کہ تم میڈم سے شادی کر لو۔ تمہاری زندگی بن جائے گی۔ یہ خاندان سے تمہاری گردن کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ اب تم کبھی نور پور لوٹ نہیں سکو گے۔ آگے..... اور آگے..... ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ گے۔ تم سچ کہتے تھے کہ ایک نہ ایک دن قسمت کی دیوی تم پر مہربان ہو جائے گی اور تمہارے سارے دلدرد دور ہو جائیں گے۔ بس وہ قسمت کی دیوی میڈم کے روپ میں تمہاری زندگی میں آچکی ہے..... آہ! ایک تم ہو کہ منزل تمہارے پیچھے بھاگتی ہے۔ ایک یہ

توڑی اور بعد چائے سے لبریز دو پیالے اٹھا لیا، بولا۔ ”میں جتنی پوری ہے یا نہیں مجھے معلوم نہیں۔ لو! گزرا کرو۔“ اس نے چائے اچھی بنائی تھی۔ میں چائے پی کر بستر میں لیٹ گیا۔ وہ باتیں کرتا رہا۔ جب اسے احساس ہوا کہ میں اس کی باتوں سے غافل گہری نیند سوچکا ہوں، تو خاموش ہو گیا۔ پھر صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے جاگ گیا اور شہرے قسانی کے گھر سے اپنے اور میرے لیے ناشا تیار کروا دیا۔ بڑے عرصہ کے بعد خالص دیہاتی طرز کا ناشا ملا تھا۔ رات سے کھایا۔ کھالا اس دوران مجھے کریدنا رہا۔ اسے بے قراری تھی۔ جاننا چاہتا تھا کہ میں نور پور کیوں آیا تھا۔ وہ یہ بات ماننے پر تیار نہیں تھا کہ میں بے سبب یہاں آیا تھا، وہ۔ ”دیکھ شہرے! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم اب بہت بدل گئے ہو۔ تمہارے پاس فضول گوشت پھرنے کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں اجازت حاصل ہے۔ سچ بتاؤ! تمہیں میڈم نے کون سا مشن دے کر یہاں بھیجا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”سچی بات تو یہ ہے کہ میں غزالہ سے ملنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔“ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کیا تم اب بھی اس سے نفرت کرتے ہو؟“

اب حیرانی کی باری میری تھی۔ میں نے جواباً سوال کیا۔ ”اب بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اس نے آنکھیں گھمائیں، منہ لٹکایا۔ کہا۔ ”بلے بھی بلے! کھالے استاد کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو..... جگ جگ جو ہزار سال..... شیطان کے برابر..... ملا میڈم شکیلہ جیسی ہستی کی موجودگی میں تم کسی غزالہ و زالہ کو کیوں دیکھو گے؟“

میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس کا رخ نظر بھانپ کر میں نے کہا۔ ”کھالے! میرا اور میڈم کا کیا جوڑ..... وہی بات تمہاری اور خاندانی والی..... ویسے بھی وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ اس کے لیے دل میں محبت کا گوشہ رکھا جائے۔ اہمیت تریا چلتی ہے۔ یقین مانو میں کل بھی غزالہ سے محبت کرتا تھا، آج بھی اور اپنی آخری سانسوں تک اسے چاہتا رہا گا۔“

اسے میری بات پر یقین نہیں آیا۔ بے یقینی بھری آنکھوں سے مجھے ٹھوٹتا رہا، اچار کی ڈلی چوستا رہا پھر چائے پینے لگا گیا۔ چائے کی چیتک اور پیالے اٹھائے واپس آیا۔

زیادہ قریب رہنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس کی ضد پر اسے خان نے مجھے اس کا خاص ملازم رکھ لیا ہے۔ خواہ اچھی ہے۔ کام کاج بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور شہرے ایک بات بتاؤں؟“ مجھ سے سوال کرنے کے بعد اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ اپنی بات آگے بڑھا دی۔ ”شہرے! یہ بڑے لوگ اندر سے بہت نکو ہوتے ہیں۔ خاندانی کو ہی دیکھ لو۔ وہ مجھ پر بہت اعتماد کرتی ہے اور جانتی ہے کہ میں اس کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہوں مگر..... مگر وہ اٹھے پھر تمہارا دم بھرتی رہتی ہے۔ تم سے ملنا چاہتی ہے۔ سچ بتاؤں..... زبان نہ جل جائے..... وہ تم سے محبت کرتی ہے اور جاگتی آنکھوں تمہارے سنے دیکھنے لگی ہے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا تھا..... مگر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا۔ ”جب سے تم اسے میرے حوالے کر کے یہاں سے چلے گئے ہو، وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ آج بھی اگر اسے پتا چل جائے کہ تم میرے کمرے میں بیٹھے ہو، تو وہ یہاں آنے میں جھٹ دیر نہیں کرے گی۔“

میں ہنسا۔ ”اور اس کا باپ بھی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا یہاں آ جائے گا..... واہ کھالے واہ! بڑی رپورٹ دے رہے ہو!“

”آبے بھتیجی کے..... مجھ پر طنز نہ کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو میرے ساتھ بلوچ نگر چل کر اپنی آنکھوں سے اس کی حالت دیکھ لو۔“ میں نے کھالے کی حالت سے لطف لیا، چھیڑا۔ ”کیا وہ ہر آبرے غیرے کو اپنی حالت دکھانے لگی ہے اب؟“

”کیا مطلب؟“ وہ برا بیچنے ہو گیا۔

”یہی..... کہ وہ مجھے یعنی ایک پھیری والے پنجان کو دل کی کہہ دے گی۔ بتا دے گی کہ وہ شہر یار کی محبت میں پاگل ہوئی پھرتی ہے۔“

میرے لہجے میں نہاں گہرے طنز نے اسے بے قابو کر دیا۔ میرے شانے پر بھر پور ہاتھ مار کر بولا۔ ”اوائے سچ تھیویں چاہ پیسیں؟“

(چائے پیو گے؟)

”تو کیا مجھے ماس خور سمجھا ہے جو نہیں پیوں گا؟“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

اس کم بخت کا ہاتھ شروع دن سے خاصا بھاری تھا۔ میں شانہ سہلانے لگا جبکہ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

ہے۔ گھر چلیں۔ میں تمہارا بستر لگا کر ادھر آیا تھا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم اجڑے ہوئے میلے میں سے گزرے۔ ایک اسٹال کے قریب کھالے کو کھڑا کر کے میں ٹھیکیدار کی طرف گیا۔ مجھے اپنا سامان اٹھانا تھا۔ ٹھیکیدار ایک دیپے پتلے کمائی دار مونچھوں والے شخص سے جھگڑ رہا تھا۔ اس شخص کو میں نے خان کے آگے پیچھے دم ہلاتے دیکھا تھا۔ ”جورے! سچ بتاؤ۔ بڑے خان نے تمہیں کتنا بھاڑا دیا ہے؟“

”سچ کہہ رہا ہوں استاد! اس نے مجھے بیس ہزار روپے دیے ہیں۔ آدھے تمہیں دیے رہا ہوں۔“ دیپے پتلے شخص کی آواز خاصی بھاری بھر کم تھی جو اس کے وجود کا حصہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔

”صرف بیس ہزار..... کیا تم نے مجھے گاؤ دی سمجھ رکھا ہے؟ اتنا بڑا پڑا اور صرف بیس ہزار روپے..... اونٹ کے منہ میں زیرہ..... نہیں جورے میاں! مجھے چکر مت دو۔ سیدھی طرح بتا دو۔“

اسی اثنا میں ٹھیکیدار کی خشونت بھری نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ پہچان لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے مجھے سامان اٹھا کر چلتا بننے کا حکم صادر کیا۔ میں نے ان کے معاملے میں پڑ کر کیا لیا تھا۔ جلدی سے اپنا سامان اٹھا کر، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ کھالانے مجھے گدھے کی طرح لدا ہوا دیکھ کر فلک شکاف قہقہہ لگایا، بولا۔ ”پیاجی نے مجھ پر اس سے بھی زیادہ سامان لادا تھا۔ کندھا سٹل ہو گیا تھا۔“

ہم دونوں چلتے ہوئے سائیں جیت شاہ کے مزار کے قریب پہنچے۔ اکا دکا لوگ گلی میں دکھائی دے رہے تھے۔ نور پور بیدار ہونے والا تھا جب ہم کھالے کے کمرے میں پہنچے۔ گھر خالی تھا۔ میرے استفسار پر کھالے نے بتایا سب لوگ اس کا رشتہ مانگنے فرید آباد گئے ہوئے تھے۔ فرید آباد میں کھالے کی ایک دور پار کی پھولی میٹیم تھی۔ اس کی بیٹی کے لیے بخشو لوہار ان کی روایتی خوشامدوں میں جتا ہوا تھا۔ میں نے چھیڑا۔ ”کھالے! کیا تم نے شادی کے لیے ہامی بھری ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تم نے خاندانی کا خیال دل سے نکال بھی دیا؟“

اس نے ایک مسکراہٹ میری طرف اچھالی۔ اس مخصوص مسکراہٹ سے غربت اور کم مائیگی کا مکمل احساس جھلکتا تھا، بولا۔ ”شہرے! بھلا میرا اور خاندانی کا کیا جوڑ..... وہ تو میری قسمت چٹکی لگی کہ مجھے اس کے زیادہ سے

بدبخت کھالا استاد ہے جو اپنے دل کی رانی پر اپنے دل کی کیفیت بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا۔ ”کھالے! مجھے الٹی پٹی مت پڑھاؤ۔ چھوڑو میڈم اور غزالہ کی باتوں کو..... یہ بتاؤ کہ میں مراد بخش دیوانے سے کیسے اور کہاں مل سکتا ہوں؟ کیا اس پر اپنا آپ ظاہر کرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہوں؟“

وہ کچھ دیر سوچ میں غلطاں رہا، پھر بولا۔ ”ہے تو وہ یار باش بندہ..... غدار اور یار مار نہیں ہے مگر..... مگر آج کل یارن خان کے آگے پیچھے دم ہلاتا رہتا ہے۔ کیا خبر خان کی خوشنودی کے لیے تمہارا راز راز نہ رکھے اور خان کے پاس جا کر بک دے۔ اس صورت میں تمہارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا۔ ”مگر میں اسے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا کروں؟“

”تم اس سے کیوں ملتے پر بھند ہو؟“

”یارن خان کے بارے میں کچھ معلومات لینی ہیں۔“

”ہوں..... تو یوں کہو ناں..... اس مشن پر نور پور آئے ہو۔ مسل چکر دیتے آئے ہو مجھے۔“

”ایسی بات بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر تمہیں یارن خان کی ٹوہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کھالے نے غصہ بھری نظروں سے گھورا۔

”ٹھیک ہے یار! ایسا ہی سہی۔ آج میری قسمت اچھی ہے۔ تمہارے گھر والے فرید آباد گئے ہوئے ہیں۔ تم غزالہ کو یہاں لے آؤ۔“ میرے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ شاید اسے میرا دماغ چل جانے کا شبہ ہوا تھا، بولا۔ ”کیسے لے آؤں؟ وہ گلی میں بیٹھی ہے ناں کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں لے آؤں۔ بھتیگی کے! بتایا تو تھا کہ وہ بخت خان کی حویلی میں رہتی ہے۔ وہ باہر نہیں آتی اور میں حویلی کے اندر نہیں جا سکتا۔“

”یار کھالے! کوئی نمیل کرو..... ملا دو۔“ میں نے منت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ برتن سینٹے ہوئے گنگنانے لگا۔ ”جے کریمتوں سردا ہے تے..... مائے میڈا یار ملا دے.....“

(ماں! اگر تم سے ممکن ہے تو مجھے میرا یار ملا دے)

مجھے اس کی گنگناہٹ زہر لگی۔ میں نے قدرے غصے سے کہا۔ ”کیا بکواس ہے نہیں کر رہا ہوں اور تم نخرے دکھا رہے ہو۔ کوئی طریقہ کرو، اسے یہاں لے آؤ۔“

اس نے صاف انکار کر دیا، کہا۔ ”شہرے! اسے توئی نہ کرو۔ جا کر پھیری لگاؤ۔ شاید وہ تمہیں گلی میں نظر آ جائے۔ اسے دیکھ کر تم اپنا جی خوش کر لینا مگر ملنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ بخت خان تمہاری چڑی ادھیڑ کر رکھ دے گا۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلنا تھا مگر میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ میں نے اپنا سامان کندھے پر رکھا، شام کو دوبارہ ملنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ہاتھ ملا کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ دن خاصا چڑھ آ یا تھا۔ کھالے کے گھر کے پہلو میں، اپنی مخصوص جگہ پر ہائی اسس چوک قریشی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ شیدوائی چیمپ آواز میں سواریوں کو بلارہا تھا جبکہ دیماں رن آؤٹ وین کے فرنٹ ہڈ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ کھالے کے گھر سے نکل کر میں نے نور پور کی گلیوں کا چکر لگایا۔ سوائے چند چہروں کی زیارت کے بے نکل مرام رہا۔ غزالہ دکھائی دی نہ امیر نواز۔ میں نے سردار بخت خان کی حویلی کے کم و بیش دس چکر لگائے اور اپنے کھنڈر گھر کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گلی خالی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ چشم تصور میں رنگ و قسائی کا چہرہ لہرایا۔ میرے ماں باپ کا ایک قاتل دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ انتقام کے شعلوں پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ گیا تھا۔ باقی دشمن ابھی روئے زمین پر چھائی پھیلانے دندناتے پھرتے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے عہد کا اعادہ کیا۔

ایسے ہی وقت میں کھالا دکھائی دیا۔ وہ حیات خان کے دارے کے سامنے پہنچ کر میری جانب مڑا۔ اس کے آنے کا انداز خبر دیتا تھا کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہو گیا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جوسر کا ڈبا اٹھا کر دیکھا شروع کر دیا۔ دھیمی آواز میں بتانے لگا۔ ”شہرے! تیری قسمت چلتی ہے۔ میرے گھر والے آگئے ہیں۔ میں نے پلو کو تمہارے بارے بتایا ہے اور اسے بڑی مشکل سے راضی کیا ہے کہ وہ خان کی حویلی سے غزالہ کو حیلے بہانے سے گھر لے آئے۔ اب دعا کرو کہ وہ آجائے اور تمہارے دل کی آس پوری ہو جائے۔“

میں نے کھالے کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا خوشی ہوئی۔ دل میں کہا۔ ”ملتان سے لکھا تھا تو دل دعا کرنے لگا تھا۔ اب تک خدا سے اس کے ملنے کی دعا ہی تو کر رہا ہوں۔“

ایسے ہی وقت میں اس کے عقب میں مجھے سردار بخت خان دکھائی دیا۔ وہ اپنی حویلی سے نکلا تھا۔ مجھے اور کھالے کو دیکھ کر ذرا اٹھم گیا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

مسافر

”خوجہ! یہ دودھیا جوسر اے۔ لینی اے تو لو ورنہ آم کو تنگ نہ کرو۔“

میری بات سن کر سردار بخت خان کے لیوں پر مسکراہٹ ابھری۔ وہیں سے کھالے کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اوئے کھالے! ابھی کیوں تنگ کرتے ہوئے غریب کو۔ اسے مزدوری کرنے دو۔“

کھالا پلٹا۔ فس کر بولا۔ ”خان جی! دل لگی کر رہا ہوں اس سے۔ ہم غریبوں نے کیا خریداری کرنی ہے۔“

بخت خان باوقار انداز میں چلتا ہوا ہمارے قریب آ گیا..... اسے مجھ سے کچھ خریدنا نہیں تھا مگر میرا سامان دیکھنے لگا۔ میں ایک کے بعد دوسرا ڈبا نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور بڑے جوش کے عالم میں اپنے سامان کی ترغیبیں بھی کرتا۔ اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اوئے خان! یہ تو دودھیر مال ہے۔“

میں نے جھٹ سے کہا۔ ”نہیں خان بابا! قسم سے..... اصل جاپانی مال اے۔ آم نے خود میڈن جاپان کے اسٹرنگ لگائے ہیں۔“

وہ میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنسا۔ میں نے اُسے بغور دیکھا۔ وہ بدلا نہیں تھا۔ وہی رنگ ڈھنگ، وہی وجاہت اور حراج کی نزاکت..... بلاشبہ اس کا بڑھاپا بھی بہت وجہہ تھا۔ اس نے کھالے کو مخاطب کیا۔ ”کوئی نئے لینی ہے؟“

کھالے نے انکار میں سر ہلایا۔ بخت خان نے مجھے کہا۔ ”جس مال پر تم نے میڈن ان جاپان کا اسٹرنگ نہیں لگایا، وہ نکال کر اسے دے دو۔“

میں نے ایک بلیئڈر نکال کر کھالے کو تھا دیا۔ بخت خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مجھ سے رقم پوچھی۔ میرے ہاتھ پر اس نے رقم نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ کھالے نے کہا۔ ”خان جی! یہ لیں۔ اچھا ہے۔“

بخت خان پلٹا۔ چند قدم چل کر رُک گیا۔ شاہانہ انداز سے پلٹ کر بولا۔ ”کھالے! یہ میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔ جاؤ! عفو کو دے دو۔ وہ کسی کڑی کے داج میں رکھ لے گی۔“

کھالے نے تشکر آمیز نظروں سے خان کو دیکھا۔ خان آج بھی کھلے دل کا مالک تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گلی میں سیدھا چلا گیا۔ جب تک وہ یارن خان کی حویلی میں داخل نہیں ہو گیا، ہم دونوں اس کی پشت کو گھورتے رہے۔ کھالا بولا۔ ”اللہ خیر کرے! آج کل دونوں میں سے کوئی گزرتی۔“

مجھے بھی حیرت ہوئی تھی، کہا۔ ”بخت خان اور یارن خان کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ خدا جانے کیونکر تعلقات خوش گوار ہو گئے دونوں کے؟“

”یہ آنے والے الیکشن کا کمال ہے۔“ کھالے نے دانش مندانہ طور سے کہا۔

ایسے ہی وقت میں جب کھالا بلیئڈر کا ڈبا اٹھائے جانے کے لیے پلٹا، کھالے کی بہن خالدہ عرف بلو دکھائی دی۔ وہ سبز چادر میں لپیٹی ہوئی تھی اور تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ اس نے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ خان کی حویلی کے بڑے گیٹ پر پہنچ گئی۔ رُک کر ایک نظر ہمیں دیکھنے کے بعد حویلی میں گھس گئی۔ میں نے کھالے سے کہا۔ ”یہ بلو کو کیا ہوا؟ بہت کمزور ہو گئی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ہاں! بیمار شمار رہتی ہے۔ سرکاری ڈاکٹر کہتا ہے کہ پیٹ میں السر ہے۔ ڈاکٹر نے کہتی ہے کہ رسولی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اس پر سایہ ہو گیا ہے۔ خدا جانے کیا ہے؟ دن بدن سوکھ کر کاٹا ہو رہی ہے۔“

”تم اسے ملتان لے آتے۔ وہاں کسی بڑے ڈاکٹر سے چیک آپ کروالیتے۔“ میں نے تاسف سے کہا۔

”خیال ہی نہیں رہا۔ چند دنوں تک اسے ملتان لے کر آؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم یہیں رُک کر دیکھتے رہنا۔ اگر بلو کے ساتھ غزالہ حویلی سے نکلے تو تم بھی فوری طور پر میرے گھر پہنچ جانا۔ دکان کے چھپرے تلے بیٹھنا۔ ذرا دیکھ بھال کر۔ ہاں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کھالے کے جانے کے بعد دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرنے سے مجھے عجیب سا روحانی سکون ملتا تھا۔ میں نے دانستہ طور پر رقم نکال کر جھولی میں رکھ لی۔ اب مجھے دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ میں اپنی بکری شمار کر رہا ہوں۔ کمائی کا حساب کتاب کر رہا ہوں۔ میرے عقب میں میرا گھر تھا جہاں میرے والدین کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میرے سامنے کالے بزدل کا خستہ ہال مکان اور ملحقہ سردار و یارن خان کی حویلی واقع تھی۔ میرے بائیں ہاتھ پر نور پور کی اکلوتی مسجد تھی جس کے عقب میں مولوی کا مکان تھا۔ یہ سلطنت میری تھی۔ آج اجنبی تھی۔ وقت ایسے ہی بدل جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ نور پور کے درود یوار سے حسرتیں جھانک کر مجھے دیکھ رہی تھیں۔ باوجود کہ یہ محض میرا خیال تھا، مگر بہت توانا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے ہوئے خاصی دیر گزر گئی۔

کوئی پون گھنٹے بعد، جب مجھے بھوک اور پیاس نے ستانا شروع کر دیا، میری امید برآئی۔ بخت خان کی حویلی سے سبز چادر میں لپٹی ہوئی خالدہ برآمد ہوئی۔ اس کے عقب میں گہرے گہجی رنگ کے کپڑوں میں چھپی ہوئی غزالہ تھی۔ دونوں پہلے آگے پیچھے، پھر برابر چلتی ہوئی کھالے کے گھر کی طرف چلی گئیں۔ میں انہیں ایک ٹک دیکھتا رہا۔ ایسے ہی وقت میں کالے بزدار کی سالی میدونے اپنے چوٹی دروازے سے بھاگا۔ مجھے دیکھ کر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ ”تم وہی پٹھان ہوتا جس سے میں نے ایک استری لی تھی؟“

اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بڑی شریر لڑکی تھی۔ میں نے گھبرا جانے کی اداکاری کی۔ ”کیا ہوا؟ کیا وہ خراب ہو گیا اے؟“

”وہ اصلی جاپانی نہیں تھی۔“ اس کے لہجے میں غصے کی آمیزش تھی۔

”اپنے دماغ کا علاج کراؤ بی بی..... چھ سو میں اصلی جاپانی استری کہاں سے ملتا اے؟“

”مگر تم نے تو یہی کہا تھا۔“

”ام تو اب بھی ہر کسی سے یہی بولتا اے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ استری خراب ہو گیا اے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ مسکرائی۔ اس کے انداز سے پتا چلا کہ وہ مجھے تنگ کرنے کے لیے ڈرامے بازی کر رہی تھی، بولی۔ ”گلاس کا سیٹ ہے تمہارے پاس؟“

میرے پاس واٹر سیٹ تھا مگر سودے بازی کا وقت نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ”پٹھان! تم جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ یہ تو پڑا ہوا ہے۔“

اس نے ایک ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے شرمسار ہو کر جلدی سے کہا۔ ”یہ دو نمبر مال اے بی بی۔“

چھوڑو۔ اسے نیچے رکھ دو۔“

اس نے منہ بنا کر ڈبا نیچے رکھ دیا۔ اس کی بڑی بہن دروازے میں آگئی۔ شکر ہوا کہ اس نے میدو کو بلا لیا۔ دونوں بہنیں چند لمحے کھسر پھسر کرتی رہیں پھر کالے کی بیوی نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”اساں کجھ ناں گھنسون پٹھان..... وچ تھی۔“

(پٹھان! ہم کچھ نہیں خریدیں گی۔ جاؤ)

تھا۔ دکان بند تھی۔ میں جھلنگا سی چار پائی پر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اگر میں نے سوانگ نہ چار کھا ہوتا تو بے دھوکہ دھوکہ میں داخل ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد دکان کا دروازہ کھلنے سے کھلا۔ کھالا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر ہنسا۔ ”واہ مجنوں ابوہال کے بیٹھا ہیں!“

(واہ مجنوں! دروازے پر بیٹھے ہو)

میں نے جھینپ کر کہا۔ ”اور امتحان نہ لو۔“

اس نے مجھے سامان سمیت دکان میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ شریف چکی والا کھانسا ہوا حیات خان کے دارے سے نکل رہا تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں برق رفتاری سے دکان میں داخل ہو گیا۔ کھالے نے بیرونی دروازہ بند کر دیا۔ اندرونی دروازے سے نکلتے ہوئے مجھے وہیں رکے رہنے کا اشارہ کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد غزالہ میرے سامنے تھی۔ وہ گہجی رنگ کی پھولدار چادر میں پوری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ پہچان کر دھوکا کھائی۔ وہ شہر یار سے ملنے کے لیے آئی تھی مگر یہاں الیکٹرکس کا سامان بیچنے والا گلاب خان شکر تھا۔ پٹنی۔ واپس جانا چاہتی تھی کہ میں نے لپک کر چادر تھام لی۔ اپنے اصل لب و لہجے میں بولا۔ ”غزالہ..... یہ میں ہوں شہر..... تمہارا شہر یار۔“

وہ تڑپ کر مڑی۔ مجھے بغور دیکھا۔ آنکھوں میں بھری ہوئی بے یقینی فی الفور شناسائی میں بدل گئی۔ چہرے کو چھپانے والی چادر سرک گئی۔ وہ ہائے کہتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی بے ساختگی نے مجھے سمجھنے کی مہلت نہیں دی تھی جس کی وجہ سے میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ فوراً سنبھل بھی گیا۔ اسے سینے سے لگا کر بچنے لگا۔ اس کی سسکیاں نہ

تھمنے والی داستان کی طرح میری ساعت میں اترنے لگیں۔ ”یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟“ اس نے بد وقت خود کو سنبھالا۔

”تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔“ میں نے اس کے عقب میں کھلا ہوا اندرونی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ارد گرد دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کا پرانا بچ دکھائی دیا۔ اسے آہستہ سے چلاتا ہوا بچ تک لایا۔ بٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں زندگی سرسرا رہی تھی۔ چہرے پر آس و امید کے کئی رنگ جھلما رہے تھے۔ وہ یکتا نہیں تھی مگر میری جولانی طبع نے اسے یکتا بنا رکھا تھا۔ وہ حسین تھی مگر ایسی بھی نہیں تھی کہ اس کے بعد کوئی اور چہرہ حسین نہ لگتا مگر

سنبھالا۔

”تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔“ میں نے اس کے عقب میں کھلا ہوا اندرونی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ارد گرد دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کا پرانا بچ دکھائی دیا۔ اسے آہستہ سے چلاتا ہوا بچ تک لایا۔ بٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں زندگی سرسرا رہی تھی۔ چہرے پر آس و امید کے کئی رنگ جھلما رہے تھے۔ وہ یکتا نہیں تھی مگر میری جولانی طبع نے اسے یکتا بنا رکھا تھا۔ وہ حسین تھی مگر ایسی بھی نہیں تھی کہ اس کے بعد کوئی اور چہرہ حسین نہ لگتا مگر

سنبھالا۔

”تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے یہ جتن کیا ہے۔ کھالے کا احسان ہے کہ اس نے تم سے ملا دیا۔“ میں نے اس کے عقب میں کھلا ہوا اندرونی دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ارد گرد دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کا پرانا بچ دکھائی دیا۔ اسے آہستہ سے چلاتا ہوا بچ تک لایا۔ بٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

مسافر

میں نے کہا۔ ”غزالہ! کیا تم مجھے یاد کرتی تھیں؟“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا، بولی۔ ”اور ہر اکون تھا، جسے یاد کرتی۔ تمہارا چھپ کر یہاں آنا اور مجھ سے ملنا ظاہر کرتا ہے کہ تم واپس چلے جاؤ گے۔ ہے ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ”تم مجھے دیکھ رہے ہو، میں تمہیں دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم کچھ دیر کے لیے اپنا بہروپ اتار دو؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں..... یہ ایک بار اتر گیا تو پھر دوبارہ نہیں اوڑھا جاسکے گا۔“

”تمہاری آنکھوں کا رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ مجھے ایکس رے کرتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”آنکھوں میں لینز فٹ کر رکھے ہیں میں نے۔“ میں نے کہا۔ ”ان باتوں کو چھوڑو..... اپنی باتیں کرو۔ میں نے ملتان میں اپنا گھر لے لیا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ملتان چلو گی؟“

وہ گڑبڑ گئی۔ ”اور اماں؟“

”وہ بھی ساتھ چلے گی ناں!“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ پریشان سی ہو گئی۔ ”وہ نہیں لے سکتی۔“

”یہاں رہنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ نور پور تو خالی ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شائو، فرزانہ اور موجو میرے پاس

نہیں۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔“

”میں بھی انہیں بہت یاد کرتی ہوں۔ پروین کہاں ہے؟ کیا مل گئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”امیر نواز اکیلا یہاں آ رہا تھا۔ تو کیا وہ امیر نواز کے ساتھ نہیں تھی؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں! مگر وہ خیریت سے سنبھلا۔“ میں اسے مل چکا ہوں۔“ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ نور نواز اور پونو نے شادی کر لی ہے۔ پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ غزالہ کو بتانے سے پورے نور پور کی لڑکیوں کو خبر ہو جائے گی۔ راز، راز نہیں رہتا تھا۔

”مگر اماں یہاں سے نہیں جائے گی۔“

”تم اپنی بات کرو۔“

”میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟“ اس کے ہونٹ کانپے۔

”ہم دونوں شادی کر لیں گے۔“

میری توقع کے مطابق وہ شرمائی نہیں۔ یوں لگا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں تھی، بولی۔ ”بلو نے مجھے بتایا تھا کہ تم وہاں کسی عورت کے چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو، ملتان میں۔ کیا یہ سچ ہے؟“ اس کے دل کی بات لبوں پر آگئی۔ ساتھ ہی آنکھیں پھر غم ہو گئیں۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ کھالے نے بلو کو میڈم کے بارے میں بتایا ہوگا۔ میرا اور میڈم کا تعلق اس پر آشکار کیا ہوگا۔ اس نے غزالہ کے کانوں میں پچھلا ہوا سیدھا آثار دیا ہوگا۔ میں نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات ہوتی تو میں یوں جان بھرتی پر رکھ کر نور پور نہ آتا۔ کوئی آ جائے گا اس لیے آئیں بائیں شائیں نہ کرو اور جلدی سے مجھے بتاؤ۔“

”نہیں شہرے! میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔ اماں نہیں مانے گی۔ اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر جاؤں گی تو میرا نام گالی بن جائے گا۔ میرا باپ پنا جائے گا۔ ماں کی چادر اچھالی جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہاں لوٹ آؤ۔“

اس کی لرزتی ہوئی آواز کے پیچھے کوئی گہرا گھاؤ تھا جو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ”میں تمہیں کہتی تھی ناں کہ شہر جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ جو آتے ہیں وہ بدل کر آتے ہیں۔ تم ملتان جا کر بدل گئے ہو۔“

میں نے اس کے ہاتھ تھامے، ماتھے پر آ کر آنکھ کو مجھ سے چھپانے والی تل دالٹ کو پیار سے ایک طرف ہٹایا اور آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں بدلائیں ہوں میری جان! وہی ہوں۔ تمہارا شہر۔ تمہارے بغیر ادھورا۔ تمہیں لینے آیا ہوں۔ پھر بھی تمہیں مجھ پر یقین نہیں آ رہا۔ کیوں؟“

اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں گفتگو کا رخ بدل دیا۔ چاچا چراغ دین، امیر نواز اور پروین کو موضوعِ سخن بنا لیا۔ کافی دیر گزر گئی۔ شاید آدھا گھنٹا بیت گیا۔ کھالے نے دروازے سے جھانک کر وقت کا احساس دلایا۔ اس کے اوجھل ہونے پر میں نے غزالہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پيالے میں لے لیا۔ ایسے ہی سے میڈم شکیلہ کا چہرہ چشم تصور میں ابھرا آیا۔ اس کی آنکھوں میں سوالوں کے کئی سانپ کلبلا رہے تھے۔ وہ وعدہ یاد دلا رہے تھے جو میں نے کیا تھا۔ میں نے سر جھٹکا۔ اسے پرے ہٹانا چاہا۔ وہ نہیں ہٹی تو میں



مبارک باد

منظرِ رما

کسی زمانے میں محبت کرنے والا مجرم اور محبت کو جرم ٹھہرایا جاتا تھا مگر اب... بدلتے زمانے کے نئے تقاضے... کچھ یوں ہیں کہ اگر کسی کو سچی محبت مل جائے تو خاندان کے تمام لوگ ایسے خوشی مناتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو اور اس خاندان کے پاس توسیع کو جانچنے کا ایسا پیمانہ تھا کہ کچھ ہی دنوں میں معاملہ ”دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی“ کی طرح صاف ہو جاتا تھا۔

جھوٹے کو اپنے گھر تک پہنچانے اور سچ کو پہچاننے کا ایک کامیاب طریقہ

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں محبت میں ناکام ہوا تھا بلکہ میں تو کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کامیابی کسی اور اسٹائل کی تھی۔

ارم ایسی لڑکی تو نہیں تھی کہ جس کو خوبصورت کہا جاسکے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کی کشش ضرور تھی۔ میرا خیال ہے کہ حسن تو کشش ہی کا نام ہوتا ہے۔

میں نے اسے ایک تقریب میں دیکھا تھا اور بس دیکھتا رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب دو دل ملتے ہیں تو

کرتی۔ دلوں سے کھلتی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا..... کئی عاشق بدلتی ہے۔ کہاں اس کا وہم نہ کرو۔ وہ میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر ”میں نہیں مانتی۔“

”کیسے مانو گی؟“ میں نے زچ ہو کر کہا۔ ”میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ!“ اس نے بے ساختہ کہا۔ اب تک ہونے والی گفتگو میں یہ اگوتا جملہ تھا جس سے ہمارے عشق کا ماضی جھلکتا تھا۔

میں نے جھٹ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ انہماک محبت کی تجدید کی۔ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائیں اور اسے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ مان گئی۔ دیہاتی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جھٹ ناراض..... پٹ راضی..... اس نے وعدہ کیا کہ وہ پھوپھی کبریٰ سے بات کرے گی اور اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کرے گی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ماں اس کی بات ٹالنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ پہلے بھی اس کی سبھی ماں لگتی تھی اب بھی مان جائے گی۔

وہ کھڑی ہو گئی۔ جانا چاہتی تھی۔ ایسے میں مجھے خود پر اختیار نہیں رہا۔ میں نے نہایت آہستگی سے اسے شانوں سے تھاما۔ قریب کیا۔ پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔ وہ ہنسی، بولی۔ ”یہ ڈاڑھی موچھیں کتنی عجیب لگتی ہیں تمہارے چہرے پر..... ہے ناں؟“

میں کوئی جواب دینے لگا تھا کہ زور دار دھماکا ہوا۔ غزالہ کے حلق سے بے اختیار ”ہائے“ برآمد ہوئی اور وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بجلی کی سی مستعدی سے گردن موڑی۔ فوری سمجھ میں آ گیا کہ دھماکا دروازہ ٹوٹنے کا ہوا تھا۔ بیرونی دروازے کا ایک چوبی طاق قبضوں سے اکڑ کر زمین یوں ہو چکا تھا۔ دوسرا چوبی کھل گیا تھا۔ جونہی میری نظر کھلے دروازے میں پڑی، میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ موت اگلنے والی ڈیل کے گن کے دہانے کا رخ میری جانب تھا اور اس مختصری دکان میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

”تنت..... تم کون ہو؟“ مجھے اپنے حلق سے برآمد ہونے والی آواز اجنبی لگی۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کسی گردش نیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے بڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھبی آواز میں غزالہ کو مخاطب کیا۔ ”غزالہ! سچ کہتا ہوں۔ میں تمہارا ہوں۔ ملتان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ میں جس لڑکی کی ملازمت کرتا ہوں، اس کا حسن دیکھ کر انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھ پر مہربان ہے بلکہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔ مگر یقین کرو میں اس کا کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہاں ایک دوسرواری کام ہیں جو اس کی معاونت کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتے۔ ان کاموں کو مکمل کرنا بے حد ضروری ہے ورنہ میں کبھی سکھ کی سانس نہیں لے سکوں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ابھی میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ از خود شہری زندگی کو سراوایو کر سکوں۔“

”یعنی ابھی تم اس کی محبت کا دم بھرتے ہو؟“ غزالہ نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کی گفتگو کے انداز پر حیرانی ہوئی۔ اس کے لہجے میں ضدی پن اور بغاوت کی پرچھائیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

”ہاں! ابھی میں اسے دھوکے میں رکھتا ہوں۔ جونہی مجھے اس کی ملازمت کی ضرورت نہ رہی، اسے چھوڑ دوں گا۔ پھر میں ہوں گا اور تم..... اور ہماری ایک چھوٹی سی جنت..... یس!“

”تم مجھے ملتان لے جانا چاہتے ہو۔ اگر میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو کیا وہ کچھ نہیں کہے گی؟“ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکا۔ لبوں پر گہری طنزیہ مسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔

”اسے یقیناً پتا چل جائے گا، شاید غصہ بھی کرے مگر میں اسے مطمئن کر لوں گا۔ یہ میرا کام ہے۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے سمجھایا۔

”جب تم اسے چھوڑنا چاہو گے، کیا وہ آسانی سے پیچھے ہٹ جائے گی؟ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت امیر اور اثر و رسوخ والی عورت ہے۔“ اس کے چہرے کے تاثرات چغلی کر رہے تھے کہ وہ میری باتوں پر سرے سے اعتماد کر ہی نہیں رہی تھی۔

”کس سے سنا ہے تم نے؟“

”میں کیوں بتاؤں؟ غلط سنا ہے تو قسم کھا کر کہوں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ ہر وقت تمہیں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ تم اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہو۔“

”اوہ غزالہ..... سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ایسی عورت نہیں ہے کہ لپٹی جھٹوں والی محبت کرتی پھرے۔ اس کے نزدیک میری خاص اہمیت نہیں ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک چاہنے والا اس کی راہ میں کھڑا ہے۔ وہ دل داری نہیں

دونوں کے درمیان کچھ اس قسم کی انڈر اسٹینڈنگ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس طرح ہمارے درمیان ہوا تھا۔ وہ ڈنر کے بعد کافی پینے کے لیے ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی اور جس میز پر کافی دی جا رہی تھی وہاں بہت بھیڑ تھی۔ اس لیے اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اس کی مشکل اس طرح آسان کی کہ اپنے حصے کا کافی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لیں۔ یہ آپ کے لیے ہے۔“

”جی! اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ”یہ آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ میں آپ کو بہت دیر سے پریشان دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ لے لیں۔ میں اپنے لیے اور لے لوں گا۔“

اس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے وہ گلاس لے لیا۔ بس یہ تھی میری اس سے پہلی ملاقات۔ عام طور پر ملاقاتوں کے بہانے کچھ اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ کبھی بہت احسان، کبھی بچکانہ، کبھی کچھ اور لیکن ملاقاتیں پروان چڑھنے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ دوستی پھر محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہماری دوستی بھی محبت میں تبدیل ہو گئی۔

ارم میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ جن سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ”ندیم! میری ایک بات دھیان میں رکھو۔“

”میں تو تمہاری ہر بات دھیان میں رکھنے لگا ہوں۔“

”نہیں۔ مذاق نہیں۔ یہ بہت سیریس بات ہے کہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے گھر والوں کو چھوڑ دوں گی۔ نہیں۔ میرے لیے سب سے پہلی اہمیت ان ہی کی ہے۔“

”ارم! تم یقیناً کرو۔ تمہاری یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ جو اپنے والدین کا نہ ہو سکے۔ وہ کسی اور کا کیا ہوگا؟“

”چلو شکر ہے۔ تم یہ بات سمجھتے ہو۔“ اس نے ایک گہری سانس لی ”اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں محبت کو بہت بھرپور طریقے سے خوش آمد کہا جاتا ہے۔ ہم اس جذبے کی بہت قدر کرتے ہیں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں خوش ہو گیا تھا۔

”کس طرح خوش آمدید کہتے ہو۔“

”ابھی سے بتا دیا تو پھر لطف ہی کیا رہے گا؟ وقت آنے پر تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔“

ایک رات، اچانک دروازے پر دستک ہو گئی۔ دروازہ کھولا تو اجنبی چہرے دروازے پر تھے۔ ایک خاص عمر کا اور دونو جوان۔ ”جی فرمائیں۔“ میں ان سے مخاطب ہوا۔

”تم ہی ندیم احمد ہوتا؟“ بڑی عمر والے نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”میں ارم کا والد ہوں۔“ اس نے بتایا۔

”جی! میرے ہوش اڑ گئے تھے۔“ ارم کے والد۔

”ہاں اور یہ میرے دونوں بیٹے ہیں۔ ارم کے بھائی۔“ ارم کے والد نے تعارف کروایا۔

وہ یقیناً خطرناک ارادوں ہی سے آئے ہوں گے ورنہ اس طرح کون کس کے یہاں رات گئے آتا ہے؟ ارم کے دونوں بھائی خاصے صحت مند بھی تھے۔

”آ۔ آپ۔ تشریف لائیں۔“

”پریشان کیوں ہو رہے ہو؟“ بڑے میاں مسکرا دیے۔ ”ہم تو مبارک باد دینے آئے ہیں۔“

”مبارک باد!“

”ہاں بھئی۔ ہمارے یہاں محبت کی بہت اہمیت ہے جس کو حاصل ہو جائے ہم اس کو سرا نکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ارم کو تمہاری وجہ سے اور تمہیں ارم کی وجہ سے محبت حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے تم دونوں مبارک باد کے مستحق ہو۔“

”جی؟“ میں ہونق بنا کر ان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

”ہاں۔ دیکھ کیا رہے ہو؟ آؤ گلے لگ جاؤ۔“

بڑے میاں نے مجھے گلے لگالیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں بھائی بھی بڑی گرم جوشی سے گلے ملے تھے۔ کیاں تو میں کچھ اور سوچ رہا تھا اور کہاں یہ صورت حال ہو گئی تھی۔ بالکل مختلف اور حیرت انگیز۔

میں خوشی خوشی ان کو اندر لے آیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنے نام بتائے۔ ایک کا نام ابراہیم اور دوسرے کا ابراہیم تھا۔ ابراہیم کچھ بے تکلف نوجوان تھا۔ اس نے کہا۔ ”ندیم صاحب۔ آپ پر تو مٹھائی ڈیو ہو گئی ہے۔ مٹھائی کھلوائیں۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔ ساتھ ہی دکان ہے۔“

میں نے باہر آ کر ارم کو موبائل سے فون کر کے ساری صورت حال بتا دی۔ ”اچھا وہ لوگ پہنچ چکے ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”بہت جلدی چلے گئے۔“

”لیکن یہ کیا ڈراما ہے۔“

”ڈراما نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ہمارا خاندان بہت بھرپور طریقے سے مناتا ہے۔ وہ تینوں اسی لیے آپ کے پاس گئے ہیں۔“

”اور اب میں ان کے لیے مٹھائی لینے جا رہا ہوں۔“

”دو گلو گھر کے لیے بھی بھجوا دیجیے گا۔“

مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک گلو مٹھائی ان تینوں کے لیے اور دو گلو گھر کے لیے۔ اچھے خاصے پیسے خرچ ہو گئے تھے۔ لیکن معاملہ ایسا تھا کہ میں کچھ کربھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن شام کے وقت جب ارم سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی۔ ”مبارک ہو۔ میرے گھر والوں نے آپ کو پسند کر لیا ہے۔“

”اوہ۔ اب سمجھا۔ تو یہ شادی کے لیے پسند کا معاملہ تھا۔“

”شادی تو بعد کی کہانی ہے۔ ابھی تو محبت کا معاملہ ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارے خاندان میں پہلے محبت پہنچتی ہے۔ پھر شادی ہوتی ہے۔“

”تمہارا خاندان بہت ہی دلچسپ ہے۔“

”دلچسپ نہیں، روایتی قسم کا ہے۔ کسی بزرگ نے ایک روایت قائم کر دی۔ سب اسی پر چل رہے ہیں۔“

تیسری شام کو جب میں دفتر سے گھر پہنچا تو دروازے پر پہلے سے کچھ عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں انہیں بھی دیکھ کر سٹ پٹا گیا تھا۔ ”جی فرمائیں۔ کون ہیں آپ لوگ۔ کس سے ملنے آئی ہیں؟“

”ہم تم ہی سے ملنے آئے ہیں۔“ ایک عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ارم کی والدہ ہوں۔ اور یہ میری دونوں بہنیں ہیں۔“

ان کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ ان کی بھی خاطر مدارت کرنا پڑی۔ ان کا بھی کہنا تھا کہ وہ محبت کی مبارک باد دینے آئی ہیں۔ ارم سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

”ارم۔ تمہارے خاندان کا یہ دستور سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرا خاندان ہوتا تو اس بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا۔“

”یہ تو جہالت کی بات ہے۔ اس میں لڑنے مرنے والی کون سی بات ہو گئی۔“ ارم نے کہا۔ ”محبت کوئی جرم تو نہیں ہے نا۔ ان لوگوں پر تو رشک کرنا چاہیے۔ جن کو محبت حاصل ہو جاتی ہے۔“

”اس لحاظ سے تو تمہارا خاندان شاید دنیا کا سب سے زیادہ روشن خیال خاندان ہے؟“

”اس میں کیا شک ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”ویسے آج

تم گھر پر رہنا۔“

”وہ کیوں؟“

”آج شام کو میرے دو پھوپھا اور دو پھوپیاں بھی مبارک باد دینے کے لیے آ رہی ہیں۔“ ارم نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ اب زیادہ مبارکبادیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھی خاصی وصول کر لی ہیں۔“

”ارے نہیں۔ ان کی بھی خواہش ہے۔ اب خاندان کے بزرگ ہیں۔ ان کو کیسے روکا جائے اور وہ تو ہماری خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے تمہارے پاس جائیں گے۔ ذرا سلیقے سے ملنا اور ان کی خاطر مدارت کر دینا۔ میری عزت رہ جائے گی۔“

بہر حال شام کو وہ چاروں آ گئے۔ ان کے لیے میں نے ہوٹل سے کھانا منگوایا تھا۔ کھانے کے بعد آکس کریم کا دور بھی چلا تھا۔ اس کے بعد بھی بس نہیں ہوا۔

ارم کے خالوتایا، ماموں ممانی سب کے سب آتے

WELCOME BOOK SHOP

SOLE DISTRIBUTOR of U.A.E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com



وبال جان

سليم انور

وقت کی تقسیم کا ہر کینے والے ایک جوڑے کی دلچسپ کہانی

بعض اوقات دل میں اترنے والے نظروں سے یوں گرتے ہیں کہ زندگی عجب اتار چڑھاؤ کا شکار ہو جاتی ہے... ایسے رشتے جن کے ساتھ رہنا مشکل اور ساتھ چھوڑنا ناممکن ہو جاتے... بس مارے باندھے نباہے جاتے ہیں... مگر ایک روز اسے فرار کا ایسا نادر موقع ہاتھ آیا، جسے وہ ہرگز کھونا نہیں چاہتا تھا۔

”بلڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ نے تمہیں یہاں داخل کرایا؟“
”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر میرے اگلے متوقع سوال کے جواب میں اپنا ریوالور ایک بار پھر لہراتے ہوئے بولا۔ ”اس نے یہ بھی کہا کہ وہ نہیں سمجھتا اس بارے میں پولیس کو کچھ خبر کرنے کی ضرورت ہے۔“
”ویل، مجھے ڈر ہے کہ تمہیں کوئی غلط فہمی...“

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے چار عدد دگلی تصویریں کمرے میں بیڈ کی جانب اچھال دیں۔ ان میں سے صرف ایک تصویر بیڈ پر آن گری۔ میں نے وہ تصویر اٹھا کر پلٹی۔ اس تصویر میں، میں اور جولیا ریڈ لوہسٹر ریسٹورنٹ کے باہر بوس و کنار کر رہے تھے۔ میرا ایک ہاتھ جولیا کی پشت پر تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہی میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا کیونکہ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ باقی تین تصویریں جو فرش پر گری ہوئی تھیں ان میں کن مناظر کی عکاسی کی گئی ہوگی۔ ساتھ ہی جولیا کے نازک اندام عریاں

میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک شخص کو کمرے کی دوسری جانب جھولنے والی آرام کرسی پر دبکا ہوا دیکھا۔ اس نے اپنے دونوں پیر اور پراٹھائے ہوئے تھے۔ اس کی داہنی آنکھ مصنوعی اور گولیاں ٹھیلنے والے کچے کے مانند تھی۔ البتہ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور اصلی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے بیدار ہونے پر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”تم میری بیوی جولیا کو جانتے ہونا؟“

جولیا کے بال سنہری اور بدن نازک اندام تھا۔ جبکہ یہ شخص ان دونوں خصوصیات میں سے کسی کا حامل نہیں تھا۔ اس کی آواز کی شدت میری توقع سے کہیں زیادہ بلند تھی جو اس کے جیسے کے عین مطابق تھی۔
”تم میرے اپارٹمنٹ میں کس طرح داخل ہوئے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور لہرا دیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر مجھے سچ سے بتا دو یا پھر مجھ سے شادی کرنا تاکہ یہ مبارکبادوں کا سلسلہ ختم ہو۔ میں تو پریشان ہو کر گیا ہوں۔“

”کیا تم شادی کے لیے سنجیدہ ہو؟“
”اب اور کس طرح سنجیدہ ہو کر دکھاؤں۔ تمہارے پورے خاندان کو بھگت رہا ہوں۔ تمہیں اور کیسا ثبوت چاہیے؟“ وہ ہنستی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اب تم ایسا کرو۔ میرے گھر آ جاؤ۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔ ہم تمہیں آزار ہے تھے۔“
”آزار ہے تھے؟“

”ہاں۔ تم میرے گھر تو آؤ۔ پھر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔“

اس کے اصرار پر میں اس کے گھر چلا گیا جہاں اس کے والد موجود تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”میاں۔ دنیا میں ایسا کوئی خاندان نہیں ہوتا، کم از کم ہمارے معاشرے میں تو نہیں کہ بیٹی سے محبت کرنے والے کو مبارکباد دینے کے لیے پہنچ جائے۔“

”تو پھر یہ سب کیا تھا جناب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ ان نوجوانوں کے لیے تھا جو لڑکیوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”دھوکا دینے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ لڑکی کو بے وقوف بنا کر اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن جب لڑکے کا پورا خاندان مبارکباد دیتے اس کے گھر پہنچنا شروع ہوتا ہے تو پھر اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ یا تو وہ لڑکی سے شادی کر لیتا ہے۔ یا پھر گھر چھوڑ کر بھاگ لیتا ہے اور کبھی اس لڑکی کے سامنے نہیں آتا۔ اس لیے ہمارے خاندان کی کسی لڑکی کو آج تک کوئی دھوکا نہیں دے سکا ہے۔“

”یہ تو بہت زبردست ترکیب ہے جناب۔“
”اب دیکھو نا، یہی ترکیب تمہیں شادی کی درخواست تک لے کر یہاں لے آئی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟“

”میں اب کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ میں اپنی اگلی نسل کو بھی یہی نسخہ بتا جاؤں گا۔“

ارم کے ابوئیں پڑے اور اب ارم میری بیوی ہے۔ ہم دونوں ایک اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہاں۔ ایک بات اور۔ شادی کی مبارکباد دینے بہت کم لوگ آئے کیونکہ ان کے یہاں صرف محبت کی مبارکباد ہوتی ہے۔

جانتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ایک بار خاندان کے ایک نانا بھی سہارے کر چلے آئے تھے۔ ان سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ لیکن وہ مبارکباد دینے چلے آئے تھے۔

ایک دن جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں ارم پر برس پڑا۔ ”خدا کے لیے اب ختم بھی کرواؤ یہ سلسلہ۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں رہی کہ میں تمہارے خاندان والوں کی یہ بے تکی مبارکبادیں وصول کروں۔“

”پریشان مت ہو۔ اب سارے خاندان والے آچکے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”خدا کا شکر ہے۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”لیکن اب محلے والے تمہارے پاس آنا چاہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کیا۔ وہ کیوں۔ ان کم بختوں کو ہماری محبت سے کیا دلچسپی؟“

”یہ کیا بات ہوئی۔ محلے والوں کا تو زیادہ حق ہوتا ہے۔

ہمارے دکھ درد میں سب سے پہلے شریک ہوتے ہیں۔“

”اور ان کی کتنی تعداد ہے؟“

”زیادہ نہیں۔ ساٹھ ستر ہوں گے۔ باری باری آیا کریں گے۔“

”ارم! میرا خیال ہے کہ میں نے تم سے محبت کر کے اپنے پیروں پر کلباڑی ماری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب ختم کرو یہ سلسلہ۔ تم اپنی جگہ خوش۔ میں اپنی جگہ۔ اب مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ تمہاری محبت مجھے تباہ کر کے رکھ دے گی۔“

”اب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تم نے اپنی محبت کے اتنے گواہ بنا لیے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے میرا پورا خاندان اس بات کو جانتا ہے۔ تم مجھے چھوڑ بھی دو گے تو وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تمہارے گھر کے سامنے آ کر ہنگامہ کریں گے۔ احتجاج کریں گے۔ تمہارے دفتر پہنچ جائیں گے۔ تمہارے خلاف اخباروں میں خبریں شائع کروائیں گے۔ تم کہیں کے نہیں رہو گے۔“

”میرے خدا! میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں۔“ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ”کیا تم سے چھٹکارے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟“

”یہ کیا بات ہوئی؟ پہلے تو خود محبت کی اور اب جان چھڑانے کی بات کر رہے ہو۔“

”خدا کی بندی! میں نے محبت تم سے کی تھی۔

تمہارے پورے خاندان سے نہیں کی۔“

”خاندان تو بیچ میں آئے گا۔“

میاں میر، بالا پیر

ضیاسنیم بگلرامی



عبادت و ریاضت تو ممکن ہے کہ ہر کوئی کر لے مگر... اس کا پہل ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا... اس کا حقدار صرف وہی ہوتا ہے جس نے عبادت و ریاضت کے تمام تر تقاضے پوری ایمان داری اور خلوص نیت سے نبا ہے ہوں... انہی مشکل مراحل سے گزرنے والے ایک اور ولی کی شان... جن کی زندگی حق و صداقت پر مبنی تھی۔

حیران کن واقعات پر مشتمل اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کا زندگی نامہ

سہولان سے کچھ فاصلے پر ایک خوش حال گھرانے میں معلوم نہیں کیوں ایک بچے کی پیدائش کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ والدین کو کچھ پتا نہ تھا کہ جس کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ گھر میں دائی اپنے فرائض بڑی مستعدی اور تن دہی سے انجام دے رہی تھی۔ شوہر بڑی بے چینی سے چہل قدمی میں مشغول تھا۔ وہ ذرا ذرا دیر بعد دائی سے پوچھتا: ”کیا بات ہے، کتنی دیر ہے دائی؟“
دائی جواب دیتی: ”میاں! زیادہ دیر نہیں ہے، بس چند لمحوں کی بات ہے۔ میں بڑی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ کو جلد از جلد خوش خبری سناؤں۔“
دائی کا یہ جواب نا کافی تھا، شوہر کو اس جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن حالات اور وقت کی نزاکت کا اندازہ کر کے خاموشی

لیکن میرا پارٹمنٹ اس پرانی عمارت کی چوتھی منزل پر تھا اور اس بلڈنگ میں کوئی فائر اسکیپ بھی نہیں تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ میری جانب کر دیا۔ پھر وہ بیڈ کے کنارے کے ساتھ چلتا ہوا میرے نزدیک آ گیا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرا پیشاب خطا ہو رہا ہو۔
”پر سکون رہو! میں تمہیں شوٹ نہیں کروں گا۔“ اس کا چہرہ تن گیا۔ ”اس وقت تک نہیں جب تک تم جولیہ سے ملے رہو گے۔“
یہ سن کر میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”وہ کم بخت عورت وبال جان ہے۔“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔ ”تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ دوسروں کو بھی پتا چل گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔ ”تمہارے ساتھ اس کی چوری چھپے ملاقاتیں اس سال کا میرے لیے بہترین تحفہ تھیں۔“
”اور یہ ریوالور؟“

”یہ ریوالور؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور اپنے چہرے کے سامنے لہرایا۔ ”اس کے پچھلے دو عاشق اس وقت خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے جب میں نے ان سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے دوبارہ پلٹ کر جولیہ کو پوچھا تک نہیں لیکن اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اب اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اگر تم نے جولیہ سے ملاقاتیں کرنا بند کر دیں تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا تو تم بس سے ملنا جلنا بند نہیں کرو گے۔“ کہتے ہوئے اس نے ریوالور نیچے جھکا دیا۔ ”کم از کم جب وہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے تو اس وقت میں بیس بال کا گیم سکون کے ساتھ دیکھ سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کی سمت چل پڑا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ پلٹا اور ریوالور کا رخ ایک بار پھر میری جانب کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے دوبارہ آنے کی ضرورت پڑی تو اگلی مرتبہ میں اس سے فائر کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔“ اس نے ریوالور کی نال سیلوٹ کرنے کے انداز میں اپنی پیشانی سے تھپتھپائی اور کمرے سے نکل گیا۔

میں دیوار کے ساتھ سر کتا ہوا فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔
اب میں کیا کروں، میں ابھن میں پڑ گیا۔
اگر مجھے اب بھی ایک پیغمبر ٹھہرا کر دینے والی اور بنانے جان عورت کو ہی جھیلنا تھا تو اپنی سابقہ بیوی کلارا اس سے علیحدگی اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی جو مسلسل عیب جیئی اور کتہ چینی میں کسی طور کم نہیں تھی۔

بدن کا تصور میرے ذہن کے پردے پر ابھر آیا۔
لیکن دوسرے لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور چادر کھینچ کر اپنے بدن کو ڈھانپتے ہوئے اس شخص کو دیکھنے لگا جس کا نام غالباً جولیہ نے رچرڈ بتایا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس شخص کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر نائٹ اسٹینڈ پر رکھا ہوا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگاتے ہوئے کش لینے لگا۔ پھر ڈھیر سا دھواں ناک سے اگل دیا۔ وہ شخص اب بھی متاثر نہیں ہوا۔

”تم بیو گے؟“ میں نے اس کی جانب سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”ارے سنو، کیا تم امریکن فٹ بال ٹیم اوک لینڈ ریڈرز کے دلدادہ ہو؟“ میں نے کہنی کے بل اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اس کے آنے والے میچ کے دو ٹکٹ موجود ہیں جو تم لے سکتے ہو۔“

اس وقت میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح چھٹکارا پایا جائے لیکن میری پیشکش پر رچرڈ کی عدم دلچسپی نے مجھے احساس دلادیا کہ وہ اس ٹائپ کا آدمی نہیں جس پر رشوت کی پیشکش سے قابو پایا جاسکے۔ یا پھر شاید وہ اوک لینڈ ریڈرز کا مداح نہیں تھا۔

ہم دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر اس نے اپنا ایک ہاتھ آرام کرسی کے بازو پر رکھا اور دونوں ہاتھ فرش پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کچھ کہنے کے ارادے سے اپنا منہ کھولا لیکن پھر خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نہ صرف مسلح تھا بلکہ وزن میں بھی مجھ سے کم از کم ڈیڑھ سو پونڈ زیادہ ہوگا۔ میں جسمانی طور پر اسے کسی طرح بھی زیر نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے ایک قدم بیڈ کی جانب بڑھایا۔

”اوکے، اوکے!“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”میں تمہاری بیوی سے میل جول ترک کر دوں گا۔ اب تک ہماری صرف چھ ملاقاتیں ہوئی ہیں۔“
یہ سن کر وہ رک گیا۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ وہ ہمارے بارے میں جتنا جانتا تھا میں نے اس سے کہیں زیادہ اسے بتا دیا تھا۔ وہ دوبارہ بیڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ میں دوسری سمت دیوار کی طرف کھسک گیا۔ کمرے کی واحد کھڑکی بیڈ کی پائنتی کی طرف تھی۔ میں کھڑکی کی سمت دوڑ لگانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔

اختیار کی۔ کچھ دیر بعد اندر سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی لیکن آواز سے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ نومولود لڑکی ہے یا لڑکا۔ شوہر نے بڑی بے تابی سے دروازے کو کھینچا اور پوچھا۔ ”دانی! تو اندر کیا کر رہی ہے؟ بتاتی کیوں نہیں کہ نومولود لڑکی ہے یا لڑکا؟“

دانی نے دور ہی سے جواب دیا۔ ”میاں! ذرا صبر کرو، ابھی بتاتی ہوں کہ آنے والا کون ہے۔“

میاں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے لیکن بے چینی ان کے چہرے اور پوری کیفیت سے ظاہر تھی۔ کچھ دیر بعد میاں کے سر کی بات ہی نہ رہی اور وہ بیوی کے پاس پہنچ گئے اور بے اختیار بچے کو گود میں لے کر خود ہی معلوم کر لیا کہ نومولود لڑکا ہے۔ باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور بچے کو سینے سے لگا کر کئی بوسے دیے اور بیوی سے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں۔ کیا تم خوش نہیں ہو؟“

بیوی نے تحفہ آواز میں جواب دیا۔ ”میں نے بچے کو ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں ہے۔ دیکھنے کے بعد ہی اپنی خوشی اور ناخوشی کا اظہار کر سکتی ہوں۔“

شوہر نے حیرت سے کہا۔ ”جب یہ معلوم ہو گیا کہ نومولود لڑکا ہے تو بس خوش ہونے کے لیے یہی بات کافی نہیں ہے کیا؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ بات میرے لیے خوشی کی نہیں ہے کیونکہ لڑکا ہو یا لڑکی، میرے نزدیک اس کا عارف ہونا بہت ضروری ہے اور یہ لڑکا اگر عارف نکلے گا تو میں اس کی پیدائش سے خوش ہو جاؤں گی اور اگر یہ عارف نہ نکلا تو میں ملول ہو جاؤں گی۔“

شوہر نے بچے کو ماں کی گود میں ڈال دیا اور کہا۔ ”بتا نہیں یہ بچہ عارف نکلے گا یا نہیں کیونکہ اس کے مستقبل کا علم صرف خدا کو ہے۔ ہم تم قبل از وقت یہ باتیں کیسے جان سکتے ہیں؟“

ماں نے بچے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑے غور سے دیکھا اور اس کے چہرے میں معلوم نہیں کیا کچھ دیکھا کہ بے دلی سے شوہر کے حوالے کر دیا، کہا۔ ”افسوس کہ میں اس بچے سے خوش نہیں ہوں کیونکہ یہ عارف نہیں ہے، عرفان تو اسے چھو کر بھی نہیں گیا۔“

شوہر نے بچے کو سینے سے لگا لیا، پوچھا۔ ”مستقبل میں کیا ہوگا اس کا تمہیں کیا پتا؟ تم نے اتنی بڑی پیش گوئی کس طرح کر دی؟“

ماں نے آنکھیں بند کر لیں، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، خدا سے گڑگڑا کر عرض کیا۔ ”خدا یا! تو نے ازراہ لوازش و بندہ پروری مجھے جو ذرا سا عرفان عطا کیا ہے، میں اس کے ذریعے یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرا یہ بچہ عارف نہیں ہے۔ میں عارف چاہتی ہوں، ایک ایسا لڑکا جو آگے جا کر صاحب عرفان کہلائے۔ اے اللہ! تو ہی بتا میں اپنے اس بیٹے کی پیدائش سے کس طرح خوش ہو سکتی ہوں جو صاحب عرفان نہیں اور عرفا کی صفوں میں کہیں بھی موجود نہیں ہوگا۔“

شوہر اپنی بیوی کی گریہ و زاری، الحاح و بے قراری بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ شاید اس کو پہلی بار اتفاق سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اس کی بیوی عارفہ کاملہ ہے۔ وہ اپنی بیوی کو بڑی عقیدت اور محبت سے دیکھتا رہا پھر ادب سے پوچھا۔ ”بیوی! کیا یہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، درست ہے؟ کیا تم یہ بات پورے اعتماد اور وثوق سے کہہ رہی ہو کہ نومولود عارف نہیں نکلے گا؟“

بیوی نے آنکھیں بند کر لیں، جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ ایک حقیقت ہے۔ میں اس کا مستقبل اسی طرح دیکھ رہی ہوں جس طرح تم یہ دیکھ رہے ہو کہ نومولود لڑکی نہیں، لڑکا ہے۔“

شوہر نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ درست ہے اور تم واقعی نومولود کے مستقبل کو اسی طرح دیکھ رہی ہو جس طرح میں یا دوسرے لوگ اس کا منہ مانا وجود۔“

بیوی نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں تم کو اس پر یقین کر لینا چاہیے کیونکہ اپنے ہی بچے کو یوں اپنی نظر سے گرا دینا بحیثیت ماں مجھے ذیہ نہیں دیتا۔“

شوہر نے اصرار کیا۔ ”بیوی! اگر تم نے اپنے عرفان کو دلیل سے ثابت نہ کیا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

بیوی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”کیا مصیبت ہے کہ تم ثبوت کے بغیر میری بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے تو لو اپنے کانوں سے سن لو، دیکھو..... خدا کیا آری ہے آسمان سے؟ دیکھو، میری گریہ و زاری اور مناجات کے جواب میں ہاتھ غیبی کا کیا ارشاد ہے؟“

شوہر نے خود کو گوش بر آواز کر لیا۔ بیوی نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں اور ایک جھرجھری کی، چہرہ تہمتا تھا، وہ بڑی رقت سے بولی۔ ”اے اللہ العالمین! میں نے بے اختیاری میں معلوم نہیں کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ تو نے ازراہ کرم جو کچھ بخشا ہے۔ میں اسے مدتوں چھپائے رہی لیکن اب وہ فاش ہو چکا اور میرا شوہر اس پر مصر ہے کہ میں نے اس نومولود کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ دیکھا ہے، وہ میرا شوہر اگر دیکھے نہیں تو کم از کم اس کو اس کا ثبوت تول ہی جائے۔ میں اپنے شوہر کو اس بات کا یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں نے عالم سرشاری میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہ سچ ہے، وہ درست ہے۔“

بیوی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور شوہر نے پرسکوت ماحول میں ایک سرگوشی سنی، کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اے مقبول بارگاہ انام! حیرتی مناجات سنی گئی ادا سے شرف قبولیت بھی بخشا گیا۔ اک ذرا انتظار کر کیونکہ اس نومولود کے بعد تجھے ایک فرزند اور عطا ہوگا اور اس کے بعد ایک لڑکی دی جائے گی۔ ان دونوں کی بابت تجھے ابھی سے بشارت دی جا رہی ہے کہ وہ لڑکا مستقبل میں عارف کامل اور بالا بدر ہوگا، اس کا شہرہ غیر معمولی اور مقام اعلیٰ ہوگا۔ شاہان عصر اس کی ملاقات کو اپنی نجات اخروی کا وسیلہ بنائیں گے اور عرفا اس کو اپنا مرشد قرار دیں گے۔ اس طرح، اس کے بعد جو بیٹی پیدا ہوگی وہ بھی عارفہ کاملہ ہوگی۔ یہ جو کچھ کہا گیا تیرا اور حیرتی دونوں اولادوں کا مقدر ہے اور اسے بشارت سمجھ۔“

شوہر نے جو کچھ سنا، اس نے اسے نہ صرف حیرت زدہ کر دیا بلکہ اس کے دل میں بیوی کے لیے بے انتہا جذبہ عقیدت و احترام بھی پیدا کر دیا تھا۔ اس نے بڑی عقیدت سے جھک کر بیوی کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اسے قدموں اس طرح پیچھے ہٹا جس طرح درباری بادشاہ کے سامنے سے ہٹتے ہیں یا مرید اپنے مرشد سے جدا ہوتے ہیں۔ اس نے آج پہلی بار اپنی شریک حیات کے مرتبے کو پہچانا تھا۔ اب اسے اپنے نومولود کے غیر عارف ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

اس واقعے کے تقریباً ایک سال بعد 957ء میں وہ بچہ پیدا ہوا۔ باپ کا نام قاضی سائیں دنہ اور دادا کا نام قاضی قلندر تھا۔ یہ خاندان نسلوں سے قاضی گھرانہ کہلاتا تھا۔ نسب نامہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا تھا۔ قاضی سائیں دنہ نے بیوی سے پوچھا۔ ”تم تو عارفہ ہو ذرا بتانا تو کیا یہ وہی بچہ ہے جس کی پچھلے سال تمہیں بشارت دی گئی تھی؟“

بیوی نے فوراً جواب دیا۔ ”ہاں، بے شک یہ وہی بچہ ہے۔ میں اپنے اس ننھے عارف کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہی ہوں۔“

اس کے بعد ماں نے بچے کو سینے سے لگا لیا اور خوب پیچھے پیچھے کر پیا کر لیا۔ قاضی سائیں دنہ کو بھی اپنے اس بچے پر بڑا پیار آ رہا تھا۔ بیوی کی والہانہ محبت دیکھ کر بچے کے لیے اپنے ہاتھ بھی بڑھا دیے، کہا۔ ”ذرا مجھے تو دینا اس بچے کو، میں بھی تو دیکھوں اپنے اس عارف کو۔“

انہوں نے بچے کو شوہر کے حوالے کر دیا۔ قاضی سائیں دنہ نے بھی بڑی گرم جوشی سے بچے کو بار بار پیار کیا۔ بیوی شوہر کو بڑی حسرت و یاس سے دیکھتی رہی۔ بیوی کی نظروں میں موجود حسرت و یاس کو شوہر نے بھی محسوس کر لیا، پوچھا۔ ”کیا بات ہے بیوی؟ کیا کوئی اور بات بھی معلوم ہو گئی تمہیں؟“

بیوی نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس وقت میں یہ سوچ رہی تھی کہ میرا بچہ کتنا خوش قسمت ہے کہ اس پر ماں اور باپ دونوں ہی کا سایہ موجود ہے ورنہ بعض کسی ایک کے سائے سے اور بعض دونوں ہی سایوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔“

قاضی سائیں دنہ نے مزید استفسار نہیں کیا لیکن ان کے چہرے سے یہ بات جھلک رہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہیں۔ جب شوہر چلا گیا تو ماں نے بیٹے کو بڑی محبت سے لپٹا لیا اور روتے ہوئے بولیں۔ ”میرے بیٹے! میں یہ بات تجھے کیسے بتاؤں کہ تو سات برس کی عمر میں یتیم ہو جائے گا اور تیری پرورش اور تربیت کا سارا بوجھ مجھ پر آن پڑے گا۔“

باپ نے بیوی کے مشورے سے نومولود کا نام شیخ محمد میر رکھ دیا۔ بچے کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہونے لگی لیکن سات سال کی عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ قاضی سائیں دنہ کا انتقال ہو گیا۔ شوہر کی مفارقت نے بیوی کو بے حد غمزدہ کر دیا لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے محمد میر کو باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس طرح وہ بارہ سال تک تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ والدہ نے بیٹے کو سلسلہ قادریہ کی تلقین کی اور ان کی صحبت کے فیض سے عالم ملکوت کے کشف کا مقام حاصل کر لیا۔ علوم متداولہ بھی حاصل کرتے رہے۔ ادھر سے فرصت حاصل کرتے ہی محمد میر گورشد حضرت خضر سیستانی کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا کہ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو جاؤ۔

شیخ محمد میر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا، ماں کا حکم بجالائے اور خضر سیستانی کی خدمت میں چلے گئے۔

پیر نے پوچھا۔ ”صاحبزادے! تمہیں میرے پاس کس نے بھیجا ہے؟“

شیخ محمد میر نے جواب دیا۔ ”میری ماں نے۔ کیوں، آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“

پیر نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ میں تیری پیشانی پر قیمتی کی علامتیں دیکھ رہا ہوں۔“

شیخ محمد میر نے کہا۔ ”میں اگر یتیم ہوں تو اس میں کسنی خیزیت کہاں سے آئی؟ خدا یا! میرے سینے میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے میں اپنے نفس کو تکبر عطا کروں۔ میں اپنی ماں کی توقعات پر پورا اترنا چاہتا ہوں اور یہ اس وقت تک ناممکن

ہے جب تک کہ اس میں تائید ایزدی بھی شامل نہ ہو جائے۔“

شیخ خضر کو ایسا مرید آج تک نہیں ملا تھا۔ بڑی محبت اور بڑے شوق سے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور یہ مرشد کی ہدایات اور نگرانی میں ریاضت اور مجاہدے میں مشغول ہو گئے۔ ابھی پچیس سال کے نوجوان ہی تھے کہ پیر مرشد نے انہیں فرقہ خلافت سے نواز دیا۔ شیخ محمد میر کا خیال تھا، ابھی پیر مرشد کے پاس ہی رہنا ہوگا لیکن پیر نے انہیں سامنے بٹھا کر کوئی اور ہی حکم دیا، کہا۔ ”محمد میر! میں تمہیں جو کچھ زیادہ سے زیادہ دے سکتا تھا، دے چکا۔ اب تمہیں ایک ہی چیز دے سکتا ہوں، اگر تم تیار ہو تو اس سے تمہیں مطلع کر دوں۔“

شیخ محمد میر نے عاجزی اور انکساری سے جواب دیا۔ ”حضرت! میں آپ کا مرید، خادم اور خاک پاؤں ہوں۔ آپ جو کہیں گے اس کی تعمیل میں خوشی محسوس کروں گا۔“

پیر مرشد نے کہا۔ ”اب میں تجھے حکم ہی دے سکتا ہوں اور وہی دے رہا ہوں۔“

فرماں بردار مرید نے عرض کیا۔ ”ارشاد، بندہ اس کی بجا آوری پر تیار ہے۔“

مرشد نے حکم دیا۔ ”توسیوستان (سندھ) سے ترک سکونت کر اور لاہور کا رخ کر، اور لاہور اس ارادے سے جا کہ اب تجھے اپنے وطن واپس نہیں آنا ہے۔“

فرماں بردار مرید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی، جواب دیا۔ ”حضرت کا حکم سراسر آنکھوں پر۔ میں آنکھیں بند کر کے تعمیل کروں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔“

شیخ خضر نے کہا۔ ”مجھے تجھ سے یہی امید ہے۔“

آپؐ نے اسی دن اپنے خاندان میں جا کر اعلان کر دیا کہ ”میں ترک وطن کر کے سنت نبویؐ پر عمل پیرا ہونے جا رہا ہوں۔“ بھائی بہنوں اور ماں نے حیرت سے ان کی صورت دیکھی۔ ماں کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ایک بہن، بی بی جمال خاتون بھی عارفہ تھیں، بھائی کے اعلان کو خاموشی سے سنا اور سوال جواب سے باز رہیں لیکن بڑے بھائی نے پوچھ ہی لیا۔ ”آخر یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے اور لاہور کیوں جا رہے ہو؟“

ماں نے بڑے بیٹے کو منع کیا۔ ”بیٹے خبردار! محمد میرؒ کے فیصلے میں دخل اندازی نہ کرو، کیونکہ اس کا یہ فیصلہ اپنا نہیں ہے، اس کے پیر مرشد کا حکم اور منشاء ہے۔“

یہاں آپؐ نے خاموشی سے عبادت و ریاضت شروع کر دی۔ لاہور والوں کو ایک عرصے تک آپؐ کے کمالات کا علم ہی نہ ہو سکا لیکن جب علم ہوا تو ایسا ہوا کہ شاہان وقت بھی آپؐ کی ملاقات اور آپؐ سے ہمکلام ہونے کو اپنی نجات اخروی اور سعادت دنیوی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ یہ جہانگیر کا دور حکومت تھا۔ آپؐ کی بزرگی اور علم و فضل کی شہرت اس کے کانوں تک پہنچی تو وہ ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا۔ ان دنوں جہانگیر کشمیر گیا ہوا تھا۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں تھی اور تبدیلی آب و ہوا اور بحالی صحت کی خاطر وہ کشمیر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہیں اس کو پھر ایک بار شیخ محمد میرؒ کی یاد آئی۔ اس نے چند آدمی اس عرضداشت کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں روانہ کیے کہ میں بیماری کی وجہ سے حاضری دینے سے معذور ہوں، اس لیے اگر آپؐ اس ناچیز کے لیے زحمت فرمائیں تو میں اس کو آپؐ کی ذرہ نوازی سمجھوں گا۔

آپؐ کے ارادت مندوں کا خیال تھا کہ آپؐ بادشاہ کی دعوت مسترد فرمادیں گے لیکن آپؐ نے بادشاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آپؐ نے اپنے ارادت مندوں سے کہا کہ اس طرح میں بیمار بادشاہ کی عبادت بھی کروں گا اور ساتھ ہی کچھ نصیحتیں بھی کر سکوں گا۔ آپؐ کشمیر روانہ ہو گئے۔ بادشاہ کو آپؐ کی تشریف آوری کی خبر جوئی تو اسے یقین نہیں آیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ آپؐ اس کی درخواست رد فرمادیں گے۔ وہ جوش عقیدت میں استقبال کو دوڑا لیکن صحت کی خرابی اس کی بھی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ناچار اپنی قیام گاہ کے در پر کھڑے ہو کر آپؐ کا انتظار کرنے لگا۔ آپؐ جیسے ہی اس کے قریب پہنچے، بادشاہ نے آپؐ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور نہایت ادب و احترام سے انہیں اندر لے گیا۔

بادشاہ کے امرا اور دوسرے ہم سفر بھی آپؐ سے ملنا اور آپؐ کی صحبت میں وقت گزارنا چاہتے تھے لیکن آپؐ نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ سروسٹ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں بادشاہ کی عبادت کروں اور اس کو اچھی اچھی نصیحتیں کرتا رہوں۔ آپؐ نے بادشاہ کو بہت سارے دینی اور علمی مسائل سمجھائے اور اس نے جو کچھ جانتا چاہا آپؐ نے شرح و بسط سے کوشش گزار کر دیا۔ بادشاہ آپؐ کے علم و بزرگی اور سمجھانے کے انداز دلنشین سے اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”حضرت آپؐ

کی بابت جو کچھ اور جتنا کچھ سنا تھا، آپؐ اس سے کہیں زیادہ ثابت ہوئے۔ افسوس کہ میں آپؐ کو ہمیشہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اور نہ آپؐ خود گوارا فرمائیں گے لیکن یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ جب تک میں کشمیر میں ہوں آپؐ یہیں تشریف فرما رہیں۔“ آپؐ نے جواب دیا۔ ”نور الدین! میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور لاہور سے کشمیر چلا آیا، بس اتنا ہی کافی ہے۔ اب مجھے واپس جانے دے۔ میں ایک گوشہ نشین اور عزت گزین انسان، میرا درباروں، سرکاروں سے کیا اعلق؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”پھر میں ایک درخواست کروں گا، امید ہے کہ آپؐ اسے مسترد نہیں فرمائیں گے؟“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”نور الدین! میں تیری اس درخواست کے سوا کہ تو مجھے مال و زر سے زیر بار کرے، ہر درخواست مان لوں گا۔“

بادشاہ نے عاجزی سے کہا۔ ”حضرت! بادشاہ کے پاس مال و زر ہی ہوتا ہے، جسے یہ دے سکتا ہے۔ آپؐ کے پاس علم و فضل اور بزرگی تھی۔ آپؐ نے اس سے مجھے نواز دیا اور میرے بے قرار دل کو اطمینان اور سکون بخشا۔ جس کے پاس جو ہے وہ تو وہی دے گا۔“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”میں اس کا انکار کب کر رہا ہوں لیکن میرے پاس جو کچھ ہے، تو نے اس کو طلب کیا تھا، میں نے دے دیا لیکن تیرے پاس جو کچھ ہے میں اس کو طلب نہیں کر رہا ہوں اور اس سے پناہ مانگ رہا ہوں۔“

بادشاہ اتنا مغلوب الحزبات ہو گیا کہ نہایت انکساری سے آپؐ کے آگے سر جھکا دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بھرائی آواز میں بولا۔ ”حضرت! اس وقت میں اپنے آپؐ میں نہیں ہوں۔ اگر آپؐ حکم دیں تو میں اسی وقت تاج و تخت کو لات مار دوں اور آپؐ کی مصاحبت اختیار کر لوں۔ میں دنیا اور علاقہ دنیا سے بیزار ہوں۔“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ تو بادشاہ رہ کر بھی بہتوں کو فیض پہنچا سکتا ہے، تیرا صحیح مقام یہی ہے۔“

بادشاہ نے عجز و انکساری سے پوچھا۔ ”کیا آپؐ مجھ سے کچھ بھی نہیں قبول فرمائیں گے؟“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”مال و زر کے سوا تو اور کیا دینا چاہتا ہے؟“

بادشاہ نے سفید ہرن کی کھال کی جائے نماز آپؐ کی خدمت میں پیش کی، پوچھا۔ ”کیا یہ بھی نہیں؟“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کو قبول کر لوں گا کیونکہ اس کے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔“ آپؐ نے ہرن کی کھال کی جائے نماز لی اور لاہور واپس جانے لگے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”میرے لائق اور کوئی خدمت؟“

آپؐ نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہ یہ کہ اب دوبارہ مجھے اس قسم کی زحمت نہیں دینا۔“

اس کے بعد آپؐ لاہور واپس تشریف لے گئے۔ اس ملاقات کا احوال جہانگیر نے اپنی تزک میں اس طرح لکھا۔

”جب مجھے اس کی اطلاع ملی کہ لاہور میں میاں شیخ محمد میرؒ نامی ایک سندھی نژاد درویش موجود ہیں۔ یہ بزرگ نہایت فاضل، ریاضت کش، مہارک نفس اور صاحب حال ہیں اور وہ گوشہ نشین و عزلت میں گوشہ نشین ہو کر فقر کی دولت سے غنی اور دنیا سے بے نیاز ہیں تو یہ سن کر میری حق پسند طبیعت ان کی ملاقات کے لیے بے قرار ہوئی اور ان کے دیکھنے کا جذبہ اشتیاق اور بڑھا۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک رقم لکھا اور اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ وہ بزرگ زحمت سفر برداشت کر کے میری ملاقات کے لیے تشریف لائے اور ایک طویل مدت تک تجلیے میں ان کے ساتھ میری محبت رہی۔ فی الحقیقت وہ نہایت شریف النفس بزرگ ہیں اور اس زمانے میں ان کا وجود بے حد غنیمت ہے۔ یہ نیاز مند ان سے دالہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ بہت سی حقائق و معارف کی بلند باتیں ان سے سنیں۔“

میں نے ہر چند چاہا کہ ان کے سامنے نذر پیش کروں لیکن ان کے عزم و حوصلے کو دیکھ کر اور اس سے بلند و بالا پاکر میرے دل نے اس ارادے کو پورا کرنے کی اجازت نہ دی۔ سفید ہرن کی کھال کی جائے نماز ان کی خدمت میں پیش کی۔ وہ ملاقات سے فارغ ہونے کے بعد فوراً لاہور واپس تشریف لے گئے۔“

☆☆☆

آپؐ اپنے حجرے میں خاموش، اللہ سے لو لگائے تشریف فرما تھے کہ ان کے بڑے بھائی سندھ سے تشریف لائے۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے اور ان سے بڑی دیر تک گہری باتیں کرتے رہے لیکن ان باتوں کے دوران انہیں یہ فکر پریشان کرتی رہی کہ گھر میں بھائی کو کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ باتوں کے بعد آپؐ نے بھائی کو تو

حجرے میں چھوڑا اور خود باغ کے ایک گوشے میں چلے گئے۔ وہاں وضو کیا، دو گانہ نماز نفل ادا کی اور اللہ سے دعا کی۔
”بارا الہا! تیرے سوا میرا کوئی یار و مددگار نہیں اور تو خوب جانتا ہے کہ اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک عرصے بعد میرا بھائی وطن سے آیا ہے اور مجھے میں اتنی سکت بھی نہیں کہ میں بھائی کے خور و نوش کا انتظام کر سکوں.....“

ابھی یہ مناجات جاری ہی تھی کہ ایک شخص آپ کو تلاش کرتا ہوا باغ میں داخل ہوا اور دور ہی سے آواز دی۔ ”کیا شیخ محمد میر اس باغ میں تشریف رکھتے ہیں؟“
آپ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن وہ شخص آپ کو تلاش کرتا ہوا باغ کے گوشے میں پہنچ گیا اور آپ کو دیکھتے ہی کہا۔
”حضرت! میں تو آپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“
آپ نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، خیر تو ہے؟“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”ایک شخص حجرے کے در پر آپ کا منتظر کھڑا ہے، خوان طعام اس کے سر پر ہے اور آپ کو دریافت کر رہا ہے۔“

آپ اس کے ساتھ اپنے حجرے میں واپس تشریف لے گئے۔ وہاں وہ اجنبی خوان طعام لیے بیٹھا تھا۔ آپ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”محمد میر! آپ نے جس سے یہ کھانا مانگا تھا، اس نے میرے ذریعے روانہ کر دیا ہے۔“ اس کے بعد اس نے کچھ نقدی بھی آپ کی طرف بڑھائی، کہا۔ ”اور کھانے کے ساتھ یہ نقدی بھی بھیجی ہے اور کہا ہے کہ اگر کچھ اور نقدی درکار ہو تو ارشاد فرمائیں تاکہ وہ بھی روانہ کر دی جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جس نے یہ سب کچھ میرے لیے روانہ کیا ہے اس کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا اور کہنا کہ مجھے اور کچھ درکار ہوگا تو پھر مانگ لوں گا۔“
وہ شخص چلا گیا۔ آپ نے اسی وقت دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور بھائی کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ مہمان نوازی کے دوسرے فرائض ادا کیے۔

بڑے بھائی نے پوچھا۔ ”محمد میر! کیا تو مجھے دریائے راوی کے کنارے لے چلے گا کیونکہ مجھے دریا سے عشق ہے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”چلیے، چلتا ہوں۔“

یہ دونوں راوی کے کنارے پہنچے اور کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے پھر ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ابھی یہ باتیں جاری ہی تھیں کہ ایک طرف سے ساتھی ساتھی کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں نے آواز کی طرف دیکھا، ایک کالا سانپ تیزی سے ان دونوں کی طرف بھاگا چلا آ رہا تھا۔ آپ کے بڑے بھائی اُچی کودیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور اس کو مارنے کے لیے کھڑے ہو کر ادھر ادھر پتھر تلاش کرنے لگے اور آخر ایک بڑا پتھر اٹھا کر سانپ کی طرف بڑھے۔ آپ نے بھائی کو منع کیا اور کہا۔ ”بھائی صاحب! سانپ کو مارے گا نہیں، یہ ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ میرے پاس آکر بے خوف و خطر بیٹھ جائے۔“ لیکن بڑے بھائی کو اس پر یقین نہیں آیا، وہ دور کھڑے سانپ کو خوف زدہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

سانپ آپ کے سامنے پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ بڑے بھائی نے دور ہی سے متنبہ کیا۔ ”محمد میر! یہ افی تھے ڈس لے گا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! خاموش رہے، یہ سانپ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔“

بڑے بھائی خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بھائی نے دریافت کیا۔ ”کیا سانپ سچ کچھ کہہ رہا تھا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ محمد میر! میں نے ایک عرصے سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ میں جب بھی آپ کو دیکھوں گا، آپ کے گرد تین چکر ضرور لگاؤں گا۔ کیا آپ مجھے طواف کی اجازت دیں گے۔ چنانچہ میں نے اسے اجازت دے دی۔“ اس کے بعد یہ آواز بلند سانپ سے کہی۔ ”اے سانپ! میں نے تجھے اجازت دی کہ تو میرا تین بار طواف کر لے۔“
بڑے بھائی نے یہ باتیں یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیات سے سنیں لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ سانپ نے اجازت پاتے ہی آپ کا طواف شروع کر دیا ہے تو بڑی حیرت ہوئی۔

سانپ نے تین بار طواف کیا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ بڑے بھائی پر چھوٹے بھائی کا ایسا رعب بیٹھا کہ بات کرنا محال ہو گیا۔ اب وہ اپنے چھوٹے بھائی کی مزید کرامات دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ایک دن بڑے افسوس سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو میری ماں کو اسی دن یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میں عارف نہیں ہوں اور مجھے عرفان نہیں حاصل ہوگا۔ والد صاحب تو میری پیدائش سے بہت خوش ہوئے تھے لیکن والدہ صاحبہ طول ہو گئی تھیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ماتہ بخشد خدائے بخشنده۔ آپ کو، جس حال میں ہیں اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور میں جو کچھ بھی ہوں اور اس پر ناز نہیں کر سکتا کیونکہ ہمیں جو کچھ بھی ملتا ہے خدا کی مہربانی اور کرم سے ملتا ہے اور جو خدا کی مہربانی اور کرم سے ملا ہوا اس پر ناز یا غرور بے کار ہے۔ خدا کا شکر گزار ہونا بہت ضروری بلکہ فرض ہے۔“
بڑے بھائی نے افسردگی سے کہا۔ ”ہاں، محمد میر! تم کو اسی قسم کی باتیں کرنا چاہیے کیونکہ تمہارے لیے والدہ نے بڑی دعا کی تھی، تمہارے لیے بھی اور بی بی جمال خاتون کے لیے بھی۔“

یہ دونوں باتوں میں مشغول تھے کہ ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میر زین خان کے باغ میں آپ دونوں کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ وہاں آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں نے آپ کے بڑے بھائی کی آمد کی خوشی میں ضیافت دی ہے، آپ دونوں وہاں تشریف لے چلیں گے تو ہم سب کو بڑی خوشی ہوگی۔“

آپ نے مسکرا کر بڑے بھائی کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ”بھائی صاحب! ملاحظہ فرمایا آپ نے، میر زین خان کے باغ میں آپ کے اعزاز میں ضیافت دی جا رہی ہے۔ گویا میں خود بھی وہاں جو کچھ کھاؤں پیوں گا آپ کے طفیل۔“
بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ”محمد میر! تم نے جو کچھ کہا، میں اس کی تردید نہیں کروں گا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر میں تمہارا بھائی نہ ہوتا تو یہ ضیافت بھی نہ ہوتی۔ اس طرح طفیلی میں ہوں یا تم؟“

آپ نے فرمایا۔ ”کیا ہم دونوں کا ایک دوسرے کا بھائی ہونا عز و افتخار کی بات نہیں ہے؟“
بڑے بھائی نے جواب دیا۔ ”صرف میرے لیے فخر کی بات ہے، تمہارے لیے ہرگز نہیں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”میں آپ کی ہر بات کا شافی و کافی جواب دے سکتا ہوں لیکن حد ادب کہہ کر اس بحث کا در بند کرتا ہوں۔ آپ بھی طول نہ ہوں اور خوش خوش میرے ساتھ میر زین خان کے باغ میں تشریف لے چلیں۔“
بڑے بھائی نے کہا۔ ”محمد میر! تو یہ ہرگز نہ سمجھ کہ میں تیری بزرگی، فضیلت اور علم و فضل سے خوش نہیں ہوں، میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ مجھے تمہارے جیسا چھوٹا بھائی ملا، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔“

دونوں بھائی ارادت مندوں اور مریدوں کے ساتھ میر زین خان کے باغ میں پہنچے۔ وہاں ضیافت میں جو کچھ پیش کیا گیا، آپ نے تھوڑا سا کھا کر مریدوں اور ارادت مندوں کے لیے چھوڑ دیا۔ کھانے کے بعد لوگوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور مختلف مسائل تصوف اور علمیہ پر گفتگو کرنے لگے۔ اس گفتگو کے دوران ایک فاختہ نے سامنے درخت پر بیٹھ کر بڑے پرسوز لہجے میں کوکو کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے بات چیت بند کر دی اور فاختہ کی آواز سننے لگے۔ ایک طرف سے ایک اجنبی آیا اور جس درخت پر فاختہ بیٹھی تھی، اس کے نیچے کھڑے ہو کر نظروں سے فاختہ کو تلاش کرنے لگا پھر فاختہ جیسے ہی نظر آئی اس نے ایک پتھر مار کر نیچے گرا دیا۔ دوڑ کر فاختہ کو اٹھایا تو پتا چلا کہ وہ مرچکی تھی۔ اسے مردہ سمجھ کر اس نے پھینک دیا اور اپنی راہ لی۔ آپ نے ایک مرید سے فرمایا۔ ”جا، اس فاختہ کو اٹھالا۔“

مرید تعمیل حکم میں فوراً ہی اٹھالایا اور آپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! یہ فاختہ تو مرچکی ہے۔“
آپ نے فاختہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ سے فرمایا۔ ”نہیں، یہ مری نہیں زندہ ہے۔“

اس کے بعد آپ نے آہستہ آہستہ اسے سہلانا شروع کر دیا اور مرید یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ فاختہ نے ایک زوردار جھرجھری لی اور پھر اڑ کر درخت پر جا بیٹھی۔ اب اس نے دوبارہ کوکو کرنا شروع کر دیا۔ شکاری نے دور سے جو یہ آواز سنی تو وہ پھر پلٹا اور ہاتھ میں پتھر لے کر شکار کرنے درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ”اس ظالم کو روکو، یہ کیا کر رہا ہے؟“
مرید نے جب اس کو روکنا چاہا تو شکاری نے غضب ناک نظروں سے مرید کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میں فاختہ کا شکار کر رہا ہوں تیرا شکار تو نہیں کر رہا پھر مداخلت کیوں کر رہا ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”منع میں نہیں، میرے پیرومرشد کر رہے ہیں۔“ اس کے بعد اس نے آپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ رہے میرے مرشد۔“

شکاری نے آپ کو دیکھا، بولا۔ ”میں کیا جانوں کہ یہ تیرا پیر ہے یا کچھ اور۔ تیرا پیر ہے تو تو اس کا حکم مان۔ میرا پیر ہوتا تو میں بھی اس کا حکم مان لیتا۔ اس وقت تو میں اس فاختہ کو نہیں چھوڑوں گا، شکار کر کے ہی رہوں گا۔“
مرید نے آپ کو شکاری کے جواب سے مطلع کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”یہ میرا حکم مانے یا نہ مانے لیکن یہ اس فاختہ کا شکار نہیں کر سکتا۔“

شکاری نے پتھر والا ہاتھ اٹھایا اور نشانہ لیا لیکن اچانک ہاتھ میں خطرناک درد اٹھا اور وہ اس کی اذیت سے زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ آپ مریدوں کو چھوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور دریا یافت کیا۔ ”او ظالم انسان، تیرا کیا حال ہے؟“ اس نے درد سے چیختے ہوئے جواب دیا۔ ”حضرت! میں مر جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔“ آپ نے فرمایا۔ ”تیرا یہ حال تیرے ظلم اور بے رحمی کے نتیجے میں ہوا ہے۔ بول! کیا تو بے زبان پرندوں پر اپنا ظلم جاری رکھے گا؟“

شکاری نے جواب دیا۔ ”حضرت! اگر اس بار مجھے معاف کر دیا جائے تو میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ یہ کام میں زندگی بھر نہیں کروں گا۔ میں توبہ کرتا ہوں، بس مجھے سبق مل گیا۔“

آپ نے جھک کر اس کا درد والا ہاتھ پکڑ لیا اور تین بار سہلایا پھر دریافت کیا۔ ”اب درد کہاں ہو رہا ہے؟“ شکاری نے اپنے اس ہاتھ کو ادھر ادھر حرکت دی اور کہا۔ ”حضرت! تعجب ہے کہ درد کا کہیں پتا نہیں۔ میرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔“

آپ نے جواب میں کہا۔ ”اچھا اب جا اور مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس پر زندگی بھر قائم رہنا۔“ شکاری آپ کے قدموں میں گر گیا اور بولا۔ ”حضرت! اب میں کہاں جاؤں گا۔ میں تو آپ کے قدموں ہی میں پوری زندگی بسر کروں گا۔“

آپ نے اس کو بھی اپنے حلقہ مریدوں میں داخل فرمایا اور بعد میں یہ شخص بلند مرتبے پر فائز ہوا۔ آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی یہ کرامت جو دیکھی تو فرط خوشی میں برا حال ہو گیا۔ اب انہیں اپنے چھوٹے بھائی پر فخر محسوس ہونے لگا۔

☆☆☆

حاجت مندوں اور عاشقوں کا اتنا ہجوم رہنے لگا کہ آپ پریشان ہونے لگے لیکن آپ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ آپ حاجت مندوں کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیتے تھے کہ یہ شخص حاجت مند ہے۔ اسی طرح ایک دن آپ نے ایک شخص کو ایک لڑکے کا ہاتھ پکڑے کھڑے دیکھا۔ آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تو کیا حاجت لے کر آیا ہے؟“

اس شخص نے اپنے لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”حضرت! یہ گونگا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیے۔“

آپ نے لڑکے کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، پوچھا۔ ”کیا تو گونگا ہے؟“ لڑکے نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ گویا اس نے آپ کی بات سنی ہی نہ تھی۔

آپ نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”لڑکے! تو میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا، کیا تو گونگا ہے؟“ لڑکا پھر خاموش رہا۔ لڑکے کا باپ ضبط نہیں کر سکا، بولا۔ ”حضرت! کیا آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟ میں نے کہا جو دیا کہ یہ گونگا ہے اور آپ اس کے حق میں دعا فرمائیے۔“

آپ نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”اچھا اگر تو میری بات کا جواب نہیں دیتا تو نہ دے، یہ تو کر سکتا ہے کہ میں تجھے جو حکم دوں، اس کی تعمیل کر دے۔“

باپ کو آپ کی باتوں پر تعجب ہو رہا تھا۔ آپ نے لڑکے کو حکم دیا۔ ”پڑھ، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ لڑکے نے جواب میں، بسم اللہ الرحمن الرحیم کہا اور آپ کی صورت اس انداز میں دیکھنے لگا گویا پوچھ رہا ہو۔ ”حضرت! کوئی اور حکم؟ بسم اللہ تو پڑھ دی میں نے۔“

لڑکے کے باپ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کے گونگے بیٹے نے پوری بسم اللہ پڑھ دی ہے۔ وہ بڑی حیرت سے بار بار بھی آپ کو دیکھتا اور بھی اپنے بیٹے کو دیکھنے لگتا۔

آپ نے اس لڑکے سے بات چیت شروع کر دی۔ اب وہ نہایت بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا تھا۔ آپ نے لڑکے کے باپ سے کہا۔ ”اب اسے لے جا۔ اللہ نے چاہا تو اب یہ زندگی بھر یوں ہی باتیں کرتا رہے گا۔“

وہ شخص اپنے بیٹے کو لے کر چلا گیا تو ایک دوسرا شخص آپ کی طرف بڑھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ نے اس گونگے کو تو زبان عطا کر دی، اب میرے بیٹے کی طرف بھی توجہ فرمائیے۔“

آپ نے دریافت فرمایا۔ ”تیرے بیٹے کو کیا ہو گیا؟“ اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! وہ اتنا غلیل ہے کہ میں اسے آپ کے پاس نہیں لاسکتا کیونکہ ڈر ہے کہ یہاں تک لاتے ہوئے کمزوری کی وجہ سے اس کی حرکت قلب نہ بند ہو جائے۔“

آپ نے گویا اپنے آپ سے فرمایا۔ ”تو اس کا یہ حال ہے۔“ اس کے بعد آپ نے ایک کوزے میں پانی بھرا اور اس پر دم کر کے اس شخص کے حوالے کر دیا، فرمایا۔ ”جا اور اس پانی کو دوا کی طرح ذرا ذرا کر کے پلاتا رہے۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔“

وہ شخص پانی لے کر چلا گیا اور کئی دن بعد واپس آ کر آپ کو مطلع کیا کہ اب میرا لڑکا صحت یاب ہو چکا ہے۔ آپ ہمارے حق میں دعا فرمائیے کہ ہمیں مالی مشکلوں سے بھی نجات مل جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اللہ پر تکیہ کر، وہ تیرے اس مرض کا علاج بھی کر دے گا۔“

آپ کے اس عطا و سخا کو دیکھ کر ایک دن آپ کے ایک خادم نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ کی عنایات اور مہربانیاں عام ہیں اور ان سے جو چاہے فائدہ اٹھالے لیکن میں جو ہر وقت آپ کی خدمت میں موجود رہتا ہوں، آپ کے اس نوع کے کرم سے محروم ہوں۔“

آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”بے شک اور تجھے واقعی میری عطا و سخا سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔“

ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ آپ نے وضو کے لیے پانی طلب کیا اور جب پانی آ گیا اور آپ نے اپنے مخصوص رومال سے اپنا چہرہ پونچھا تو اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔ آپ نے وہ بھیگا ہو اور رومال اپنے خادم کی طرف بڑھا دیا اور فرمایا۔ ”لے میرا یہ رومال رکھ لے۔ اس رومال میں خصوصیت یہ ہے کہ گھر میں جو بھی بیمار ہو، اس رومال کو اس کے سر سے باندھ دینا۔ مریض چند ساعتوں میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کے بعد آپ نے اپنے خادم سے ارشاد فرمایا۔ ”اس رومال کے فیض کو جب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو تیری عقل دنگ رہ جائے گی۔ یہ بڑے کمال کی بات ہے کہ یہ رومال بیسیوں مرضوں کا علاج ثابت ہو گا۔“

خادم نے بعد میں جب اس رومال کے کمالات کا تجربہ کیا تو دنگ رہ گیا۔ اس نے اس رومال سے آسیب تک سے نجات دلائی اور لوگوں میں معزز اور پروقا رہن کر رہنے لگا۔

☆☆☆

جہانگیر کشمیر میں موجود تھا اور وہیں سے احکام جاری کر رہا تھا۔ بادشاہ کے آس پاس جو لوگ موجود تھے، اب ان کا ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ بادشاہ کو جس شخص کے خلاف اکسانا یا ورغلا نا چاہتے ورغلا دیتے۔ امرا میں کئی ایسے تھے جنہیں دہلی کے مشہور بزرگ عبدالحق محدث دہلوی اور خواجہ باقی باللہ کے مرید مرزا حسام الدین سے بڑی نفرت تھی۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو ان دونوں کے خلاف خوب خوب بھرا، آخر بادشاہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ میں کیا کر دوں؟“

چغل خور امرانے جواب دیا۔ ”حضور والا! عبدالحق محدث دہلوی اور باقی باللہ دہلی کی دو خطرناک شخصیتیں ہیں اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم نے یہ سنا ہے کہ یہ دونوں دہلی میں سازشیں کرتے رہتے ہیں اور حضور کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ ہم سب تمک خواروں کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ حضور کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”آخر تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

ایک امیر نے جواب دیا۔ ”حضور والا! ہم سب اپنے لیے کچھ بھی نہیں چاہتے لیکن حضور کے لیے بہت کچھ چاہتے ہیں۔“

بادشاہ نے برہم ہو کر پوچھا۔ ”چلو یہی سبھی، کچھ بتاؤ تو سہی کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“

ایک دوسرے امیر نے جواب دیا۔ ”وہ محدث دہلوی ہوں یا خواجہ باقی باللہ ان دونوں کو قابو میں رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عبدالحق محدث دہلوی کے بیٹے شیخ نورالحق کو کاہل بجھوایا جائے کیونکہ نورالحق اپنے باپ کا سیدھا ہاتھ ہے۔

جب یہ دہلی میں نہیں ہوگا تو عبدالحق بے ہاتھ کے رہ جائیں گے۔ اسی طرح خواجہ باقی باللہ کا مرید مرزا حسام الدین، خواجہ کا سیدھا ہاتھ ہے۔ اس ہاتھ کو حضور کشمیر طلب فرمائیں۔ حسام الدین کے آجانے سے خواجہ باقی باللہ بے کار ہو جائیں گے اور اس طرح یہ دو کانٹے دہلی سے نکال کر حضور کے خلاف ہونے والی سازشوں کے دروازے بند کر دیں گے۔“

جہانگیر نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں اسی وقت ان دونوں کے لیے یہ فرمان جاری کرتا

ہوں کہ دونوں ہی یہاں میرے پاس کشمیر آجائیں۔ میں یہاں سے ان دونوں کو جہاں چاہوں گا روانہ کر دوں گا۔“

امرانے بیک زبان عرض کیا۔ ”حضور کا فیصلہ انب ہے۔ ہم سب تائید کرتے ہیں۔“

بادشاہ نے اسی دن شیخ نور الحق اور مرزا حسام الدین کے نام دو خط روانہ کر دیے۔ ان خطوط میں ان دونوں کو حکم دیا گیا تھا کہ فوراً کشمیر پہنچیں۔ بادشاہ انہیں کاہل یا کہیں اور بھیجا جاتے ہیں۔

جب یہ پروانہ طلعی دہلی پہنچے تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی بہت پریشان ہو گئے۔ وہ اپنے بڑھاپے میں اپنے لائق بیٹے شیخ نور الحق کو اپنے پاس سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی حال خواجہ باقی باللہ کا تھا۔ وہ مرزا حسام الدین کو دل سے عزیز رکھتے تھے اور کسی طرح بھی حسام الدین کو جدا کرنے پر راضی نہیں تھے۔ دونوں بزرگ ایک جا ہوئے اور آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ان حالات میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ یہ صلاح مشورے آپس میں جاری تھے کہ کسی شخص نے عبدالحق محدث دہلوی کو مشورہ دیا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ اپنا فیصلہ بدل دے اور دونوں مطلوب شخصوں کو دہلی ہی میں رہنے دے تو اس کی ایک ہی تدبیر ہے۔“

محدث دہلوی نے کہا۔ ”کون سی تدبیر؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ بادشاہ لاہور کے محمد میر کی بہت عزت کرتا ہے۔ اگر آپ دونوں میں سے کوئی بھی لاہور چلا جائے اور محمد میر کو اپنا وسیلہ بنالے تو یہ کام بڑی آسانی سے ہو جائے گا۔“

محدث دہلوی نے فرمایا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں لاہور چلا جاؤں گا اور محمد میر سے درخواست کروں گا کہ وہ بادشاہ پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے دونوں کے تبادلے کو ادیں۔“

اس کے بعد محدث دہلوی نے رخت سفر باندھا اور یہ بگلت لاہور روانہ ہو گئے۔ جب آپ کو محدث دہلوی کی تشریف آوری کا علم ہوا تو ملاقات کے لیے بے چین ہو گئے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور ایک دوسرے سے تپاک سے ملے۔ آپ نے محدث دہلوی سے پوچھا۔ ”حضرت! آپ نے یہ طویل سفر کی زحمت کیوں فرمائی؟“

محدث دہلوی نے اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کی اور آخر میں فرمایا۔ ”شیخ! بادشاہ کو غمازوں نے ہماری طرف سے برگشتہ کر دیا ہے اور بادشاہ نے ہم پر اپنا عتاب یوں نازل کیا ہے کہ میرے بیٹے نور الحق کو کاہل چلے جانے کا حکم دیا ہے اور باقی باللہ کے مرید خاص حسام الدین کو کشمیر طلب کر لیا ہے۔ اگر بادشاہ کے حکم پر عمل کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دو خاندان منتشر اور پریشان ہو جائیں گے۔“

آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ تامل کے بعد فرمایا۔ ”آپ لوگ پریشان نہ ہوں کیونکہ آپ سب دہلی میں ہی رہیں گے۔“

محدث دہلوی نے بے چینی سے پوچھا۔ ”اور بادشاہ نے جو حکم دیا ہے اس کا کیا ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کی تعمیل نہیں ہوگی کیونکہ بادشاہ کا پیاناہ عمر لبریز ہو چکا ہے، اک ذرا انتظار کیجیے۔“

محدث دہلوی لاہور میں ہی ٹھہر گئے۔ چند دنوں بعد کشمیر سے خبر آئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ کی لاش کشمیر سے لاہور پہنچائی گئی جہاں اس کی تدفین عمل میں آئی۔

محدث دہلوی دہلی واپس تشریف لے گئے۔

ایک امیر پریشان حال آپ کی خدمت میں پہنچا اور بے دلی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا۔ ”اے شخص! تو ادھر اتنی دور کیوں جا بیٹھا۔ ادھر ذرا میرے قریب تو آ اور اپنی پریشانی بتا۔“

امیر آپ کے پاس جا بیٹھا، جواب دیا۔ ”آپ کو ہر بات کشف سے معلوم ہو جاتی ہے۔ میں کیوں پریشان ہوں؟ یہ بات بھی آپ کو معلوم ہو جانی چاہیے۔“

آپ نے تبسم فرمایا، بولے۔ ”مسئلہ کھاری پانی کا ہے۔ ہاں، اب بیان کر، کیا معاملہ ہے؟“

امیر کا چہرہ کھل اٹھا، بولا۔ ”حضرت! میں نے اپنی حویلی میں ایک کنواں کھدوایا تھا۔ اس کا پانی کھاری نکلا۔ اب آپ ہی بتائیے، وہ پانی کس طرح کام میں لایا جاسکتا ہے؟ دعا فرمائیے کہ پانی کام کا ہو جائے۔“

آپ نے ایک کوزے میں پانی طلب کیا اور اس پر سورۃ فاتحہ دم کی، تھوڑا سا پانی پی کر امیر کو حکم دیا۔ ”اے کنویں میں ڈال دے، اللہ نے چاہا تو تیری مراد بر آئے گی۔“

امیر نے پانی کا کوزہ لیا اور اپنی حویلی میں واپس گیا اور کوزے کا پانی کنویں میں ڈال دیا۔ دو دن بعد جب کنویں سے

پانی بھرا تو اس کا ذائقہ میٹھا تھا۔ پانی کا کھار پین زائل ہو چکا تھا۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ آپ کی خدمت میں دوبارہ پہنچا اور قدموں میں گر کر عرض کیا۔ ”حضرت! میری مراد تو آپ کی دعا سے پوری ہو گئی، میرے لائق کوئی خدمت؟“

آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”میری خواہش یہ ہے کہ تم کسی اہم ضرورت ہی سے میرے پاس آؤ تو آؤ ورنہ یوں پریشان نہ کرو۔“

امیر چلا گیا اور اس نے ایک عرصے تک آپ کو پریشان نہیں کیا لیکن دوسری بار پھر حاضر ہوا اور حسب سابق ایک کونے میں جا بیٹھا۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی پکارا۔ ”اے شخص! تو وہاں کہاں جا بیٹھا۔ ادھر میرے پاس آ۔“

امیر آپ کے پاس جا بیٹھا، آپ نے فرمایا۔ ”بڑی مدت بعد آیا؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”آپ ہی نے تو ہدایت کی تھی کہ میں کسی اہم ضرورت ہی سے حاضری دوں، ورنہ نہ آؤں۔“

آپ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”کوئی اہم ضرورت آپڑی؟ بتا، میں کیا کر سکتا ہوں؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! جب آپ میری بات سنیں گے تو مسکرائیں گے بات اتنی اہم تو نہیں تھی کہ میں اس کے لیے آپ کے پاس آتا۔“

آپ نے کہا۔ ”بتا تو سہی، کیا بات ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری کنیز میرا بہت سامان وزر لے کر فرار ہو گئی۔ میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ خدا کے لیے میرا یہ مسئلہ حل کر دیجیے۔ اگر اور کچھ نہیں تو یہی بتا دیجیے کہ میں اسے کہاں تلاش کروں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر کنیز چلی گئی تو اس کو چلا جانے دے۔ مال وزر لے گئی تو اپنے مقدر کا لے گئی تو کیوں پریشان ہو رہا ہے؟ جا، آرام کر اور یہ سمجھ لے کہ جو کچھ تیری قسمت کا ہے، تیرے پاس ہے اور جو کنیز کی قسمت کا تھا وہ لے گئی۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضرت! اگر وہ مال وزر میرا ہوتا تو آپ کے ارشاد کے مطابق صبر کر لیتا لیکن میری کنیز جو کچھ اپنے ساتھ لے گئی ہے اس کا بیشتر حصہ میرے پاس لوگوں کا بطور امانت رکھا تھا۔ اب میں امانت والوں کو کیا جواب دوں گا؟ میں بددیانت اور خائن مشہور ہو جاؤں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات کی تو نے۔ اب تو میری نظر میں اس لائق ہو گیا ہے کہ میں تیرے حق میں دعائے خیر کروں۔“ اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا۔ ”میں نے تیری یہ شکایت چار دن پہلے ہی سن لی تھی، تو خود میرے پاس تاخیر سے آیا ہے۔ بھلا بتا تو سہی، یہ کنیز تیرے پاس سے کب گئی ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”چار دن قبل۔ میں ان چار دنوں میں اتنا زیادہ پریشان رہا ہوں کہ مجھے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا لیکن جیسے ہی ہوش آیا میں بھاگ بھاگ آپ کے پاس آ گیا اور آپ کی اعانت کا طلب گار ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جا، اپنے گھر واپس جا۔ کنیز تیری حویلی ہی میں موجود ہے۔ یہ سمجھ لے کہ وہ کہیں بھی نہیں گئی۔“

امیر نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں اس کو چار دن سے تلاش کر رہا ہوں اور آپ یہ فرما رہے ہیں کہ وہ میری حویلی میں ہی موجود ہے اور میں یہ سمجھ لوں کہ وہ کہیں نہیں گئی؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا وہی مطلب ہے جو میں نے بیان کیا۔ تو اپنی حویلی میں واپس جا، تیری کنیز گھر میں موجود ملے گی۔“

امیر نے آہستہ سے کہا۔ ”اچھا تو میں حویلی واپس جاؤں؟“

”ہاں، تو واپس جا اور وہاں جو کچھ بھی دیکھ، اس سے مطلع کر۔“

امیر حویلی واپس گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کنیز مال وزر کے ساتھ موجود ہے۔ امیر نے پوچھا۔ ”تو چلی کہاں گئی تھی؟“

کنیز نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”امیر! یہ نہ پوچھ کہ کہاں چلی گئی تھی، بلکہ یہ پوچھ کہ میرے ساتھ کیا پیش آیا اور میں کس طرح واپس آ گئی۔“

امیر نے کہا۔ ”ہاں، وہ سب بیان کر جو تیرے ساتھ پیش آیا اور تو اچانک کس طرح واپس آ گئی؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں اس حویلی سے واقعی فرار ہو گئی تھی اور واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد اچانک ایک بزرگ میرے سامنے آ گئے اور درشت لہجے میں فرمایا کہ اے عورت! تو نے یہ کیا غضب کیا کہ خود تو فرار ہوئی مگر اپنے ساتھ امانت میں رکھی ہوئی چیزیں بھی لیتی آئی۔ جا، فوراً واپس جا اور یہ چیزیں ان کے امین کو واپس کر دے اور میری یہ بات بھی یاد رکھ کہ جہاں سے تو بھاگی ہے، اس سے بہتر آقا تجھے نہیں ملے گا۔“

امیر نے پوچھا۔ ”ان بزرگ کی شکل کیسی تھی؟“

کنیز نے جو شکل بتائی وہ محمد میر بھیسی تھی۔ امیر نے بے ساختہ کہا۔ ”یا پیر و مرشد! آپ کتنے باخبر اور فریادرس ہیں۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔“ پھر کنیز سے پوچھا۔ ”اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

کنیز نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“

امیر نے کنیز کو آغوش میں سمیٹ لیا، کہا۔ ”اب میں خود بھی تیرا بہت زیادہ خیال رکھوں گا اور تجھے کہیں بھی نہیں جانے دوں گا۔“

☆☆☆

آپ مجلس میں اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں وعظ و تلقین فرما رہے تھے کہ ایک پریشان حال، برہنہ پا، برہنہ سر مغل اس مجلس میں داخل ہوا۔ آپ نے اس پر سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ صرف تہ بند باندھے ہوئے تھا۔ مغل ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا۔ آپ کچھ دیر تک وعظ فرماتے رہے۔ وعظ کے خاتمے پر ایک شخص نے آپ کو پچیس روپے بطور نذر پیش کیے۔ خلاف معمول آپ نے یہ رقم قبول فرمائی اور اس مغل کو اشارے سے پاس بلایا اور وہ روپے اس کے حوالے کر دیے، فرمایا۔ ”اے شریف زادے! اس رقم سے اپنا حلہ درست کر اور ایک گھوڑا خرید لے۔ شہزادہ دارا شکوہ کے پاس چلا جا، تجھے ملازمت مل جائے گی اور تیری پریشانی دور ہو جائے گی۔“

مغل یہ رقم لے کر شکریہ ادا کر کے چلا گیا لیکن حاضرین مجلس میں سے ایک شخص آپ کی طرف بڑھا اور طیش میں کہا۔ ”جناب! آج آپ نے ہم سب پر دوزیا دیتا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی، یہ تمہارا وہم یا سوء ظن ہے۔“

اس شخص نے غصے سے کہا۔ ”آپ اول تو کسی سے کچھ لیتے نہیں لیکن آج خلاف معمول پچیس روپے قبول کر کے آپ نے ہم سب کے اعتماد کو ٹھیس لگائی ہے، دوسرے یہ کہ نذرانے میں آپ کو جو کچھ ملا تھا، اس میں ہمارا بھی حصہ تھا لیکن آپ نے وہ ساری رقم اس مغل زادے کے حوالے کر دی۔“

آپ نے نہایت نرمی سے فرمایا۔ ”وہ نذرانہ میں نے اسی مغل زادے کے لیے قبول کیا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی حق نہیں تھا پھر میں اس میں کسی اور کو کیا شریک کرتا؟“

اس شخص نے زور زور سے پاؤں پٹختے اور مجلس سے جاتے ہوئے کہا۔ ”اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا کیونکہ اس میں عدل و انصاف باقی نہیں رہا۔“

وہ شخص چلا گیا۔ آپ اس کو حیرت سے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ چلا گیا تو آپ نے فرمایا۔ ”لوگو! تم نے اس حریص کی حرکت دیکھی؟ حالانکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی کمر میں ایک سو بائیس روپے آٹھ آنے بندھے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود کو مستحقین میں شمار کرتا ہے۔ بے شک انسان بڑا ظالم ہے اور خسارے میں ہے۔“

پوری مجلس دم بخود آپ کی باتیں سنتی رہی، کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! اس حریص کا انجام کیا ہوگا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے خدا سے استدعا کی ہے کہ اس کو اس کے حرص کی سزا دی جائے چنانچہ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کو اس کی سزا ملے گی، ضرور ملے گی۔“

ایک مرید اس شخص کے پیچھے دوڑا کہ دیکھے اس کا کیا انجام ہوتا ہے۔

وہ شخص آپ سے رخصت ہو کر ایک حمام میں گیا اور غسل کیا۔ کمرے سے تھیلی کھول کر حمام ہی میں رکھ دی اور نہانے کے بعد کپڑے بدل کر اپنی راہ لی۔ حمام والے کو معاوضہ پیشی ادا کر دیا تھا۔ اس شخص کے جاتے ہی ایک دوسرا شخص حمام میں داخل ہوا اور روپوں کی تھیلی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تھیلی قبضے میں کی اور نہانے بغیر ہی فرار ہو گیا۔

آپ سے گستاخی کرنے والے حریص کو جب اپنی تھیلی یاد آئی تو وہ بھاگا بھاگا حمام پہنچا لیکن وہاں تھیلی نہ پا کر غش کھا کر گر پڑا۔ حمام کے مالک کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بے ہوش کیوں ہو گیا؟ لیکن جب اسے اصل واقعہ معلوم ہوا تو اس نے اس حریص کو تھیلی دی کہ پریشان کیوں ہوتا ہے، کوشش کر اور اس شخص کو تلاش کر، ممکن ہے مل جائے۔

حریص نے جواب دیا۔ ”جب میں اس شخص سے بالکل واقف ہی نہیں تو اس کو تلاش کہاں کروں گا؟“

وہ زار و قطار روتا ہوا آپ کی خدمت میں پہنچا اور پورا واقعہ بتا کر درخواست کی کہ ”میری مدد کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تیری کیا مدد کروں؟ تجھے تیری حرص کھا جائے گی۔“

حریص نے روتے ہوئے درخواست کی۔ ”حضرت! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور اگر میرے روپے مجھے نہ ملے تو میں ان کے غم میں مر جاؤں گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تیری تھیلی ایک درویش کے پاس ہے اور وہ درویش کشتی میں سوار راوی عبور کر رہا ہے۔“

یہ شخص اٹھ کر دریا کی طرف بھاگا۔ ایک کشتی دوسرے کنارے کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ حریص شخص نے چلانا شروع کر دیا۔ ”کشتی کو واپس لاؤ، خدا کے لیے کشتی کو واپس لاؤ۔“

یہ شخص پوری قوت سے دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔ کشتی والوں نے اس کی آواز سن لی مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ یہ شخص پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا۔ ”خدا کے لیے کشتی کو واپس لاؤ۔ رسول کے لیے کشتی کو واپس لاؤ۔“

چیتے چیتے اس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ ملاح نے مسافروں سے کہا۔ ”آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کشتی کو واپس لے جایا جائے؟“

چند مسافروں نے جواب دیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں۔ یہ شخص تو دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔“

ایک مسافر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ شخص کسی اہم ضرورت کے تحت فوراً ہی دوسرے کنارے پر پہنچنا چاہتا ہے۔“

ملاح نے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

ایک درویش نے مسکرا کر کہا۔ ”ملاح! کشتی کو واپس لے چل، میں جانتا ہوں یہ شخص کیوں چیخ رہا ہے۔“

کئی اور مسافروں نے بھی زور دیا۔ ”ہاں، کشتی واپس لے چلو کیونکہ اگر کشتی واپس نہ گئی تو یہ شخص چلا چلا کر مر جائے گا۔“

ملاح نے کشتی کو واپس لوٹایا اور ساحل پر لے آیا۔ کشتی جیسے ہی رکی، حریص شخص چلانا ہوا دوڑا۔ ”میری تھیلی، میری تھیلی۔ خدا کے لیے میری تھیلی واپس کر دو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔“

وہ چلا رہا تھا اور خون کی کلیاں بھی کیے جا رہا تھا۔ درویش تھیلی کو ہاتھ میں لے کر اس شخص کی طرف بڑھا۔ حریص نے درویش کے ہاتھ میں اپنی تھیلی جو دیکھی تو خوشی سے برا حال ہو گیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہر چیز ناچتی گھومتی نظر آئی۔ وہ چکرا کر بے ہوش ہو گیا۔

درویش نے ملاح سے کہا۔ ”اب تو اپنی کشتی واپس لے جا کیونکہ اس نے میری خاطر کشتی کو واپس بلایا تھا۔“

ملاح اور مسافروں کی سمجھ میں بات نہیں آئی لیکن کشتی واپس چلی گئی۔ درویش، حریص شخص کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد حریص کو ہوش آ گیا لیکن ذرا سی دیر کے لیے۔ اس پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اس نے یہ مشکل تمام کہا۔ ”میری تھیلی۔“

اور اس کا دم نکل گیا۔ اسی وقت محمد میر کی مجلس کے تین آدمی اور وہاں پہنچ گئے۔ ان تین لالچیوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی طرح وہ درویش کو کشتی سے اتارالیں گے اور دم کی دے کر تھیلی چھین لیں گے لیکن یہاں کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ درویش تھیلی لیے مرحوم حریص کے قریب بیٹھا تھا۔ یہ تینوں درویش کے سر پر پہنچ گئے اور ایک نے ڈانٹ کر درویش سے کہا۔ ”کیا تو نے اس تھیلی کی خاطر ہمارے اس عزیز کو ہلاک کر دیا؟ بخدا تو نے یہ بہت برا کیا۔ ہم تجھے معاف نہیں کریں گے اور قاضی شہر کے پاس لے جائیں گے۔“

درویش نے تھیلی ان تینوں کے حوالے کر دی، کہا۔ ”میں نے یہ تھیلی اس سے نہیں چھینی تھی اور نہ ہی میں نے اسے ہلاک کیا۔ میں تو یہ تھیلی اس کے حوالے کر دینا چاہتا تھا لیکن یہ اس سے پہلے ہی مر گیا۔ اب اگر تم تینوں واقعی اس مرحوم کے عزیز ہو تو میں یہ تھیلی تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اسے سنبھالو اور میرا پیچھا چھوڑو۔ قاضی کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

تینوں نے تھیلی اپنے قبضے میں کی اور درویش سے کہا۔ ”خبردار! جو تو نے یہ باتیں کسی اور کو بتائیں۔ اگر تو نے کہیں زبان کھولی تو ہم تینوں تیرے خلاف یہ گواہی دیں گے کہ تو نے اس شخص کو ہلاک کیا تھا۔“

درویش وہاں سے چلا گیا اور سیدھا آپ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے درویش کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”کیا وہ تھیلی ان تینوں کے حوالے کر آیا؟“

درویش نے جواب دیا۔ ”جی بابا! میں نے جو کچھ بھی کیا آپ کے حکم اور ایمان پر کیا۔“

آپ نے حاضرین سے فرمایا۔ ”لوگو! ایک حریص اور بخیل تو اپنے انجام کو پہنچ گیا، اب تمہیں کی باری ہے کیونکہ یہ حریص اور بخیل کا روپ یہ ان تینوں کو بھی راس نہیں آئے گا۔“

وہ تینوں تھیلی لے کر ویرانے میں پہنچے اور روپوں کی تقسیم میں جھگڑنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”یہ تجویز میری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ تم دونوں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ اگر میں تمہاری کام کرتا تو اس وقت تھیلی کے سارے روپے میرے ہوتے لیکن

چلو، میں لالچ نہیں کرتا پھر بھی آدھے روپے میرے ہیں اور آدھے کے تم دونوں حق دار ہو۔“

دوسرے نے چمک کر جواب دیا۔ ”واہ جناب! یہ خوب کہی، تو نے بس یہ کہا تھا کہ آدھے ہم تینوں لالچی سے پہلے ہی درویش سے مل لیں اور کسی بھی طرح یہ تھیلی لے لیں لیکن وہ حریص تو ہم تینوں سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس لیے تیری تدبیر بے کار ہو چکی تھی۔“

تیسرے نے ان دونوں کا مذاق اڑایا، بولا۔ ”واہ جناب! مجھے تو تم دونوں نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا حالانکہ اگر ایمان لگتی کہو گے تو اس منصوبے میں بنیادی آدی میں ہی ٹھہروں گا۔ کیا میں نے درویش کو یہ دھمکی نہیں دی تھی کہ اگر اس نے تھیلی ہمارے حوالے نہ کی تو میں اس کو کل کے جرم میں قاضی کے حوالے کر دوں گا۔ بس میری یہ دھمکی کام کر گئی اور درویش نے مارے ڈر کے یہ تھیلی ہمارے حوالے کر دی۔“

تینوں روپوں کو بھصہ مساوی نہیں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ ہر کوئی کم از کم آدھے کی فکر میں تھا۔ آخر ایک نے بقیہ دونوں کو دھوکے سے ہلاک کر دیا اور پوری تھیلی اپنے قبضے میں کر لی۔ اسی وقت قاضی شہر کے آدی بخیل کے قتل کے سلسلے میں قاتلوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دولاٹے اور پڑے دیکھے تو اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ اس کی تھیلی بجن بادشاہ ضبط کر لی گئی۔ اس شخص پر قتل کا مقدمہ چلا اور فیصلے میں ہزائے موت دے دی گئی۔

جب اس واقعے کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو فرمایا۔ ”بخیل اور طمع انسان کو کہیں کا بھی نہیں رکھتی۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ تھیلی کے روپے کسی کے بھی کام نہ آئے۔“

☆☆☆

اب آپ کا لقب میاں میر بالا پیر ہو چکا تھا۔ شاہجہاں آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ اس نے آپ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایک بار تو شہزادہ داراشکوہ کو لے کر حاضر ہوا۔ شہزادہ بہت بیمار تھا اور اطباء اس کے علاج سے عاجز آچکے تھے۔ بادشاہ نے آپ سے درخواست کی۔ ”حضرت! آپ کا یہ بیس سالہ غلام حاضر ہے۔ اطباء نے جواب دے دیا ہے۔ اب آپ جو چاہیں کریں، اچھا کریں یا مار دیں۔“

میاں میر نے ایک کوزہ پانی منگوایا اور ذرا سانی کر شہزادے کو دے دیا کہ۔ ”پی لے، اللہ شفا دے گا۔“ شہزادے نے پانی پی لیا اور ایک ہفتے بعد صحت مند ہو کر دوبارہ حاضر ہوا اور آپ کا شکریہ ادا کر کے دست بستہ بیٹھ گیا۔ اس وقت آپ اپنے ایک مرید ملائگی روستاقی کی طرف بہت توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ یہ شخص نہ صرف یہ کہ بڑا عالم فاضل تھا بلکہ آپ کا اتنا بڑا شیدائی تھا کہ آپ کی خاطر ایک عرصے سے بیوی کو چھوڑے، آپ کے پاس پڑا ہوا تھا۔ دن رات آپ کی خدمت میں لگا رہتا۔ اس وقت جو آپ نے ملائگی پر خاص توجہ دی تو ایک مرید نے ملائگی کے کان میں کہا۔ ”آج تو کچھ نہ کچھ بن جائے گا کیونکہ میاں تجھ پر بے حد مہربان نظر آ رہے ہیں۔“

ملائگی نے کہا۔ ”چپ رہ اے نادان انسان۔ میاں جی کو سرگوشی میں بات کرنا پسند نہیں ہے، وہ ناراض ہوں گے۔“ آپ نے ملائگی کو آواز دی۔ ”ملائگی! ذرا میرے پاس تو آ۔ تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔“ ملائگی خوف زدہ اٹھے اور آپ کے پاس جا بیٹھے، آپ نے پوچھا۔ ”ملائگی! تیرے وطن کا کیا نام ہے؟“ ملائگی نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ میرے وطن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ روستاق، فارس لیکن پھر بھی معلوم نہیں کس مصلحت سے دریافت فرما رہے ہیں۔“

آپ نے پھر پوچھا۔ ”تو روستاق کتنی مدت سے نہیں گیا؟“ ملائگی نے جواب دیا۔ ”تقریباً بائیس سال سے۔“ آپ نے پھر پوچھا۔ ”کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟“ جواب دیا۔ ”جی حضرت! میری شادی ہو چکی ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو نے بائیس سال سے اپنی بیوی کی خبر ہی نہیں لی لیکن اب تو وطن جا اور بیوی سے مل آ۔“ ملائگی نے کہا۔ ”حضرت! میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“ آپ نے سختی سے فرمایا۔ ”یہ میرا حکم ہے۔ تو فوراً وطن واپس جا اور کم از کم ایک بار اپنی بیوی سے ضرور مل آ۔“ ملائگی اب انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اسی دن سفر کی تیاری کی اور ایک قافلے کے ساتھ ایران روانہ ہو گیا۔ شب

درواز منزل میں طے کرتا ہوا روستاق میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے وطن کی سرزمین بائیس سال بعد دیکھی تھی۔ اس نے بڑی خوشی محسوس کی، جیسے جیسے وہ اپنے گھر کی طرف قدم اٹھاتا جا رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔

جب وہ اپنے گھر کے سامنے پہنچا تو وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ مغرب کا وقت گزر چکا تھا، رات بڑھتی چلی آرہی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ شامیانوں کے نیچے شمعیں روشن تھیں، پاس ہی میدان میں پتھر کے چولہوں پر دیمکیں جڑھی ہوئی تھیں۔ مزید ارکھانوں کی خوشبو دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

ملائگی نے ایک شخص کو روک کر دریافت کیا۔ ”جناب! کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، شاید تم روستاق میں نئے نئے آئے ہو کیونکہ اگر تم اس بستی کے باشندے ہو تو اس تقریب سے ضرور واقف ہوتے۔“

ملائگی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں باہر سے چلا آ رہا ہوں اور یہ سامنے جو گھر ہے، جہاں اس وقت مہمانوں کا ہجوم نظر آ رہا ہے، میں اس گھر کے لیے ایک پیغام لایا ہوں۔“

اس شخص نے ملائگی کو غور سے دیکھا، پوچھا۔ ”تو اس گھر کے لیے کون سا پیغام لایا ہے کیونکہ پانچ ماہ پہلے بھی اس گھر میں ایک شخص پیغام لے کر آیا تھا۔ بتا تو کیا پیغام لایا ہے؟“

ملائگی نے کہا۔ ”شاید ملائگی کا یہی گھر ہے؟“ اس شخص نے طنزیہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”ملائگی کا نہیں بھائی، مرحوم ملائگی کا گھر کہہ۔“

ملائگی نے حیرت سے پوچھا۔ ”مرحوم ملائگی کا کیا مطلب ہوا؟“ ”مرحوم ملائگی کا وہی مطلب ہے جو ہو سکتا ہے۔“

ملائگی نے کہا۔ ”لیکن ملائگی تو ابھی زندہ ہے پھر تو اسے مرحوم کیوں کہہ رہا ہے؟“ اس شخص نے حقارت سے کہا۔ ”بھائی! پانچ ماہ پہلے، تیرے ہی جیسا ایک شخص یہ خبر لے کر آیا تھا کہ ہندوستان میں ملائگی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی اس غم میں بلک بلک کر روئی اور جب روتے روتے عدت کے دن گزارنے لگی تو لوگوں نے اس کو شادی کے پیغام دینے شروع کر دیے چنانچہ ان میں کا ایک رشتہ بیوہ ملائگی کو پسند آ گیا اور وہ آج کی شب اس سے نکاح کر رہی ہے۔“

ملائگی نے گھبرا کر کہا۔ ”لیکن حضرت! میں تو زندہ ملائگی سے یہ پیغام لایا ہوں کہ بیوی سے جا کر کہہ دو کہ میں عنقریب واپس آ رہا ہوں۔“ اس شخص نے بے یقینی سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تیری بات کا میں کیا جواب دوں۔ بہر حال اگر تو ملائگی کی حیات پر یقین رکھتا ہے تو اس کی بیوی سے ابھی جا کر مل لو ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“

ملائگی نے کہا۔ ”میں تو اس سے اسی وقت ملوں گا کیونکہ یہ شادی نہیں ہونی چاہیے۔ اس عورت نے عدت کے دن خواہ مخواہ گزارے جبکہ اس کا شوہر زندہ ہے۔“ ملائگی اسی وقت اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ملائگی اپنی بیوی سے ملنا چاہتے تھے مگر لوگ انہیں روک رہے تھے۔ یوں جوان لوگ تھے جو ملائگی کو نہیں پہچانتے تھے۔ ملائگی نے نوجوانوں سے کہا۔ ”تم اپنے بزرگوں کو بلاؤ، وہ مجھے پہچان لیں گے۔“

ایک نوجوان کسی بوڑھے کو بلا لایا، بوڑھا ملائگی کو دیکھتے ہی چٹ گیا۔ ”ملائگی! ارے تو زندہ ہے؟“ ملائگی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں زندہ ہوں اور یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بوڑھے نے کہا۔ ”تقریباً پانچ ماہ قبل کسی نے یہ اطلاع دی تھی کہ تیرا انتقال ہو گیا ہے۔ تیری بیوی نے عدت کے دن گزارے اور اب عقد ثانی ہونے ہی والا تھا کہ تو آ گیا۔“

ملائگی نے کہا۔ ”ذرا میری بیوی کو تو خبر کرو، میں بھی تو اسے دلہن بنا ہوا دیکھوں۔“ بوڑھے نے ملائگی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کی بیوی کے سامنے جا کھڑا کیا۔ بیوی نے ملائگی کو حیرت سے دیکھا اور تھوڑی دیر تک اسے یقین ہی نہیں آیا کہ ملائگی اس کے سامنے موجود ہے۔

ملائگی نے آواز دی۔ ”بیوی! تم نے مجھے پہچانا؟“ بیوی کی حیرت دور ہوئی اور جب اسے اپنے شوہر کی موجودگی کا یقین ہو گیا تو، کانٹو لہو نہیں بدن میں کے مصداق جہاں بیٹھی تھی، بیٹھی رہ گئی۔ مارے شرم کے اپنی جگہ سے مل بھی نہ سکی۔



دشمنِ جاں

سریم کے حنان

دنیا میں تغیر کی وجوہات میں دو طرح کے جذبات نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہیں محبت نے اور کہیں نفرت نے... خواہ وہ کسی بھی دنیا کے باسی ہوں... کسی بھی فرقے سے تعلق ہو اگر ان دو میں سے کوئی بھی رشتہ استوار ہو جائے تو سمجھو کہ کسی نہ کسی داستان نے جنم لے لیا ہے... ایسی ہی ایک کہانی اپنے کرداروں کے ساتھ اپنے انجام کی جانب رواں حیران کن مراحل طے کر رہی تھی کہ اچانک ایک موڑ ایسا آیا کہ چلتی سانسیں تھم تھم گئیں... اگر... کہانی میں جان ہو تو کردار خود بخود زندگی کی جانب دوڑنے لگتے ہیں... ایک ایسا ہی منظر یہاں بھی دکھائی دے رہا تھا۔

دل میں گھر کرنے والے جانی دشمنوں کی الجھنوں

کا ماجرا

میں کام سے تھکا ہوا گھر آیا تھا اور ابھی شاور لینے کا سوچ رہا تھا کہ کال بیل بجی میں جھنجھلا گیا، اس وقت میں کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا پہلے میں نے سوچا کہ دروازے تک جانے کی زحمت ہی نہ کروں جو بھی ہوتا بیل بجا کر واپس چلا جاتا لیکن پھر مجھے یہ اخلاق سے گری ہوئی بات لگی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ڈیوری بوائے ہو۔ بادل نا خواستہ میں دروازے تک آیا اور کیٹ آئی سے باہر جھانکا۔ سامنے ایک بہت خوب صورت چہرہ تھا۔ بہت صاف

ملا سکی نے مزید پوچھا۔ ”بیوی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“
بیوی نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ”مجھے آپ کی بابت یہی بتایا گیا تھا کہ انتقال ہو گیا، مجھے لوگوں نے عقد ثانی پر مجبور کیا چنانچہ اگر آپ کے آنے میں تھوڑی سی دیر اور ہو جاتی تو میرا نکاح ایک دوسرے شخص سے پڑھایا جا چکا ہوتا۔“
اس کے بعد وہ اپنے شوہر کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔
ہر طرف یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ملا سکی زندہ ہے اور اپنی بیوی کے پاس موجود ہے۔ اس خبر سے ملا سکی کے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہونے والے دلہا اور اس کے رشتے داروں میں شرمندگی اور افسوس کیا جانے لگا۔
ملا سکی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”بیوی! میں اب بھی نہ آتا لیکن میرے مرشد حضرت میاں میر نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ایک بار وطن تو ضرور ہواؤں چنانچہ میں آ گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے مرشد اس لیے وطن بھیج رہے ہیں۔“
ملا سکی نے اپنی بیوی اور کنبے کے ساتھ کچھ عرصہ فنی خوشی گزار دیا۔ اس کے بعد بیوی کے خرچ کا انتظام کر کے دوبارہ بیرومرشد کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔
ملا سکی جیسے ہی میاں میر کے سامنے پہنچے، آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ”کیوں ملا سکی! اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کیسی قیامت اٹھ کھڑی ہوتی؟“
ملا سکی نے میاں میر کے سامنے محبت اور عقیدت سے سر جھکا دیا، کہا۔ ”حضرت! جب تک آپ ہم میں موجود ہیں، مجھے اس بات کا ذرا بھی خوف نہیں کہ میں شرمندگی کا شکار ہوں گا۔“

☆☆☆

اب آپ کی عمر اٹھاسی سال ہو چکی تھی۔ آپ کے مرید اور خلیفہ ملا شاہ بدخشی آپ کے ساتھ قبرستان تشریف لے گئے۔ آپ ایک قبر کے پاس فاتحہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ ملا شاہ بدخشی نے عرض کیا۔ ”حضرت! صاحبِ قبر کچھ عرض کر رہا ہے۔“
آپ نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا ہے؟“
ملا بدخشی نے عرض کیا۔ ”وہ کہہ رہا ہے میں جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہوا اور اب اپنی بد اعمالیوں کے باعث عذابِ قبر میں مبتلا ہوں اور افسوس تو اس بات پر ہے کہ آپ جیسے بزرگ میری قبر پر فاتحہ پڑھیں اور مجھے اس کا اتنا ثواب بھی نہ پہنچے جس سے عذابِ قبر میں تخفیف ہو۔“
میاں میر نے فرمایا۔ ”ملا! ذرا صاحبِ قبر سے یہ تو معلوم کر کہ اس کا عذاب کس طرح رفع ہو سکتا ہے؟“
ملا بدخشی نے مراقبے میں جا کر فرمایا۔ ”حضرت! صاحبِ قبر کہتا ہے کہ اگر ستر ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھ کر اس کا ثواب پہنچایا جائے تو میرے عذاب میں کمی ہو سکتی ہے۔“
آپ نے اسی وقت کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا اور ستر ہزار بار پڑھ کر صاحبِ قبر کو اس کا ثواب پہنچایا۔ آپ نے ملا بدخشی سے کہا۔ ”ذرا معلوم تو کرو کہ صاحبِ قبر کا اب کیا حال ہے؟“
ملا بدخشی نے مراقبے میں کچھ دیکھا، عرض کر دیا۔ ”حضرت! صاحبِ قبر کہہ رہا ہے کہ کلمہ طیبہ اور آپ بزرگوں کے دم قدم کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے عذابِ قبر سے نجات دے دی ہے۔“
اب 88 سال کی عمر میں حضرت میاں میر کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا آخری وقت آچکا ہے۔ آپ ساٹھ سال سے زیادہ لاہور میں رہے۔ ان دنوں لاہور کا حاکم نواب وزیر خان تھا۔ 7 ربیع الاول 1045ھ بروز سہ شنبہ آپ کا وصال ہو گیا۔ لاہور کے ہاشم پور میں آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے اور اب یہ جگہ میاں میر کہلاتی ہے۔
شہزادہ دارالشکوہ نے آپ کے مزار کو بنوانا چاہا تھا، مسالے کا انتظام بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اورنگ زیب کے مقابلے میں مارا گیا اور بعد میں یہ مزار اورنگ زیب کے ذریعے عمل ہوا۔

خزینۃ الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ مسکنۃ الاولیاء، شہزادہ دارالشکوہ۔
سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارالشکوہ شاہجہاں نامہ (عمل صالح)، محمد صالح کمبوہ۔
تزل جہانگیری، شہنشاہ جہانگیری۔ انوار اصفیا

ماخذات

شفاف گلابی چہرہ جس پر نازک سے نقوش تھے اور سنہری زلفوں نے اس حسن چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا مگر چہرہ میرے لیے انجانا تھا۔ میں نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے ذہن میں سوال آیا کہ وہ کون تھی؟ اس کا ممکنہ جواب یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی پڑوسن ہو اور اسے مجھ سے کوئی کام پڑ گیا ہو لیکن مجھے اس میں شک تھا، میرے آس پاس اتنا حسین چہرہ تھا اور میں اس سے بے خبر تھا۔ میں نے خبرہرہ سکتا تھا پر اس عمارت کا منبر وائسن ہرگز بے خبر نہیں رہ سکتا تھا اور اگر اسے پتا ہوتا تو وہ لازمی مجھے بتاتا۔ وائسن اور میری دوستی تھی۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ اس نے دوبارہ دستک دی۔ میں نے دروازہ کھول دیا اور مسکرا کر بولا۔

”نہیں...؟“

”جو ناخن...؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”نہیں...“

جواب میں وہ میرے برابر سے ہوتی اندر آگئی۔ وہ جتنی خوش رو تھی اتنی ہی خوش بدن بھی تھی اسکرٹ بلاؤز اس پر سج رہا تھا حالانکہ اس نے شاید آفس ڈریس پہنا ہوا تھا۔ اس کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور شانے پر بڑے سائز کا ہینڈ بیگ تھا۔ ابھی میں اس کی بے تکلفی پر حیران تھا کہ اس نے کہا۔ ”دروازہ بند کرو جلدی۔“

مجھے کسی خطرے کا احساس نہیں تھا لیکن میں نے اس کے کہنے پر دروازہ بند کر دیا۔ وہ لاؤنج میں تھی اور بہت مضطرب لگ رہی تھی مجھے پوچھنا پڑا۔ ”کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“

”نہیں۔“ اس نے انکار کیا۔ ”معاف کرنا میں تعارف کرانا بھول گئی میں آئرس ہوں۔“

”اوکے آئرس...؟“

وہ کچھ دیر مضطرب انداز میں ٹپکتی رہی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ میں تو اس کی دلکشی اور جسمانی بیچ و خم میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اچانک رکی تو میں چونکا اس نے میری طرف دیکھا وہ فیصلہ کن انداز میں بولی ”جو ناخن تیار کر لو ہمیں یہاں سے فوراً روانہ ہونا ہے اس سے پہلے کہ دشمن یہاں آجائیں۔“

میں چونکا۔ ”دشمن... کیسے دشمن؟“

”ہمارے دشمن...“ اس نے کہا۔ ”وقت نہیں ہے، مجھے کہا گیا ہے کہ تمہیں یہاں سے نکال کر ساتھ لے جاؤں فوراً چلو۔“

مجھے اس کے ساتھ کہیں جانے پر بھی اعتراض نہیں

تھا لیکن یہ دشمن والی بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مگر اس نے مجھے سوال کا موقع نہیں دیا وہ لپک کر میرے پاس آئی۔ ”پلیز جلدی کرو جو لینا ہے لے لو ہم پانچ منٹ میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔“

میں اتنی آسانی سے تیار نہ ہوتا اس کے ہوشربا دھچکے سے اٹھتی کیف آمیز خوشبو میرے حواس پر قابض ہو رہی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس کی بات شرافت سے مان لیتا لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی اعتراض کرتا میرے موبائل نے بیل دی۔ میں نے موبائل نکالا وائسن کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”جونی ابھی کچھ خطرناک لوگ تمہارا پوچھتے ہوئے آ رہے ہیں ممکن ہے وہ کسی ایجنسی سے تعلق رکھتے ہوں لیکن ممکن ہے جرائم پیشہ ہوں، میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں اور اب پولیس کو کال کرنے جا رہا ہوں۔“ وائسن نے بات مکمل کرتے ہی کال کاٹ دی اور میں کسی رپورٹ کی طرح حرکت میں آیا۔ میں نے اپنی تمام ضروری چیزیں اور دستاویزات ایک بریف کیس میں ڈالیں اور میرے کپڑوں کا بیگ تو تیار رہتا تھا وہ اٹھایا اور تین منٹ بعد ہم اپارٹمنٹ سے باہر تھے۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور ہم لفٹ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں، میں نے اسے وائسن کے بارے میں بتایا وہ لفٹ کے پاس رکی اور کہا۔ ”لفٹ سے جانے میں خطرہ ہے، ہم پھنس سکتے ہیں۔“

”پھر کیسے جائیں؟“

اس نے سیزمیں کا رخ کیا تو چودہ منزل اترنے کے خیال سے میں پریشان ہو گیا مگر اس نے نیچے کے بجائے اوپر کا رخ کیا۔ بائیسویں فلور پر میں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم اوپر کیوں جا رہے ہیں؟“

”وہیں سے نکلیں گے۔“ اس نے مشینی انداز میں سیزمیاں چڑھتے ہوئے کہا۔ آٹھ فلور اوپر آنے کے بعد بھی اس کا سانس ہموار تھا لیکن سیزمیاں چڑھتے ہوئے اس کے وجود میں ایک طرح کا دلکش تلاطم برپا تھا اس کے برعکس ہوا برا حال ہو گیا تھا اور سانس لینے کی وجہ سے مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا یہ عمارت تیس منزلہ تھی اور ہمیں دس منزلیں اور چڑھنا تھیں میں نے اس سے التجا کی۔

”پلیز کیا ہم کچھ دیر کے لیے رک نہیں سکتے؟“

اس نے پہلی بار مڑ کر دیکھا اور ہنسی۔ ”لگتا ہے ہمارے زندگی نے ہمیں کمزور کر دیا ہے۔ ویسے تم کب سے یہاں ہو؟“

”سات برس سے۔“ میں نے جواب دیا میں اس

عمارت میں سات برس پہلے آیا تھا۔ ”آئرس میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا ہوں کہ مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”ہمارے دشمنوں سے۔“ اس نے کہا اور اچانک اس کے بیگ سے ایک عجیب سی آواز آئی اس نے پھرتی سے بیگ کھولا اور اس میں سے ایک عجیب سا آلہ نکالا یہ موبائل، نی وی ریموٹ اور ویڈیو گیمز جو اپنے اسٹک کا مجموعہ لگ رہا تھا۔ آئرس نے اس کی اسکرین پر دیکھا اور چند ثن دہائے۔ وہ فکر مند ہو گئی، اس نے میری طرف دیکھا۔ ”وہ آگے ہیں اور تمہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔“ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون تھے؟ لیکن وہ اس سے پہلے دوبارہ حرکت میں آگئی اور مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ آخری فلور اور پھر چھت تک آتے آتے میں اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس سے کوئی سوال کر سکوں۔ اس بلندی پر ہوا بہت صاف اور خشک تھی اور میں دسے کے مریض کی طرح منہ کھولے اس ہوا کو اپنے اندر سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا عمارت کے چاروں طرف نیویارک کا خوب صورت شہر پھیلا ہوا تھا۔ یہ مین ٹن کا علاقہ تھا آئرس اوپر آنے کے بعد اسی آلے کے ساتھ مصروف عمل تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے۔ یہاں سے صرف نیلی کا پٹر کی مدد سے نکلا جا سکتا تھا اور دور دور تک کسی نیلی کا پٹر کا کوئی نشان نہیں تھا اچانک ہلکی سی زوں کی آواز آئی اور ایک سیاہ ہیولائیڈ ہوا وہ ہوا میں معلق تھا اور زوں کی آواز اسی سے آ رہی تھی۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔

”یہ کیا بلا ہے؟“

”کار کی ہے اور کیا ہے۔“ وہ بولی۔

”میں نہیں جانتا...“

”کم آن۔“ اس نے میرا بازو پکڑا۔ ”نیا ماڈل ہے اس لیے تم پریشان ہو رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ، اس سے پہلے کہ دشمن اوپر تک آجائیں۔“

وہ مجھے کھینچ کر اس ہیولے کے پاس لائی تو اس کے اطراف خلا نمودار ہوئے۔ یہ اندر سے کسی کار کی طرح ہی تھا تب ہی شاید اسے کار کی کانام دیا گیا تھا مجھے یہ سائینس فکشن فلموں میں دکھائی جانے والی چیز لگ رہی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ اس سے نہ تو روشنیاں نکل رہی تھیں اور نہ ہی آوازیں صرف زوں کی ہلکی سی آواز تھی اور وہ بھی بالکل پاس آنے پر ہی جا سکتی تھی۔ ہمارے اندر بیٹھے ہی اس کے خانے بند ہو گئے اندر سے یہ پوری طرح روشن تھی اور سامنے اسکرین پر باہر کے مناظر صاف نظر آ رہے تھے۔ آئرس نے مجھے سیٹ

بیلٹ باندھنے کو کہا اور جب مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ سیٹ بیلٹ کیسے باندھتے ہیں تو اس نے جھک کر میری سیٹ کے ساتھ لگا ایک ٹین دبایا۔ فوراً ہی ایک اسٹریپ نکل کر میرے جسم کے گرد لپٹ گئی اس دوران میں، میں ایک بار پھر اس کے بدن کی مسحور کن خوشبو سے محفوظ ہوا تھا۔ روانگی سے پہلے اس نے ایک بار پھر اسی آلے پر دشمن کا جائزہ لیا۔

”وہ اب اوپر آ رہے ہیں۔“

اب مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے بازو پر چٹکی لی۔ تکلیف ہوئی لیکن میں بیدار نہیں ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جاگ رہا تھا اور یہ سب حقیقت میں ہو رہا تھا۔ یعنی آئرس ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے ایک ٹین دبایا اور نیلی کا پٹر کی اسٹک جیسی ایک چیز سنبھال لی گاڑی اوپر اٹھی اور پھر کھوں میں اتنی بلندی پر آگئی کہ یہاں سے سارا نیویارک نظر آنے لگا آئرس نے اسٹک گھمائی اور گاڑی بہت تیزی سے نیچے آئی اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ میرا دم خشک ہو گیا اور مجھے لگا کہ ابھی یہ کسی عمارت سے ٹکرائے گی اور اس کے ساتھ ہمارے پرزے بھی بکھر جائیں گے۔ مگر وہ بہت تیزی سے ایک ویران گلی میں داخل ہوئی اور نیچے اتر گئی فوراً ہی اس کا اگلا حصہ کسی کار جیسا ہو گیا اور وہ کسی کار کی طرح چلتے ہوئے گلی سے نکل کر سڑک پر آگئی۔ میں نے حیرت سے آئرس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

”اب ہم دشمن کی نظروں سے محفوظ ہو کر سفر کر سکیں گے۔“

”فضائیں نظروں میں آنے کا امکان تھا؟“

”بالکل... لیکن یہاں لاکھوں گاڑیوں کے درمیان ایک گاڑی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔“

”دوسرے اسے دیکھ کر چوٹیں گے نہیں؟“

”نہیں باہر سے یہ بالکل کسی گاڑی جیسی ہو گئی ہے۔“ وہ بولی۔ اگرچہ اندر سے یہ ویسی کی ویسی تھی اور ابھی بھی آئرس اسٹک کی مدد سے اسے چلا رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”مس آئرس میں ابھی تک سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا چکر ہے؟“

”تم جلد سمجھ جاؤ گے۔“ وہ بولی۔ ”دراصل تمہارا راز

فاش ہو گیا ہے اور کروڑ والے تمہاری تاک میں تھے اس سے پہلے کہ وہ تم تک آتے میں تمہیں وہاں سے نکال لائی۔“

”یہ کروڑ والے کون ہیں؟“

”ہمارے دشمن۔“

”ہم کون ہیں۔“

”لیرائے والے۔“ اس نے اس بار خشک لہجے میں کہا۔ ”اب مذاق بند کرو اور سنجیدہ ہو جاؤ۔“

”میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”ویسے یہ لیرائے کہاں ہے؟“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ”تم اپنے آبائی سیارے کے بارے میں نہیں جانتے؟“

اس بار میں دنگ رہ گیا۔ ”آبائی سیارہ... کیا مطلب؟“

جواب میں اس نے کچھ کیا اور اسکرین پر اچانک منظر بدل گیا اور پہلے ملکی وے کہکشاں یا اس جیسی کوئی چیز نظر آئی پھر وہ تیزی سے بڑی ہوتی گئی اور اس کا ایک بازو نمایاں ہونے لگا پھر اس بازو میں ستاروں کے جھرمٹ دکھائی دینے لگے آخر کار ایک درمیانے درجے کا زرد ستارہ دکھائی دیا اور پھر اس کا نظام شمسی واضح ہوا یہ بالکل ایسا منظر تھا جو آپ آئے دن ڈسکوری اور اسی قسم کے دوسرے چیلنجر پر دیکھتے رہتے ہیں۔ آئرس نے ستارے کے گرد گردش کرنے والے ایک سیارے کی طرف اشارہ کیا ”یہ لیرائے تھا۔“ پھر اس نے اس سیارے سے ذرا دور گردش کرنے والے ایک اور سیارے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کروئل تھا۔“

میں دم بہ خود رہ گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ہم یہاں سے آئے ہیں اس سیارے پر جسے زمین کہتے ہیں؟“

”ہاں...“

مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ ”اے سنو، یہ بکواس ہے تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”تمہیں بتایا تو ہے تمہارا راز افاش ہو گیا ہے۔“

”کیسا راز؟“

”یہی کہ تم ایک لیرائے ہو۔“ وہ زچ ہونے لگی۔

”تمہارا مطلب ہے کہ اس سیارے جسے زمین کہتے ہیں اور جو سورج نامی ستارے کے گرد گھومتی ہے اور جو ملکی وے نامی کہکشاں میں ہے میں اس کا باشندہ نہیں ہوں؟“

”بالکل تم ایک لیرائے ہو۔“

”یعنی میں انسان نہیں ہوں؟“

”ان معنوں میں نہیں کہ تم ایک لیرائے ہو، ویسے ہم انسانوں جیسے ہی ہیں۔“

مجھے ایک بار پھر لگا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”یہ بکواس ہے۔“

”یہ حقیقت ہے۔“ وہ شیریں لہجے میں بولی۔

”یہ ناممکن ہے۔“

”یہ بالکل ممکن ہے، کیا کارکی کو دیکھ کر بھی تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ کوئی بہت جدید ہوائی جہاز ہے۔“

”غلط، یہ کارکی ہے۔“

”میں انسان ہوں۔“

”تم لیرائے ہو۔“ آئرس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”شاید تم ہمارے لیے کام کرنا نہیں چاہتے ہو لیکن میں تمہیں بتا دوں اگر تم نے ہمارے لیے کام نہیں کیا تو ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکیں گے اور تم کروئل کے ہتھے چڑھ جاؤ گے اور وہ تمہیں مار دیں گے۔“

میری بے یقینی خواب کے مرحلے سے نکل کر پاگل پن کی حد میں داخل ہونے لگی تھی۔ میں نے سر ہٹام لیا۔ ”میں یقیناً پاگل ہو گیا ہوں۔“

”میرا خیال ہے تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔“

آئرس بولی۔ ”تم جو نامن ایڈورڈ ہونا؟“

”ہاں۔“

”اپنی باتیں ہاتھ کی آستین الٹو، کہنی تک۔“

میں نے حیل کی اس نے کہنی کے جوڑ پر اپنی رکھی۔ ”یہ دیکھو... یہاں تمہیں نشان نظر آ رہے ہیں؟“

کہنی کے جوڑ پر اندر والی طرف تین عجیب سے نشانات تھے۔ ”ہاں، لیکن یہ شروع سے ہیں۔“

آئرس کچھ کہنے والی تھی کہ گاڑی کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ جیسے کوئی چیز پیچھے سے ٹکرائی ہو اور وہ سڑک پر گھومتے اور دوسری گاڑیوں سے ٹکرانے لگی آئرس چلائی۔ ”ہوشیار رہو، دشمن نے حملہ کیا ہے۔“

سیٹ بیلٹ کی وجہ سے ہم محفوظ رہے تھے گاڑی کئی گاڑیوں سے ٹکرانے کے بعد بالآخر رک گئی آئرس نے بٹن دبایا گاڑی کے خانے کھل گئے وہ باہر نکلنے لگی میں نے فریاد کی۔ ”مجھے تو کھولو۔“

وہ بٹن دبانے کے لیے میرے پاس آئی اودان حالات میں بھی میں اس کی دلکشی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا شاید اس نے بھی بھانپ لیا تھا کہ میں اس کے قریب سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بولی۔ ”اب نیچے اتر آؤ... میں نے گاڑی کی تباہی کا بٹن دبا دیا ہے اور ایک منٹ بعد یہ ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔“

میں جلدی سے نیچے اتر آیا سڑک پر افراتفری مچی جن گاڑیوں سے یہ گاڑی ٹکرائی تھی ان کا حشر خراب ہو گیا تھا پھر دوسری گاڑیاں بھی آپس میں ٹکرائی تھیں۔ آئرس نے میرا

ہاتھ تھاما اور تیزی سے آگے بڑھ گئی دشمن یقیناً آس پاس موجود تھا ہم ایک پتلی سی گلی میں داخل ہوئے اور اسے کراس کر کے دوسری طرف آئے۔ وہاں آئرس نے ایک جیسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور ہم اس میں بیٹھ گئے دس منٹ بعد ایک چھوٹے سے کینے میں ہم سب سے کونے والی میز پر بیٹھے تھے آئرس نے مجھے دیکھا۔ ”اب تمہیں یقین آ گیا۔“

”کسی حد تک۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں اس پر یقین نہیں کر سکتا کہ میں انسان نہیں ہوں۔“

”ہم انسان ہی ہیں، مطلب جینیاتی لحاظ سے ہم انسانوں جیسے ہی ہیں فرق صرف سیارے کا ہے جیسے امریکا اور افریقا میں بسنے والے سب انسان ہی ہیں فرق صرف ملکوں کا اور براعظموں کا ہے۔“

یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ہم اصل میں انسان ہی تھے۔ ”اوکے، میں نے مان لیا کہ ہمارا تعلق لیرائے سے ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”اپنی بقا کی جدوجہد۔“ اس نے جواب دیا اسی اثنا میں ایک نو عمر ویٹریس کافی اور سینڈ وچز لے آئی۔

”وہ کیسے؟“ میں نے غور کیا۔ ”لیرائے یہاں سے لاکھوں نوری سال کے فاصلے پر ہے اور ہم زمین پر ہیں آخر کیوں...؟“

”کیونکہ لیرائے اور کروئل دونوں تباہ ہو چکے ہیں ہمارا ستارہ جسے ہم اسٹین کہتے تھے سرخ دیو بن گیا اور اس نے دونوں سیاروں کو تباہ کر دیا، خوش قسمتی سے ہم سائنسی لحاظ سے اتنی ترقی کر چکے تھے کہ بروقت آنے والی تباہی کو بھانپ کر وہاں سے نکل آئے اور پھر زمین پر آ گئے۔“

”یہ کسی سائنس فکشن ناول کا پلاٹ لگ رہا ہے۔“ میں نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”اس پر بہت اچھی مووی بھی بن سکتی ہے۔“

”تم اس معاملے میں زیادہ سرنہ کھاؤ۔“ وہ سینڈ وچز کھاتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے تم اپنی حقیقت بھول گئے ہو۔“

”اس کے برعکس مجھے سب یاد ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا اور پلاڑی ہا میں میسا چوسٹس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا اور میرے ماں باپ وہیں سے تعلق رکھتے تھے وہ دنیا سے گزر گئے ہیں اور اب میں نیویارک میں رہتا ہوں اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کرتا ہوں۔“

”یہ تمہارا کور ہے۔“

”لیکن میرا ماضی...“

”وہ میسوری پلانٹ ہے اس کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے تم میسوری پلانٹ کو بچ بچھنے لگے ہو۔“

”یہ بکواس ہے۔“ پہلی بار میں نے غصے سے کہا اور کلائی کا جوڑ اس کے سامنے کیا۔ ”اس کا کیا مطلب ہے؟“

”یہ تمہارا کوڈ نمبر ہے اسے تم دو صفحہ سات نو چار سمجھ سکتے ہو۔“ اس نے کہتے ہوئے اپنی سنہری کلائی سامنے کی اس کے جوڑ پر بھی ایسے ہی نشانات تھے۔ ”یہ میرا نمبر ہے سترہ بیس ایک۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ میں کسی چکر میں پھنس گیا ہوں۔ میری کافی سینڈ وچز ایسے ہی پڑے تھے میں نے انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میرا شک کی حد تک کم ہوا تھا آئرس جس طرح سے مجھے یہاں لائی تھی وہی ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”اگر میں تمہاری بات تسلیم کر لوں تو اس کا مطلب ہے میں واپس اپنے ایبارٹمنٹ نہیں جاسکتا۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”تم نے دیکھا دشمن کتنے مستعد ہیں انہوں نے سڑک پر بھی ہمارا پیچھا کیا اور حملہ کر دیا۔“

”تم نے کہا تھا کہ گاڑی تباہ ہو جائے گی لیکن کوئی دھماکا سنائی نہیں دیا۔“

”اس میں دھماکا نہیں ہوتا ہے وہ بس ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے وہ دیکھو۔“ آئرس نے کینے کے کونے میں لگے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ہمارے بارے میں خبر آرہی تھی ایک رپورٹر لوگوں کے درمیان گھبراہوتا رہا تھا کہ ایک پراسرار گاڑی نے یہاں ایک درجن سے زیادہ گاڑیوں کو ٹکرائی ماری اور اس کے بعد اچانک ایک جھماکے سے غائب ہو گئی۔ میں نے کہا۔

”یہ تو غائب ہونے کا ذکر کر رہا ہے۔“

”ہاں یوں سمجھ لو کہ وہ روشنی میں بدل جاتی ہے۔“

”اب تم کیا کرو گی؟“

”میں تمہیں سینٹر لے جاؤں گی وہاں تمہیں کسی دوسری جگہ بھیجنے کا فیصلہ ہوگا۔“

”میں نہیں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”پلیز جونی۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا۔ ”بحث مت کرو میں تمہاری بہتری کے لیے یہ سب کر رہی ہوں۔“

اس کے لمس نے میرا غصہ اور مزاحمت ختم کر دی اور

”صرف لیرائے اور کیرول کے باسی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن جب ہم ایک جیسے ہیں تو ایک دوسرے کو شناخت کیسے کرتے ہیں؟“

”جسمانی طور پر کچھ نشانیاں مقرر کی ہیں لیکن ویسے ہمارے پاس شناختی آلات ہوتے ہیں جیسے میرے پاس یہ لیکٹر ہے۔“ اس نے وہی آلہ نکال کر دکھایا۔ ”یہ کثیر المقاصد آلہ ہے۔ اس سے ہم دشمن کی شناخت بھی کرتے ہیں اور دوست کو پہچان جاتے ہیں۔“

”دوست دشمن کی پہچان کیسے کرتے ہیں؟“

”ان کے پاس بھی آلات ہوتے ہیں دوستوں کے پاس ایسے ہی ہوتے ہیں اور دشمن کے پاس ذرا مختلف ہوتے ہیں یہ آلہ ان کو جانچ لیتا ہے۔“

”اگر یہ جانچ لیتا ہے تو دشمن کے آلات بھی اسے جانچ لیتے ہوں گے۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”بالکل ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ہماری مجبوری ہے اسے رکھنا لازمی ہے ہمارے ماہرین وقفے وقفے سے اس میں چیخ کرتے ہیں لیکن دشمن بھی اس کا توڑ کر لیتے ہیں اسی طرح جو تبدیلیاں دشمن اپنے آلات میں لاتا ہے ہم ان کا توڑ کر لیتے ہیں۔“

”یہ تو بالکل انسانوں جیسی دشمنی ہے۔“ میں ہنسا۔

”میں نے کہا تھا ہم انسانوں سے مختلف نہیں ہیں۔“

دو بجے ہم ایک گیس اسٹیشن پر رے کے وہاں ایک اچھا بڑا ریسٹوران بھی تھا کار کا ٹینک فل کرایا اور اپنا پیٹ بھی ممکنہ حد تک بھر لیا تھا۔ آگے پتا نہیں کچھ ڈھنگ کا ملتا بھی یا نہیں۔ آئرس نے وہیں شاپنگ سینٹر سے کچھ سامان لیا اور ہم دوبارہ روانہ ہو گئے۔ چار بجے ڈرائیونگ آئرس کے سپرد کر کے میں آرام کرنے لگا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور مجھے اونگھ آگئی تھی اچانک ہی زبردست دھچکے سے میری آنکھ کھلی، کار سڑک سے اتر کر کچے میں دوڑ رہی تھی اور آئرس اسٹیرنگ سے لڑ رہی تھی۔ میں نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا کار سڑک سے کیوں اتار لی؟“

”ہم گھر گئے ہیں ایک گاڑی کچھ دیر سے پیچھے تھی اور اب آگے بھی ایک گاڑی نے راستہ روکا ہوا تھا میں نے کار نیچے اتار لی سیٹ بیلٹ باندھ لو۔ میرا خیال ہے یہ کیرول ہیں۔“

جھٹکا سڑک کے ساتھ برساتی نالے سے گزرتے ہوئے لگا تھا یہاں زمین بالکل فطری حالت میں تھی اور کار یوں اچھل رہی تھی جیسے پہیوں پر چلنے کے بجائے اسپرنگز پر چل رہی ہو میں نے مڑ کر دیکھا، ہائی وے سے دور روشنیاں

ہماری طرف آرہی تھیں۔ میں نے آئرس کو خبردار کیا۔ ”پیچھے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔

اچانک روشنی کا ایک بہت بڑا گولہ ہماری کار کی طرف لپکا لیکن آئرس نے مہارت سے کار کو اس سے بچا لیا اور گولہ پاس سے گزر گیا میں نے دہشت سے کہا۔ ”یہ کیا چیز تھی؟“

”سائنڈر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر یہ کار کو لگ جاتا تو ہماری کار اور ہم روشنی میں بدل جاتے اب کار میں سفر کرنا خطرناک ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے کار کی تمام روشنیاں بجھا دیں اور مجھ سے کہا۔ ”جیسے ہی میں ایک دو تین کہوں دروازہ کھول کر باہر کود جانا۔“

”کیا؟“ میں نے چلا کر کہا۔ ”چلتی گاڑی سے کود جاؤں۔“

”ہاں، اگر مرنا نہیں چاہتے ہو تو۔“ اس نے کہا اور بولی۔ ”ایک... دو... تین۔“

میں تین کہتے ہی خود کار انداز میں حرکت میں آیا اور دروازہ کھولتے ہوئے باہر لڑھک گیا زمین پر گرا اور جھاڑیوں و گھاس پر قلابازیاں کھانے لگا جھاڑیوں اور گھاس نے مجھے بچایا اور بس معمولی سی چند خراشوں پر معاملہ ٹل گیا۔ بائیں ہاتھ کی پشت چھل گئی تھی آئرس کار آگے لے گئی اور پھر اسے واپس موڑا اور اس کا رخ آنے والی دو گاڑیوں کی طرف کر دیا اس بار رفتار پہلے سے زیادہ تیز تھی پھر میں نے دروازہ کھلتے اور آئرس کو باہر گرتے دیکھا۔ اس نے چند قلابازیاں کھائیں اور پھر ساکت ہو گئی میں بے اختیار اس کی طرف دوڑا۔ ابھی میں اس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک دھماکا ہوا میں نے مڑ کر دیکھا آنے والی ایک کار آئرس کی کار سے ٹکرائی تھی وہ خود نیچے ساکت پڑی تھی۔ میں نے بے تابی سے اسے ٹولا۔ ”آئرس تم ٹھیک ہونا۔۔۔“

”شش۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آواز مت نکالو۔“

اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن وہ ہمت کر کے کھڑی ہو گئی۔ ”اس سے پہلے کہ وہ جان جائیں کہ کار خالی تھی یہاں سے نکلو۔“

خود مجھے بھی خطرے کا احساس تھا، میں نے اسے سہارا دیا اور ہم ہر ممکن تیزی سے چل پڑے دوسری گاڑی بھی وہیں رک گئی تھی۔ میں نے آئرس سے پوچھا۔ ”تمہارا آلہ پاس ہے؟“

”ہاں۔“ وہ کراہ کر بولی۔

”اگر آں ہے تو اسے آف کر دو ورنہ وہ اس کی مدد

سے ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے۔“ آئرس نے بیگ سے آلہ نکال کر اس کا ایک ٹن دیا اور واپس رکھ لیا۔ ”اب یہ بند ہے، دشمن اس کی مدد سے ہمارا سراخ نہیں لگا سکے گا۔“

آئرس کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی جھٹکے لگنے سے جسم متاثر ہوا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بہتر ہوتی جا رہی تھی کچھ دیر میں ہم اس جگہ سے خاصا دور نکل آئے تھے اور اب جھاڑیوں اور چھوٹے درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ مسلسل دو گھنٹے چلنے کے بعد ایک جگہ ہماری ہمت جواب دے گئی اور ہم رگنے پر مجبور ہوئے۔ میں نے اسے ایک درخت سے ٹکا کر بٹھایا اور خود دوسرے درخت سے ٹک گیا۔ ”تمہارا اندازہ غلط نکلا، وہ مسلسل ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ میری غلط فہمی تھی کہ ہم نے ان سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔“

”لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی اگر وہ پیچھا کر رہے تھے تو ان کا مقصد یقیناً ہمارے سینٹر کا پتا چلانا ہوگا پھر انہوں نے راستے میں حملہ کیوں کیا۔ اس کے بجائے وہ خاموشی سے پیچھا کرتے رہتے۔“

”ہاں، یہ سوچنے والی بات ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے کرول والوں کی کوئی چال ہوگی۔“

ہم آدھے گھنٹے کے رات کے نو بجے دوبارہ چلنے کے لیے تیار ہوئے تھے روانگی سے پہلے آئرس نے مجھے ایک چھوٹی سی شیشی دی جس میں شفاف سیال بھرا ہوا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”انرجی ڈرنک ہے... ابھی ہمیں توانائی کی ضرورت ہے۔“

میں نے اسے حلق سے اتار لیا اس کا ذائقہ بڑا واہیات تھا لیکن اثر بڑا حیران کن نکلا۔ پینے کے ایک منٹ بعد مجھے لگا جیسے میرا وجود توانائی سے بھر گیا ہو چونوں کی تکلیف غائب ہو گئی اور میں خود کو پوری طرح چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ آئرس نے بھی ایک شیشی پی اور وہ بھی ٹھیک ہو گئی اس بار ہم خاصی رفتار سے آگے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہم ایک فارم ہاؤس تک پہنچے جس کے باہر ایک بیک اپ ٹرک کھڑا تھا۔ اتفاق سے اس میں چابی لگی ہوئی تھی لیکن احتیاطاً ہم اسے دھکیل کر فارم سے باہر لائے اور پھر اسٹارٹ کیا گیارہ بجے ہم دوبارہ ہائی وے پر تھے اس حادثے میں میرا بیگ رہ گیا تھا البتہ بریف کیس میرے

ساتھ تھا اسی طرح آئرس کا بیگ بھی اس کے پاس تھا۔ راستے میں آنے والے ایک بورڈ نے بتایا کہ ہم انڈیا میں تھے اور ایلی نو اس سے سو میل دور رہ گئے تھے۔ آئرس نے کہا ”اس کا مطلب ہے ہمیں ابھی چار سو میل کا فاصلہ طے کرنا ہے۔“

”ابندھن لینا پڑے گا۔“ میں نے فیول ٹینک کیج کا جائزہ لیا۔ ”گیس کم ہے۔“

خوش قسمتی سے کچھ دیر بعد ہی ایک گیس اسٹیشن مل گیا یہاں ہم نے گیس ڈلوای اس کے ساتھ اسٹور سے کھانے پینے کا سامان لیا اور اس کے واش روم میں خود کو صاف سترا کیا کیونکہ ہم دونوں کا حلیہ خراب ہو رہا تھا راستے میں کھانی کر میری جان میں جان آئی۔ پیدل سفر نے پیٹ خالی کر دیا تھا اور جسم توانائی مانگ رہا تھا انرجی ڈرنک کا اثر دو گھنٹے بعد ختم ہو گیا تھا میں نے ڈرائیو کرتی آئرس سے کہا۔ ”اگر دشمن اس ہائی وے پر ہمیں گھیر سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے وہ جانتے ہیں کہ ہم کہاں جا رہے تھے؟“

”اس کا امکان ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس صورت میں اگر ہم دوبارہ اسی ہائی وے پر سفر کرتے ہیں تو اس کا امکان ہے کہ وہ پھر ہمیں تلاش کر لیں۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو اب کیا کریں؟“

”میرا خیال ہے راستہ بدل دیتے ہیں کوئی نہ کوئی متبادل راستہ ہوگا۔“

آئرس نے مجھ سے اتفاق کیا اور آنے والے پہلے ہائی پاس پر پیک اپ موڑ دی۔ یہ سنگل لین سڑک اور کسی قدر خراب حالت میں تھی لیکن ہائی وے کے مقابلے میں محفوظ تھی۔ آئرس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب تمہیں پورا یقین ہو گیا ہوگا؟“

”ہاں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اب میں بے چین ہوں کہ میری یادداشت واپس آجائے۔“

”تم فکر مت کرو جلد ہمارے ماہرین یہ کام کر دکھائیں گے۔“

دو گھنٹے بعد ہم ایک اور ہائی وے تک پہنچے اور یہاں سے گھوم کر دوبارہ آئیووا کی طرف روانہ ہوئے۔ میں ایک بار پھر سو گیا تھا اور آئرس ڈرائیو کرتی رہی جب اس نے مجھے جگا یا تو ہم پھر ایک جنگل میں موجود تھے میں نے اکثرانی لی اور معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہاں کچھ دیر آرام کا ارادہ ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے میری امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

ہم نیچے اتر آئے جنگل گھنا اور اونچے درختوں پر مشتمل تھا سو فٹ سے بھی زیادہ اونچے ان درختوں کی وجہ سے صبح کی روشنی صرف اوپر تک تھی اور نیچے ابھی تاریکی تھی کچھ دیر میں آکھیں اس تاریکی سے مانوس ہو گئیں آئرس نے اپنا لیکٹر نکال کر اس کا رخ پیک اپ کی طرف کر کے ایک ٹن دیا فوراً ہی جیسے کوئی لہر پیک اپ کی طرف بڑھی اور ایک جھماکے کے ساتھ وہ غائب ہو گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا تھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ آلہ کسی بھی چیز کو اسی طرح غائب کر سکتا ہے۔ سمجھ لو چیز کے ایٹم ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ چیز بکھر جاتی ہے۔“

”تب تو بہت بڑا نیوکلیئر بلاسٹ ہونا چاہیے۔“

”نہیں، ہماری وضع کی ہوئی اس ٹیکنالوجی میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہیں سمجھا نہیں سکتی جب تمہاری یادداشت واپس آجائے گی تو تم خود سمجھ جاؤ گے۔“

آئرس آگے بڑھی اور میں اس کے ساتھ تھا۔ جنگل فطری حالت میں تھا اور صاف لگ رہا تھا کہ یہاں انسانوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ راستے نا پید تھے اور ہر طرف فطری لمبا پڑا تھا یہ مشکل ہم راستہ بناتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں نے شک سے کہا۔ ”ہم صحیح جگہ آئے ہیں؟ یہاں تو کچھ نہیں ہے۔“

”ہم بالکل ٹھیک جگہ آئے ہیں۔ بس کچھ دور اور چلنا ہے۔“ آئرس نے اطمینان دلایا تقریباً بیس منٹ بعد جب روشنی خاصی تیز ہو گئی تھی آئرس ایک چھوٹی سی پہاڑی کے سامنے رکی۔ ٹکونی شکل کی اس پہاڑی کے چاروں طرف اس سے زیادہ اونچے درخت تھے اس لیے یہ دور سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آئرس نے لیکٹر نکال کر اس کا ایک ٹن دیا اور انتظار کرنے لگی ایک منٹ بعد ہی اچانک سامنے سے پہاڑی کا ایک حصہ الگ ہو گیا اور راستہ نظر آنے لگا یہ کسی چٹیل دھات سے بنی سرنگ تھی۔ آئرس نے اشارہ کیا تو میں ہچکچاتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ وہ میرے ساتھ تھی، ہمارے اندر آتے ہی راستہ بند ہو گیا سرنگ خاصی لمبی تھی اور نیچے جا رہی تھی جس دھات سے بنی تھی وہ پاؤں رکھنے سے ٹکلی سی دیتی تھی اندر ہوا خشک اور خشک تھی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے وہاں ایک شخص شیشے کے ایک بکس میں کچھ مشینوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اس نے حکم دیا۔

تبصرہ

مشہور زمانہ فرانسیسی شاعر ”بولتر“ کو اس کے ہم عمر فلاسفر ”روسو“ نے اپنی نئی کتاب ”کیمبجی“ تو اس نے اسے پڑھنے کے بعد روسو کو خط لکھا۔

”مجھے تمہاری نئی کتاب مل گئی ہے، میں نے پڑھی۔ تم نے جس ذہانت کے ساتھ سب کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے اسے دیکھ کر میرا جی چاہا ہے کہ میں چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلنا شروع کر دوں۔ مگر پچھلے ساٹھ سالوں سے مجھے اس کی عادت نہیں رہی اور عمر کے اس حصے میں اسے بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔“

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

”سب چیزیں اتار کر سامنے فرش پر بنے دائروں پر کھڑے ہو جاؤ۔“

میں نے بے یقینی سے آئرس کی طرف دیکھا۔ ”کپڑے بھی؟“

اس نے سر ہلایا اور اپنا لباس اتارنے لگی بادل ناخواستہ میں نے بھی پیرو کی اور کچھ دیر بعد شرمسار سا دائرے میں کھڑا ہوا اچانک اوپر سے روشنی گری اور ہم اس میں نہا گئے یہ روشنی ایک منٹ تک گرتی رہی اور پھر بند ہو گئی اور ہمیں کپڑے اور دوسری چیزیں پہننے کی اجازت مل گئی۔ یہاں سے آگے نکلے تو آئرس نے بتایا ”ہمیں چیک کیا جا رہا تھا۔“

”اس طرح سے؟“

”ہاں اگر کوئی کرول دھوکا دے کر یہاں گھس آئے تو اس طریقے سے پکڑا جائے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”کرول کے بازو پر اس کا کوڈ نمبر نہیں ہوگا۔ اور اگر کسی طرح وہ کوڈ نمبر اپنے بازو پر لکھوائے تو یہ مشین اس کا راز فاش کر دے گی۔“

کچھ دیر بعد میں ایک آپریشن روم نما کمرے میں تھا یہاں آئرس کے ساتھ سفید کوٹ پہنے ایک شخص بھی تھا۔ آئرس نے اسے میرا مسئلہ بتایا اور اس نے سر ہلایا۔ ”یہ جو میں گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے گا کچھ ٹریٹ منٹ کرنی ہوگی لیکن اس سے پہلے اسے کچھ دوا میں دی جائیگی۔“

میں نے سکون کا سانس لیا کہ مجھ پر فوری کوئی تجربہ

نہیں ہو رہا تھا ڈاکٹر نے مجھے ایک کمرے میں شفٹ کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”بارہ گھنٹے کے لیے تمہارا کھانا پینا سب بند ہے اور بارہ گھنٹے بعد تمہیں دوا دی جائے گی اور مزید بارہ گھنٹے بعد تمہاری تھراپی ہوگی اس کے بعد تمہاری یادداشت بحال ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر کے بعد آئرس نے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پلیز تم مت جاؤ... میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ اس نے میرا ہاتھ تھپکا۔ ”میں کچھ دیر میں آ جاؤں گی۔ اب تم میری ذمہ داری ہو جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتے۔“

”اور اس کے بعد؟“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے گہری سانس لی۔ ”یہ اوپر والوں کی مرضی ہوگی کہ تمہیں کہیں اور بھیج دیں۔ تم ایک نئی زندگی کا آغاز کرو گے۔“

”اس میں تم میرے ساتھ ہوگی؟“

اس نے منہ پھیر لیا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ میں تڑپ گیا۔

”دیکھو، تم ابھی خود کو بھولے ہوئے ہو اس لیے عام انسانوں کی طرح ری ایکٹ کر رہے ہو جب تمہاری یادداشت بحال ہو جائے گی تو تم یہ سوال نہیں کرو گے۔“ اس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی میں بستر پر دراز ہو کر چھت کو گھورنے لگا اس کمرے میں سوائے ایک سادہ سے بیڈ اور ایک چھوٹی سی میز کے اور کچھ نہیں تھا یہاں میں نے صرف یہی چند حصے دیکھے تھے اس زیر زمین سینٹر میں آمد و رفت کے لیے ہر جگہ ویسی ہی چمکی اور نرم دھات سے بنی سرنگیں تھیں۔ میری گھڑی کلائی پر تھی میں نے وقت دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اچانک زمین تھر تھرائی بیڈ ہل گیا تھا اور میں اٹھ بیٹھا۔ اس پہلی تھر تھراہٹ کے بعد زمین وقفے وقفے سے اسی طرح تھر تھرانے لگی لیکن صرف حرکت تھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور بدحواس آئرس اندر آئی۔

”جونی اٹھو... ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یہاں حملہ ہو گیا ہے۔“

”حملہ کس نے کیا ہے؟“ میں اٹھتے ہوئے بولا۔

”کرول والے ہیں، میرا خیال ہے ہم سے غلطی ہوئی ہے اور وہ تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے۔“

”وہ تعاقب کرتے نہیں آئے ہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے قریب آ گیا۔

”کیا مطلب؟“ آئرس نے چونک کر کہا اور پھر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”دھوکا... تم کرول ہو...“

اس نے پھرتی سے اپنا لیکٹر نکالنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے میرا گھونسا اس کی کینٹی پر پڑا اور وہ لہرا کر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے لیے ایک گھونسا کافی ثابت ہوا تھا لیکن احتیاطاً میں نے اپنی گھڑی اتار کر اس کی گردن سے لگائی اور گھڑی کا پٹن دبایا پٹن دباتے ہی اسے جھٹکا لگا اب وہ کم سے کم چار گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹایا اور اس کا لباس درست کیا۔ میں نے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا، میرے لوگ، کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ ایسا ہی ہوا آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ایک کرول اندر داخل ہوا اس نے رپورٹ دی۔ ”ہم نے اس جگہ پر قبضہ کر لیا ہے۔“

میرے لیے یہ انتہائی خوشی کا مقام تھا جس کام کے لیے ہم کرول گزشتہ دو صدی سے کوشش کر رہے تھے بالآخر وہ میرے ہاتھوں انجام پایا تھا۔ مگر اگلے دس منٹ میں میری ساری خوشی مانند پڑ گئی جب پتا چلا کہ یہ لیرائے کا سینٹر نہیں بلکہ معمولی سا ڈاکٹھ تھا۔ یہاں بس چند ایک لوگ تھے جو حملے میں مارے گئے تھے اور صرف آئرس زندہ ہاتھ لگی تھی وہ بھی دھوکے میں آگئی ورنہ اسے موقع ملتا تو وہ بھی جان دے دیتی مگر خود کو ہمارے حوالے نہ کرتی۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا پورا ڈاکٹھ بس چند کمروں اور چند سرنگوں پر مشتمل تھا۔ کرول بہت قوت کے ساتھ یہاں حملہ آور ہوئے تھے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں ہم لیرائے کا سینٹر پر حملہ کرنے والے تھے مگر ہمیں دھوکا ہوا تھا اور یہ دھوکا آئرس نے دیا تھا وہ مجھے مسلسل یہی باور کراتی رہی کہ مجھے لیرائے کا سینٹر ملے جا رہی ہے۔ اب وہی بتا سکتی تھی کہ لیرائے کا اصل سینٹر کہاں ہے؟

☆☆☆

آئرس کو ہوش آیا تو میں اس کے سامنے تھا وہ ایک ویسے ہی بیڈ پر لیٹی تھی جیسا مجھے دیا گیا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس کے جسم پر سادہ رنگی لباس تھا اور اس کا ایک ہاتھ فولادی کڑے میں قید تھا جس کے ساتھ تین فٹ لمبی زنجیر تھی۔ اس کی مکمل تلاشی لی گئی اور لباس سمیت ہر چیز اس سے الگ کر دی گئی تھی۔ خطرہ تھا جیسے میرے پاس گھڑی کی صورت میں سگنل دینے والا آلہ تھا اسی طرح اس کے پاس بھی کوئی چیز نہ ہو۔ گھڑی نما آلہ خاص طور سے اسی کام کے لیے تیار کیا گیا تھا اور لیرائے کے ڈی ٹیکٹر اسے پکڑ نہیں سکتے تھے وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ وہ

بولی تو اس کا لہجہ سرد تھا۔ ”تو تم کرول ہو اور اب میں تمہارے قبضے میں ہوں۔“

”یہ درست ہے۔“

وہ پیچھے سرک کر بیڈ کی پشت سے پشت لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا یہ پوز بھی نظر نواز تھا وہ ان عورتوں میں سے تھی جو ہر حال میں اچھی لگتی ہیں۔ ”تم نے دھوکا خوب دیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم کرول نکلو گے۔“

”تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں شک نہیں تھا تو تم مجھے سینٹر کے بجائے اس معمولی سے ڈے تک کیوں لے گئی تھیں؟“

”یہ ہمارا طریقہ کار ہے کوئی بھی شخص چاہے وہ کتنا اہم کیوں نہ ہو براہ راست سینٹر تک نہیں جاسکتا۔“ وہ بولی ”وہ لیے تم نے جو تھکن کی جگہ کیسے لی؟“

”ایک برس پہلے ہم نے اس کا سراغ لگا لیا تھا۔ پھر میں نے رضا کارانہ اس کی جگہ لی میری سرجری کی گئی تاکہ بالکل اس جیسا ہو جاؤں بازو کے نشانات بنائے گئے اور مکمل جاسوسی سے اس کے معمولات اور دوسری چیزوں کا پتا چلا کر میں نے اس کی جگہ لی وہ تیسرے درجے کا کارکن تھا اور اس کا کام بزنس سے متعلق معلومات جمع کرنا تھا اس لیے مجھے اس کی جگہ لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں اس کے معلومات کی ترسیل کے طریقہ کار سے واقف نہیں تھا اس لیے جب جو تھکن کو پتا کر اس کی جگہ لی تو معلومات کی ترسیل رک گئی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اسی وجہ سے سینٹر والے تمہارے لیے فکر مند ہوئے تھے اس وقت شب نہیں ہوا تھا کہ تم بدل گئے ہو خیال تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے اکثر میوری پلانٹ والے کارکنوں کے ساتھ مسئلہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے جو لوگ تمہاری نگرانی کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ تم معمول کی زندگی بسر کر رہے ہو پھر ہمیں اطلاع ملی کہ تمہارے آس پاس مشکوک افراد موجود ہیں بالآخر معلوم ہو گیا کہ کرول والے تمہاری نگرانی کر رہے ہیں۔“

میں مسکرایا۔ ”یہ بھی ایک سیٹ اپ تھا جو تم لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے لگایا گیا تھا اور بالآخر تم لوگ ہمارے جال میں پھنس گئے۔ جب تم میرے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئیں تو میں اپنے لوگوں کو اشارہ کر چکا تھا اس کے بعد ڈراما شروع ہوا جو مستقل چلتا رہا۔“

وہ جواباً مسکرائی۔ ”لیکن اس سے تمہیں کیا ملا؟... تم ہمارے ایک معمولی سے سینٹر تک رسائی حاصل کر سکے ایلے

کئی سینٹر ہم نے تمہارے بھی تباہ کیے ہیں۔“

میرا منہ بن گیا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی یہ کامیابی ایسی ہی تھی جیسے ہاتھی کے شکار کے لیے جانے والے کو چوہا ملے۔ یہ معمولی سا سینٹر تھا اور اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ مگر فوراً ہی میں دوبارہ مسکرانے لگا۔ ”لیکن ہمیں ایک کامیابی ضرور ملی ہے۔“

پہلی بار اس کے حسین چہرے پر فکر دکھائی دیا۔ ”یعنی تم نے مجھے پکڑ لیا ہے۔“

”ہاں اور اب تم بتاؤ گی کہ لیرائے کا سینٹر کہاں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں بھی تیسرے درجے کی کارکن ہوں اور مجھے بھی نہیں معلوم کہ سینٹر کہاں ہے درحقیقت دوسرے درجے کے کارکنوں کو بھی نہیں معلوم ہے کہ ہمارا سینٹر کہاں ہے۔ صرف اول درجے کے کارکنوں کو علم ہوتا ہے۔ لیکن اول درجے کا کارکن کون ہے یہ بات اس کے ساتھ کام کرنے والوں کے علم میں بھی نہیں ہوتی ہے صرف سینٹر والے اول درجے کے کارکنوں کے بارے میں جانتے ہیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی ایسا ہی طریقہ کار ہمارا یعنی کرول کا بھی تھا ہمارا سینٹر کہاں تھا اس سے صرف چند لوگ واقف تھے اور ان کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ سینٹر میں ہماری نئی نسل کی پرورش کی جاتی تھی اور ہمارے لیے چیزیں تیار ہوتی تھیں اور نئے علوم، ٹیکنالوجیز پر تحقیق ہوتی تھی۔ یہاں نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی اور پھر ان کے ذمے کام لگائے جاتے تھے۔ جو ایک بار سینٹر سے باہر بھیج دیا جاتا تھا وہ دوبارہ واپس سینٹر نہیں جاسکتا تھا۔ یہ سینٹر کو پوشیدہ رکھنے کی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ درجہ اول کے کارکن ہی سینٹر واپس جاسکتے تھے لیکن وہ بھی وہاں سے بلاوا آنے کی صورت میں ایک مخصوص پیچیدہ طریقہ کار کے تحت جاتے تھے۔ میں خود دوسرے درجے کا کارکن تھا اور دس سال پہلے مجھے سینٹر سے نیویارک بھیجا گیا تھا۔ میں ایک امریکی ادارے میں کام کرتا تھا۔ پھر جو تھکن والے معاملے میں، میں رضا کار بن گیا۔ اس سے میری پہلے والی حیثیت ختم ہو گئی تھی۔

میرا گھر تھا لیکن میں نے شادی نہیں کی تھی کوئی بھی کرول کسی انسان سے شادی نہیں کر سکتا ہے، ہاں ہمیں دوستی اور تعلق سے منع نہیں کیا جاتا ہے ایسا کرنے کا مقصد اپنی نسل پر قرار رکھنا ہے۔ شادی بیاہ اور گھر داری کے جھنجٹ سے بچنے کے لیے تمام بچے ٹیسٹ ٹیوب کی مدد سے پیدا کیے جاتے ہیں اور ان کے ماں باپ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں ہیں بچے پیدا ہوتے ہی ماں سے جدا کر کے بے بی کیئر

یونٹ بھیج دیے جاتے ہیں جہاں وہ ہوش سنبھالنے کی عمر تک رہتے ہیں۔ پھر ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے انہیں ان کی پسند کے شعبوں میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں اور ذہنی لحاظ سے پختہ ہو جاتے ہیں تب پہلی بار انہیں باہر کی دنیا کے بارے میں بتایا جاتا۔ یہ آگاہی دو سے تین سال چلتی ہے اس میں ہم لوگوں کو انسانوں کے طور طریقوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ جسے جہاں بھیجنا ہوا ہے وہاں کے بارے میں مکمل معلومات اور تربیت دی جاتی ہے آخر میں امتحان لیا جاتا ہے اور کامیاب ہونے والوں کو ذمے داریاں دی جاتی ہیں ناکام ہونے والوں کو دوبارہ تربیت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔ تقریباً ایسا ہی سسٹم لیرائے والوں کا بھی ہوگا۔ مگر مجھے سوہوم سی امید تھی کہ شاید آئرس سینٹر سے واقف ہو اگر ایسا تھا تب بھی وہ آسانی سے نہیں بتاتی اور ہمیں اس سے مشکل سے معلوم کرنا پڑتا۔ جب میں سوچ رہا تھا تو وہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”تم تشدد کا سوچ رہے ہو؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجبوری ہے، اگر تم شرافت سے نہیں بتاؤ گی تو یہی ایک طریقہ رہ جاتا ہے۔“

”اگر تم فیصلہ کر چکے ہو تو میں اسے تبدیل نہیں کر سکتی بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

میں نے شانے اچکائے۔ ”تم جانتی ہو ہم نفع نقصان کا نہیں سوچتے ہم ریبوٹ ہیں اور ہمیں اپنی ذمے داریاں پوری کرنی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں میرا وقت آگیا ہے اور مرنے سے پہلے میرے ساتھ بہت برا ہوگا لیکن میں تم سے صرف ایک سوال کروں گی۔ کیا تم یہ سب دل سے کر رہے ہو؟“

میں نے رخ پھیر لیا تھا ”میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔“

جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی وہ بیڈ سے اتر کر میری طرف آنے لگی لیکن زنجیر نے اسے روک لیا اس لیے میں خود اس کے پاس چلا آیا کچھ وقت گزرا تو اس نے گرم سانسوں کے درمیان میرے کان میں کہا۔ ”تم ایک کروڑ ہو لیکن اگر میں نے دنیا میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم ہو۔“

میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور پھر کمرے سے نکل گیا یہ ہمارا بھی ایک چھوٹا سا سینٹر تھا اور ایسے ہی کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ہاتھ ایک اہم لیرائے آیا تھا آئرس کے بارے میں اوپر والے متفق تھے کہ

وہ اہم پوزیشن رکھتی ہے اور اس کا امکان ہے کہ وہ سینٹر سے واقف ہو اس لیے اس سے ہر ممکن طریقے سے پوچھ گچھ کی جائے۔ میرا اب اس معاملے سے تعلق نہیں تھا اور یہ کیس ایک دوسرے کروڑ آندرے کے سپرد کر دیا گیا تھا میری درخواست پر مجھے ایک بار آئرس سے ملاقات کا موقع دیا گیا تھا مجھے معلوم تھا کہ اب اسے وارننگ دی جائے گی پہلے میں شاک تھراپی ہوگی اور پھر اسے جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑے گا تشدد کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ مطلوبہ معلومات یا جان نہیں دیدے گی چونکہ مجھے بعد اس کا حسین وجود تشدد کے ہاتھوں اپنی رعنائی کھونے لگے گا اور مرنے سے پہلے وہ صرف گوشت کا ایک ڈھیر رہ جائے گی۔

یہ سوچ کر میں اندر سے مضطرب ہونے لگا شاید میں ایسا نہیں چاہتا تھا اس نے مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا تھا لیکن میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا یہ بہت خوفناک بات تھی لیرائے اور کروڑ کے تعلقات کے بارے میں آئرس نے درست کہا تھا کہ ہم موت تو قبول کر سکتے تھے لیکن ایک دوسرے سے دوستی قبول نہیں کر سکتے تھے۔ آئرس کے معاملے کی وجہ سے میں اپنی ذمے داریوں سے ہٹ گیا تھا اور اب میں دوبارہ جاب پر جاتا تو میرے بارے میں انکوائری شروع ہو جاتی اور اس بات کا امکان تھا کہ میری کہانی جعلی ثابت ہو جائے اس لیے مجھے واپس جانے سے منع کر دیا گیا تھا اور نئی ذمے داریوں اور مقام کے تعین تک مجھے اسی سینٹر میں رہنا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے یہاں آنے نہ دیا جاتا اور میں واپس نیویارک جا چکا ہوتا۔ یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ میں نے آئرس سے ایک ملاقات اور کر لی تھی۔ اگلے دن صبح آندرے نے مجھے بلایا۔ اب آئرس اس کے سپرد تھی اس نے کہا۔

”ہم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“

میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”نقصی شیسل میں۔“ اس نے جواب دیا اور اپنی میز پر رکھی اسکرین میری طرف گھما دی۔ اسکرین پر دکھائی دیا جانے والا منظر خوفناک تھا آئرس کو برہنہ حالت میں کلائیوں سے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس کا جسم جگہ جگہ لگے زخموں سے بھرا ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی تیز دھار آلے سے کٹ لگائے گئے ہوں۔ صرف اس کا چہرہ صاف تھا وہ ہوش میں تھی مگر جھوٹے انداز میں کھڑی تھی شیسل میں موجود جلاد نے اس پر نمک والا پانی چھڑکا اور پوچھا۔

”تمہارا سینٹر کہاں ہے؟“

پانی زخموں پر لگا تو آئرس بلیاتی مگر اس نے غیر متوقع طور پر جلاو کے منہ پر تھوک دیا آندرے نے کہا۔ ”یہ گزشتہ چھ گھنٹے سے تشدد کا سامنا کر رہی ہے لیکن اب تک اس نے ذرا بھی کمزوری نہیں دکھائی ہے۔ مثیل شاک ٹریٹ منٹ نے بھی اس پر اثر نہیں کیا۔“

”یہ بہت مضبوط عورت ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اس پر اتنی جلدی اثر ہوگا اسے کچھ وقت دو۔“

آندرے نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”وقت دوں... اس سے تو یہ سنبھل جائے گی۔“

”نہیں، یہ مر جائے گی اگر اس پر لگا تار تشدد کیا گیا، اس کی حرکت بتا رہی ہے کہ یہ ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار ہو گئی ہے اور جلاو کو اشتعال دلا کر موت حاصل کرنا چاہتی ہے اس سے بہت ٹھنڈے دماغ سے نمٹنا ہوگا ورنہ یہ ضائع ہو جائے گی اور ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں آئے گا۔“

آندرے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”کیا یہ طریقہ کامیاب رہے گا؟“

”امید ہے، وقفے وقفے سے دی جانے والی اذیت زیادہ موثر ثابت ہو سکتی ہے ورنہ اس وقت یہ جتنا برداشت کر چکی ہے اس سے زیادہ اذیت اور کیا ہوگی۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

آندرے نے سر ہلایا اور کی بورڈ کا ایک بٹن دبایا جلاو چونکا کیونکہ ایک کونے میں لگا ہوا سرخ بلب جلنے بجھنے لگا تھا وہ کمرے سے نکل گیا میں نے آندرے سے کہا۔ ”اسے وقت دو اور جب اس کی تکلیف کم ہو جائے تب اسے دوبارہ تکلیف دو۔ امید ہے بار بار کی اذیت اسے توڑ دے گی۔“

میں آندرے کے پاس سے اپنے کمرے میں آیا اور پھر باہر نکل آیا ہمارا یہ سینٹر ساؤتھ ڈکوتا کے ایک گھنے جنگل میں تھا۔ ایسی جگہیں ہمارے سینٹرز کے لیے کارآمد تھیں جہاں عام افراد کی آمد و رفت نہیں تھی یہاں صرف شکاری آتے تھے اور وہ بھی سیزن میں، ان پر آسانی سے نظر رکھی جاسکتی تھی۔ میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور اس کے کش لیتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میں واپس اندر آ گیا آئرس نقیشتی کمرے میں اکیلی تھی میں نے دروازے کے اوپر لگی جالی سے اندر دیکھا وہ ہوش میں تھی اور اپنے پیروں پر کھڑی تھی جب کہ آدھے گھنٹے پہلے وہ جمول رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اتنی کمزور نہیں تھی جتنا خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ مجھے بھی یقین تھا کہ وہ ان زخموں سے کمزور نہیں ہوگی۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔

جیسے ہی پہلی تھر تھراہٹ ہوئی میں پھرتی سے حرکت میں آیا میرا بیگ تیار تھا وہ میں نے پشت پر باندھا اور کمرے سے نکل آیا میرا رخ نقیشتی سیل کی طرف تھا اس بار وہاں جلاو موجود تھا اور آئرس کو چھیڑ کر اپنی نفسانی تسکین کر رہا تھا، میں نے دروازے پر دستک دی تو وہ چونکا اور پھر دروازہ کھولا اسی لمحے زمین دوسری بار تھر تھرائی پہلے شاید اس نے محسوس نہیں کیا تھا میں نے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے باہر دیکھو۔“

وہ باہر کی طرف لپکا اور اس کے جاتے ہی میں آئرس کے پاس آیا اس کی کلائی میں بندھے کڑے بٹن دبا کر کھولے اور وہ گرنے لگی تو اسے سہارا دیا وہ کتنی مضبوط سی لیکن آٹھ گھنٹے سے یہ اذیت برداشت کر رہی تھی میں نے آہستہ سے کہا۔ ”آئرس ہوش کرو، ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

وہ ہمت کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور ہم باہر آئے میں اسے ایک راہداری کے آخری سرے پر لایا اور پھر دیوار میں لگے ایک نم پیڈ پر کود مایا تو خفیہ دروازہ کھل گیا یہ بھی ایک سرنگ تھی میں اندر آیا اور دوسرے نم پیڈ پر دوسرا کوڈ ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ جب دروازہ بند ہو رہا تھا تو آندرے نمودار ہوا اور وہ ہماری طرف لپکا تھا لیکن وہ دروازہ بند ہونے سے نہ روک سکا۔ اب وہ اسے باہر سے بھی نہیں کھول سکتا تھا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ آئرس نے آہستہ سے کہا۔

”میں تمہیں یہاں سے لے جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور ہم سرنگ میں آگے بڑھنے لگے سرنگ تقریباً ایک کلومیٹر لمبی تھی اور ایک ندی کے ساتھ غار میں نکلتی تھی یہاں پہنچ کر میں نے آئرس کو بیگ سے ایک لباس نکال کر دیا اس کے زخموں پر لگا خون خشک ہو گیا تھا ابھی وقت نہیں تھا کہ میں اس کی مرہم پٹی کرتا، اس وقت یہاں سے نکل جانا ضروری تھا میں اسے سہارا دے کر ندی میں سفر کرنے لگا ہمارا رخ شمال کی طرف تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم ایک ہائی وے پر نکلے اور ایک ٹرک والے نے ہمیں نارتھ ڈکوتا کی سرحد تک چھوڑ دیا اس سفر کے دوران خوراک اور آرام سے آئرس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ ٹرک والے نے ہمیں سینڈ وچز اور گرم کافی دی تھی۔ یہاں سے ہم دوبارہ جنگل میں سفر کرنے لگے اور بالآخر رات گئے ایک کیمپن تک پہنچے میں کامیاب رہے راستے میں ایک گیس اسٹیشن سے ڈیابند خوراک کے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی لی تھیں۔

یہ کیمپن میرے ایک دوست کا تھا وہ میرے ساتھ ہی کام کرتا تھا اور ایک بار ہم شکار کے لیے یہاں آئے

تھے۔ ممکن ہے برا حال تھا لیکن پہلے میں نے آئرس کے زخموں کی صفائی کی اور ان کی مرہم پٹی کی۔ بعض زخم ایسے تھے کہ ان پر ٹانگے لگانے پڑے تھے اور باقی پر میڈیکل پٹی سے کام چل گیا۔ اب اس کی حالت بہت بہتر تھی کھانے اور کافی کے بعد میں نے اسے سونے کو کہا لیکن اس نے مجھے روک دیا۔ ”نہیں پہلے میرے کچھ سوالوں کا جواب دو۔“

میں جانتا تھا کہ وہ کیا پوچھے گی۔ ”اوکے، لیکن زیادہ بات مت کرنا۔“

”تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”میں نہیں جانتا، بس اتنا جانتا ہوں کہ میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”تم نے لیرائے کو کیسے اطلاع دی؟“

”میں نے ایک چانس لیا تمہارا لیکٹر میرے پاس تھا وہ میں نے باہر لے جا کر آن کر کے ایک جگہ رکھ دیا مجھے امید تھی کہ تمہارے لوگ تمہیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ وہ یہاں تک آجائیں گے۔“

”تمہاری توقع پوری ہوئی لیکن کرول کا ایک اڈا تباہ ہو گیا۔“

”یہ ویسا ہی سینٹر تھا جیسا کہ تمہارا سینٹر تھا۔ اس کی تباہی سے کرول پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔“

”تم مجھے نکال کر یہاں کیوں لائے ہو؟“

”دو وجوہات کی بنا پر، ایک تو سینٹر کے لوگ جب دیکھتے کہ وہ حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو وہ تمہیں قتل کر دیتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اب میں واپس نہیں جاؤں گا ممکن ہے میری غداری چھپ جائے لیکن بہت امکان ہے کہ کرول کو میری غداری کا پتا چل گیا ہوگا اور اب میں ان کے ہاتھ آیا تو مجھے فوری سزائے موت دیدی جائے گی۔ ایک کرول کسی لیرائے سے دوستی کرے یا اس کے بارے میں اچھے جذبات رکھے یہ ہمارے ہاں ناقابل معافی جرم ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”بالکل ایسا ہی ہمارے ہاں بھی ہے تو تم نے واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے؟“

میں نے شانے اچکائے۔ ”میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اب تم کو فیصلہ کرنا ہے۔“

”کیسا فیصلہ؟“

”یہی کہ تم میرا ساتھ دو گی یا واپس جاؤ گی۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”اگر میں واپس جانے کا فیصلہ کر دوں تو...؟“

”تو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”کہاں جاؤ گے؟“

”پتا نہیں، لیکن ارادہ کینیڈا جانے کا ہے وہاں کسی دور دراز جگہ میں آسانی سے روپوش ہو جاؤں گا یا پھر ایشیا یا یورپ چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور اسے کبل اوڑھا دیا۔ ”اب سو جاؤ فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس وقت ہے۔“

کیمپن میں ایک ہی بیڈ روم تھا میں لاؤنج میں صوفے پر کبل لے کر لیٹ گیا سردی اتنی نہیں تھی کہ آتش دان جلانے کی ضرورت پیش آتی۔ یہ اچھا تھا کیونکہ کیمپن کی چینی سے نکلنے والا دھواں دور سے نظر آتا۔ میں نے روشنیاں بھی بجھا دی تھیں اب کوئی کیمپن تک آتا تو باہر سے اسے بھی لگتا کہ یہاں کوئی نہیں ہے صبح میری آنکھ کھلی تو باہر روشنی ہو گئی تھی میں نے چوہے پر کافی کے لیے پانی رکھا اور بیڈ روم میں چھانکا تو مجھے جھکا لگا تھا کبل الٹا پڑا تھا اور آئرس غائب تھی۔ وہ نہ جانے کس وقت یہاں سے نکل گئی مجھے پتا بھی نہیں چلا میرے اندر ایک بوجھل سا احساس بھر گیا، مجھے توقع تھی کہ شاید وہ میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرے لیکن اس کا فیصلہ کچھ اور تھا مجھے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ مجھے بتائے بغیر اور طے بغیر خاموشی سے چلی گئی تھی اب مجھے بھی یہاں سے چلے جانا تھا اگرچہ مجھے آئرس سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ لیرائے کو یہاں کے بارے میں بتائے گی مگر اس کے خاموشی سے جانے سے میرے اندر کچھ دوسرے سر اٹھانے لگے تھے۔ میرا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں نے کافی نکالی اور ابھی کافی پی رہا تھا کہ کیمپن کا دروازہ کھلا، میرا ہاتھ بے اختیار میز پر رکھے چاقو کی طرف گیا لیکن پھر آئرس کو دیکھ کر رک گیا۔

”تم...؟“ میں نے خوشی اور حیرت سے کہا۔

”کہاں تھیں، میں سمجھا...“

”کہ میں جا چکی ہوں۔“ وہ بولی اور آگے آئی اس نے ایک برتن اٹھا رکھا تھا جس میں انڈے تھے۔ ”میں ان کی تلاش میں گئی تھی یہاں جنگلی مرغیاں ہوتی ہیں، اب آلیٹ کا ناشا کریں گے۔“

میں نے اٹھ کر اسے بازوؤں میں لیا تو وہ مسکراتے لگی تھی کچھ دیر بعد ہم ناشا کر رہے تھے اور بہت خوش تھے قطع نظر اس کے کہ اب کرول اور لیرائے دونوں ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے ہماری قسمت میں کیا تھا لیکن مجھے اتنا معلوم تھا کہ ہم جب تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے بہت خوش رہیں گے۔



چشم دیدگواه

احمد اقبال

جب نگاہ کسی خواب کے دھندلکے میں گم ہو تو کوئی منظر واضح دکھائی نہیں دیتا... نہ خواب، نہ حقیقت... اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ کبھی کبھی وہیں پڑاؤ ڈالنا ناگزیر ہو جاتا ہے جہاں قافلے لٹنے کا ڈر ہو... ایسے میں اگر ستاروں سے بھرا آسمان بھی سر پر ہو پھر بھی رستہ سبھائی نہیں دیتا کیونکہ توند ہوا اور لہروں کے مخالف بہاؤ میں جب جیون کی نیا ڈول چائے تو کہیں طوفان کہیں بھنور... بھی زندگی کا حصہ محسوس ہونے لگتے ہیں لیکن درحقیقت یہی وہ وقت ہوتا ہے جب انسان زندگی کو انتہائی قریب سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ ان سر پہروں کے سر پر بھی عشق کا جنون سوار تھا... دنیا میں کوئی چہرہ انہیں دوسرے سے زیادہ حسین دکھائی نہ دیتا تھا... وہ جو ایک ریاست کی ملکہ تھی جانے کیسے اس فقیر پر دل ہار بیٹھی اور پھر رفتہ رفتہ زندگی کی بساط پر ہربازی مات ہوتی چلی گئی۔ جب اس کا حسن ہی اس کا دشمن اور پیار رقیب بن گیا تو ایسے میں بربتنہ پاوہ تنہا سفر کرنے پر مجبور تھی لیکن... اس جان لیوا تنہائی میں بھی کوئی تو ایک ایسا تھا جو اب بھی اس کے لیے جلتی دھوپ میں سایہ بنا قدموں میں نثار ہو جانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا... آنسوؤں سے بھری جھیل میں اسے جانے کتنے بیتے عکس دکھائی دیتے تھے اور یہ عکس کتنے خونیں مناظر کے چشم دید گواہ تھے لیکن... منظر کا تعلق نظر سے ہوتا ہے زبان سے نہیں لہذا پھر کیسے کسی کی زبان گھلتی... اس کی زبان پر بھی تالے تھے... لیکن وہ ہزار پہروں کے باوجود اس کا تعاقب کرنے پر مجبور تھا... شاید یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔

حسن کی سلطنت میں عشق کی رفاقتوں اور رقیب کی رفاقتوں کا لرزہ خیز احوال

خط کا مضمون بار بار پڑھنے سے مجھے یاد ہو چکا تھا کہ میرے دل کے اندر سچ کی غلطی کی پھانس کی طرح باعث آزار بنی ہوئی تھی۔ سخت حالات اکثر نئی ایام کی پوری طرح ترجمانی کرتے تھے اور فریاد کرتے تھے کہ احساس کرتے ہو تو میرے درد کو پہچانو۔ میرے عذاب کو سمجھو اور دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔

یہ نچلے متوسط طبقے کے ایک مجبور مصنف کا الیہ تھا کہ وہ عزت و غیرت کے تقاضوں اور شرم و حیا کی بوسیدہ دیواروں میں بند تھا اور انہیں گرانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ وہ کسی پر یہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے گھر میں فاقے چل رہے ہیں۔ بیوی بیمار ہے مگر وہ علاج کی استطاعت نہیں رکھتا اور اس کا بچہ فیس نہ ہونے کے باعث اسکول نہیں جاسکتا۔ اس نے اپنا ہدف مجھے بنایا تھا اور سارا قصہ مجھ سے کہا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”آپ ایک کثیر الاشاعت جریدے کے مدیر اعلیٰ ہیں... جس کا پبلشر ایک جاگیردار صنعت کار سیاسی خانوادے سے تعلق رکھتا ہے۔ عوام کا منتخب نمائندہ ہے اور فی زمانہ اپنی خریدی ہوئی جعلی ڈگری، بیرون ملک اثاثوں اور ٹیکس کی مد میں ایک روپیہ نہ دینے کی وجہ سے ہر ٹاک شو اور کالم کا موضوع سخن بھی ہے۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ لفافہ جرنلسٹ اور لاکھوں معاوضہ لینے والے اینکرز بھی پروگرام کی رونق بڑھانے کے لیے ایسے ہی عزت داروں کو بلاتے ہیں۔

مجمروں کے اس گروہ کے سرغنہ آپ ہیں ایڈیٹر صاحب! آپ نے میری ہر کہانی پر جلی حروف میں اعلان فرمایا ہے کہ اس چشم کشا تحریر پر مصنف کو ایک ہزار روپے انعام دیا گیا اس سے بڑا سفید جھوٹ اور کیا ہوگا۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

شاید اپنے دفاع میں آپ فرمائیں گے کہ وہ سب بھی تو جھوٹ ہی تھا جو چشم دید گواہ بن کے آپ نے لکھا تھا۔ ہرگز نہیں ایڈیٹر صاحب! اس کا ہر لفظ سچ تھا۔ صرف سچ۔ اس کا ثبوت تاریخ کے اوراق میں مل سکتا ہے مگر آپ کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ کی جھوٹ کی فیکٹری چل رہی ہے۔

آج مجھے خود کو مصنف کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ وہ جو بھٹکی کہلاتا ہے۔ حقیر سمجھا جانے والا ثانی، موچی اور مراٹی۔ کوئی ہے جو اجرت کے بغیر کام کرتا ہو۔ ایسی محنت کو بیکار کہا جاتا ہے۔ یہ کام یہاں میرے جیسے مصنف شاعر اور

ادیب کرتے ہیں مگر ان کی تخلیق کو سرمایہ دار سرباز فروخت کرتے ہیں۔ مغرب کی بے حیائی پر لعنت ملامت کرتے ہیں مگر اپنی اولادوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وہیں بھیجتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ وہاں مصنف بھی دولت مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔

میں نے بھی سوچا تھا کہ اپنی خداداد صلاحیت کو استعمال کر کے شاید میں فاقہ کشی اور بھیک مانگنے کی ذلت سے بچ جاؤں۔ صرف شہرت سے تو میرا پیٹ نہیں بھرے گا اور میں کیا کروں؟ خود کو بیچوں..... آپ ایک اخبار، ایک رسالہ اور ایک چینل چلا کر جتنا کمارہے ہیں، اس آمدنی سے بھیک سمجھ کر ایک مصنف کا حق محنت تو دے سکتے ہیں۔ مجھے صرف اتنا چاہیے کہ جسم و جاں کا رشتہ برقرار رہے اور اس مجبوری کی زندگی کا انجام خودکشی کی حرام موت پر نہ ہو..... مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

اگر پانچویں کہانی آپ تک نہ پہنچے تو سمجھ لیں کہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ نہ مجھے آپ سے دعائے مغفرت درکار ہے، نہ بعد از مرگ تمغہ حسن کارکردگی۔ یوم حشر کی فکر مجھے نہیں تو آپ کو بھلا کیوں ہو؟ یہ خون خاک نشیناں تھا، رزق خاک ہوا۔“

خط میں اور بھی بہت کچھ تھا جو مبنی بر حقیقت نہیں تھا مثلاً اس نے لکھا تھا کہ میں اپنے شانہ طرز پر آراستہ انرکنڈیشنڈ آفس سے انرکنڈیشنڈ میوزین میں جسے وردی پوش ڈرائیور چلاتا ہے اپنے قصر عالی شان جاتا ہوں تو بھی وردی پوش ملازم میری خدمت کے لیے کمر بستہ ملتے ہیں اور میری طویل کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے مٹھی پوری، چینی اور اطالوی کھانے سजे ہوتے ہیں۔

معلوم نہیں اس نے یہ احقانہ تصور کہاں سے لیا۔ شاید کسی اشتہار سے جس میں ملٹی میڈیئل کمپنیوں کے ایسے ہی دفاتر دکھائے جاتے ہیں یا کسی ڈراپے سے۔ اصل صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ میرا آفس ایک دو منزلہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ چار میں سے ایک کمرہ مجھے ملا ہوا تھا۔ باقی تین میں سے ایک کچن کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور دو میں دفتر کا عملہ بیٹھا تھا۔ میرے کمرے کا فرنیچر کسی بے مصرف سرکاری دفتر کے خستہ حال پرانے فرنیچر جیسا تھا جس کی مرمت اور پالش شاید پاکستان بننے سے پہلے ہوئی تھی۔ میرے زمانہ ہوش و ہواس میں ویسا نہیں ہوا تھا۔ یہی حال دیواروں کے رنگ و روغن کا تھا۔ عمارت کی چلی منزل پر لگی مسالے چس کر ایک بڑی کمپنی کے اصلی نام پر بیک ہوتے

تھے۔ ان کی بو اور دھانس ہمہ وقت رسالے کے دفتر میں بسی رہتی تھی۔ یہ کاروبار رسالے اور اخبار کے مالک کے کسی سالے کا تھا چنانچہ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاسکتی تھی۔

میرا گھر شہر کے ایک پرانے محلے میں تھا۔ اس کا کل رقبہ پانچ مرلے تھا۔ میرے سوا اس کے سارے مکین ایک ایک کمرے رخصت ہو گئے تھے۔ میرے دو بھائی امریکا، کینیڈا پہنچ گئے۔ دو بہنیں سسرال اور والدین شہر خوشاں۔ آنے جانے کے لیے میں پچاس ساٹھ لاکھ کی گاڑی استعمال کرتا تھا جسے عرف عام میں بس کہا جاتا ہے۔ جب میں تنخواہ آتی تو میں ٹیکسی میں سفر کر کے بعد میں پچھتا تا تھا کہ دس کی جگہ سو خرچ کر کے حاصل کیا ہوا۔ پینچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ دفتر سے اسی گھر میں۔

تو یہ بھی ایک ایڈیٹر کی یعنی میری اوقات جس کو خط لکھنے والے کی نظر نے کسی فلسفہ کی طرح دیکھا جو جھوٹ پڑے کے مکین کو محلوں کے خواب دکھانے کا ہنر جانتے ہیں۔

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی تھی سب سے زیادہ پریشانی کی بات تو مصنف کی اپنی زندگی سے مایوسی اور بددلی کی وہ انتہا تھی جس میں اس نے صرف تین ہزار نہ ملنے کی شکایت کے ساتھ ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اب اس کے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پھر اسی ایک احساس جرم نے میرے ذہن کو اسیر کر دیا تھا کہ بات صرف اتنی نہیں کہ لکھنے والے کو تین ہزار نہیں ملے اس لیے وہ زہر کھا کے یا ریل کی پٹری پر لیٹ کے مر گیا، اندر کی کہانی کچھ اور ہے۔ میں اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ تین ہزار بھیج کے اپنے احساس جرم سے چھٹکارا پالوں اور اسے منع کر دوں کہ بھائی آئندہ کے لیے مجھے معاف رکھیے۔ آپ کی چشم دید گواہی مجھے نہیں چاہیے۔

لیکن ایسا لگتا تھا کہ تین ہزار بھیج کے بھی میرے جرم کی غلطی مٹے گی نہیں۔ جب تک میں حقیقت حال جان نہ لوں۔ ایک اچھا خاصا صاحب طرز اور عمیق مشاہدہ رکھنے والا مصنف ذہنی طور پر اتنا دیوالیا کیسے ہو سکتا ہے۔ خدا نے اسے دیکھنے، سوچنے اور بیان کرنے کی غیر معمولی صلاحیت دی ہے۔ پھر یہ کیسا شخص ہے کہ جیتا مشکل ہو جائے، وہ مرنے کی خواہش رکھتا ہو اور اس کا اظہار بھی کر دے۔ کہیں یہ شخص دھمکی تو نہیں یا بلیک میلنگ ہی سمجھا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ قصہ مختصر میرے دل میں اس مصنف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ کیا واقعی کسی کے حالات اتنے خراب ہیں۔ وہ ایک باصلاحیت مصنف تھا۔ ذاتی

چشم دید گواہ

تعلق کی بنا پر میں اسے کسی نہ کسی اخبار یا رسالے میں جگہ بھی دلوا سکتا تھا۔

ایک اور بات جس نے مجھے چونکایا تھا اس کا یہ دعویٰ تھا کہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے اس نے جو بھی لکھا تھا وہ فرضی نہیں تھا، مجھے یہ دعویٰ بھی جھوٹ لگتا تھا۔ کہانی محض کہانی ہوتی ہے۔ اسے حقیقی واقعہ کہنے اور تاریخ کا حصہ بنانے کی بات بے معنی تھی۔ اسے تین ہزار مانگنے کے لیے یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

جب رسالے کے پبلشر اور مالک چودھری کرم داد نے قدم رنج فرمایا تو میں شکایت کر کے خودکشی کی دھمکی دینے والے مصنف کی تینوں کہانیوں کو ایک تسلسل میں پڑھ کے فارغ ہوا تھا۔ میرا ذہن ان کہانیوں کے واقعات اور پس منظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا اور میرا یہ یقین کمزور پڑ گیا تھا کہ مصنف کے دعوے میں کوئی صداقت نہیں۔

چودھری کرم داد نے درود یوار میں لرزہ پیدا کرنے والی ایک چھینک مار کے تاک کی برآمدات کو اپنی پگ کے شملے میں بحفاظت منتقل کیا اور پھر پگ کو میری ٹیبل پر کسی ٹرائی کی طرح سجا دیا۔ پیچھے سے ان کا نصف تریوز جیسا کاسہ سرپینے میں چمکتا ہوا نظر آیا۔ طرہ دستار کے بغیر ان کے لیے قدمیں دوڑھائی فٹ کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

ان کی فرمائش سے پہلے ہی میں نے چائے منگوا لی اور پھر وہ خط ان کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے پتر مدیر اعلیٰ!“ میں نے کہا ”آپ خود ہی پڑھ لیں۔“ ”مگر یہ تو تمہارے نام ہے۔ تم ویسے ہی بتا دو اس میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے کے لیے آج میرے پاس چشم نہیں ہے۔“

میں نے چشم نہیں پیش کیا۔ یہ آپ کل بھول گئے تھے۔ مجبوراً انہوں نے وہ خط پڑھ لیا۔ ہر روز آنے والی ڈاک میں سے مجھے صرف تعریف و توصیف پر مبنی خطوط پیش کرنے کی ہدایت تھی۔ یہ خط پڑھ کر ان کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”اوئے یہ کیا بکواس لکھی ہے اس..... نے۔“ عادت کے مطابق انہوں نے جملے میں ایک شاندار گالی فٹ کی۔ ”اسے تین ہزار دینے ہیں چودھری صاحب!“ میں نے اعلان کیا۔

”تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ قلو سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میری بات سے ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔

”اور ہے دے یار۔ اس کو اس پر یقین کر لیا تو نے۔ یہ تو کوئی پکا بلیک میٹر ہے۔ ہم ایسے ہی تین ہزار دے دیں اس کو۔ مرتا ہے تو مر جائے۔ لکھنے والوں کی کوئی کمی ہے۔“

”چودھری صاحب۔ میری بات تو آپ کو ماننا ہی پڑے گی ورنہ.....؟“

”ورنہ کیا.....؟ بول۔“ انہوں نے شیر کی طرح دھاڑنا چاہا مگر زکام کے باعث آواز بلی جیسی نکلی۔

میں نے جیب سے اپنا پرانا ریڈی میڈ ٹائپ کیا ہوا استغنی نکالا اور دستخط کرنے کے لیے قلم اٹھالیا۔ ”ورنہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔“

”تو یہ نوکری چھوڑ دے گا تو پھر کیا کرے گا؟“

”میں گھاس کھودوں گا۔ قاسم بارخ کے مالی کو مجھ سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے اور باقاعدگی سے۔“

چودھری صاحب نے اعتراف شکست کے طور پر ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ وہ کچھ دیر مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ مجھے کان سے پکڑ کر نکال دیا جائے یا حسب معمول ایک موقع اور دیا جائے۔ اس

وارنگ کے ساتھ کہ میں پھر بھی خرچ بڑھانے کی بات نہ کروں۔ قصور ان کا نہیں تھا۔ خدا نے انہیں ایسا ہی بنایا تھا۔

وہ پیدا کئی طور پر کنجوس تھے۔ اکثر آہ بھر کر حسرت سے فرماتے تھے کہ شرعی حد میں رہتے ہوئے چوتھے نکاح کے لیے مزید تین کا انتخاب مشکل نہیں تھا مگر یہ ایک ہی اتنی مہنگی پڑ رہی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ خواخواہ اباجی کی بات مان

لی۔ زندگی یوں بھی گزر رہی جاتی۔

کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے انہوں نے خط کو ایک بار پھر پڑھا۔ ”یار مدیر صاحب، آخر یہ ہے کون؟ کیا نام ہے

اس کا؟“

”این آر ہیں، این آر کا مطلب مجھے بھی معلوم نہیں؟“

”اگر میں اس سے ایک بار فون پر بات کر لیتا.....“

”میں نے جھٹا کر کہا۔“ کوئی نمبر ہو تو بات کروں

چودھری صاحب۔ خط کتابت کے لیے کسی شاندار جنرل اسٹور کا پتا ہے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ یہ

سکھر سے جیک آباد کے راستے میں کوئی قصبہ ہے۔“

”ہوں۔“ انہوں نے کافی غور فرما کے کہا ”مگر یہ رقم کیسے بھیجی جائے گی اسی شاندار جنرل اسٹور کے پتے پر؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے لیے رقم کا منی

آرڈر بنوانا پڑے گا اور ڈاک خانے کے معاملے میں میرا تجربہ برا بھی ہے، جب میں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا تو ہانا نے مجھے امتحان کی فیس بھیجی تھی۔ رزلٹ آنے تک وہ مٹی

آرڈر مجھے نہیں ملا تھا۔ یہ دیکھیے.....“ میں نے اپنی دراز سے ایک فائل نکال کے دکھائی۔ ”میں نے صحافت میں

ایم اے کر لیا ہے۔ شکایت پر خط کتابت ہنوز جاری ہے۔ کبھی مہینے دو مہینے بعد میں ایک لیٹر بھیج دیتا ہوں۔ دو چار

ہفتے میں ان کا جواب آ جاتا ہے کہ ہم تقیث کر رہے ہیں۔ یہ فارغ وقت کا کھیل ہے مگر میں دوبارہ نہیں کھیلتا چاہتا۔ خصوصاً

اس کیس میں۔“

”راجا صاحب، پھر کیا تم خود جاؤ گے یا اسے یہاں بلاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”اسے بلانے کا مطلب ہوگا کہ وہ آنے جانے کا خرچ برداشت کرے اور جس کے پاس زہر کھانے کو

پیسے نہ ہوں، جو فاقہ کشی کے ہاتھوں مرنے پر مجبور ہو.....“

”میں پھر کہتا ہوں۔ تو جذباتی ہو رہا ہے۔ آخر یہ شاندار جنرل اسٹور کس کا ہے؟ چلو خود اس کا نہ سہی۔ کسی چاچے

ماتے کا ہوگا۔ یا ربلی کا ہوگا۔ کیا وہ اس کی مدد نہیں کر سکتے؟“

”چودھری صاحب اگر وہ بھیک مانگ سکتا تو مدد کرنے والے بہت مل جاتے لیکن جو ہاتھ پھیلانے سے

جان دینا آسان سمجھتا ہو وہ ہر ایک سے جا کے کیسے کہے کہ اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ کیا پتا اس کے بھی بیوی

بچے ہوں۔ اس نے کہہ دیا ہو کہ اب تو اسے ہر کہانی پر ایک ہزار ملیں گے۔ وہ ہر روز ایک کہانی لکھے گا جب مشہور ہو جائے

گا تو ہزار دینے والے اسے دس ہزار دیں گے۔ مگر ہوا کیا؟ اسے پیسا نہیں ملا۔ اب وہی لوگ اس پر ہنستے ہوں گے۔“

”راجا تو ایسا کیوں نہیں کرتا اس شاندار جنرل اسٹور والے کو ایک چٹھی لکھ کر اس سے پوچھ۔“

”چودھری صاحب۔ صرف تین ہزار دیتے ہوئے آپ کی جان جا رہی ہے۔ ایسا نہ ہو وہ سچ سچ اپنی جان

دیدے۔ پھر یہ خون آپ کی گردن پر ہوگا۔“

چودھری صاحب نے گہرا کے کہا۔ ”اچھا اچھا میں چیک دیتا ہوں، کیش کرالینا کل۔“

”مجھے آج ہی جانا ہوگا۔ میں دیر نہیں کر سکتا۔ چیک کی رقم میں خرچہ آدھورفت بھی شامل کر لیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھے شوق ہے تو پیدل جا، سائیکل

بنایا۔ ایک اور خوفناک سی چھینک ماری اور زینہ اتر گئے۔

تین بار گلا پھاڑ کے چلانے کے باوجود چیراسی کی فٹ بھر کی لہرائی ڈاڑھی والا چہرہ نمودار نہ ہوا تو میں نے دروازہ

کھول کے دیکھا۔ وہ تین ٹانگوں والی کرسی پر منہ کھولے سو رہا تھا۔ کھیاں آزادانہ اس کھلے غار میں آ جا رہی تھیں۔

میں نے لات مار کے چوٹھی ٹانگ کی جگہ رکھی ہوئی اینٹوں کو گرایا تو کرسی کی بیک دیوار سے ٹکرانی اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

”راجا صاحب آپ مجھے شرافت سے آواز دے کے بھی بلا سکتے تھے۔“ اس نے رنجیدگی سے شکوہ کیا۔

”فرمائیے کیا حکم ہے؟“

”بارخاطر نہ ہو تو خراماں خراماں بینک تک جا کے بٹانگی ہوش وحواس یہ چیک کیش کرائیے اور آج ہی لوٹ آئیے۔“ میں نے کہا۔ ”رقم سمیت۔“

وہ ہر مشکل کام پر آہ بھرتا تھا۔ ”ہم بھی انسان نہیں کھوتے ہیں۔ پیدا ہی ہو جھانٹانے کے لیے ہوتے ہیں اور

گالیاں کھانے کے لیے۔“ اس نے جب چائے میرے سامنے رکھی تو میں سوچ کے گہرے سمندر میں غرق تھا۔ میں

خانم پور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

تقسیم ہند سے پہلے چھوٹی بڑی چھ سو کے لگ بھگ ریاستوں کے وجود کا ذکر سنا ہے۔ ان میں کچھ محض جاگیریں

تھیں جن کے مالک خود راجا یا نواب کہلا کے خوش ہو لیتے تھے اور کچھ بہاولپور جیسی جن نے سکے اور ڈاک کے ٹکٹ

جاری کرنے کا اختیار تھا۔ بلوچستان سے بنگال تک پھیلی ہوئی بہت کم ریاستوں کے نام میں نے سنے تھے۔ پاکستان

میں بہاولپور کے علاوہ خیرپور، قلات، سوات یا ہنزہ کے نام مشہور تھے۔ یہ سب اپنی مرضی سے یا سرکار کی مرضی سے ضم

ہو گئی تھیں یا کر دی گئی تھیں۔

کے بعد دیگرے این آر ذین کی تینوں کہانیوں کا مطالعہ فرما کے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مصنف نے اپنی

کہانیوں کے لیے ایک فرضی ریاست بنائی ہے چنانچہ اس کے والی اور ولی عہد سے دیوان اور خزانچی، وزیر خاص اور

قاضی تک سارے عہدے اور نام بھی فرضی ہوں گے۔

اب مصنف نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ سب سچ تھا۔ پھر مجھے اس دعوے کی صداقت پر شک ہونا لازمی تھا۔ پہلا

مرحلہ تو یہ تھا کہ میں ریاست خانم پور کا محل وقوع دریافت کروں۔ میری معلومات کے مطابق ایک خان پور کہیں

خانم پور کی خانم، بظاہر مشکوک خیر لگتا تھا لیکن جھانسی کی رانی ایک اتنا مشہور کردار تھا کہ اس پر قلم بنائی گئی تھی۔

خانم پور کی خانم کے بارے میں معلومات کہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں؟ میں اس نکتے پر غور فرما ہی رہا تھا کہ

میرے ذاتی موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دفتر کا فون ایک تھا اور اس کے کنکشن عملے کے لیے چار مختلف نمبروں پر فراہم

کر دیے گئے تھے۔ ایڈیٹر کو فون کرنے والوں سے عموماً نائب مدیر حضرت ہارودس جی خود نمٹ لیتے تھے۔

پہلے میرے سل فون پر نصف کال کرنے والے دوست یار ہوتے تھے تو نصف ایسی حسین مداحوں کے جن کو

میں جذباتی ہو کر نمبر دے بیٹھتا تھا۔ جذباتی ہونے کا سبب ہمیشہ میری سچی محبت ہوتی تھی۔ بعد میں ان سے پیچھا چھڑانا

مشکل ہو جاتا تھا جب وہ قاضی یا پولیس کے ساتھ حملہ آور ہونے کی دھمکی دینے لگتی تھیں۔ مزید خرابی اس وقت ہوئی

جب دو چار مرتبہ فون میری اکلوتی دعوے دار، سچی محبت کی واحد ٹھیکیدار اور مجھے اپنے عشق میں مجنوں بنانے کی ذمے دار حسینہ عالم نے بقلم خود یہ فون سن لیے۔

اب نیا نمبر صرف دو چار دوستوں کے پاس تھا یا اس ناز آفرین کے پاس جس کا اصل نام بھی یہی تھا۔ میرے ہیلو

کہتے ہی اس نے مجھے ڈاغنا شروع کیا۔ ”کہاں ہو تم۔ پھر بھول گئے کہ مجھ سے کیا کہا تھا.....؟“

میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ میں ابھی رہ گزر میں ہوں۔ پلک جھپکتے ہی پہنچ رہا

ہوں۔ یہ ٹریفک جام بھی بڑی مصیبت ہے۔“

”میں نہیں ہوں۔ لاہوری میں۔ دس منٹ اور دیکھوں گی۔“

اس کی یہ آخری بات میں نے ان سنی کی اور ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کے دوڑا۔ آفس سے یونیورسٹی تک کا

راستہ زیادہ نہیں تھا مگر سنگل اور ٹریفک جام میں پھنس کر میں نے یہ فاصلہ پون گھنٹے میں طے کیا۔ پھر گیٹ پر کھڑے

بندوق بردار سنتری سے مغز ماری ہوئی۔ اس کے پاس نے میرا پریس اور میڈیا کارڈ دیکھا اور میں نے بتایا کہ مجھے

چینل پروائس چانسلر سے انٹرویو کا وقت لینا ہے تو اس نے مجھے اندر جانے کی اجازت دی۔

ناز آفرین نے تین دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ ہیرا پھتم ہونے کے بعد لاہوری میں میرا انتظار کرے گی۔ میں آر

این دین کے مسئلے میں نہ پڑتا تو شاید اس سے پہلے لاہوری میں کوئی کتاب کھولے راستہ تک رہا ہوتا۔ رہی سہی کسر اس

کے والد ماجد نے پوری کردی جو دس منٹ کی بات سمجھنے میں آدھا گھنٹا لگاتے تھے۔ خصوصاً وہ بات جس کا تعلق اخراجات میں اضافے سے ہو۔

لائبریری میں درجنوں لیلیٰ مجنوں ضخیم اور قابل فہم کتابیں کھولے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نصاب عشق کو دہرا رہے تھے۔ خلوت اور خاموشی میں آنے سامنے بیٹھ کے دل کی بات کہنے اور سنانے کے لیے لائبریری سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جو پڑھا کو قسم کے طالب علم یہاں سنجیدگی سے حصول علم کے لیے آتے ہوں گے ان کو بھی لائبریری کی رومان پرور فضا کے اثرات سے خود کو محفوظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہوگا۔

میری نظر نے ہال میں مناسب فاصلے سے موجود تمام جوڑوں کا سرسری جائزہ لیا۔ اکیلے وہی تھے جو کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ باقی سب لمبی لمبی میزوں کے دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آنے سامنے بیٹھے تھے۔ کچھ بھاری بھر کم کھلی کتاب زیر مطالعہ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے یوں سرگوشیوں کی زبان میں نصاب عشق پڑھ رہے تھے کہ کسی کی خلوت متاثر نہ ہو اور قوانین کے مطابق لائبریری میں خاموشی بھی رہے۔

اندر قدم رنج فرماتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اپنی عزیز معاون سہیلی کے ڈارک براؤن برقعے میں سرتاپا ملفوف، اندر سے اپنی آنکھوں کے کیمرے گھما رہی تھی۔ چار فٹ چوڑی میز کی طرف کرسی پر گرتے ہی میں نے حسب عادت کہا۔ ”بلبل جاں تم خفا ہو.....“

میرا اتنا کہنا تھا کہ نقاب ہٹ گیا اور ساٹھ سال کی چوہیل نما نرس نے چلانا شروع کر دیا۔ ”بیزا غرق ہو تیرا بلبل جان کے بچے خدائی خوار، مشنڈے۔ آج اسی لیے میں پکٹی گئی یہاں۔ روز تنگ کرتا ہے میری بہن کو۔“

اب اتفاق سے کچھ تو میں پیدا کی اداکار ہوں اور باقی تجربے نے حالات کی سنگینی سے نمٹنا سکھا دیا ہے۔ شاک صرف ایک سینکڑ کا تھا جس کے بعد میں نے پلک جھپکتے ہی ایک بھولے بھالے معصوم طالب علم کا روپ دھار لیا۔ میں نے مسکینی سے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ فرمایا خالہ جان!“

لائبریری میں سنسنی پھیل چکی تھی اور لائبریرین قلم خود سچویشن کو کنٹرول کرنے کے لیے ”کیا ہوا“ ”کیا ہوا“ کرتا آ رہا تھا۔

”ارے خالہ جان کے ہوتے سوتے! اور کون ہے

یہاں؟“

میں نے اتنی ہی مصیبت سے کہا۔ ”مگر میں تو آپ کو جانتا بھی نہیں اور ابھی آیا ہوں۔ بیٹھتے ہی آپ نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔“

ادھر ادھر سب ہنس رہے تھے اور اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ یہ بد معاش اندر کیسے آ گیا۔ لائبریری صرف اسٹوڈنٹس کے لیے ہے۔ ان سے کوئی پوچھتا کہ وہ بڑھیا جو پہلے سے وہاں شور شرابے کے لیے موجود ہے کیا طالب علم تھی۔

اللہ عزتوں کا رکھوالا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ لائبریرین نے مجھے پہچان لیا۔ ”آپ یہاں کیسے راجا صاحب؟“ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”دراصل مجھے ایک کتاب کی تلاش تھی، ریاستوں کی تاریخ۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

”ایک بار میں اپنی کہانی آپ کے پاس لایا تھا۔ میں لکھ لیتا ہوں۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”ابھی دو ماہ قبل۔“

میں نے دوستانہ اور مدبرانہ خوش مزاجی سے کہا۔ ”نام بتائیے۔“

”جی..... میرا نام یا کہانی کا۔ کہانی کا نام تھا ”بے قرار بلبل“ اور میرا عنوان ہے قرار حسین بے قرار۔“

”اوہ۔ وہ کہانی تو آئندہ شمارے کے لیے منتخب ہو چکی ہے۔ یہ بزرگ خاتون بھی یونیورسٹی کی طالبہ ہیں؟“

لائبریرین کو مجھ سے مصافحہ کرتے دیکھ کے شریںد فوراً دیک گئے تھے یا کھسک گئے تھے۔ آتش فشاں بڑی بی کے حلق سے برآمد ہونے والا شور بھی شرمندگی اور بدحواسی میں بدل گیا تھا۔ فرد جرم عائد کرتے کرتے وہ خود مجرم بن گئی تھیں۔ انہیں تو خیر لائبریرین نے باعزت طریقے سے بے عزت کر کے رخصت کر دیا مگر جس کے لیے میری آمد نے

سب سے زیادہ پریشانی کے اسباب پیدا کیے تھے وہ خود نیاز آفرین تھی۔ نہ وہ کھل کے سامنے آ سکتی تھی اور نہ کہہ سکتی تھی کہ عقل کے دشمنو! اندھو! میرے اکلوتے چاہنے والے راجا کو بھی نہیں پہچانے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ نہ وہ بڑی بی سے کہہ سکتی تھی کہ احمد کی پلوی کیوں محمود کے سر باندھ رہی ہو۔

اپنی دختر نیک اختر کے پرستار کا فوٹو تو ساتھ لے کر آئیں۔ وہ خود کسی سہیلی کے برقعے میں روپوش اور گنما رہنے پر مجبور تھی۔ سب کی نظر بچا کر اس نے مجھے بہت اشارے

چشم دید گواہ

بھی کیے کہ میں اس کے پیچھے نکل آؤں لیکن میں نے اسے افشائے راز کے خوف سے فرار ہوتے دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر میں قرار حسین بے قرار کا کیا کرتا جو فریضہ غیب بن کر مجھے بچانے آگئے تھے اور نہ صرف یہ کہ مجھے مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا تھا بلکہ میرے لیے چائے کا آرڈر بھی دے چکے تھے۔

حالات پر سکون ہوئے تو مجھے وہاں سواری برقعے میں ملفوف صرف ایک ہی حسد نظر آئی مگر وہ بہت دراز قد تھی اور اس کے نصف قد کا کوئی نوجوان غالباً اسے یہ سمجھانے میں مصروف تھا کہ عشق میں اونچ نیچ کو نہیں دیکھا جاتا.....

چنانچہ یہ سمجھنا غلط نہ تھا کہ ناز آفرین میری رسوائی کا تماشا دیکھنے سے پہلے ہی انتظار سے تنگ آ کے جا چکی تھی۔ اس کے بعد تاو لوں پر مبنی ڈرامے دیکھنے سے اس کا یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ سارے مرد ہر جگہ دھوکے باز جھوٹے اور مطلب پرست وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس سے تو میں ہر مشکل کو ملتا تھا

لیکن ہفتے کے باقی چھ دن یہاں کسی اور سے بھی ملنے آتا تھا۔ آج پکڑا گیا۔ میری کسی محبوبہ کی جگہ اندر سے اس کی ماں نکل آئی۔ جیسے گفت پیک میں ہم ہو جو کھولتے ہی پھٹ جائے۔

ریاستوں کی تاریخ کے بھی ایک سو ایک ابواب تھے اور یہ کتاب بھی شاید ایک سو ایک کلو کی ہوگی۔ اگر میں اس کا مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا تو ایک سو ایک سال کی عمر درکار تھی۔

میری مشکل کو جناب قرار حسین بے قرار نے یوں آسان کیا کہ مجھے کیمپس میں شعبہ تاریخ کے ایک پروفیسر صاحب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا باقی کام میری خدا داد ذہانت نے کیا کہ موصوف کو شرف ملاقات بخشنے سے پہلے میں نے فون پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور کامیاب بھی رہا۔

ریاست خانم پور کے محل وقوع کے بارے میں میرا اندازہ کسی حد تک درست تھا۔ یہ سندھ و بلوچستان کے درمیان کوئی انگریز بہادر کی عطا کردہ جاگیر تھی جس کو بعد میں ریاست کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ تاریخ کے پروفیسر صاحب نے تو مجھے پوری کتاب لکھوانے کی کوشش کی لیکن میں بڑی ہوشیاری سے درمیان میں مطلب کے سوالات کرتا رہا۔

بیشتر معلومات غیر ضروری اور لا حاصل تھیں۔ میں نے کہا۔ ”پروفیسر صاحب۔ کیا یہ ریاست بھی پاکستان میں شامل ہوئی؟“

”ظاہر ہے اس خطے میں تھی تو بھارت میں کیسے شامل ہوتی۔ اس وقت یہ جان پور کہلاتی تھی اور یہاں رئیس جان محمد کی حکومت تھی۔ جاگیر اس کے باپ خان محمد کو عطا ہوئی

تھی۔ جان محمد نے علاقے کے سرکردہ لوگوں کو اپنا باپ بنا رکھا تھا۔ ایک سال پہلے ستر سال کے نواب نے چوبیس سال کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی جس کا باپ گویا نواب صاحب کا معالج تھا۔ اس کی بیٹی بھی ڈاکٹر تھی ایک دن باپ کی جگہ نواب کو دیکھنے چلی گئی مگر جان محمد نے اسے دیکھا تو نوابوں کی روایت کی مطابق زبردستی شادی کر لی۔ کہتے ہیں کہ باپ نے بیٹی کو یوں بچایا کہ شادی سے قبل ہی کوئی انجکشن دے کر بیمار کر دیا۔ شادی کے دوسرے ہفتے میں ان کا ہارٹ ٹل ہو گیا۔ نئی بیوہ بلکہ کنواری بیوی نے عنان حکومت سنبھال لی اور جان پور کا نام بدل کر خانم پور کر دیا۔

وہ بہت خوبصورت ہی نہیں انتہائی سازشی اور چالاک عورت تھی۔ اس نے ریاست کا سارا خزانہ اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا۔ اس کا مددگار اور معاون خصوصی وہ تھا جو دیوان کہلاتا تھا مگر وہ وزیراعظم کے اختیارات رکھتا تھا۔ بعد کے حالات کہتے ہیں کہ علاقے سے انگریز کے جانے سے ذرا پہلے ہی خانم کا قتل ہو گیا تھا لیکن اس کی خبر کسی کو نہ تھی کہ یہ کارنامہ اس کے عاشق وزیراعظم نے سرانجام دیا ہوگا وہ بعد میں غائب ہو گیا۔ ایک کہانی یہ ہے کہ اس نے زہر آلود شراب کا جام اپنے وزیراعظم کو پلانا چاہا مگر اس نے کسی طرح جام بدل دیا۔ ایک فلمی طریقہ اور یوں خانم کو دنیا سے جانا پڑا۔ تیسری کہانی یہ بھی ہے کہ خانم ایک رات ہمیں بدل کے نکل گئی اور جب اس کا پرستار، مستقبل کا ساتھی اور شریک جرم سو کے اٹھا تو اسے پتا چلا کہ سونے کی چڑیا تو راتوں رات اڑ گئی۔ وہ بھی جان بچا کے نکل گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ پلان کے مطابق باری باری فرار ہوئے تھے۔

پروفیسر کہانی سن رہا تھا تو میں ان سب کہانیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو این آر ڈین نے ”چشم دید گواہ“ کی حیثیت سے لکھی تھیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ یہ سب حقائق تھے۔ آخر وہ کیسے ان واقعات کا چشم دید گواہ تھا جو شاید پون صدی پہلے رونما ہوئے تھے۔ تاریخ کے پروفیسر کی روداد میں اور ان کہانیوں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ کہانیوں میں دیگر کرداروں کے نام بھی تھے اور تفصیلات بھی بہت زیادہ تھیں۔ محل کے اندر کا نقشہ، وہاں رہنے والوں کے نام اور ان کے کام اور حالات۔ یہ سب فرضی نہیں تھے۔ پروفیسر کی تصدیق کے بعد شک کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ ان کہانیوں کے مرکزی کردار کا نام بھی یوسف تھا اور ان میں خان محمد سے جان محمد تک کے حوالے اصلی تھے۔ میرا تجسس بھڑک اٹھا تھا۔ میں تاریخ کے اس کردار

سے ملنا چاہتا تھا جس سے خانم پور کی خانم کو دیکھا تھا۔
میں لائبریری سے نکلا تو خانم پور جانے کا فیصلہ تو خیر
کر ہی چکا تھا۔ میرے لیے انقلاب زمانہ کی اس روداد میں
غیرت کے بڑے سامان تھے۔ مغل شاہان کے جانشینوں کی
طرح جو فاقہ کشی کرتے رہے روپوش رہے اور بھیک مانگنے
پر مجبور ہوئے۔ این آر دین بھی آج صرف تین ہزار روپے
کی معمولی رقم نہ ملنے کی صورت میں خودکشی کر کے دنیا
چھوڑنے کی دھمکی دے چکا تھا۔

اپنا حصہ نکالنے کے لیے ناز آفرین نے مجھے اگلے
روز طلب کیا۔
پہلا نصف گھنٹا وہ منہ سجائے چپ بیٹھی رہی۔ یہ ظاہر
کرنے کے لیے کہ وہ مجھ سے سخت ناراض ہے۔
میں نے کہا۔ ”دیکھو، میری اس میں کیا غلطی ہے۔ وہ
برقع بھی نسواری رنگ کا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کھانے کے ساتھ کیا
بیوی؟“

”میں تمہارا خون پیوں گی۔“ اس نے غرا کے کہا۔
”ہاں غریبوں کا خون چوسنے والے فرسٹ ڈریکولا
کی اولاد ہونا۔ مگر یہ بعد میں پی لیتا مائی ڈیز جو تک اتم بھول
رہی ہو کہ ہم یہاں سچ کرنے آئے تھے۔ آخر تک چلے
گا کا یہ روٹنے کا ڈراما۔ کیا تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ
تمہاری جگہ بیٹھی تھی۔ آخر کیوں؟ اسے غلط فہمی ہوئی تو کیا یہ
میرا قصور تھا۔“

”وہ پہلے سے بیٹھی تھی۔ میں کیا اسے اٹھا دیتی اور
بات غلطی یا غلط فہمی کی نہیں۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”باہر نکلنے سے
پہلے میں نے تمہیں کتنے اشارے کیے۔ تم نے دیکھا تک
نہیں میری طرف اور باہر میں نے پون گھنٹا انتظار کیا۔ مجھے
برقعہ بھی واپس کرنا تھا۔“

”تمہارا باپ ایک برقعہ بنوا کے نہیں دے سکتا؟“
”ایک ہے تو سبکی۔“

”مگر رنگ کا ہونا چاہیے تمہارے پاس مگر وہ خسیس
اعظم جو بدستری سے میرا خسر ہوگا۔ یہ تین ہزار میں نے کتنی
مشکل سے لیے ورنہ وہ تو کہہ رہا تھا کہ این آر دین مرتا ہے تو
مر جائے۔ یہ قیمت ہے اس کی نظر میں انسانی جان کی۔“

ناز آفرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”راجا تم
نے پھر اباجی کو نشانہ بنالیا۔ اپنی بات کرتے کرتے۔“
میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ ”اچھا آئی ایم
سوری۔ چلو کوئی اور بات کرتے ہیں۔ منج تو میں چلا ہی جاؤں
گا۔ پتا نہیں آگے کیا ہو۔ وہاں کے حالات کا تو ہمیں علم ہے،

کیا پتا افواہو جاؤں اور یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔“
”راجا۔“ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔
”مت کرو انکی دہلانے والی باتیں۔ تم خیر خیریت سے
واپس آؤ گے۔ میں ہر وقت تمہاری سلامتی کے لیے دعا
کروں گی۔ میں تو کہتی ہوں مت جاؤ۔“
”میرا جانا ایک مشن ہے جان بچانے کا۔ تم بھی
میرے ساتھ چلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کاش میں جاسکتی۔ تم اپنی
گاڑی میں جاؤ گے؟“
میں نے کہا۔ ”اس میں بھی جاسکتا ہوں اگر تم کسی
طرح مجھے یہ موقع فراہم کرو کہ میں اس کے ٹائر بدل دوں۔
جو دھری صاحب کی گاڑی کے ٹائر بالکل نئے ہیں۔ میرے
بالکل گنجنے ہوئے ہیں ان کے سر کی طرح۔“
”یہ ناممکن ہے۔ گیراج میں تالا پڑا رہتا ہے۔ پیسے
ہیں تمہارے پاس؟“

”اگر تین مہینے کے واجبات کو تم بیساکھ سکتی ہو تو ہیں۔“
اس نے اپنا بیگ کھول کے سوکے نوٹوں کی ایک گڈی
نکالی۔ ”راجا یہ رکھ لو۔ پورے دس ہزار ہیں۔“
میں نے فوراً اپنی پاکٹ نوٹ بک نکال کے اندراج
کیا۔ ”یہ ہو گئے اب تک دو لاکھ..... سو دو لاکھ۔ میں پانی
پانی چکا دوں گا۔“

”پھر وہی بکواس۔ حساب کیوں رکھتے ہو؟“
”یہ ادھار ہے۔ ادھار محبت کی پہنی ہے لیکن یہ تم سے
نہیں سو خسیس اعظم..... میرا مطلب ہے والد صاحب سے۔“
”میں ایک چیک پھاڑ لیتی ہوں۔ ان کے دستخط شاید
میں بہتر کر سکتی ہوں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا۔“ وہ ہنس پڑی۔
”نہیں ناز آفرین۔ آسمان پر ایک ستارہ کم ہو۔ اس
کے باغ میں کسی درخت کا ایک پتہ کم ہو۔ اس کے کسی ٹوب
ویل میں پانی کا ایک گلاس کم ہو تو اسے پتا چل جاتا ہے۔
تمہاری بات اور ہے۔ تم بیٹی ہو اس کی۔ اس کا انجان بننا بھی
لاڈ کا ایک کھیل ہے کیونکہ وہ باپ ہے۔“

ناز آفرین میری صورت دیکھتی رہی۔
☆☆☆

برائے لائن ٹرینوں پر سفر کے لرزہ خیز قصبے میں نے
ہمیشہ دوسروں سے سنے تھے اور خاصی عبرت پکڑی تھی مگر
اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ اب میں خود نمونہ جرات بنا
خانم پور کی طرف رواں دواں تھا۔
نام نہاد اپر کلاس جس میں یہ ناچیز مدیر اعلیٰ سفر کر رہا

چشم دید گواہ

تھا کسی طرح بھی نچلے درجے سے مختلف نہ تھا۔ دونوں جگہ
چمکے ساکت تھے۔ روشنیاں گل تھیں۔ کھڑکیاں دروازے
ایک ساتھ الگ الگ آوازوں سے پاپ میوزک کا آرکسٹرا
ساز بجاتے تھے۔
رات کو کسی وقت بہرام ڈاکو قسم کے ٹکٹ چیکر نے
سونے کی کوشش کرنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ سے جگایا اور
ٹکٹ خرید کے سفر کرنے والوں کو شرمندہ کرنے والی نظروں
سے دیکھا۔ ان میں یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ بے ٹکٹ
مسافروں کے نذرانے جیب میں ڈال کے اس نے مجھے پھر
مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ”پرلیس کے بندے ہو کے ٹکٹ
بھی خریدتے ہو۔“ تاہم میرا کارڈ چیک کرنے کی جرات
اس میں نہ تھی۔

رات بھر عمر رسیدہ انجن ہانپتا ہوا دوڑتا رہا۔ جہاں
کبھی اس کا سانس پھول جاتا وہ دم لینے کے لیے رک جاتا۔
ناز آفرین کی دور اندیشی میرے کام آئی اس نے میرے
احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ہاٹ باکس میں خوراک
اور ایک بوتل پانی کی مجھے پہنچا دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میرا
بس چلے تو اسباب سفر میں تن کے پٹڑے بھی قالتو بوجھ سمجھ
کے چھوڑ دوں۔

عبرت کے سامان قدرت خود مجھے فراہم کر دیتی
ہے۔ میرے مقابل ڈاکو کے گیٹ اپ میں ایک فٹ دائیں
یا بائیں پھٹکی ہوئی خوفناک مونچھوں اور سڑک کوٹنے والے
انجن جیسی آواز والا ہم سفر جب پہلی بار یولا تو میں نے پوچھ
لیا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”اوئے نہیں۔“ غرا کے جواب دیا۔ ”نہیں، چپ
کر“ میں خاموش ہو گیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے پھر کہا۔
”کیا تکلیف ہے آخر تجھے؟“ اوپر بیٹھے بیٹھے سوال
کیا۔ ”بکواس کی تو چلتی گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔“
مجھے شک ہوا کہ وہ پاگل خانے کا مغرور یا خودکلامی کا عادی
ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

اچانک میں نے اسے سیٹ کے نیچے ہاتھ لے جاتے
دیکھا، اس کے ہاتھ میں روٹی تھی۔ سیٹ کے نیچے ایک ہاتھ
نظر آیا اور روٹی غائب ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ڈراما ایک گلاس
پانی کے ساتھ ہوا۔ روشن حروف والی کتاب ابھی تک ایجاد
نہیں ہوئی ورنہ میں اندھیرے میں بھی پڑھتا رہتا تو یہ سب
کیسے دیکھتا۔ مجھے سیٹ کے نیچے ایک پوری نظر آئی۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”کون ہے اس پوری میں؟“
”میری بیوی اور کون۔“ خوفناک مونچھوں والے

نے کہا۔ ”تم کیوں دیکھ رہے ہو؟“
میں نے جان بھیلی پر رکھ کے پوچھا۔ ”اسے اگلے
اسٹیشن پر پولیس کے ساتھ سب دیکھیں گے، پوری سے نکال
کے۔ پھر یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ بیوی تمہاری ہے یا کسی
اور کی..... اور اگر مر گئی تو۔“

مونچھیں ایک دم سنگل کی طرح ڈاؤن ہو گئیں اس کی
آواز میں جو شیر جیسی دھاڑ تھی وہ بھی بلی کی میاؤں میاؤں جیسی
ہو گئی۔ ”سائیں غریب لوگ ہیں ہم۔ دو کا بھاڑا نہیں دے
سکتے۔ پوری میں سامان ہو تو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسے ہی آتے
جاتے ہیں ہم۔ آپ فکر نہ کرو۔ یہ بہت سخت جان ہے،
مرے گی نہیں۔“

مجھ پر جیسے سچ سچ لرزہ طاری ہو گیا اور میرا دل چاہا
کہ اندھیرے میں وہیں سجدہ ریز ہو جاؤں کہ تیرا احسان کتنا
بڑا ہے میرے خدا کہ تو نے مجھے مدد پر اعلیٰ بنایا۔ اس مجازی
خدا کی بیوی نہیں بنایا۔ بقیہ سفر میں میری اس ظالم شوہر سے
کوئی بات نہیں ہوئی۔ شاید میں اس سے پوچھتا تو وہ بتاتا کہ
وہ چار کا شوہر ہے اور سب کے ساتھ مساوی سلوک کرتا
ہے۔ سب کو ہنی مون پر ایسے ہی لے گیا تھا۔

خدا خدا کر کے سچ ہوئی تو نہ جانے کسی اسٹیشن پر ایک
شخص چلاتا ہوا آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کے تار سے
بنے شکنجے میں ایک درجن مٹی کے کوزے آویزاں تھے۔ وہ
گرما گرم شیرے جیسی ایک چیز کے لیے حلق سے ”ہائے“
جیسی آواز نکالتا تھا مگر درحقیقت وہ چائے بیج رہا تھا۔ اپنے
ذوق پسند اور معیار کو بھول کر میں نے وہ گاڑھا مشروب
مزے لے لے کر پیا جس میں دارچینی، الائچی کے علاوہ ہتی
بھی ضرور ڈالی گئی ہوگی۔

خانم پور کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر کر میں
ایسے بھاگا جیسے ایک بار چور کے پیچھے بھاگا تھا اور اس سے
کافی آگے نکل گیا تھا کیونکہ اس نے پلٹ کے کہہ دیا تھا کہ تم
مجھ سے جیت نہیں سکتے۔ پوری بند زوجہ اور شوہر کو مزید آگے
جانا تھا۔

ریلوے اسٹیشن پر عجیب ماتی فضا تھی۔ اکا دکا لکڑی
کی بیچوں پر کسی ٹرین کے مختصر مسافر سرنگوں بیٹھے تھے۔ ایک
قلی گھٹنوں میں سر دیے سو رہا تھا۔ ٹکٹ چیکر بدھنسی کے
مریض کی طرح پیٹ پکڑے کھڑا تھا۔ اترنے والے مسافر
بلا روک ٹوک شارٹ کٹ سے آ جا رہے تھے۔ گیٹ سے
گزرنے اور ٹکٹ پیش کرنے والا مسافر صرف میں ہی تھا۔
اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔

بڑے لوگ بڑی باتیں

☆ جہالت کے ساتھ جب دولت بھی موجود ہو تو تباہ کن ہوتی ہے (شوہن یاد)
☆ خمیر کی خلش اس دنیا کو ہی دوزخ بنا دیتی ہے (ورجل)

☆ عورتیں ایسے جھوٹ کو پسند کرتی ہیں۔ جس میں ان کی تعریف ہو لیکن وہ ایسی سچائی کو پسند نہیں کرتیں جن میں ان کی تعریف نہ ہو۔ (ایٹھرن)

☆ ایک جابر حکومت درندوں سے زیادہ خوفناک ہوتی ہے (کنفوشس)

☆ ہر غلام کے آباؤ اجداد میں کوئی نہ کوئی بادشاہ بھی شامل رہا ہے (افلاطون)

☆ پاکیزگی حسن کو اور بڑھا دیتی ہے (حنیامور)

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

کہا۔ ”تمہیں حضور والا۔ اس کی ماں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ اب نہیں دے رہی ہے۔ اصل نسل ہے، وفاداری جانتی ہے۔“

اس کا انداز گنگو واقعی حیران کرنے والا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک چھوٹے سے گناہ قصبے کا تانگے والا ایسی زبان بول سکتا ہے۔ شاید یہ ریاست کے حکمرانوں کی خدمت کرتا رہا ہوگا۔ اب تک وہی درباری لہجہ اور ادب آداب باقی ہیں۔

تانگہ قصبے کے بازار سے گزرا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں کتنی غربت ہے۔ ٹوٹی پھوٹی خستہ چال سڑکوں پر سے کبھی کبھار کوئی کار دخول اڑاتی گزر جاتی تھی۔ سامان لانے لے جانے والی پک اپ، تانگے، ریڑھے بھی بہت کم تھے۔ دکائیں زیادہ اور خریدار کم تھے۔ عورت دکھائی ہی نہ دیتی تھی۔ دو چار بوڑھی عورتیں یا نو دس سال کی بچیاں بھی چادریں اوڑھے گزریں۔ عام لوگ غریبانہ طبع اور شلوار قمیض میں تھے۔ چنانچہ میں واضح طور پر ان کے درمیان اجنبی لگتا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایک خاموش سوال جیسے ٹھہر جاتا تھا۔

”یہ آگیا آپ کا ہوٹل حضور۔“ تانگے والے نے لگام کھینچی۔ میں نے اس سائن بورڈ کو دیکھا جو ریسٹورنٹ کے ہال کی پوری وسعت تک پھیلا ہوا تھا اور پرانا ہونے کے باوجود اس پر لکھے ہوئے گریڈ ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ کے حروف نمایاں تھے۔ نیچے اعلیٰ طعام اور قیام کا مرکز اردو میں لکھا گیا تھا۔ غالباً سائن بورڈ کسی قریبی شہر سے بنوا کے لایا گیا ہوگا یا پھر یہاں بھی کوئی آرٹسٹ تھا جو خوبصورتی کو سمجھتا تھا۔

جب میں نے رقم ادا کرنے کے لیے بٹوا کھولا تو اس میں سو کا ایک ہی نوٹ نظر آیا۔ کچھ دس کے نوٹ بھی تھے۔ باقی سب پانچ سو اور ہزار والے۔ سو کا نوٹ دیتے ہوئے میں نے دیکھا کہ داہنی طرف سے اس کا ایک حصہ تھوڑا سا پھٹ گیا تھا جسے اسکو اش ٹیپ سے جوڑ کے نوٹ کو بچالیا گیا تھا۔ میں نے تانگے والے سے کہا۔ ”معاف کرنا۔ اس وقت میرے پاس سو کا بھی ایک نوٹ ہے۔ باقی پانچ سو والے ہیں۔ اگر تم چار سو واپس کر سکتے ہو تو.....“

”آپ کیا مذاق فرماتے ہیں جناب عالی۔ اس غریب تانگے بان نے صبح سے چار پیسے نہیں کمائے۔ آپ چار سو کی بات کرتے ہیں۔“ اس نے سر جھکا کے وہ نوٹ

میرے مقابل آ کے اس نے دونوں ہاتھ جوڑے اور رکوع میں چلا گیا۔ ”حضور آپ کا خادم حاضر ہے۔ لایے اسباب مجھے دیجیے۔“

میں نے کہا۔ ”رہنے دیں۔ یہ بیگ میں اٹھا سکتا ہوں۔“

”نہیں حضور۔ ہم جو ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔ یہ فرمایے حضور کس کے مہمان ہوں گے؟“

میں نے کہا۔ ”دیکھیے آپ میرے بزرگ ہیں۔ ایسے حضور نہ کہیں مجھے اور میں کسی کا بھی مہمان نہیں ہوں۔ ایک کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں اور دو تین دن قیام کے لیے مجھے کسی اچھے ہوٹل کی تلاش ہے۔“

اس نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”میں حضور کو بالکل صحیح جگہ پہنچا دوں گا۔ یہاں سیاح اور مسافر نہیں آتے۔ اس لیے ہوٹل صرف ایک ہے۔ نیچے ریسٹورنٹ ہے اور پر صرف دو کمرے ہیں۔ مالک شریف بھی ہے اور بدمعاش بھی۔ حضور حیران نہ ہوں۔ صرف بدمعاشوں کے لیے وہ بدمعاش ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو وہاں بدمعاشی دکھائے۔“ میں اپنا بیگ سامنے والی سیٹ پر رکھ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ”میں آپ کو ایک سو روپے دوں گا۔ قصبہ یہاں سے کتنی دیر کی مسافت پر ہے؟“

وہ آگے بیٹھ گیا۔ ”حضور یہ تو حساب کا سوال ہے۔ فاصلہ وہی دو میل ہے۔ میں آپ کو تقریباً بیس منٹ میں پہنچا دوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”ایک بات بتاؤ۔ جو زبان تم بولتے ہو۔ تمہارا یہ حلیہ اور تانگے کی سجاوٹ سب حیران کرنے والی ہے۔“

”بس حضور اچھے لوگ تھے اور اچھے وقت تھے۔ جب ہم جوان تھے۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ”اب قدر دان نہیں رہے۔ لیکن ہم پرانی وضع پر قائم ہیں۔ ہم اور ہمارے وفادار..... ایک شریک حیات پرانے وقتوں کی منکوحہ دوسرا یہ گھوڑا۔“

”تم کس دور کی بات کر رہے ہو۔ جب یہ ریاست جان پور تھی..... یا جب خانم پور ہوئی۔“

وہ چونکا نہیں مگر اس نے سر گھما کے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ شک کی چمک نظر آئی۔ ”حضور تو سب جانتے ہیں۔ تاریخ سے واقف ہیں۔ نصف صدی سے پہلے کی بات ہے جب میری عمر بھی پچیس سال تھی۔“

”یہ گھوڑا اتنا عمر رسیدہ ہے۔“ میں نے حیرانی سے

میں نے کہا۔ ”مجھے اسٹیشن ماسٹر سے ملنا ہے۔“

”تو میں اسٹیشن ماسٹر بھی ہوں۔“

میں نے اپنا کارڈ اسے دکھایا۔ ”میں ایک کام سے خانم پور آیا ہوں۔ میرا نام ہے راجا، ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔“ اس کی چٹلون کرتے کرتے رہ گئی۔ ”سائیں، تم کام کرو۔ کوئی روکے تو ہمیں بتانا۔ ہم خادم ہیں، خادم حسین۔“ میں نے کہا۔ ”خادم یہاں ٹھہرنے کے لیے کوئی ہوٹل ہے؟“

”اچھے برے کا حال اللہ جانتا ہے۔ ایک ہی ہوٹل ہے۔ باہر ایک ہی اچھا تانگہ کھڑا ہوگا۔ اس میں ایک ہی گھوڑا ہوگا۔ ایک ہی کو چیان اس کی ایک آنکھ ہے۔ وہ ایک سو روپیہ مانگے گا۔ بستی کا ایک ہی راستہ ہے۔“

باہر جہ خستہ حال تانگے موجود تھے۔ ایک اونٹ گاڑی بھی کھڑی تھی جس پر لیٹ کر جایا جاسکتا تھا اور ایک گدھا جسے میں خود ڈرائیو کر سکتا تھا۔ جو تانگے والا مجھے دیکھتے ہی چھلانگ مار کے دوڑا، میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی عمر شاید ستر برس ہوگی لیکن وہ دبلا پتلا اور صحت مند تھا۔ تانگہ دنیا میں ازل سے ہے اور شاید اپنی اسی صورت میں اب تک کہیں نہ کہیں رہے گا۔ لاہور کی مال روڈ پر بند کیا جائے گا تو پھر ہاری شاہ عالمی یا بھائی گیٹ میں نظر آئے گا۔ میں نے اس کے پائیدان سے اس بانس تک بیٹھ کر سفر کیا ہے جہاں میں براہ راست گھوڑے کے کان میں سرگوشی بھی کر سکتا تھا۔ یہ تانگہ بھی عجیب تھا اور تانگے بان بھی۔ تانگے میں چمک دکھ رکھنے والی ہر چیز لگا دی گئی تھی اور اس کی آرائش میں توس قزح کے ساتوں رنگ نظر آتے تھے۔ پرانے رئیس اور نواب شاید ایسے تانگوں میں ہوا خوری کے لیے ٹھکتے ہوں گے۔ پشاور، مردان اور راولپنڈی میں بھی پہلے شوقین مزاجوں کے تانگے یوں نظر آتے تھے جیسے آج نئی پرانی چھوٹی صابن دانوں جیسی کاروں میں کوئی چمکتی دکتی مر سیڈ یا بی ایم ڈیبلو دکھائی دیتی ہے۔

خود تانگے والا شاہی چوہدری قسم کی چیز نظر آتا تھا۔ اس نے ایک زرد دھاری والی شرٹ چٹلون پر سرخ کوٹ پہن رکھا تھا جس کی دونوں آستینوں پر بھی لہائی کے رخ زرد دھاری تھی۔ چٹلون پر واسٹ بہت پرانی تھی اور گھس چکی تھی۔ کوٹ کے سامنے والے تین بٹن پٹیل کے تھے جن کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اس نے زرد دھاری والی ایک سرخ پی کپ بھی لگا رکھی تھی۔ اس لباس میں وہ اپنی سفید ڈاڑھی مونچھوں کے ساتھ ایک مضحکہ خیز کردار لگتا تھا۔

سواری ہے حضور۔ باقی سب تانگے ہیں جن کا ہم سے کیا مقابلہ۔“ اس نے غور سے کہا۔

میں کچھ دیر اسے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ”اچھا تم ٹھہر جاؤ، کچھ دیر بعد مجھے ایک جگہ جانا ہے۔“

ہوٹل کا مالک درشت چہرے اور گٹھے ہوئے سرو والا ایک پہلوان قسم کا شخص تھا لیکن اس نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ ”بس سر۔ آپ کو قیام کے لیے کمرہ چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”جی لیکن آپ نے کیسے جان لیا؟“

وہ مسکرایا۔ ”اس قصبے میں آپ اپنی نظر آتے ہیں۔ ضرور آپ اس ٹرین سے تشریف لائے ہوں گے۔“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، کیا آپ اس قصبے کے ہر فرد کو پہچانتے ہیں۔“

”یہاں سب ہی ایک دوسرے کے شناسا ہیں۔ فرمایے کون سا کمرہ؟ میرے پاس دو کمرے ہیں۔“

”اگر کوئی انٹرکونٹیننٹ ہو تو بتلایے۔“

”ایک ہے۔ کوئی مطالبہ کرتا ہے تو انٹرکونٹیننٹسز چلا دیا جاتا ہے۔ کرائے میں پانچ سو کا اضافہ ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک گزارش ہے میں اپنی آمد کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور نہ میں جیل سے بھاگا ہوں۔ دراصل میں ایک صحافی ہوں۔“ میں نے اسے اپنا کارڈ پیش کیا۔ ”شاید آپ اس نام سے واقف ہوں۔“

”راجا صاحب، آپ کے نام سے کون واقف نہیں جناب۔ یہ تو بڑا اعزاز ہے ہمارے لیے۔“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بس یہی بات ہے جس کی وجہ سے میں اپنی آمد کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ یہ بات عام ہوگئی تو لوگ اپنے اپنے مسئلے لے کر آجائیں گے اور یہاں کی مقامی سیاست کے ٹھیکے دار مجھے پکڑ لیں گے۔ کل پرسوں تک میں واپس چلا جاؤں گا۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا، کوئی خود ہی آپ کو پہچان لے تو اور بات ہے۔“

”اس کا کوئی امکان نہیں، لوگ میرا نام جانتے ہیں میری صورت نہیں پہچانتے۔ اگر میرا ناشا کھانا ہوٹل کے کمرے میں پہنچا دیا جائے تو بڑی عنایت ہوگی۔“

”جیسا آپ کا حکم جناب۔ ہم تو بیٹھے ہی خدمت کے لیے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے ریاست خانم پور پر ایک مضمون

لکھنا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ سے مجھے کافی مدد ملے گی۔“

”میں حاضر ہوں جناب۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

رات بھر کے تکلیف دہ سفر نے مجھے بہت تھکا دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے غسل کیا اور پھر ناشا طلب کیا۔ خلاف توقع مجھے سب کچھ اپنی مرضی کا ملا۔ اس قصبے میں ایسی سہولیات کی توقع بھی نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ کمرہ صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ اسے سی کی ٹھنڈک سے مجھے مزید راحت ملی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ این آر دین کے کمرے میں بلا تاخیر پہنچنا بھی چاہتا تھا پھر خیال آیا کہ اب یہاں تک پہنچ گیا ہوں تو جلدی کیسی۔ کچھ دیر سو کے تازہ دم ہو جاؤں۔

آنکھ کھلی تو دو پہر بھی سہ پہر میں بدل چکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو وزیر علی خاں اپنی شاہی سواری کو ایک درخت کی چھاؤں میں کھڑا کیے بڑے پیار سے گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ کپڑے بدل کے میں نیچے گیا اور بہتر یہ سمجھا کہ کھانا بھی کھا لوں۔

وہ ایک ہال تھا شاید چالس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا جس میں لکڑی کی چوکور میزوں کے گرد چار چار کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ ہال صاف تھا لیکن فرنیچر کی خستہ حالی عیاں تھی۔ غالباً یہاں کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ وہ اس پر باقاعدگی سے رنگ و روغن بھی کر سکتا۔ مقامی آبادی سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ دو دو یا تین چار کے گروپ میں مختلف میزوں پر موجود تھے اور ایک کے سوا سب چائے پی کے گپ لگا رہے تھے۔ ان سب کی بولی میں سندھی اور بلوچی کا عنصر نمایاں تھا۔ انہوں نے بڑے غور سے مجھے دیکھا لیکن کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

کھانا کھاتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ اتنی دور آنے کے بعد کیا مجھے صرف این آر دین کو تین ہزار روپے پہنچا کے لوٹ جانا چاہیے یا سابق ریاست کے متعلق بھی وہ معلومات حاصل کرنا چاہئیں جو تاریخ کا حصہ ہیں اور ہمارے قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ ویسے تو ہر ریاست ہی محلاتی سازشوں کا گڑھ رہی ہے اور زیادہ تر حکمران ظالم اور عیاش بھی گزرے ہیں۔ رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ کرنے والے انصاف پسند یا خدا ترس نوابوں راجوں کے ذکر سے تاریخ کا دامن خالی ہے۔ نہ کسی نے اسکول بنوائے نہ اسپتال شادیاں کرنے کے علاوہ داشتائیں اور کنیزیں رکھتے رہے اور خوشامدی نا اہل درباریوں کے ٹولے پالتے رہے۔

میرے خیالات کا سلسلہ اچانک شروع ہونے والی

چشم دید گواہ

تلخ کلامی اور شور سے ٹوٹ گیا۔ ایک میز پر چار افراد کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک نے خستہ حال پرانی وردی پہن رکھی تھی اور وہی سب سے زیادہ گالیاں بک رہا تھا۔

اس نے اچانک ہاتھ مار کے گلاس کو فرش پر گرادیا اور چلانے لگا۔ ”کیا سمجھ کے ایسی بات کی تو نے صاحب سے۔“

دوسرے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”جانے دو صاحب بے وقوف ہے۔“

”میں اس کا سرو توڑ کے اندر عقل ڈالوں گا۔“ اس شخص نے برہمی سے کہا۔

”کون دے گا مجھے تھوڑی سی عقل۔ تو دے گا۔ مجھ سے زیادہ عقل مند تو ہی ہے۔“

اسے سمجھا بجھا کے بٹھانے والے نے کہا۔ ”ہاں ہاں لے لیں صاحب۔ ابھی آپ بیٹھو۔“

چار کے گروپ میں سے ایک اس شخص کو گھورتا ہوا چلا گیا۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا تو مالک مجھے اشارے سے سمجھا رہا تھا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید وہ ایسے تماشوں کا عادی تھا۔ خود کو صاحب کہلوانے والا ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے پی رکھی تھی۔ چند منٹ بعد وہ باقی تین افراد کے ساتھ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

جب میں باہر نکلا تو وزیر خاں نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے تانگے کو میرے سامنے لے آیا۔ ”جناب والا کہیں تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

میں نے سر ہلادیا۔ ”یہاں ایک شاندار جنرل اسٹور ہے؟“

”بالکل ہے حضور۔“

”اس کا مالک کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”غلام رسول۔ آپ تشریف رکھیے۔“

میں پیچھے بیٹھ گیا۔ تانگا ایک بازار سے گزرا۔ پھر کوئی دیران سڑک آگئی جس کے دونوں جانب نیم پختہ غریبانہ مکان تھے پھر ایک چوک آیا اور تانگا دائیں سمت چلنے لگا۔ وہاں میں نے پرانے محل دیکھے جو زیادہ برے تو نہیں تھے لیکن ان کی خستہ حالی بدلے ہوئے حالات کی عکاسی کرتی تھی۔ ان کے باہر بورڈ لگے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہاں سرکاری دفاتر ہیں۔ اس وقت دفتر بند تھے۔ ایک منزلہ بڑے محل رفتہ رفتہ کھنڈر ہو رہے تھے۔ ان کا رنگ و روغن اڑ گیا تھا۔ دیواروں کا پلستر جھڑ رہا تھا۔ دروازے کھڑکیوں کے پٹ جھول رہے تھے اور ان کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے پرندے آ جا رہے تھے۔ ان محلات کا سلسلہ کافی دور

تک پھیلا ہوا تھا۔ محلوں کے باغات سوکھ چکے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت قصبے کی آبادی دو سے تین لاکھ کے درمیان ہوگی۔ کچھ قدیم وضع کی کوٹھیاں جن کو مقامی لوگ حویلی کہتے تھے شہر کے وسطی علاقے میں تھیں لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی بد حال تھیں۔

پاکستان میں دیہات سے آبادی کے شہروں کی سمت نقل مکانی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ گاؤں چھوڑ کے لوگ قصبوں کی طرف اور قصبوں سے شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ صنعتی علاقے میں کارخانے قائم ہوتے ہیں اور شہری سہولیات میں بہتری نظر آتی ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی، صاف ظاہر تھا بستی اجڑ رہی ہے۔ پیسے والے یہاں سرمایہ کاری نہیں کر رہے اور مقامی آبادی میں وہی بچے ہیں جن کا ٹھکانا کہیں اور نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کم ہمت یا بالکل بے صلاحیت لوگ ہوتے ہیں جو فاقہ کشی کو قبول کرتے ہیں مگر نقل مکانی نہیں کرتے۔ انہیں آبائی زمینوں سے پیار ہوتا ہے جو ان کا پیٹ نہیں بھرتیں۔

تانگا اچانک ٹھہر گیا تو میرے خیالات کی رو بھی ٹوٹ گئی جو میرے مشاہدے کے ساتھ اس بستی کے آج اور کل کا تجزیہ کر رہی تھی۔ مجھے چار دکانیں نظر آئیں۔ ایک شہر گرا ہوا تھا دوسری میں ایک درزی کام کر رہا تھا۔ تیسری میں باربر شاپ تھی اور چوتھی پر شاندار جنرل اسٹور کا سائن بورڈ بہت نمایاں تھا۔ اس کا شہر نصف گرا ہوا تھا۔ میرے معلوم کرنے سے پہلے درزی نے مشین چلانا روک کے مجھے مطلع کیا کہ دکاندار نماز کے لیے گیا ہوا ہے اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

غلام رسول پانچ منٹ بعد آ گیا۔ وہ بچاس پچپن برس کا ادھیڑ عمر، صحت مند، باریش اور شفیق چہرے والا آدمی تھا۔ شلواریں کے ساتھ اس نے واسٹ بھی پہن رکھی تھی اور سر کو سفید لٹھے کی کام والی گول ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا۔

شہر پورا اٹھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کو کچھ چاہیے جناب۔“ تو اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ پرانا مقامی باشندہ ہے۔

میں نے کہا۔ ”میں آپ سے ملنے آیا تھا۔ آپ غلام رسول ہیں۔“

اب اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”جی لیکن میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

میں نے کہا۔ ”کیسے دیکھتے۔ میں راجا ہوں، ایک

رسالے کا ایڈیٹر ہوں اور اخبار میں کالم بھی لکھتا ہوں۔“
”میں نے اخبار یا رسالہ تو نہیں دیکھا لیکن آپ کو جانتا ہوں۔ اندر آئیں۔“ اس نے گرجوٹی سے کہا۔

اس نے میرے لیے اپنی کرسی رکھی اور خود چاول یا آٹے کی دو بھری ہوئی بوریوں پر بیٹھ گیا۔ دکان کی ہر دیوار پر لکڑی کے تختوں سے بنی الماریاں عام استعمال کے ساز و سامان سے بھری نظر آرہی تھیں۔ فرش پر چھوٹی بوریوں میں ہر قسم کی دال چاول اور مسالے نظر آ رہے تھے اور اندر سب کی ٹی جلی بونٹی۔ اس نے ایک شیشے کے پٹ والے فریج میں سے میرے لیے ٹھنڈی بوتل نکالی اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ”غلام رسول صاحب۔ میں کراچی سے آیا ہوں، یہاں کوئی رائٹر رہتا ہے۔ وہ مجھے کہانیاں بھیجتا تھا۔ اس کی تین کہانیاں ہم شائع کر چکے ہیں۔ چوٹی ہمارے پاس پڑی ہے۔ مجھے ان کہانیوں کا معاوضہ ادا کرنا تھا۔ مٹی آرڈر سے رقم بھیجنے میں ڈر تھا کہ رقم کہیں خورد برد نہ ہو جائے۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس بہانے میں خود اس سے مل لوں۔ وہ کہانیاں تمہارے پتے سے بھیجتا رہا ہے۔ تم جانتے ہو گے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کا نام ہے این آر دین۔“

جتنی دیر میں بولتا رہا وہ خاموشی سے سنتا رہا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”این آر دین کوئی مرد نہیں ہے راجا صاحب، ایک خاتون ہے۔“
میرے لیے یہ انکشاف بم کے دھماکے جیسا چونکانے والا تھا۔

”این آر دین عورت ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
”اس کا نام نجمہ ہے۔ رئیس الدین اس کا شوہر ہے۔“
میں نے اپنے برفیہ کيس میں سے وہ خط نکالا جس نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا اور پھر پڑھا، واقعی اس کی عبارت سے کہیں لکھنے والے کے مرد یا عورت ہونے کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے تذکیر و تانیث کا صیغہ کسی جملے میں استعمال نہیں کیا تھا۔

”این آر دین۔ نجمہ رئیس الدین ہے، میں نے خط واپس رکھ لیا۔“

”جی، اس کا دس سال کا ایک بیٹا بھی ہے۔“
میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”مجھے غلط فہمی ہوئی۔ خیر میں اتنی دور سے آیا ہوں تو اس سے مل کر ہی جاؤں گا۔“
غلام رسول نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ مشکل ہے جناب، اس کا شوہر پسند نہیں کرے گا۔“

”کیا مطلب، وہ کہانیاں لکھ کر بھیجتی ہے۔ اس کے شوہر کو اعتراض نہیں ہوتا چاہیے اور وہ سخت پردہ کرتی ہے۔“
”اس کے شوہر کو نہیں معلوم کہ وہ کہانیاں لکھتی ہے۔“
غلام رسول نے میری بات کاٹ دی۔ ”اس لیے وہ میرا ہج استعمال کرتی ہے۔ میں ہی اس کی کہانیاں ڈاک سے بھیج رہا ہوں۔ آپ کا رسالہ اس نے بازار سے منگوا کے دیکھا ہو گا۔ شوہر سے چوری چھپے گھر میں چھپا کے رکھا ہو گا۔“

مجھے سخت غصہ آیا۔ ”کیا اس کا شوہر اتنا جاہل ہے؟“
”ایسا ہی سمجھ لیں، ویسے تو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی شوہر ہی ہوتے ہیں، بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے۔ خود باہر جوتی چاہیں کرتے پھریں بیوی کو سات تالوں میں قید کر لیتے ہیں۔ خود طوائفوں سے دل بہلا لیا یا زاری عورتوں کے پیچھے خوار ہوں۔ بیوی کسی کو نظر اٹھا کے دیکھ لے تو اس پر آوارگی کی تہمت۔“ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔

”کیا وہ..... یعنی رئیس الدین ایسا ہی ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”اتنی ذہین اور تعلیم یافتہ عورت نے آخر اسے قبول کیسے کر لیا تھا اور اب ان حالات میں اس کے ساتھ نباہ پر کیوں مجبور ہے؟“

وہ افسوس سے سر ہلانے لگا۔ ”راجا صاحب! آپ کیا اس ملک کی عورت کے حالات سے اتنے ہی ناواقف ہیں اور پھر ہمارے اس علاقے میں عورت کیا ہے..... اس کی حیثیت بھیڑ بکری سے بھی کم ہے۔ ماں باپ مکمل مالک ہوتے ہیں اس کی تقدیر کے۔ جس سے چاہیں بیاہ دیں۔ بیس سال کی عمر کے لڑکے سے یا ساٹھ سال سے زائد عمر کے بڑھے سے اس کی نقد قیمت وصول کر لیں یا ویسے ہی جب چاہیں کاری قرار دے کر مار دیں۔“

میں نے مایوسی سے کہا۔ ”گو یا میرا یہ سفر انجان گیا۔ میں بے وقوف بنا۔ جسے مرد سمجھ رہا تھا وہ عورت ہے۔ میں تو اسے کہانیوں کا معاوضہ خود دینا چاہتا تھا۔ خیر اب تم میری طرف سے پہنچا دینا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔ اگر وہ چوری چھپے کہانیاں لکھتی ہے تو تین ہزار کی اس رقم کا شوہر کو کیا حساب دے گی۔ اس کے خط سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے گھر میں فاقہ کشی ہے، سخت مفلسی ہے۔“

”اس میں شک کیا ہے۔“
”اس کا شوہر کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”کچھ نہیں۔ سارا دن ادھر سے ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ بد معاشی کرتا ہے، شراب نے اسے تباہ کر دیا ہے۔ اچھی تو ملتی نہیں ایسی ٹھہرا پیتا ہے، اسپرٹ سے بنا ہوا۔“

چشم دید گواہ

”اس کے لیے بھی پیسے کہاں سے آتے ہیں گھر کیسے چلتا ہے؟ کھانا پینا، تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا۔ یہ سب کہاں سے آتا ہے؟ تم نے بتایا کہ ایک بیٹا بھی ہے۔“
”ہاں، شوہر کی آمدنی کے کچھ ذرائع ہیں۔ ریاست کے بڑے لوگوں سے وظیفہ ملتا ہے۔ کچھ میں مدد کرتا ہوں۔ آٹا دال پہنچا دیتا ہوں اور اب آپ سے کیا پردہ..... وہ رشتے میں میری بھانجی ہے۔ واقعی غیرت والا شوہر ہو تو پوچھے کہ یہ روٹی کہاں سے آئی۔ چوٹھا کیسے جل رہا ہے۔ اپنا پیٹ بھر کے نکل جاتا ہے۔ یہ تین ہزار جو آپ لائے ہو یہ بھی اس کی شراب میں بہہ جائیں گے۔ بہت کانٹاں شخص ہے۔ پیسے کی بوفور اسونگھ لے گا۔ بیوی خود نہیں دے گی تو مار پیٹ کے پھین لے گا۔“

”نجمہ نے لکھا ہے کہ وہ خودکشی کر لے گی۔ یہ اس کے حالات کا تقاضا ہے۔ اگر اسے مرنے میں سکون اور نجات کا احساس ملتا ہے تو اس نے تین ہزار کا مطالبہ کیوں کیا؟ اس شرابی شوہر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور وہ لکھتی بھی کیوں ہے، آخر کیا فائدہ؟“

وہ نہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا اور کیا سوچ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔ ”راجا صاحب اگر آپ دو چار دن ٹھہر جاتے تو شاید میں کوئی موقع نکال کے آپ کی اس سے ملاقات کروا دیتا۔“

نہ جانے کہاں سے ایک بچہ نمودار ہوا۔ اس نے غلام رسول کو سلام کیا اور کاغذ کا ایک لفافہ پکڑا دیا۔ غلام رسول نے لفافہ کھلا اور اس میں سے دوسرو بے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی باہر نکل گئے گر گیا۔ اس نے کاغذ اٹھا کے دیکھا اور لڑکے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“

لڑکا پھر سلام کر کے چلا گیا تو غلام رسول نے وہ کاغذ پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ ”ماماجی کیا میرے نام کا کوئی مٹی آرڈر موصول ہوا ہے؟“

”یہ نجمہ کا بیٹا تھا۔“ غلام رسول نے ایک آہ بھری۔ ”وہ شوہر کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکتی ورنہ آسانی سے کسی بھی اسکول میں استانی بن جاتی۔ سلائی کڑھائی جانتی ہے لیکن اس کے لیے مشین چاہیے اور شوہر اسے یہ کام کرنے نہیں دے گا۔ اس کی ناک بہت اونچی ہے۔ یہ کہانیاں بھی اس نے چھپ چھپ کر لکھی تھیں۔ شوہر کو پتا چل جاتا تو اس کی ہڈیاں توڑ دیتا۔ شاید قتل کر دیتا کہ عشق و محبت کی کہانیاں لکھتی ہے۔ وہ چوری چھپے آس پاس کے گھروں کی بچیوں کی قرآن پڑھاتی ہے۔ لوگ مدد کے خیال سے یہ رعایت دیتے ہیں کہ جب

چاہے آجائے اب یہ دوسرو بے کسی نے دیے ہوں گے۔ گھر میں رکھتی تو شوہر تلاش کر لیتا۔ میں اس کے لیے بینک کا کام کرتا ہوں۔ گیارہ سو روپے میرے پاس جمع ہیں۔“

اب میرا خون کھولنے لگا تھا۔ ”یار غلام رسول، آخروہ ایسے شوہر سے نجات حاصل کیوں نہیں کر لیتی۔“

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ”راجا صاحب یہ شہر نہیں ہے جہاں سے آپ آئے ہو۔ وہ ایسی بات زبان پر لائے تو زندہ گاڑ دی جائے گی یا شوہر کے کہنے پر پنجابیت کا فیصلہ ہو گا۔ میں بھی اس معاملے میں بے بس ہوں۔ نجمہ کو اسی شوہر کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔“

”آخر ماں باپ نے کیا دیکھ کے اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی تھی۔“

”ماں باپ نے تو اچھا ہی کیا تھا۔ وہ مہذب اور شریف انسان تھا۔ باعزت تھا اور اس کی آمدنی بھی معقول تھی۔ خراب تو نجمہ کی قسمت تھی۔ شوہر کا مزاج اور کردار بگڑ گیا۔ ایک بچہ بھی ہو گیا، اب جائے تو کہاں جائے۔“
”یہ رقم جو وہ تمہارے پاس جمع کر رہی ہے، کس لیے؟“

غلام رسول کی آنکھوں میں ایک محبت بھری چمک پیدا ہوئی۔ ”لڑکا اسماعیل چھٹی جماعت میں پڑھتا ہے اور اللہ کا شکر ہے صورت شکل میں باپ پر گیا ہے مگر ذہانت اور فطرت ماں پر۔ اسے وہ بڑی محنت سے پڑھا رہی ہے۔ باپ کی مخالفت کے باوجود..... اور شاید اسی کے لیے زندہ بھی ہے۔ بڑی ہمت والی لڑکی ہے۔ کہتی ہے اسماعیل کو کالج بھیجوں گی۔ ڈاکٹر بناؤں گی۔“

گھٹو کا سلسلہ بار بار ٹوٹ جاتا تھا جب کوئی گا ہک آ جاتا تھا۔ مغرب کا وقت بھی گزر گیا تو میں نے غلام رسول سے اجازت لی۔ خود اسے بھی نماز کا وقت نکل جانے کی فکر ہو گی۔ مغرب اور عشا کے درمیان وقفہ بھی کتنا ہوتا ہے۔ وزیر خاں اپنی بھٹی میں ساکت بیٹھا تھا۔ اس کا سرا تاجھکا ہوا تھا کہ ڈاڑھی اس کے سینے کو چھو رہی تھی۔

”وزیر خاں کیا سو گئے؟“ میں نے کہا۔
میری آواز سن کر اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ ”بس اب سونا ہی تو ہے حضور، یوم حشر تک۔ لیکن ابھی ہماری آنکھوں میں نیند کہاں۔“

میں تانگے میں بیٹھ گیا۔ ”چلو مجھے شہر کی سیر کرادو۔“
”نہ یہ شہر ہے حضور، نہ یہاں کوئی قابل دید جگہ ہے۔ کچھ پرانے کھنڈر ہیں، کچھ قبرستان۔ ہاں ایک نہر گزرتی ہے

کچھ دور سے۔ اس کے کنارے پر جو پارک ہے کسی زمانے میں بہت شاندار باغ بنایا گیا تھا۔ نہر کے پانی کو فوارے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ پن چکی تو آپ نے دیکھی ہوگی۔“

”نہیں۔“ نہر پر چل رہی ہے پن چکی۔ دھن کی پوری ہے کام کی چکی۔ یہ شعر سنا تھا۔“

”وہ بھی دیکھ سکتے ہیں آپ۔ باغ تو خیر اجڑ گیا ہے فوارے بند ہو چکے ہیں۔ چوراچکے لائنس تک لے گئے۔ پہلے رات کو میلا سا ہوتا تھا..... خصوصاً گرمیوں میں۔ اب ادھر کوئی نہیں جاتا۔ آوارہ گرد اور نشئی بیٹھتے ہیں یا جواری۔“

”تم نے پرانا وقت دیکھا ہے، کل کسی وقت تم سے گئے زمانے کی ساری کہانی سنوں گا۔“ میں نے کہا۔

پارک میں واقعی کچھ نہیں تھا۔ نہر کی لمبائی کے رخ بنے ہوئے پارک کی طوالت ایک فرلانگ سے زائد ہی تھی۔ کچھ لوگ وہاں مالش کروا رہے تھے کچھ واقعی نشے میں بے سدھ پڑے تھے اور ہیروچی بھی ہو سکتے تھے، کچھ لوگ نہر میں نہا رہے تھے۔ حیرت مجھے نہانے والوں میں ایک عورت کو دیکھ کر ہوئی۔ اس کے ساتھ دو مرد تھے اور بہ ظاہر سب کپڑے اتار کے ہی نہا رہے تھے۔ عورت زور زور سے ہنس رہی تھی۔ ظاہر ہے کوئی شریف عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ حیرانی مجھے اس پر ہوئی کہ وہاں موجود لوگوں میں سے کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وجہ اس وقت میری سمجھ میں آئی جب میں نے ان کے قریب جانے کی کوشش کی۔ ابھی میں پچاس گز دور ہی تھا کہ ان میں سے ایک نے مجھے گالی دے کر کہا۔ ”کون..... ہے..... کیا دیکھ رہا ہے۔ چل دفع ہو ادھر سے۔“

پھر دوسرے نے کہا۔ ”اچھا آجا۔ تیری لاش کے ٹکڑے کر کے بہا دیں۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ جرائم پیشہ اور خطرناک بد معاش ہیں چنانچہ جو جانتے ہیں وہ چپ ہی رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ خود میں نہ جھگڑا چاہتا تھا اور نہ کوئی پریشانی مول لینے کے موڈ میں تھا، میں فوراً واپس ہو گیا اور تانگے میں آ بیٹھا۔ وزیر خاں مجھے واپس ہوٹل لے گیا۔

”کیا حضور کو کل میری خدمات کی ضرورت ہوگی؟“

اس نے مجھ سے سوکا نوٹ لے کر بڑی احتیاط سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے سرخ کوٹ میں چمکنے والے جینل کے تین بٹنوں میں سے ایک کم ہے۔ ”ابھی مجھے چار دن رکنا ہوگا۔ تمہارے کوٹ کا ایک بٹن ٹوٹ گیا۔“

وہ چونکا اور لاشعوری طور پر اسے چھپانے لگا۔ ”کہیں گر گیا ہے حضور۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ان پر ہر روز جینل پالش کرتے ہو۔ سونے کی طرح چمک رہے ہیں۔“

وہ زبردستی مسکرایا۔ ”ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی حضور آپ نے سنا ہی ہوگا۔“

ہوٹل میں مالک نے مجھے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ہی روک لیا۔ ”جناب راجا صاحب۔ ایک منٹ..... ایک درخواست ہے۔ وہ جو آپ کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ خالی تھا، وہ کسی نے لے لیا ہے۔“

”اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟“ میں نے مسکرا کے کہا۔

”وہ دراصل۔ آپ نے دن میں دیکھا ہوگا۔ ایک شخص نشے میں جھگڑا کر رہا تھا۔“

”وہ صاحب۔ شرابی؟“

”جی، سر معلوم نہیں اس کے ہاتھ میں کہاں سے رقم آگئی۔ ایک طوائف کے ساتھ آ گیا کہ مجھے کمرہ چاہیے، کہنے لگا یہ میری بیوی ہے۔“

”آپ انکار کر سکتے تھے۔“

”نہیں جناب۔ آپ اس مسئلے کو نہیں سمجھتے۔ مجھے یہاں رہنا ہے اور ہوٹل بھی چلانا ہے۔ جھگڑا فساد نہیں کر سکتا۔ یہ شخص روز کسی کو لے کر آ جائے اور ہنگامہ کرے تو گاہک آنا چھوڑ دیں گے۔“

”آپ پولیس سے مدد لے سکتے ہو۔“

وہ تکی سے مسکرایا۔ ”راجا صاحب۔ صحافی ہو کے آپ ایسی بات کرتے ہو؟ یہاں بھی پولیس شریف آدمی کے ساتھ نہیں بد معاشوں کے ساتھ ہے۔ یہ شخص پولیس کا منبر بھی ہے۔ آپ اسے برداشت کر لیں پلیز۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے کیا پرابلم ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں جو چاہے کرے۔ کھانے میں جو اچھا ہے میرے لیے بھیج دیں۔“

سونے سے پہلے میں بہت دیر تک نجمہ رئیس الدین کے متعلق سوچتا رہا۔ یہ عجیب قصبہ تھا۔ یہاں نیا دور کی بد معاش کی طرح زبردستی قابض ہوتا جا رہا تھا اور اس کے آثار ناجائز تجاوزات کی طرح پھیل رہے تھے۔ پرانے وقت کے لوگ اپنی روایات اور وضع داری کے ساتھ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے، ختم ہو رہے تھے۔ ایسے ہی تہذیب کا عروج و زوال ہوتا ہے۔

اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ تبھی جیسا تا نگا چلانے والا بھی ریاست کا نمک خوار تھا اور اسی شاہی سواری کو روزی کمانے کے لیے استعمال کر رہا تھا مگر پوری وضع داری اور آن بان کے ساتھ ستر سال سے زائد عمر کا یہ شخص یقیناً مجھے ریاست کی قدیم تاریخ کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا تھا۔ شاید ہوٹل کے مالک نے خود وہ وقت نہ دیکھا ہو مگر اپنے باپ دادا سے بہت کچھ سنا ہو۔ ایسے عمر رسیدہ افراد بھی بہت ہوں گے۔

مجھے نیند آنے لگی تھی کہ ایک دھماکے نے مجھے ہڑبڑا کے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ یہ فائر کی آواز تھی جو میرے ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں وہ صاحب ایک طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا ہے۔ کیا اس نے نشے میں طوائف کو خون کر دیا؟ یہ سوچ کے میں تیزی سے نیند بھلا کے دروازے سے نکلا۔ نیچے ریسٹورنٹ سے ایک ویٹر کے ساتھ مالک اوپر آ رہا تھا۔ میں نے غصے میں زور سے ساتھ والے کمرے کا دروازہ بجایا۔

اندر سے کسی نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ ”کون ہے بے!“ میں نے دہاڑ کے جواب دیا۔ ”دروازہ کھولو۔“ اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ہم آرام فرما رہے ہیں۔“

میں نے دروازے پر لات ماری۔ ”دروازہ کھولو، نہیں تو میں توڑ کے اندر آ جاؤں گا۔“ چند سیکنڈ کے بعد کسی نے اندر سے کنڈی کھولی اور دروازے کے چار انچ کھلے پٹ سے مجھے صاحب کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ صرف ایک دھار پدار پاجامے میں تھا جو اس نے الٹا پہن رکھا تھا۔ ”کیا پریشانی ہے تمہیں؟“

میں نے غرا کے کہا۔ ”گوئی کس نے چلائی تھی؟“ میرے پیچھے سے ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ”کیا تم نے خون کر دیا ہے اس عورت کا جسے تم اپنی بیوی بنا کے لائے تھے۔“

میں نے دھکا دیا تو دروازہ پورا کھل گیا۔ اندر کا پورا نقشہ میرے سامنے آ گیا۔ ایک فریبہ جسم کی عورت نے غلٹ میں بستر کی چادر کھینچ کے اپنے بے لباس جسم کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی عمر تو شاید تیس سال کے لگ بھگ تھی لیکن کثرت استعمال سے اس کا جسم ڈھلک گیا تھا اور

بد اعمالی اس کے چہرے پر بد صورتی بن کے پھیل گئی تھی۔ وہ نہایت بے شرمی سے اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ ”یہ کیا بکواس ہے۔“ صاحب بولا۔ ”میں نے کسی کا خون نہیں کیا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ پر الزام لگانے کی..... اور تم کون ہو خدا کی فوجدار۔“ وہ میری طرف ہڑبڑا مالک نے دہاڑ کے کہا۔ ”گوئی کس نے چلائی تھی؟“ ”میں نے۔“ وہ سکون سے بولا۔ ”اپنے دفاع میں۔“

میں نے کہا۔ ”کس پر چلائی تھی۔ کس نے تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اس عورت نے؟ ریوا لور کہاں ہے؟“ اس نے تکیے کے نیچے سے ریوا لور نکالا۔ ”یہ میرا ریوا لور ہے۔ اس کا لائسنس ہے میرے پاس اور اسے میں اپنے دفاع میں استعمال کرنے کا پورا حق رکھتا ہوں۔ خطرہ مجھے اس سے تھا۔“

اس کے ہاتھ کا اشارہ چھت کی طرف تھا۔ میری اور ہوٹل کے مالک کی نظر ایک ساتھ اوپر اٹھی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

”یہاں ایک چھپکلی تھی۔ میں نے اسے مار دیا تو کیا جرم کیا؟ چھپکلی ایک خطرناک زہریلا جانور ہے۔“ میں نے دیکھا تو دیوار کی جڑ میں ایک چھپکلی کی جسم سے الگ ہو جانے والی دم اب بھی مل رہی تھی اس کا بقیہ حصہ گوئی لگنے سے ٹکڑے ہو کر پیچھے پھیلا ہوا تھا۔

”تم کہتے ہو ہوٹل شرفا کے قیام کے لیے ہے اور کمروں میں خطرناک زہریلے جانور پالتے ہو۔ پھر بے گناہ شریف لوگوں کی نیند خراب کرتے ہو۔ ان پر جھوٹے الزامات لگاتے ہو۔“ وہ چلانے لگا۔

میں نے اس کی گردن دیوچ لی۔ ”تم نے میری نیند خراب کی ہے۔“

ہوٹل کے مالک نے مجھے کھینچ لیا۔ ”جانے دیں راجا صاحب۔ صاحب ہوش میں نہیں ہیں۔“ پھر وہ صاحب سے مخاطب ہوا۔ ”یہ بھی مسافر ہیں۔ کراچی کے مشہور صحافی راجا صاحب۔“

میرے صحافی ہونے کا سن کے صاحب کا غصہ اور جوش و خروش ایک دم سرد پڑ گیا تھا۔ ہمارے باہر نکلتے ہی دروازہ پھر بند ہو گیا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کی طرف دیکھا مگر اسے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ ڈرپوک شاید نہ ہو لیکن وہ مقامی باشندہ تھا اور اس کو یہاں رہتے ہوئے اپنا ہوٹل بھی چلانا تھا۔ اپنی کاروباری مجبوری کا اظہار اس نے پہلے ہی کر دیا تھا۔

چشم دید گواہ

صبح کا ناشتا میں نے دیر سے کیا۔ میں سو کر بھی دیر سے اٹھا تھا۔ گھڑی دیکھ کر میں نے ناز آفرین سے کچھ رومانی ڈائلاگ بولنے کے لیے فون کرنا چاہا تو موبائل پر سنگٹل نہیں آ رہے تھے۔ میں نے نیچے جا کر ہوٹل کے مالک سے اس ریاست کے ماضی پر بات کرنی چاہی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے نکلا ہوا ہے اور شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ وزیر خاں بڑی مستعدی سے اپنی بھی میں میرا انتظار کر رہا تھا۔

”حضور والا۔ مجھے غلام رسول نے ایک پیغام دیا تھا آپ کے لیے کہ آپ فرصت ملتے ہی اس سے ملاقات کر لیں۔“ وزیر خاں نے کہا۔

”تم میرے کمرے میں آ کے مجھے یہ پیغام دے سکتے تھے۔“

”وہ..... جناب عالی یہ خلاف مصلحت تھا۔“ وہ بولا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ والے کمرے میں نجمہ کا شوہر رئیس الدین ایک بازاری عورت کے ساتھ موجود تھا اور وزیر خاں بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں پھر شاندار جنرل اسٹور میں بیٹھا کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔

”تم نے وزیر خاں کو پیغام دے کر مجھے بلوایا تھا۔“ غلام رسول نے کہا۔ ”جی سر۔ میرے علم میں ایک بات آئی تھی کہ رئیس کے ہاتھ کہیں سے کچھ رقم لگی ہے اور وہ بیچ بیچ کارٹیکس بنا یہاں کی ایک بازاری عورت کے ساتھ اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں پڑا ہے جہاں آپ کا قیام ہے۔ کل رات وہ گھر نہیں آیا تھا۔ شاید آج بھی نہ آئے۔ یہ موقع بہت غنیمت ہے، آپ چاہیں تو نجمہ سے مل لیں لیکن میرا نام بیچ میں نہ آئے۔ آپ تو جانتے ہیں رئیس کس قماش کا آدمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی ہنگامہ آرائی سے میری دکانداری خراب ہو۔“

ہر شخص کسی نہ کسی وجہ سے رئیس کو برا بھی سمجھتا تھا مگر اس سے ڈرتا بھی تھا۔ میں وزیر خاں کے تانگے میں جا بیٹھا۔ شاید اسے غلام رسول نے اشارے سے بلایا تھا کہ وہ دو منٹ کے لیے گیا اور لوٹ آیا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وزیر خاں نے مجھے نجمہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔ اس جنگ گلی میں تانگے کا جانا بھی محال تھا۔

”میں حضور کا اسی جگہ انتظار کروں گا۔“ اس نے تانگے کو ایک درخت کے گھنے سائے میں کھڑا کر دیا۔ ”وہ بائیں ہاتھ پر گیارہواں گھر ہے جہاں آپ جانا چاہتے ہیں۔ پیلے رنگ کا دروازہ ہے۔ کھٹی نہیں ہے، کنڈی بجائیں

گے تو اسماعیل دروازہ کھولنے آئے گا۔“ کنڈی بجانے سے پہلے میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ گلی میں سے صرف ایک شخص گزر رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا مگر سوال کے بغیر چلا گیا۔ اسماعیل فوراً نمودار ہو گیا اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”کل آپ ماما جی کی دکان پر آئے تھے۔“

”ہاں مجھے انہوں نے یہاں بھیجا ہے۔ جا کے اپنی امی کو بتاؤ، کراچی سے راجا صاحب آئے ہیں۔“ ”اسماعیل کے جواب دینے سے پہلے ہی اندر سے آواز آئی۔“ راجا صاحب۔ آجائیے۔“

یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہی تھی اور جب کنڈی بجی تو وہ بھی اسی آس میں اسماعیل کے ساتھ دروازے تک آ گئی تھی کہ شاید میں آ گیا ہوں۔ میں ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو نیم تاریک راستے پر مجھے دائیں جانب ایک دروازہ دکھائی دیا۔ اندر سے پھر اسی آواز نے کہا۔ ”تشریف لائیے راجا صاحب۔“

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس علاقے کی تہذیب اور قبائلی یا خاندانی نظام میں عورت کو یہ آزادی حاصل نہ تھی کہ وہ کسی غیر مرد کو گھر میں بلائے۔ خصوصاً شوہر کی غیر موجودگی میں۔

نجمہ نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا لیکن اس میں واضح طور پر اسے اپنے ماموں کی حمایت حاصل تھی اور کسی حد تک وزیر خاں بھی اس میں شریک تھا۔ مجموعی طور پر سب کی ہمدردی نجمہ کے ساتھ تھی اور کوئی اس کے شوہر کو اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا مگر اس سے نجمہ کو یہ رعایت بہر حال حاصل نہیں ہوتی تھی کہ وہ عشق و محبت کی کہانیاں لکھے شائع کرائے اور بد یروں کو گھر میں بلائے۔

وہ اب بھی ایک خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ اس کی عمر شاید پچیس سال ہوگی کیونکہ یہاں لڑکیاں پندرہ سال کی ہونے سے پہلے ہی بیاہ دی جاتی تھیں۔ دیکھنے میں وہ پینتیس کی لگتی تھی لیکن یہی وہ عمر ہے جب عورت کا حسن ماہ کامل بنتا ہے۔ اس کا رنگ صاف تھا اور اس نے کسی اسکول گرل والا لباس پہن رکھا تھا، نیلی قمیص اور سفید شلوار دوپٹا۔ جس نے نجمہ کی عمر کا تاثر مزید کم کر رکھا تھا۔ دوپٹا اس نے سر کے گرد یوں پہنا تھا کہ رخ روشن کے گرد ہالاسا نظر آتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں خوش ادائی اور مسکراہٹ میں موتیوں جیسے چمکتے دانتوں نے خوش نمائی پیدا کر دی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا۔ ”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ کل مجھے آپ کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ تشریف رکھیے۔“

میں ایک پرانی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اگر میرے لیے براہ راست یہاں آنا ممکن ہوتا تو میں ہوٹل نہ جاتا۔ سیدھا یہاں آتا۔“

وہ مجھ سے کافی فاصلے پر رکھی ہوئی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”آپ کا مجھ سے ملنا کوئی ضروری تو نہیں تھا۔ اگر آپ رقم لائے ہیں تو ماما جی کو دے سکتے تھے۔“ اس نے ٹیبل فین کا رخ میری طرف کر دیا۔

”بجا ارشاد۔ میں آپ کے بلانے پر آیا ہوں ورنہ یہی کرتا۔ میرے لیے یہ شاک کم نہ تھا کہ این آر دین ایک عورت ہے۔ بہت کچھ آپ کے خط کے مضمون سے اندازہ ہو گیا تھا یہاں آ کے کچھ اور بھی معلوم ہوا۔ اب میرا شاک ہی شدید غصے میں بدل گیا ہے۔“

”غصہ آپ کو مجھ پر آیا ہے یا میرے سچ پر۔“

”آپ کے جھوٹ پر۔ آپ نے سارا سچ نہیں لکھا تھا اور سچ میں ڈنڈی مارنا بھی جھوٹ سے کم نہیں۔ آپ نے اپنے شوہر کے بارے میں.....“

اس نے خوفزدہ نظر سے باہر دیکھا۔ ”پہلے بتائیں آپ کیا پتیں گے۔ میں چائے بھی اچھی بناتی ہوں۔“

”میں جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤں تو آپ کے حق میں بہتر ہوگا۔ آپ کے ہاتھ کی بنی اچھی چائے پھر بھی سبکی۔“

”اچھا تو کولڈ ڈرنک لے لیں۔“ اس نے کہا اور اپنے بچے کو آواز دی۔ ”دیکھو ایک ٹھنڈی بوتل لاؤ مگر ماما جی کی دکان سے لاتا۔ یہاں سب نقلی رکھتے ہیں۔“

جب وہ اسماعیل کو سوسکا نوٹ پکڑا رہی تھی تو نوٹ نیچے گر گیا اور ہوا کے جھونکے سے اس کرسی کے نیچے چلا گیا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا اس نے جھک کر نوٹ اٹھایا تو میں نے دیکھا اس کے ایک کونے پر اسکاچ ٹیپ لگا ہوا ہے۔ یہ نوٹ عین اسی جگہ سے جوڑا گیا تھا جیسے وہ نوٹ میں نے وزیر خاں کو دیا تھا۔

میں نے کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میرے ذہن میں جنم لینے والا شک از خود یقین میں بدل گیا۔ دنیا اتفاقات سے خالی نہیں مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ نوٹ عین اسی جگہ سے پھٹ گیا ہو جہاں سے وہ نوٹ پھٹا تھا اور پھر سو فیصد اسی انداز میں جوڑا جائے۔ نمبر کے یاد ہوتا ہے لیکن ایک سوال کسی ضدی فقیر کی طرح ٹٹنے کا نام نہ لیتا ہو، میرے

سامنے آکھڑا ہوا۔ آخر وہ نوٹ جو میں نے تانگے بان وزیر خاں کو دیا تھا نجمہ کے پاس کیسے پہنچا؟ کیا ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق ہے جس کا مجھے علم نہیں۔ اب اسماعیل اپنے ماما کی دکان سے بوتل لینے جائے گا تو کیا ماما اس سے بوتل کی قیمت لے گا؟ اسے تو معلوم ہے کہ نجمہ کے پاس کون مہمان بیٹھا ہے۔

میں نے اسماعیل کو روک دیا۔ ”میں بوتل نہیں بیٹا۔ اور نوٹ نجمہ کو واپس کر دیا۔“ تم جاؤ اسماعیل اپنا کام کرو۔“

نجمہ کچھ اب سیٹ ہوئی۔ اس نے اسماعیل کو دس روپے دیے اور بولی۔ ”چلو میں چائے بناتی ہوں تم بیکری سے بسکٹ لے آؤ۔“

یہ آخری جملہ نجمہ نے ڈانٹ کے کہا تھا۔ اسماعیل نوٹ لے کر نکل گیا۔ ”تم نہیں چاہتی تھیں کہ وہ موجود رہے۔“

”ہاں خدا خواستہ آپ سے یوں ملنا میرا جرم ہے تو میرا بیٹا بھی میرے خلاف گواہی دینے پر مجبور کیوں ہو۔ میں نے اسے دور بھیجا ہے آنے جانے میں پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔“

”میں آپ کے شوہر نامدار صاحب سے دوبار مل چکا ہوں۔ کل دوپہر کھانا کھاتے ہوئے بھی میں نے اسے جھگڑا کرتے دیکھا۔ وہ نشے میں دھت تھا اور پھر کل رات۔“

اس نے سچی سے کہا۔ ”ہوٹل کے کمرے میں ایک طوائف کے ساتھ۔ آپ کا جھگڑا ہوا تھا اس کے ساتھ۔“

”اوہ تمہیں پوری رپورٹ مل چکی ہے۔“

”یہ شہر نہیں ہے راجا صاحب۔ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم نئے آنے والے نہیں۔ ایک صدی سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں۔ لوگ ہمیں جانتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”لوگوں کی طرح میری ساری ہمدردی بھی آپ کے ساتھ ہے مگر کیا آپ کے لیے محض ہمدردی کے الفاظ کافی ہیں؟“

”جینے کے لیے یہ سہارا ہی بہت ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”یعنی وہ بھی جھوٹ لکھا تھا آپ نے کہ میں خودکشی کر لوں گی۔ جینے کے بہانے تلاش کر سکتی ہیں۔ خیر یہ لیجئے اپنے تین ہزار اور اس کے ساتھ یہ چوٹی اور پانچویں کہانی کے دو ہزار۔ اب کم سے کم میں بری الذمہ ہوں۔ یہ پانچویں کہانی آپ کب ارسال کریں گی۔“

”انشاء اللہ آئندہ ماہ۔“

”یہ پانچ ہزار اپنے پاس رکھے تو اندیشہ ہے کہ صاحب کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ کیا یہ بھی آپ اپنے ماما جی کے بینک میں جمع کرائیں گی؟“

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”مجبوری ہے۔“

”دیکھیے آپ کے ماما جی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ آپ کی زندگی یقیناً بہت سخت آزمائش ہے لیکن مرنے کا آپ کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ رقم آپ کس مقصد کے لیے جمع کر رہی ہیں۔ بیٹا تو ابھی چھٹی جماعت میں ہے۔ اسے ڈاکٹر بنانے کی منزل بہت دور ہے اور اس کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں درکار ہوں گے۔ اسماعیل کے کسی میڈیکل کالج میں پہنچنے تک یہ رقم اس سے دینی تکنی ہوگی جو آج درکار ہے۔ اور آپ کا شوہر اس کو پڑھانے کے حق میں نہیں۔ اس کو تعلیم کی قدر ہوتی تو وہ آپ کو بے توقیر نہ کرتا۔“

وہ بڑی مشکل سے آنسو روک رہی تھی۔ ”میری کوئی تعلیم نہیں۔“

”اتنی ضرور ہے کہ آپ استانی بن سکتی ہیں۔ آپ ٹیوشن پڑھاتی ہیں اور کہانیاں لکھتی ہیں، چھپ چھپ کے۔“

وہ تھم لہجے میں بولی۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں میں یہ رقم کیوں جمع کر رہی ہوں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر طلاق لینا یہاں ممکن ہوتا تو میں کہتا کہ آپ خلع کا کیس دائر کریں گی۔“

”میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ اسماعیل کو لے کر نکل جائیں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ”میں کہاں جا سکتی ہوں ہر صورت میں اپنا آخری ٹھکانا مجھے قبر ہی نظر آتی ہے۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دنیا میں بقا کے اصول ہمیشہ وہی رہتے ہیں۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ کمزور کے لیے قبا ہے۔ عورت نے خود کو کمزور سمجھ لیا ہے اور اسے اپنی بد نصیبی بنا لیا ہے۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو.....“

”تو..... کیا کرتے؟“ اس نے جیسے سانس روک کر کہا۔

”میں ایسے شوہر کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے اسے قتل کر دیتا یا اگر ادیتا۔ افسوس کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میری طرف سے ہر کہانی کا معاوضہ آپ کو ملتا رہے گا۔ میں غلام رسول کے نام سے مٹی آرڈر کرادوں گا۔“ میں

نے کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔ دروازے پر میں رکا۔ ”ہاں ایک آخری بات۔ میری طرف سے آپ کو مکمل پیشکش ہے۔ آپ جب چاہیں اس پتے پر میرے پاس آ جائیں جس پر آپ کہانیاں بھیجتی ہیں۔ میرے رسالے میں نہ سہی، کہیں اور آپ کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ ایک زنانہ رسالہ بہت جلد ہی اشاعت کا آغاز کرے گا۔ آپ اس کی مدیر ہو سکتی ہیں۔“

وہ ہکا بکا کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نہ جانے جذبات کی کس رو میں بہہ کر اس عورت کو اکسانے کی کوشش کی تھی کہ وہ شوہر کو قتل کر دے اور بھاگ کر میرے پاس آ جائے۔

وزیر خاں باہر اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا۔ بیکری سے بسکٹ لانے والا بچہ مجھے گلی میں واپس آتا ملا۔ اسے کیا معلوم کہ ماں نے اسے کیوں باہر بھیج دیا تھا۔ وہ اس پر حیران تھا کہ میں چائے پیے بغیر واپس جا رہا ہوں۔ میں اس کی نظر میں ایک پراسرار کردار بن گیا تھا۔

”حضور اب کہاں تشریف لے جائیں گے؟“

وزیر خاں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں! ہوٹل میں وہ خبیث الزماں رئیس الدین نہیں ہوتا تو میں تم سے اپنے کمرے میں بات کر سکتا تھا۔ کیا حرج ہے اگر ہم نہر کے کنارے بیٹھ کے بات کر لیں۔“

”اس وقت.....؟ بھری دوپہر میں جناب والا۔“

میں نے کہا۔ ”ہم کسی سایہ دار درخت کے نیچے نہر کے پانی میں پاؤں ڈال کے بیٹھ سکتے ہیں اور پلنگ مناسکتے ہیں۔ اگر کچھ کولڈ ڈرنک وغیرہ بھی لے جائیں۔“

”وہاں الو بول رہے ہوں گے جناب۔“

”بڑی اچھی بات ہے۔ وہ انسانوں کی زبان نہیں سمجھتے۔ ہمیں مکمل خلوت میسر آئے گی، چلو۔“ میں تانگے میں بیٹھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وزیر خاں کچھ اب سیٹ ہے لیکن وہ مجھ پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دے رہا ہے۔ وہ کچھ کم صم تھا اور اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں خلا میں دیکھنے لگتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ میری طرف متوجہ تھا۔ ہر بات سن رہا تھا اور ہر بات کا جواب اسی شائستگی سے دے رہا تھا جو اس کے مزاج کا حصہ تھی مگر مصنوعی لگتی تھی۔

نہر کی طرف جانے والا راستہ بھی اس وقت سنسان تھا۔ ایک جگہ اینٹوں کے بچنے کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا

”یہ پانچ ہزار اپنے پاس رکھے تو اندیشہ ہے کہ صاحب کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ کیا یہ بھی آپ اپنے ماما جی کے بینک میں جمع کرائیں گی؟“

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”مجبوری ہے۔“

”دیکھیے آپ کے ماما جی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ آپ کی زندگی یقیناً بہت سخت آزمائش ہے لیکن مرنے کا آپ کا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ رقم آپ کس مقصد کے لیے جمع کر رہی ہیں۔ بیٹا تو ابھی چھٹی جماعت میں ہے۔ اسے ڈاکٹر بنانے کی منزل بہت دور ہے اور اس کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں درکار ہوں گے۔ اسماعیل کے کسی میڈیکل کالج میں پہنچنے تک یہ رقم اس سے دینی تکنی ہوگی جو آج درکار ہے۔ اور آپ کا شوہر اس کو پڑھانے کے حق میں نہیں۔ اس کو تعلیم کی قدر ہوتی تو وہ آپ کو بے توقیر نہ کرتا۔“

وہ بڑی مشکل سے آنسو روک رہی تھی۔ ”میری کوئی تعلیم نہیں۔“

”اتنی ضرور ہے کہ آپ استانی بن سکتی ہیں۔ آپ ٹیوشن پڑھاتی ہیں اور کہانیاں لکھتی ہیں، چھپ چھپ کے۔“

وہ تھم لہجے میں بولی۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں میں یہ رقم کیوں جمع کر رہی ہوں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر طلاق لینا یہاں ممکن ہوتا تو میں کہتا کہ آپ خلع کا کیس دائر کریں گی۔“

”میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ اسماعیل کو لے کر نکل جائیں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ”میں کہاں جا سکتی ہوں ہر صورت میں اپنا آخری ٹھکانا مجھے قبر ہی نظر آتی ہے۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دنیا میں بقا کے اصول ہمیشہ وہی رہتے ہیں۔ بقا صرف طاقتور کے لیے ہے۔ کمزور کے لیے قبا ہے۔ عورت نے خود کو کمزور سمجھ لیا ہے اور اسے اپنی بد نصیبی بنا لیا ہے۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو.....“

”تو..... کیا کرتے؟“ اس نے جیسے سانس روک کر کہا۔

”میں ایسے شوہر کے ہاتھوں قتل ہونے سے پہلے اسے قتل کر دیتا یا اگر ادیتا۔ افسوس کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ خدا بھی انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ میری طرف سے ہر کہانی کا معاوضہ آپ کو ملتا رہے گا۔ میں غلام رسول کے نام سے مٹی آرڈر کرادوں گا۔“ میں

نے کمرے کے دروازے کا رخ کیا۔ دروازے پر میں رکا۔ ”ہاں ایک آخری بات۔ میری طرف سے آپ کو مکمل پیشکش ہے۔ آپ جب چاہیں اس پتے پر میرے پاس آ جائیں جس پر آپ کہانیاں بھیجتی ہیں۔ میرے رسالے میں نہ سہی، کہیں اور آپ کے لیے جگہ نکل آئے گی۔ ایک زنانہ رسالہ بہت جلد ہی اشاعت کا آغاز کرے گا۔ آپ اس کی مدیر ہو سکتی ہیں۔“

وہ ہکا بکا کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نہ جانے جذبات کی کس رو میں بہہ کر اس عورت کو اکسانے کی کوشش کی تھی کہ وہ شوہر کو قتل کر دے اور بھاگ کر میرے پاس آ جائے۔

وزیر خاں باہر اپنے گھوڑے سے باتیں کر رہا تھا۔ بیکری سے بسکٹ لانے والا بچہ مجھے گلی میں واپس آتا ملا۔ اسے کیا معلوم کہ ماں نے اسے کیوں باہر بھیج دیا تھا۔ وہ اس پر حیران تھا کہ میں چائے پیے بغیر واپس جا رہا ہوں۔ میں اس کی نظر میں ایک پراسرار کردار بن گیا تھا۔

”حضور اب کہاں تشریف لے جائیں گے؟“

وزیر خاں نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں! ہوٹل میں وہ خبیث الزماں رئیس الدین نہیں ہوتا تو میں تم سے اپنے کمرے میں بات کر سکتا تھا۔ کیا حرج ہے اگر ہم نہر کے کنارے بیٹھ کے بات کر لیں۔“

”اس وقت.....؟ بھری دوپہر میں جناب والا۔“

میں نے کہا۔ ”ہم کسی سایہ دار درخت کے نیچے نہر کے پانی میں پاؤں ڈال کے بیٹھ سکتے ہیں اور پلنگ مناسکتے ہیں۔ اگر کچھ کولڈ ڈرنک وغیرہ بھی لے جائیں۔“

”وہاں الو بول رہے ہوں گے جناب۔“

”بڑی اچھی بات ہے۔ وہ انسانوں کی زبان نہیں سمجھتے۔ ہمیں مکمل خلوت میسر آئے گی، چلو۔“ میں تانگے میں بیٹھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وزیر خاں کچھ اب سیٹ ہے لیکن وہ مجھ پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دے رہا ہے۔ وہ کچھ کم صم تھا اور اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں خلا میں دیکھنے لگتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ میری طرف متوجہ تھا۔ ہر بات سن رہا تھا اور ہر بات کا جواب اسی شائستگی سے دے رہا تھا تھا جو اس کے مزاج کا حصہ تھی مگر مصنوعی لگتی تھی۔

نہر کی طرف جانے والا راستہ بھی اس وقت سنسان تھا۔ ایک جگہ اینٹوں کے بچنے کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا

اور برہنہ تن افراد و عورتوں میں سانچوں سے اینٹیں بن رہے تھے۔ نہر کے کنارے والا پارک سسٹان تھا۔ کنارے پر ایک قطار میں کچھ فاصلے سے سینٹ کی بیٹھیں لگی ہوئی تھیں۔ میں ایک درخت کے سائے میں لگی بیٹھ گیا۔ تھوڑی بہت جھجک کے ساتھ دزیر خاں بھی کچھ فاصلہ رکھ کے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں۔ یہ خانم پور کی خانم کون تھی؟ کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟“

وہ کچھ سوچتا رہا۔ ”دیکھا تھا حضور۔ اسے بھی اور اس سے پہلے کا زمانہ بھی۔ جب یہ ریاست جان پور تھی۔ میں ان کا شاہی کوچبان تھا۔ یہ تاں گایا بھی انہی کے استعمال میں تھی۔ اس کی آب و تاب اور خوبصورتی تب دیکھتے آپ۔ اب تو اس کا حسن و شباب ڈھل گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تم کس قسم کی کتابی ازدو بولتے ہو؟“

”یہ دربار کی زبان تھی جناب عالی، آپ نے نظام حیدر آباد دکن کا ذکر سنا ہوگا وہاں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا حالانکہ وہ جنوبی ہندوستان کے اس علاقے میں ہے جہاں ایک طرف بمبئی ہے اور دوسری طرف مدراس۔ اسی گجراتی، تامل اور ملیالم بولنے والی آبادی کے درمیان عثمانیہ یونیورسٹی تھی جس نے اردو میں اعلیٰ تعلیم کو رائج کیا تھا۔ جان محمد کے والد خان محمد تھے۔ وہ حیدر آباد کے ایک میر کے دوست تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی چنانچہ خان محمد نے یہاں بھی اردو رائج کی۔ ہمیں درباری آداب کے ساتھ مہذب گفتگو کرنا بھی سکھایا گیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”نظام کے پاس تو سنا ہے تین سو کاریں تھیں حالانکہ اس کی کتھوی کے قصے بہت مشہور ہیں۔ پر خان محمد گھوڑا گاڑیاں کیوں بدلتے تھے؟“

پہلی بار اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

گاڑیاں ان کے پاس بھی بہت تھیں جو وہ لندن اور جرمنی سے منگواتے تھے۔ آپ نے پرانے محلات نہیں دیکھے۔ وہاں پیچھے وسیع باغ تھا۔ باغ کے ایک کنارے پر قطار میں گیراج تھے۔ دوسرے کنارے پر اصطبل تھا۔ شاہی بھی خاص خاص مواقع پر استعمال ہوتی تھی۔ وہ اس پر نماز عید کے لیے جاتے تھے۔ تاجپوشی کی سالگرہ پر نکلتے تھے اور کبھی کبھی ہواخوری کے لیے یہاں بھی آتے تھے بعد میں خانم نے یہ بھی مجھے بخش دی۔“

”ریاست خان محمد کوئی تھی۔ اس نے ریاست کا نام

اپنے بیٹے جان محمد کے نام پر کیوں رکھا؟“

”اس لیے کہ خانیپور کی ایک ریاست پہلے سے موجود تھی۔ انگریز کشن نے اس پر اعتراض کر دیا تھا۔ خان محمد نے دلیل دی تھی کہ وہ سندھ میں ہے، یہ بلوچستان میں۔ سندھ اس زمانے میں صوبہ، بمبئی کا حصہ تھا۔ ایک ریاست بمبئی صوبے میں دوسری یہاں۔ خان محمد نے حیدر آباد کی مثال دی تھی اور میر پور کی۔ ایک ہی نام کے دو شہر ہیں لیکن کشن نے نہیں مانا اور نام خانیپور تجویز کیا۔ یہ کہا کہ تمہارے بعد یہاں ہی حاکم ہوگا۔ خان محمد کیسے نہ مانتا۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس بات میں کتنی صداقت ہے مگر کہتے ہیں کہ بعد میں اس نے کشن کو مروا دیا۔“

”قل کر ادا کیا..... کیسے؟“

”پرانے لوگوں سے میں نے ایک ہی بات سنی ہے۔ خان محمد نے کسی سپاہی کو کشن کے سامنے تاجپوشی کے موقع پر تماشا دکھانے بلوایا۔ سپاہی نے ایک سانپ کو باری طرح نواب کے گلے میں ڈالا۔ دوسرا اپنے گلے سے اتار کر کشن کے گلے میں ڈال دیا۔ مشہور یہ ہے کہ نواب نے وہ سانپ بدلوادیا تھا۔ اس نے کشن کے گلے پر کاٹا۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ انگریزوں نے سپاہی کو گولی سے اڑوا دیا۔ اس کی لاش ایک درخت سے تین دن لٹکی رہی۔ نواب خان محمد نے اس کے بیوی بچوں کو بھی کچھ دے دلا کے کہیں بھیج دیا تھا۔ جان محمد اس وقت تیس سال کا تھا اور ولایت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کشن کی موت کے بعد یہاں ایک انگریز جان رائس کو ریڈیڈنٹ مقرر کر دیا گیا تھا۔ وہ سخت متعصب اور سفاک شخص تھا۔ ایک رات خان محمد اپنی خواب گاہ میں سویا اور صبح مردہ پایا گیا۔ وہیں ایک سانپ بھی مرا پڑا تھا۔ اس موت نے کئی سوالات کو جنم دیا۔ ایک یہ کہ اس رات خان محمد اکیلا کیوں تھا، اس کی چار بیویوں اور چار حرم کی کنیزوں میں سے کوئی اس کے ساتھ کیوں نہیں تھی..... تھی تو اسے کچھ پتا کیوں نہیں چلا اور وہ خان محمد کی موت کے بعد خاموشی سے اٹھ کر کیسے چلی گئی؟ سانپ وہاں کیسے پہنچا اور اسے کس نے مارا؟ عام خیال یہ تھا کہ اس قتل میں نواب کی کسی بیوی یا کنیز کو شریک کیا گیا تھا۔ سانپ تو وہاں محض یہ مشہور کرنے کے لیے ڈالا گیا تھا کہ یہ انتقامی کارروائی اس سپاہی کے قبیلے یا خاندان کی ہے جس کی لاش تین دن تک درخت سے لٹکی رہی تھی اور گدھوں نے اسے نوچ کھایا تھا۔

ثابت کیا ہوتا۔ جان محمد کو ولایت سے بلا کے باپ کی

جگہ نواب بنا دیا گیا۔ وہ بہت ذہین اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ نیک بھی تھا مگر اس کی ماں نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ اس نے جان رائس سے مل کر خان محمد کی دوسری سب بیویوں اور کنیزوں کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد ماں نے بیٹے کو کنٹرول کیا کہ کہیں وہ بھی باپ کی طرح عیاش اور بے مہار نہ ہو جائے۔ یہ اس کی ترتیب کا نتیجہ تھا کہ جان محمد نے سب کو خوش رکھا۔ رعایا کو بھی، انگریزوں کو بھی اور ماں کے ساتھ ہم سب کو بھی۔

ماں نے اپنی زندگی میں ہی اس کی شادی حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی نسیم زہرہ سے کر دی تھی۔ نواب خان محمد اور میر نکلاس فیلو اور دوست بھی تھے۔ غالباً یہی تعلق کام آیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ انتہائی مہذب اور سلیقے والی عورت تھی مگر بد قسمتی یہ کہ وہ جان محمد کو ایک بھی وارث نہ دے سکی۔ اس کے بعد حالات خراب ہو گئے۔ ایک تو جان محمد کی ماں نے اس انگریز جان رائس سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ لندن چلی گئی۔ اس نے مزید نرابی یہ کہ جان محمد کو لندن بلایا اور وہاں اس کی دوسری شادی خانم سے کرادی۔“

میں نے کہا۔ ”خانم کا پورا نام کیا تھا؟“

”خانم دُر شہوار۔ حقیقت کا مجھے علم نہیں سنا ہے کہ وہ خود کو جائز یا ناجائز طور پر ایران کے شاہی خاندان کی اولاد کہتی تھی اور لندن میں رہتی تھی۔ نسیم زہرہ بھی کم خوبصورت نہ تھی مگر جناب ان آنکھوں نے خانم جیسا حسن نہ دیکھا۔ نواب جان محمد کی ماں کی زمانہ ساز طبیعت نے کچھ دیکھ کر ہی یہ حسن اپنایا تھا۔ اس نے جان محمد کو تباہ کر دیا۔ اس کے باپ نے چار شادیاں تو شرع کی حد میں رہ کر کیں۔ مجال تھی کہ اس کی کوئی بیوی چوں بھی کر سکے۔ خانم نے عقد کے لیے پہلی شرط ہی یہ رکھی کہ نواب جان محمد اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے اور تاحیات دوسری شادی نہ کرنے کا حلف نامہ دے ورنہ خانم کی از خود طلاق ہو جائے گی اور وہ لندن لوٹ جائے گی۔

جان محمد کو اس کے حسن کے تابکاری اور شباب کی تباہ کاری نے عقل و ہوش سے اتنا بے گانہ کر دیا تھا کہ اس نے اسٹامپ پیپر پر لکھ دیا۔ معلوم نہیں اس کی قانونی حیثیت کیا ہوگی۔ قصہ مختصر نسیم زہرہ قتل سے نکال دی گئی اور واپس حیدر آباد دکن چلی گئی۔ ریاست پر خانم کی حکومت قائم ہو گئی۔“

میں نے کہا۔ ”ریاست کا نام بھی خانم پور ہو گیا۔“

”یہ اتنا آسان نہ تھا جناب والا۔ سابق ریڈیڈنٹ جان رائس نے سفارش کی تو کشن نے یہ تجویز اپنی رضامندی کے ساتھ اوپر ارسال کر دی تھی کہ ریاست کا نام سرکاری طور پر خانم پور کر دیا جائے اور دلیل کیا دی گئی حضور؟ ایک نقطہ اوپر نیچے لگ جانے سے کنفیوزن پیدا ہوگا خانیپور بن جاتا ہے خانیپور ادھر کی ڈاک ادھر چلی جاتی ہے حالانکہ ایسا بھی نہیں ہوا تھا مگر تجویز رد نہیں کی گئی۔

اس زمانے میں بہت سے پرانے نمک خوار جو نواب کے قتل سے تھے اور تجربہ کار اور تیلے رخصت لے گئے۔ میرے جیسے کم حیثیت خادم رہ گئے جو یس سر اور یس میڈم کے سوا کچھ بول ہی نہیں سکتے تھے۔ نئے لوگوں میں یوسف حسن نامی ایک شخص نے اپنی ذہانت اور چرب زبانی سے بہت اثر رسوخ حاصل کر لیا۔ وہ دیکھنے میں بھی یوسف ثانی تھا۔ مردانہ حسن اور وجاہت کا شاہکار۔ خانم کے کہنے پر اسے دیوان مقرر کر دیا گیا یعنی وزیر اعظم اور خانم کے بعد وہ ریاست میں دوسری سب سے زیادہ با اختیار شخصیت بن گیا جی ہاں..... مگر وہ نواب جان محمد سے بھی زیادہ اختیارات کا حامل ہو گیا تھا۔ نواب کو خانم نے دیوانہ کر رکھا تھا۔ اسے خانم کے عشق کی وارفتگی سے فرصت ملتی تو شراب اسے ہوش و حواس سے بیگانا کرنے کے لیے موجود تھی۔ یہ بے ہوشی کی لت بھی خانم کا تھوڑی سی۔ پہلے وہ پیتا تھا تو وقت اور موقع دیکھ کر اور اعتدال کی حد سے آگے نہیں جاتا تھا۔ خانم نے ولایتی شراب اور اپنے شباب سے اسے دیوانہ اور ہوش سے بیگانا کر دیا اور تمام امور مملکت اپنے ہاتھ میں لے لیے یا یوسف کو عطا کر دیے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے حضور کہ یوسف پر خانم کی یہ عنایت بے وجہ اور بے سبب نہ تھی۔ ان کے مراسم کو اگر کوئی نہیں سمجھ رہا تھا اور نہیں دیکھ رہا تھا تو وہ خود نواب جان محمد تھا۔ خانم اپنی کچھ دار باتوں اور دیوانہ کرنے والی اداؤں سے اس کے دماغ کو ماؤف رکھتی تھی اور اس کی آنکھوں پر بے خبری کا پردہ ڈالے رکھتی تھی۔ اس کے آس پاس کون تھا جو اسے بتاتا یا سمجھاتا کہ آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

یہ فرض آپ کے اس خادم نے پورا کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اس طرح کہ خانم کو خشک بھی نہ ہو ورنہ میری اوقات ہی کیا۔ جیسے سب گئے میں بھی جاتا۔ بلکہ میں تو دنیا سے جاتا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ نواب جان محمد نے میرے خلوص اور نیت پر خشک نہیں کیا اور اس کی قدر کی۔ انہیں زبان خلق کی تو پروا نہ تھی جو ان کی بے خبری کو بے غیرتی کہہ رہی تھی۔ ہنس رہی تھی اور ان کی بے خبری کو بے غیرتی کہہ رہی تھی۔

کثرت شراب نوشی نے ان کی صحت کو تباہ کر دیا۔ ان کا علاج ممکن تھا اگر انہیں شراب سے دور رکھا جاتا۔ اوپر سے علاج ایک ایسے شخص نے کیا جس کے ڈاکٹر ہونے پر بھی مجھے شک تھا لیکن اسے شاہی معالج کا درجہ حاصل تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ شراب کے ساتھ جان محمد کو زہر بھی دیا جاتا رہا۔ اس کی ماں زندہ ہوتی تو معاملات پر نظر رکھتی۔ لندن میں ہونے کے باوجود جان محمد سے لائق نہ رہتی اور واپس آ کے حالات کو سنہال سکتی تھی۔ اس نے جس مقصد کے لیے خانم کا انتخاب کیا تھا یعنی جان محمد کی نسل کو آگے چلانا وہ پورا نہ ہوا اور ایک دن جان محمد تیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔

اس زمانے میں یعنی جان محمد کی وفات سے پہلے ہی یہ منظوری آگئی تھی کہ ریاست کو خانم پور کا سرکاری نام دے دیا جائے۔ جان محمد بے بس تھا۔ اس کی محبوبہ خانم نے اسے اپنے عشق کا ہی نہیں خواب گاہ کا بھی اسپر بنا رکھا تھا۔

اس وقت تک خانم کو خبر مل چکی تھی کہ پاکستان بنے گا تو اس کی ریاست خود بخود اس میں ضم ہو جائے گی۔ خانم کو خود انگریز حاکموں نے جان محمد کی جگہ ریاست کا حکمران تسلیم کر لیا تھا۔ اس میں شک کی بات ہی نہیں جناب والا۔ یہ بھی نئے ریڈیٹنٹ کی وجہ سے ممکن ہوا جس کو خانم نے اپنے حسن و شباب سے پوری طرح فیضیاب کیا تھا۔ وہ ایسی ہی عورت تھی جناب جو کسی مرد سے کچھ بھی کرا سکتی تھی۔ مجھے شک ہے کہ اس نے یہ سب یوسف کے کہنے پر کیا، وہ آدمی غیرت و حمیت کا مطلب ہی نہیں جانتا تھا۔ اور خانم کو اس نے پوری طرح اپنے بس میں کر رکھا تھا۔

انگریز کے جانے کے بعد خانم نے یوسف کے مشورے پر بہت سے لوگوں سے حمایت حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیا۔ مگر ایک تو سب خانم کی ریشہ دوانی سے واقف تھے، دوسرے اس کی مدد بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے خانم نے یوسف کے مشورے پر اپنے اثاثے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے اس نے گاڑیوں کو ٹھکانے لگایا۔ ان میں کچھ نئی اور بہت عالی شان تھیں، کچھ پرانی ہو کے زیادہ قیمتی ہو گئی تھیں کیونکہ وہ خان محمد نے خصوصی آرڈر پر بنوائی تھیں دیگر والیان ریاست اور رئیس ان کے قدرداں تھے۔ خانم کے غیر قانونی شوہر کی حیثیت رکھنے والے یوسف کے ایجنٹ جمیل الدین نے سارے سودے بڑی ہوشیاری سے کیے۔ گاڑی کے مالک کا نام بالکل آخر میں سودا ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا تھا۔ اس سے پہلے یہی کہ ایک والی

ریاست کی شوق سے جمع کی ہوئی گاڑیاں ہیں جن کی ناز برداری انہوں نے اپنی بیویوں سے بڑھ کر کی مگر انڈیا ہے کہ ریاست فہم ہوگی تو اس کے اثاثے بھی سرکاری تحویل میں چلے جائیں گے۔

گاڑیوں کے بعد گھوڑوں کی باری آئی وہ بڑی اصل نسل کے جانور تھے۔ پھر محل کے ظروف جن میں کچھ سونے چاندی کے عام استعمال میں آنے والے برتن اور باقی آرائشی اشیاء۔ فالوس، گلدان، شمع دان وغیرہ..... ان کے علاوہ روغنی تصاویر اور قالین تھے۔ تحائف تھے اور وہ تمام چیزیں جن سے محل کی آرائش تھی۔ یہ جمیل الدین ویسے تو یوسف کا سیکریٹری تھا مگر ہر معاملے میں اس کا فرنٹ مین..... دست راست سمجھ لیں، وہی سارے کام کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں ابھی تم نے یوسف کو خانم کا غیر قانونی شوہر کہا۔ ان کی شادی کی راہ میں کیا چیز مانع تھی؟“

”حضور والا۔ میری کوتاہی محاف فرمائیں۔ میں بتانا بھول گیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جو خانم نے عدت کے نام پر دنیا سے الگ رہ کے گزارا اور مملکت ویسے بھی خانم کے نام پر یوسف چلاتا تھا۔ خانم کے پاس اتنی عقل ضرور تھی کہ وہ مالی معاملات اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی خواہ وہ خود یوسف کے ہاتھوں میں کھلتی تھی۔ اس ناچیز کو کیسے علم ہو سکتا تھا کہ تمام اثاثے کی فروخت کرنے سے حاصل ہونے والی رقم خانم نے اپنے کس اکاؤنٹ میں رکھی اور وہ اکاؤنٹ کس بینک میں اور کس ملک میں تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ دیوانگی کا یہ ٹھیل کھیلنے والے لیلیٰ مجنوں بکار خویش بہت ہوشیار تھے۔

یہ عشق کیا تھا، ہوس تھی۔ خانم کے لیے اس کا پٹا ناز کر دینے والا حسن و شباب وہ اسلحہ تھا جس سے وہ کسی کو بھی تسخیر کرنے پر قادر تھی۔ حسین عورت کے پاس حسن کے ساتھ ذہانت بھی ہوتی وہ دودھاری تلوار بن جاتی ہے۔“

میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”یعنی یہ سب آپ کے حافظے میں محفوظ ہے؟ آپ خانم پور کی تاریخ کیوں نہیں لکھتے؟“

اس نے میرا سوال سنا اور گول کر دیا۔ ”اب اتنی فرصت کہاں حضور۔ زندگی کے چار دن پورے ہوئے۔ کیا اب ہم چلیں۔“

میں نے گھڑی دیکھی۔ ”تمہیں کہیں پہنچنا ہے؟“

”یہ ناچیز آپ کے حکم کا غلام ہے۔ حضور کے بلج کا وقت گزر چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم میری فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ خانم کا

کیا بنا۔ میں نے سنا ہے وہ روپوش ہو گئی۔ فرضی نام سے باہر نکل گئی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قتل ہو گئی۔“

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ حضور کافی لوگوں سے معلومات لیتے رہے ہیں۔ حقیقت کا کسی کو بھی علم نہیں۔ قتل والی بات بے بنیاد ہے۔ وہ خاموشی سے نکل گئی۔ لیلیٰ مجنوں دونوں ہی ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے۔ یہاں یوسف کی عقل ایک عورت کی چالاکی سے مار کھا گئی۔ اس نے یوسف کو اس خوش گمانی میں مبتلا رکھا کہ وہ یہاں سے جا کے شادی کر لیں گے۔ وہ لندن سے آئی تھی اس نے لندن ہی کا کہا ہوگا مگر کیا معلوم وہ کہیں اور چلی گئی ہو۔“

”آخر اتنی رازداری سے وہ محل سے کیسے نکلے؟“

وہ نظریے کیے زمین کو دیکھتا رہا اور کوئی جواب نہیں دیا؟

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں۔ اس نے تمہیں بھی استعمال کیا؟ شاہی کبھی کے کو چبان تم تھے۔ آخری بار اسے تم ہی لے گئے ہو گے؟“

وہ مجھ سے نظریں چراتا رہا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میری بات کا کیا جواب دے۔ سچ بتا دے جس کی رازداری کا اس نے مرتے دم تک عہد دیا ہوگا یا جھوٹ بول کے اپنی جان چھڑائے؟ کیا جھوٹ چل جائے گا؟

میں نے کہا۔ ”وزیر خاں۔ تمہاری یہ خاموشی اور تمہارا تذبذب کسی اقرار سے کم نہیں۔ میں اس طریقے سے تو اعتراف کرا نہیں سکتا جیسے پولیس ہر تھانے میں اعتراف جرم کراتی ہے۔“

”حضور والا۔ کیا عہد کر کے اس پر قائم رہنا نہیں چاہیے؟“

”بالکل رہنا چاہیے۔ آدمی کے ضمیر کی اصل آزمائش یہی ہے لیکن وزیر خاں! ہر عہد کی میعاد ہوتی ہے۔ ہر راز کی ایک سرحد ہوتی ہے، وقت کی اس حد کے بعد افشائے راز سے کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو تو سچ بولنے میں کوئی حرج نہیں، کوئی گناہ نہیں۔“

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ بڑبڑایا۔

میں نے اس پر مزید دلائل کا وزن ڈالا۔ ”خفیہ سرکاری دستاویزات کی مثال لو۔ قبل از وقت کسی راز کے افشا ہونے سے ملک و قوم کے مفاد یا سلامتی خطرے میں پڑ سکتی ہے چنانچہ وہ اعلیٰ سرکاری شخصیات بھی جو یہ راز جانتی ہیں، ایک خاص وقت تک ان کے بارے میں کوئی لفظ نہ بتانے کی پابند رہتی ہیں مگر ایک مدت گزارنے کے بعد کچھ خفیہ نہیں رہتا مثلاً امریکا میں تیس سال بعد ہر دستاویز شائع

کی جاسکتی ہے۔“

وہ اچانک میری بحث ختم ہوتے ہی بولا۔ ”میرے سوا خانم اور کس پر بھروسہ کر سکتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بلا کے قرآن میرے ہاتھ میں دیا اور کہا وزیر خاں قسم خدا کے پاک کلام کی اور اس نمک کی جو تم نے یہاں کھایا ہے۔ تم کو رازداری سے میرا ایک کام کرنا ہے۔ کیا بعد میں تم اس کی حفاظت کر سکو گے؟“

میں نے کہا۔ ”میں نہ کر پایا تو مجھ پر خدائی مار۔ قبر مجھ پر تنگ ہو اور محشر میں مجھے شفاعت میسر نہ آئے۔ آپ حکم کریں۔ انہوں نے کہا کہ آج رات بھی تیار رکھنا۔ محل سے باہر انہوں نے ایک جگہ بتائی۔ وہاں کوئی نہ مجھے دیکھ سکتا تھا اور نہ بھی کو۔ اندھیرا ہونے سے نصف شب تک میں دم سادھے کھڑا رہا، مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ محل میں بہت کچھ پہلے بھی ہو چکا تھا جس کا میں چشم دید گواہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی یقین تھا کہ اصل چشم دید گواہ تم ہی ہو۔“

”پھر حضور یہ بھی جانتے ہوں گے کہ سب سے زیادہ خطرے میں انہی کی زندگی ہوتی ہے۔“

”جانتا ہوں اگر اب بھی ایسا ہے تو تمہاری مرضی۔“

وہ سوچ کے بولا۔ ”خطرہ اب کیا ہوگا جب موت کا فرشتہ ہر وقت یاد دلاتا رہتا ہے کہ بس وزیر خاں بہت جی لیے۔ لیکن زبان رکتی ہے عہد کو توڑتے ہوئے۔ بے شک یہ ناچیز ہی خانم کو رات ڈوبے لے کر گیا تھا۔ وہ اندھیری رات تھی۔ خانم سیاہ برقعے میں نمودار ہوئی اور کبھی میں بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا سوائے ایک ہینڈ بیگ کے پھر اس نے کہا کہ چلو۔“

”سب کچھ وہ پہلے ہی نکال چکی تھی تو سامان ساتھ کیا لاتی۔ بس خود کو نکالتا تھا۔ خیر تم اسے کہاں لے گئے؟“

”اس کے شوہر کا ایک خفیہ ٹھکانا تھا جو اس سے پہلے شوہر کے والد بھی استعمال کرتے رہے تھے اور اس ناچیز کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ جس روز کسی کو اس ٹھکانے کا علم ہو اسب سے پہلے میری گردن قلم ہوگی۔ میں اصل ٹھکانے تک کبھی نہیں گیا۔ نہر کی طرف ایک گیراج تھا۔ میں نواب خان محمد اور پھر جان محمد کو گیراج تک لے جاتا تھا وہاں سے وہ ایک گاڑی میں آگے جاتے تھے کیونکہ شاہی کبھی پہچانی جاتی تو.....“

”پھر تمہیں اس ٹھکانے کا کیسے علم ہوا؟“

”اس دن بھی میں نے خانم کے ساتھ گیراج کا رخ

کیا۔ خانم کو وہاں اتار کے میں واپس لوٹ جاتا مگر خانم نے کہا۔ ”وزیر خاں بھی کو یہاں چھوڑو۔ گاڑی نکالو۔“

”تم شوفر بھی ہو؟“ میں نے کہا۔

”آپ کی دعا سے حضور۔ خانم نے مجھے ایک پستول دیا اور کہا کہ میں گیراج میں جو سامان ہے اسے اندر ہی لوڈ کروں، اب وہ ایسی صابن دانی گاڑی نہیں تھی جیسی کہ آج کل کار کھلاتی ہیں۔ جناب نے پرانی امریکن گاڑیاں تو دیکھی ہوں گی۔“

”ہاں شیور نے بیٹے ڈانچ اسٹری بیکرت ہوک۔“

”وہ لیڈی لک تھی جناب، پورا جہاز! آٹھ سلنڈر انجن والی۔ ڈکی اتنی بڑی کہ آپ بیڈروم بنا لیں، بستر بچھا کے سو جائیں۔ وہاں کچھ سوٹ کپڑے رکھے تھے۔ وہ سب میں نے ڈکی میں رکھے۔ چھوٹے بیگ پیچھے والی سیٹ پر اور گاڑی نکالی۔ خانم میرے ساتھ بیٹھ گئی۔“

خاموشی کا ایک وقفہ آیا تو میں نے کہا۔ ”پھر؟“

”پھر کیا حضور والا۔ میں نے خانم کو وہاں چھوڑ دیا اور سارا سامان اتار کے اندر پہنچایا اور واپس آ گیا۔ خانم نے کہا کہ یہ پستول تم رکھو، یہ گاڑی بھی اور بھی بھی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا کہ خانم یہ کار اور پستول میرے پاس سے برآمد ہوئے تو پولیس مجھے چوک میں پھانسی لگائے گی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تمہاری ملکیت ہوں گے اور اس رات میں دل سے خانم کی فہم و فراست کا قائل ہوا۔ اس نے ضروری دستاویزات پہلے ہی تیار کرالی تھیں۔ کار کی میرے نام منتقلی کا فارم جس پر صرف میرے دستخط ہونا باقی تھے۔ ریوالور کا لائسنس پہلے ہی میرے نام ہو گیا تھا۔ ابھی خانم نے میری خدمت گزاری کے انعام میں مجھے بخش دی تھی۔ میں نے کار کی منتقلی کے کاغذات ان کے سامنے وہیں پھاڑ کے پھینک دیے تھے۔ ابھی میں چلا رہا ہوں۔“

”اوہ وہ پستول؟“

”وہ..... وہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہاں سے خانم کہاں گئی؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جناب والا یہ مجھے معلوم ہوتا تب بھی میں نہیں بتاتا خواہ آپ مجھے چکی میں پیس دیتے۔ میں نے ان کو پھر نہیں دیکھا اور میں جانتا تھا کہ ایسا ہوگا۔ واپسی پر میں نے نہر کے کنارے سے بھی لی اور محل میں لوٹ آیا۔ ابھی رات کو ہی نہر کے کنارے گئی اور تمام رات موجود رہی چنانچہ کسی نے دیکھا بھی ہوگا تو شک کیسے کرتا۔ صبح یوسف نے محل کے ہر ملازم کی کھال ادھیڑ دی، ہر

ایک سے پوچھا کہ خانم کہاں ہے؟ کسی کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ آخر میں میری باری آئی۔ میں نے کہا کہ مجھے جہاں میں کچھ عرض کرتا ہے۔ یوسف نے محل کے سارے ملازموں کو برطرف کیا اور انہیں ایک گھنٹے میں بیوی بچوں سمیت محل چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ وہ سب جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے بھاگے۔ یوسف غصے اور جنون میں بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے کمرے میں لے جا کے کہا کہ خانم کو تم لے گئے تھے؟ صبح بتاؤ گے تو جاں بخشی ہوگی ورنہ یہیں شوٹ کر دوں گا۔ پستول شاید ہوگا اس کے پاس مگر پستول میں نکال لوں گا، ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس ریوالور پر سائلنسر میں نے خود لگایا اور اس سے پہلے کہ یوسف حرکت کرتا، میں نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔ میرا نشانہ بہت اچھا تھا جناب والا اب تو رعشے سے بازو کانپتا ہے۔“

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ ”یعنی یہ بات غلط ہے کہ یوسف بعد میں روپوش ہو چکا تھا، خانم کا قتل ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ دونوں باہر نکل گئے تھے۔“

”حقیقت کا علم آج تک اللہ کے سوا صرف مجھے تھا۔ آج میں نے آپ کو بھی بتا دیا ہے۔ خانم کہاں گئی، کب گئی اور کیسے گئی۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے معلوم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یوسف کی لاش کو میں نے رات کے وقت محل کے ایک ویران گوشے میں دفن کر کے اور اس پر برگد کا ایک درخت لگا دیا۔ برگد بہت پھیلتا ہے اور اس کی عمر سیکڑوں سال ہوتی ہے۔ میں آپ کو وہ درخت دکھا سکتا ہوں۔“

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس کے بعد میں نے پوچھا۔ ”وزیر خاں، کیا تم لکھنا پڑھنا جانتے ہو؟“

”کسی باقاعدہ اسکول میں تو میں نے تعلیم حاصل نہیں کی جناب والا لیکن گلستان بوستان بچپن میں پڑھ لی تھیں۔“

”آج جتنا تم نے مجھے بتایا۔ وہ تھا جو تمہارے دماغ میں محفوظ رہا۔ یہ ایک عہد کی تاریخ ہے کیا تم نے کہیں تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ لکھا تھا۔ کوئی ڈائری جس میں روز کے واقعات ہوں، دن اور تاریخ کے ساتھ۔ تمہیں سب معلوم ہے۔“

”جو معلوم تھیں وہ میں نے حضور کو بتا دیا۔“

میں نے کہا۔ ”اس سے زیادہ تمہارے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں تو چلو، واپس چلتے ہیں۔“

اب تک وہ ہاتھوں کو سینے پر باندھے مودب بیٹھا

تھا۔ جب وہ کھڑا ہوا تو بلا ارادہ میری نظر اس کے کوٹ پر گئی جہاں پہلے روز میں نے تین چمکتے ہوئے جین دیکھے تھے وہاں اب صرف ایک باقی تھا۔ ایک غائب ہوا تو میں نے نوٹ کر لیا۔ اب میں نے دوسرے کی جگہ نکلے ہوئے دھاگوں کو دیکھا۔ جین ٹوٹا نہیں تھا توڑا گیا تھا، کسی نے اسے نوچ لیا تھا۔ میں نے تیسرے جین کو چھو کر غور سے دیکھا۔ نہ وہ پتیل تھا نہ پلاسٹک۔ وہ خالص سونے سے بنا ہوا تھا۔ میرے تجسس نے وزیر خاں کو پریشان کر دیا تھا مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

وزیر خاں سے گفتگو کے دوران میں نے ایک صحافی کی چھٹی حس کا بھرپور استعمال کیا جس میں اس کی پیشہ ورانہ زندگی کا سارا تجربہ شامل ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کی نفسیات کو، ان کی زبان، ان کے لہجے الفاظ اور چہرے کے تاثرات سے سمجھنے اور کسی بھی سوال کے جواب کو پرکھنے کی صلاحیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ وزیر خاں نے بیشتر جواب درست دیے تھے۔ معلوم نہیں کیوں یہ سب بتانے کے لیے اس کی بے چینی میری اس خواہش سے زیادہ تھی کہ میں سب جان لوں۔ جہاں اس نے جھوٹ بولا تھا مجھے پتا چل گیا تھا۔ ڈائری کے بارے میں مجھے پورا یقین تھا کہ اس نے تمام واقعات کو اتنی تفصیل اور خاموشی سے ریکارڈ کیا ہوگا جیسے کسی نامعلوم جگہ پر لگا نظر نہ آنے والا کیمرا سب دیکھتا ہے اور محفوظ کرتا جاتا ہے۔ خانم کے بارے میں خود میں تذبذب کا شکار تھا کہ اس نے جھوٹ بولا یا سچ۔ یہ ہو سکتا تھا کہ خانم کی منزل کا اسے علم ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ خانم نے کسی کو بھی کچھ نہ بتایا ہو۔

ہوٹل میں پہنچنے کے میں نے وزیر خاں سے کہا کہ وہ جاے تو کھانا میرے ساتھ ہی کھالے یا ہال میں بیٹھ جائے لیکن اس نے بھی میں بیٹھ کے انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ کھانے کا وقت گزرے دیر ہو چکی تھی۔ میں نے خود اپنے لیے چائے کے ساتھ سینڈویچ منگوائے اور وزیر خاں کے لیے کھانا بھیجے کا آرڈر دیا۔ سوکا ایک نوٹ میں وزیر خاں کو دے چکا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے مالک اور منیجر کو میں نے پانچ سو کا نوٹ دے دیا۔ یہ اس چھوٹے سے قصبے کا سب سے اچھا ہوٹل تھا مگر یہاں کے ریٹ کسی بڑے شہر کے نام نہاد فور یا فائیو اسٹار ہوٹلوں کے لوٹ مار والے ریٹ سے بہت کم تھے۔

منیجر نے مجھے دو سو اسی روپے واپس کیے۔ ان میں سو کے دو نوٹ تھے۔ ایک نوٹ کے ہاتھ میں آتے ہی مجھے

چشم دید گواہ

جھٹکا سالگا۔ یہ وہی ٹیپ سے جوڑا ہوا نوٹ تھا جو میں نے سب سے پہلے وزیر خاں کو دیا تھا پھر یہ نوٹ میں نے منیجر ریکس الدین کے ہاتھ میں دیکھا تھا اور اب یہ ہوٹل پہنچ چکا تھا۔ یہ تصور کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کہ منیجر یہاں آئی ہو یا اس نے ہوٹل سے کچھ منگوا یا ہو۔

میں نے کہا۔ ”یہ نوٹ!“

منیجر نے معذرت کے ساتھ کہا۔ ”لامیں مجھے دیں، میں دوسرا دے دوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟“

میرے سوال نے اسے کچھ حیران کیا۔ ”سارے نوٹ گا ہک دیتے ہیں سر۔“

”میں اس مخصوص نوٹ کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کو کچھ یاد ہے یہ کس گا ہک نے دیا تھا۔“

”نہیں سر۔ یہ ہمارے صاحب نے دیا تھا اس کے ساتھ چار نوٹ بالکل ٹھیک تھے۔ یہ پانچ سو روپے اگلے چوبیس گھنٹوں کے لیے کمرے کا کرایہ تھا جو میں ان سے ایڈوانس لیتا ہوں۔ آج وہ ایک اور بیوی کے ساتھ موجود ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ نوٹ میں نے وزیر خاں کو دیا تھا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اسی نے وزیر خاں سے چھینا ہوگا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے بعد میں نے یہ نوٹ کسی اور کے پاس دیکھا تھا۔ غلام رسول مجھے اس گھر میں لے گیا تھا۔“

”پھر تو کوئی شک کی بات ہی نہیں رہی۔ اس نے اپنی بیوی سے چھینا ہوگا لیکن سر، یہ بات صاحب کو نہ معلوم ہو کہ آپ اس کے گھر گئے تھے۔ اس نام کے صاحب کا اصل نام تو ریکس الدین ہے سالانہ چھوڑ چھوڑ منیجر اس کی بیوی بڑی مظلوم ہے۔“

”اس کے باپ نے دیا ہوگا سر۔ آپ اتنے اپ سیٹ کیوں ہیں آخر۔ یہ تانگے والا وزیر خاں جو کھاتا ہے بیٹی کو دے آتا ہے۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”وزیر خاں..... اس کا باپ ہے؟“

”جی سر۔ اس بد معاش کا سر۔“

اس رات میں کھانے کے بعد اپنے کمرے سے نکلا تو رات کے دس بج رہے تھے جو خانم پور جیسے چھوٹے قصبے میں آدھی رات ہوتی ہے۔ ریسٹورنٹ خالی پڑا تھا اور ایک ویٹر

کمرے کی صفائی کر کے کرسیوں کو ایک دوسرے پر الٹا رکھ رہا تھا تاکہ صبح دھونے کے لیے فرش خالی ملے۔ منیجر بھی اپنے کاؤنٹر پر نہیں تھا۔ نیچے اترتے ہوئے میں نے ساتھ والے کمرے کے دروازے پر رک کر ایک غیر اخلاقی حرکت کی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا کے اندر کی آوازیں سنی تھیں۔ صاحب کے علاوہ اندر سے کسی عورت کی نشے میں ڈوبی ہوئی ہنسی سن کر مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔

خانم پور میں دو دن گزار کے مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنی ذات سے دو سو برس پیچھے چلا گیا ہوں یہاں نہ رکشا تھا اور نہ ٹیکسی۔ قصبے میں کچھ لوگوں کے پاس ذاتی گاڑیاں تھیں جو بہت کم دکھائی دیتی تھیں۔ زیادہ تر تانگے ریڑھے تھے جن میں سامان یا مقامی لوگ آتے جاتے دکھائی دیتے تھے لیکن ان میں مجال تھی کہ کوئی جوان عورت یا حسین صورت دکھائی دے جائے۔ آٹھل یا پیراہن کا رنگ جھلک جائے یا کسی کی ہنسی کا ترنم سنائی دے جائے۔ کہیں ٹی وی نہیں تھا۔ گرینڈ ہوٹل کے مالک نے میرے سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ڈش ریسیور سے کیبل سروس فراہم کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ کیونکہ مقامی لوگ براہ راست موصول ہونے والی ان سنسرڈ فلموں اور بے حیائی کے ڈراموں کو ناپسند کرتے تھے جس سے عورتوں میں خود سری، عیاری کو فروغ ہو۔ موبائل فون کے سگنل بھی قریب ہی کسی کمپنی کا ٹاور نصب نہ ہونے کے باعث موصول نہیں ہوتے تھے۔ چند گھروں میں یا دفاتر میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ جیسی ایجادات ہوں تو ہوں عام لوگ انہیں فحاشی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

میں احتیاطاً شلواریں بھی ساتھ لایا تھا۔ یہاں پہننے کے بعد اندازہ تو ہو گیا کہ مقامی آبادی کا پہناوا ایسی ہے۔ اس رات میں بہ طور خاص ملیشیا رنگ کے کپڑے کی شلواریں قمیص میں ملبوس تھا جو یہاں مقبول تھا۔ ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی مگر لوگ سرشام کھانا کھا کے عشا کی نماز پڑھتے ہی سونے کے عادی تھے چنانچہ گلیوں میں اندھیرا تھا اور گھروں میں خاموشی۔ میں پیدل چلتا گیا۔

رات بارہ بجے کسی نے مجھے گلی میں نجمہ رئیس الدین کے دروازے تک جاتے اور دستک دیتے نہیں دیکھا۔ پہلی بار میں نے آہستہ سے کٹدی بجائی تھی کہ وہ جاگ رہی ہوگی تو سن لے گی ورنہ دوسری بار جگانے کے لیے شور پیدا کروں گا۔ تقریباً دس سیکنڈ کے بعد اس کی سہمی ہوئی آواز نے مجھ سے پوچھا۔ ”کون؟“

”راجا۔“ میں نے یوں کہا کہ وہ سن لے۔

مزید دس سیکنڈ کے بعد دروازہ اندر سے کھولا گیا اور میں ایک پٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا تو وہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ ”آپ اس وقت؟“

”مجھے یہی سب سے موزوں وقت لگا۔ تمہارے شو ہر نامدار گھر پر نہیں ہیں اور آج آئیں گے بھی نہیں۔“

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”وہ آج بھی میرے ساتھ والے کمرے میں رونق افروز ہیں اور آج بھی اکیلے نہیں ہیں۔“

اس کی صورت پر ایک سماہ سہا آ کے گزر گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ دوپٹے کے بغیر کھڑی ہے۔ ”آپ..... بیٹھے میں آتی ہوں۔“ اس نے بوکھلاہٹ میں کہا لیکن تب تک میں اس کے متناسب جسم کے تمام خطوط اور پر شباب بدن کے سب نشیب و فراز دیکھ چکا تھا۔ میں اس پر عاشق نہیں ہوا تھا۔ ناز آفریں کے ہوتے یہ ممکن نہیں تھا۔ بس مجھے دکھ تھا کہ ایسی باصلاحیت اور خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے صاحب ان بازاری عورتوں کے ساتھ وقت گزار رہا تھا جو خود اپنے لیے ننگ و جود تھیں۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے بہترین پرائیویٹ کار کا مالک ٹیکسی یا تانگے میں پھرے۔

میں ڈرائنگ روم کھلانے والے کمرے میں بیٹھ گیا۔ اس کا تمام فرنیچر پرانا لیکن بیش قیمت تھا اور کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت بھی لگتا ہوگا جب اس پر پالش کی جاتی ہوگی۔ قالین بھی کلاشانی تھا لیکن بہت میلا اور گھسا ہوا۔ میری توجہ ایک میز نے کھینچ لی جس پر کاغذ قلم کے ساتھ چند لکھے ہوئے صفحے موجود تھے۔ جب میں نے دستک دی تو وہ پانچویں کہانی لکھ رہی تھی۔

میرا ہاتھ ایک صفحے کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ لکھے ہوئے صفحات کے اوپر ایک پرانی چمڑے کی جلد والی کاپی یا ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ اس کے وسط میں بنے ہوئے سنہرے مولو گرام کے نقوش ماند پڑ چکے تھے مگر خانم پور اب بھی پڑھا جاتا تھا۔ یہ ریاست کی سرکاری ڈائری تھی، شاید آخری ڈائری جو برسوں پہلے چھپالی گئی ہوگی۔

ابھی میں نے اسے کھولا ہی تھا کہ وہ آگئی۔ میں نے ڈائری واپس رکھ دی۔ ”آپ اس وقت ڈائری لکھتی ہیں؟“

”اگر موقع مل جائے۔ آپ کا کیسے آنا ہوا؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے بھی موقع ملا تو فائدہ اٹھانے کی سوچھی۔“

”آپ نے رسک لیا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ ملاقات مجھے کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ آپ کا کیا ہے، کل چلے جائیں گے۔“

”آپ مجھے انکار بھی کر سکتی تھیں۔ میرے لیے دروازہ کھولنا ضروری تو نہیں تھا۔ رسک میں نے یقیناً لیا تھا لیکن کسی نے مجھے یہاں آتے نہیں دیکھا۔“

اس کے ہونٹوں کی شرمیلی مسکراہٹ اور عارض کی لالی از خود اعتراف کرتی تھی کہ اسے چوری چھپے کی یہ ملاقات اچھی لگی ہے جو صرف رومانی کہانیوں میں یا خوابوں میں ہوتی ہے۔ صحرائی بے آب و گیاہ وسعت میں تو کبھی کا پھول بھی گلاب لگتا ہے اور اس کی زندگی تپتے صحرائی ریت پر ننگے پاؤں سفر سے کم عذاب ناک نہ تھی۔

”میں ابھی چائے بنا کے لاتی ہوں تب تک آپ میرے لکھے ہوئے یہ صفحات دیکھیے۔“ وہ بل کھا کے اٹھی۔ میں نے ایک صفحہ دیکھا تھا کہ وہ چائے لے آئی۔ ایک کپ میرے سامنے رکھ کے وہ بیٹھ گئی۔ کچھ وقت خاموشی میں گزر گیا پھر میں نے پوچھا۔ ”اسٹیمپل سو رہا ہے؟“ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”چائے کیسی ہے؟“ ”اچھی ہے۔ جیسی میں پیتا ہوں۔ آپ کے والد وزیر خاں ہیں؟“

کپ اس کے ہاتھ میں کانپا۔ ”جی۔“ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

”وہ کہاں رہتے ہیں؟“

”کہاں رہتے ہیں۔“ اس نے زیر لب دہرایا۔ ”کہیں نہیں۔ ان کی بھی ہی ان کا گھر ہے، چلتا پھرتا۔ وہ آپ کے ساتھ تھے؟“

میں نے کہا۔ ”رات کو وہ سوتے کہاں ہیں۔ ان کا کھانا پینا اور دیگر ضروریات؟“

وہ اداس ہو گئی۔ ”اپنی جیسی وہ گلی کے کٹر پر کھڑی کرتے ہیں اور گھوڑی کو درخت سے باندھ کر سو جاتے ہیں۔ قریب ہی ایک وینڈ پمپ ہے۔ کھانا بازار سے کھا لیتے ہیں۔ بھی میں دے دیتی ہوں۔“

”آج تو ان کی بھی وہاں نہیں ہے۔“

”پھر آپ کیسے آئے ہیں؟“ وہ کچھ فکر مند ہو گئی۔

”پیدل۔ میں نے ان کے ساتھ آنے سے گریز کیا۔ یہ انہی کی ڈائری ہے؟“ میں نے میز کی طرف دیکھا۔ اب اعتراف کے بنا جا رہا نہیں تھا۔ ”جی، میں نے جو بھی لکھا اسی ڈائری کو دیکھ کر لکھا۔ اصل چشم دید گواہ میں ہی ہوں مگر وہ مجھ سے بھی زیادہ ہیں۔ انہوں نے سب کچھ بڑی تفصیل اور ترتیب سے لکھا ہے لیکن اور بھی بہت کچھ تھا جو لکھا نہ جا سکا؟“

”کیوں؟“

”کیا آپ وہ سب کچھ لکھ سکتے ہیں جو آپ جانتے ہیں؟“ اس نے پلٹ کر سوال کر دیا۔

مجھے اعتراف کرنا پڑا ”نہیں۔“

”وہ سب ان کے حافظے میں محفوظ ہے۔ بہت کچھ وہ مجھے بتا بھی دیتے ہیں لیکن پھر ہمارے درمیان رشتے کی دیوار آ جاتی ہے۔ باپ اپنی بیٹی سے ہر بات تو نہیں کہہ سکتا جو کسی دوست یا غیر مرد کو بتا سکتا ہے۔“

میرے لیے اشارہ کافی تھا کہ محل کے اندر خواہاگاہ کی کہانیاں اور رنگین راتوں کے افسانے میں سنا چاہوں تو وزیر خاں کی زبان سب کہہ دے گی۔

میں نے موضوع بدل دیا۔ ”ایک سوال آپ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں اگر اجازت ہو۔“

وہ تپتی سے مسکرائی۔ ”جو بات سارا زمانہ جانتا ہے وہ آپ جان بھی لیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ ایک سوال سے ہی سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ یہ جانتا چاہتے ہیں تاکہ میں نے صاحب کہلانے کے شوقین صاحب جیسے منحوس شخص کو شریک حیات کے طور پر کیوں قبول کیا؟“

میں نے پسپائی قبول کر لی۔ ”آپ میرے اندازے سے کہیں زیادہ ذہین ثابت ہو رہی ہیں۔“

وہ ہنسی۔ ”ہیں تو آپ بھی روایتی مرد۔ جو عورت کو اگر ناقص العقل نہ سمجھے تو احساس کمتری کا شکار ہونے لگتا ہے۔ آج آپ جس شخص کو ایک بدکردار شرابی اور بد معاش کے روپ میں دیکھ رہے ہیں یہ اس وقت ایسا نہیں تھا جب اس نے مجھ سے محبت کی تھی۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”اور آپ نے؟“

”میں ایک نوجوان لڑکی تھی۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی۔ جذبات اور احساس رکھنے والی۔ میں متاثر کیسے نہ ہوتی۔ وہ جوان اور پروجاہت شخصیت رکھتا تھا اور مہذب اطوار کا مالک تھا۔“

”وہ صاحب کیوں مشہور ہے؟“

”کسی ریاست کو فوج رکھنے کی اجازت تو نہیں تھی لیکن انتظام اور امن و امان برقرار رکھنے کے لیے اپنے وسائل سے ریاستی پولیس فورس رکھنے پر پابندی بھی نہیں تھی۔ یہ پولیس فورس نواب فیملی کو سیکورٹی بھی فراہم کرتی تھی۔ رئیس اسی فورس کو کمانڈ کرتا تھا اور خود کو زبردستی صاحب کہلاتا تھا۔ ریاست اور اس کی پولیس فورس باقی نہ رہی مگر وہ آج بھی خود ساختہ اور جعلی صاحب ہے۔ جب اس

چشم دید گواہ

اور میری بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ کہتی تھیں کامیابی فقط آرزو کا نام ہے۔ جو چاہا ہوا سے حاصل کر لو ورنہ مت چاہو۔ چنانچہ میں نے صاحب کو حاصل کر لیا۔“

”آپ کی خواہش پروا زاتی ہی تھی۔“

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ ”اسے آف دی ریکارڈ رکھیں اگر آپ باخیر اور ایماندار ہیں تو اسے شائع نہیں کریں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

”میں صاحب کو ایک میز بھی کے طور پر استعمال کرنا چاہتی تھی کیونکہ میں خود کو کسی طرح بھی خانم سے کم تر نہیں سمجھتی تھی۔ میں خوبصورت تھی اور اپنے حسن و شباب کی قوت کا اندازہ رکھتی تھی، مجھے گفتگو کا ہنر آتا تھا۔ میں اردو، فارسی کے ساتھ انگریزی میں رواں تھی۔ دراصل مقامی اور نصابی علم کی بات مختلف ہے۔ زبان سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت ایک الگ چیز ہے۔ صاحب سے شادی کے بعد مجھے موقع ملا کہ دربار کی ہر تقریب میں جاسکوں۔ میں باعزت خواتین میں شامل تھی۔ مجھے اپنی بے شرمی کا اعتراف ہے۔ وہاں میں نواب خان محمد کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی۔ میں خانم کی رقیب بن کر سامنے آتی۔ میں اس کے مقابلے میں کم عمر تھی۔ لیکن افسوس کہ وقت نے ساتھ نہ دیا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ قسمت نے خانم کو جو دیا۔ جب ریاست نہ رہی تو صاحب بھی فارغ ہو گئے۔ چاہتے تو کوئی اور کام کر لیتے مگر شان آڑے آئی۔ حکومت نے ایک وظیفہ مقرر کر دیا جو آج بھی وہی ہے۔ پہلے پانچ سو روپے پانچ ہزار کیا پچاس ہزار تھے۔ اب پانچ سو کی کیا اوقات ہے اور جب شوق ایسے ہوں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے میرا تمام زیور بیک گیا۔ پھر گھر کا وہ سامان جو کچھ قدر رکھتا تھا۔ بابا کو خدا نے میرے لیے زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ ان کی بھی چلتی تھی تو گھر چلتا تھا۔ ان کی بھی پرانی آن، بان اور شان نہیں جاتی۔ سو روپے سے کم نہیں لیتے۔ دوسرے تانکے والے ان کا سخر اڑاتے ہیں اور انہیں وزیر اعظم کہتے ہیں مگر اللہ رازق ہے۔ انہیں ہر روز سواری پہنچا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے بہت دیر ہو گئی ہے ایک کپ چائے اور پی جاسکتی ہے۔“ اس نے بات ایک دم ختم کر دی اور اٹھ کے چن کی طرف لپکی۔

میں نے محسوس کیا کہ سب کچھ کہہ کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہے اور خوش ہے کہ اس نے کسی سے سب کچھ کہہ دیا۔ اسے کوئی تو ملا جس سے وہ سب کہہ سکتی۔ اس کے اندر کا غبار یوں بھرا ہوا تھا جیسے ہر طرف سے بند چن میں دھواں بھر

نے میرا رشتہ مانگا تو کیسے ممکن تھا کہ وزیر خاں انکار کر دیتا پھر بھی اس نے مجھ سے پوچھا۔ دراصل میری ماں تو میری پیدائش کے ساتھ ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ میں اس کا دوسرا جنم ہوں۔ ہو بہو اس کی طرح ہوں۔ میں آپ کو اس کی تصویر دکھاتی ہوں۔“

اب وہ پرسکون اور پراعتقاد تھی۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کا شوہر نامدار کسی وقت نازل ہو جائے گا تو اسے جواب کی مہلت دیے بغیر فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ کاری صرف وہ سنے گی، میرا کیا ہے، کس میں اتنی ہمت ہے کہ میری طرف انگلی بھی اٹھا سکے لیکن وہ غیرت مند شوہر ایک فاحشہ کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا اور شراب کے ساتھ شربت وصل کے دہرے نشے میں دھت پڑا تھا۔

اس نے ایک بہت پرانے گرد آلود فریم کو صاف کر کے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ دس بارہ سال کی بلیک اینڈ وائٹ کلوز اپ میں بنی ہوئی تصویر تھی۔ دھندلے شیشے سے اس کے نقوش اور مدھم نظر آتے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نجمہ نہ بتاتی تو میں اسے کسی اور کی تصویر نہ سمجھتا۔

اب وہ میرے مقابل دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”بابا نے میری پرورش کی تھی۔ لوگوں کے کہنے سے انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی کہ بچی کی پرورش اکیلے کیسے کرو گے۔ یہ عورت کا کام ہے لیکن ہر بچی کی پرورش ایک ہی عورت کر سکتی ہے، اس کی اپنی ماں۔ یہ دوسری عورت بہت جلد بھاگ گئی۔ میری تعلیم کسی اسکول کالج میں نہیں ہوئی لیکن مجھے پہلے کیم زہرہ نے خود پڑھایا۔ وہ حیدر آباد کن سے آئی تھیں اور بہت شستہ اردو بولتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد خانم آئیں۔ وہ لندن میں رہی تھیں مگر فارسی بھی ان کی مادری زبان تھی۔ میں نے ان سے درخواست کی تو انہوں نے میری تعلیم کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ان کے کردار پر اپنے اپنے زاویے سے انگلی اٹھائی جاسکتی ہے لیکن وہ نور جہاں تھیں جو ہر جہانگیر پر حکومت کرتی ہے۔ حسن و شباب کے ساتھ قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت اور وژن دیا۔ زبردست منصوبہ ساز ذہن جسے آپ سازشی کہہ سکتے ہیں اور بے پناہ ہمت عطا کی تھی۔“

”تم اس سے بہت زیادہ متاثر ہو۔“

”ہاں کیونکہ چاہنے کے باوجود میں وہ نہ بن سکی۔ ظاہر ہے انہیں جو مواقع ملے وہ مجھے نہیں ملے۔ انہیں لندن میں نواب خان محمد ملا مجھے یہاں صاحب۔ ایسی عورتیں پیدا ہی حکومت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ وہ مجھے پسند کرتی تھیں

جائے۔ میرے دماغ میں ایک افسردہ کرنے والا خیال آیا کہ ناز آفریں سے عشق نہ ہوتا تو میں آج بھی نجمہ کو بھگا کے لے جاتا اور کہتا کہ اب حکومت کرو، تمہارے لیے کوئی قدر نہیں۔ سارے میدان کھلے ہیں۔

جب وہ واپس آئی تو ایک احساس جرم کی غلش پریشان کرنے لگی۔ شاید نجمہ نے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں جیسے میں قدرت کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں جو اسے فرش سے عرش تک اڑا کے لے جائے گا اور وہ ایسا کیوں نہ سوچتی۔ آخر میں ایک مرد تھا، اس کے سرکاری شوہر صاحب کی طرح جو عورت ریاست کے نواب جان محمد کو زیر و دام لانے کا عزم رکھتی تھی خانم سے مقابلے کا حوصلہ رکھتی تھی اس کے لیے میں بھی کوئی مشکل شکار نہ تھا۔ دختر مشرق کی تقدیریں کے شاخواں جاکیں بھاڑ میں۔ یہ تو اپنی اپنی ہمت اور قسمت کی بات ہے۔

ہم نے مکمل خاموشی میں چائے پی۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے۔“ مجھے لگا کہ اب بات کرنے کو کچھ نہیں رہا۔

اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا مگر اس کا چہرہ سمجھ گیا۔ ”آپ کی ہر کہانی کا معاوضہ آئندہ بھی ادا کیا جائے گا مگر اس کے لیے میں خود نہیں آسکتا۔ اگر آپ کے ماما جی کا کہیں کوئی بینک اکاؤنٹ ہے تو رقم اس میں آجائے گی۔ ورنہ میں مٹی آرڈر کردوں گا اور پوسٹ ماسٹر کو اوپر سے بقیہ جات مل جائیں گے کہ تاخیر نہ کرے۔ آپ کھل کر لکھیں۔ سب کے لیے۔“

اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ”بہت بہت شکریہ کہ آپ خود تشریف لائے۔“ اس جملے میں طنز کی کچی بھی تھی۔ شکایت بھی اور مایوسی بھی۔

میں نے دروازے کے قریب جا کے کہا۔ ”ایک بات اور۔ آپ بھی اسے آف دی ریکارڈ رکھیں۔ آپ نے میرے بارے میں جو نقشہ بنا رکھا ہے وہ خیالی ہے میں اس رسالے کا ایڈیٹر ضرور ہوں جو کثیر الاشاعت ہے اور ایک بہت بڑے سیاسی وڈیرے کی ملکیت ہے۔ اس کا اخبار، چینل سب کچھ ہے مگر وہ انتہائی درجے کا خسیس ہے۔ کیا آپ یقین کریں گی کہ مجھے تین مہینے سے تنخواہ نہیں ملی۔ یہ الگ بات ہے کہ ادھر ادھر سے میں بہت کچھ کر لیتا ہوں مجبوری میں۔ آپ کے تین ہزار وصول کرنے کے لیے مجھے اس کے سامنے اپنا استعفیٰ رکھنا پڑا جو میں ہر بات منوانے کے لیے رکھتا ہوں۔“

”سوری، آپ کی بات کاٹ رہی ہوں۔ ایسا ہے تو آپ میری طرح گزارا کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو کیا مجبوری لاحق ہے۔“

”اس مجبوری کا نام ہے عشق۔ میں مالک کی بیٹی ناز آفریں کے عشق کی مہلک بیماری میں مبتلا ہوں۔ شادی اس وقت ہوگی جب وہ مرے گا۔ میں گدھ کی طرح شاخ نشین پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوں اور بقول شاعر۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
اس کے مرتے ہی گروپ کے تمام حقوق ملکیت ناز آفریں کو منتقل ہوں گے وہ اب بھی دستاویزات میں ایم ڈی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میں بھی صرف مدیر اعلیٰ نہیں رہوں گا۔ ناز آفریں کا پکا ارادہ خواتین کا رسالہ نکالنے کا ہے جو باپ کے مرنے کے بعد ضرور پورا ہوگا، انشا اللہ۔ آپ صدق دل سے دعا کیجیے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”یہ دعا ہے یا بددعا؟“

”سورج نکلتا ہے تو تارے غائب ہو جاتے ہیں۔ کوئی آئی جی یا ڈائریکٹر جنرل اوپر چلا جاتا ہے تو نیچے دس افراد ترقی کا زینہ چڑھتے ہیں۔ میں آپ کو اس نئے رسالے کی مدیر اعلیٰ نامزد کرتا ہوں، اس وقت آپ کو یہ تنخواہ نہیں ملے گی جو اس حقیر فقیر کو ملتی ہے۔ آپ کو شاید اس سے دس گنا زیادہ مشاہرہ ملے گا۔“

اس نے چمکتی آنکھوں اور پرتمسخر لہجے میں پوچھا۔

”مالکن کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”مالکن بڑی ہوتی ہے یا مالکن کا مالک۔“ میں نے کہا۔ ”خدا حافظ! میری یہ اوپن آفر برقرار رہے گی اور جب رسالے کا آغاز ہوگا تو آپ کو بہت پہلے پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا۔

کی مدد کے لیے یہاں تک کا سفر رائیگاں نہیں گیا۔ میں نے اتنا تو کیا کہ اسے مستقبل کی ایک راہ عمل دکھا دی۔

میں اپنے خیالوں میں مگن تھا اور انسانوں سے خالی سڑک پر اندھیرے میں چلتا جا رہا تھا لیکن میں آوارہ کتوں سے غافل نہ تھا جو ایک اجنبی انسان کو اپنی طرح سرگرداں دیکھ کر غرائے ضرورت تھے۔ دو کومیں نے پتھر مار کے بھاگا دیا ورنہ وہ میری مزاج پر سی کے لیے کافی آگے بڑھ آئے تھے۔ پھر اچانک میں نے تاریکی میں وزیر خاں کو دیکھا۔

وہ سڑک سے کچھ فاصلے پر اپنی بھٹی کو دھور رہا تھا اس نے گھوڑے کو قریب ہی ایک درخت سے پاندرہ دیا تھا اور خود کسی گڑھے میں سے پانی بھر بھر کے پانی کو بھی پر ڈال رہا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ اتنی رات گئے اسے بھی کو دھونے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا اور یہ وقت اس کے آرام کا تھا۔ اس کی بیٹی اتنی مجبور تھی کہ باپ کو اپنے گھر میں سونے کے لیے جگہ تک فراہم نہیں کر سکتی تھی اور وہ گھر کے قریب ہی بھی کھڑی کر کے اس میں سو جاتا تھا مگر آج رات گھر سے دور تھا اور جاگ رہا تھا۔

قریب آ کے میں نے کہا۔ ”وزیر خاں!“

وہ اس بری طرح چونکا کہ بالٹی اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ سیدھا کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ ”حضور والا۔ آپ.....؟“ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو اس وقت؟“

”جی..... کچھ خاص نہیں جناب عالی۔ نیند نہیں آ رہی تھی..... میں نے سوچا کہ شاہی سواری کو چمکالوں۔ دن میں فرصت نہیں ملتی اور گرمی بھی ہوتی ہے۔“

”نیند کیوں نہیں آ رہی تھی وزیر خاں۔“ میں نے کہا اور جیب میں سے نارچ نکال کر اس کی روشنی میں بھی کو دیکھا۔ تیز روشنی کا دائرہ سیٹوں سے اس طرف گیا جہاں مسافر پاؤں رکھتے تھے تو مجھے مٹی گرد میں اٹے ہوئے رنگ کے بجائے سرخ دھبے سے نظر آئے۔ واضح طور پر یہ خون کے دھبے تھے اور وزیر خاں انہی کو صاف کر رہا تھا۔ وزیر خاں بت بنا کھڑا تھا اس نے اپنی دانست میں یہ کام کرنے کے لیے ایسا وقت منتخب کیا تھا جب کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہ تھا۔ اب اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کا راز افشا ہو چکا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مجھ سے کچھ چھپائے یا جھوٹ بول سکے۔

اب وہ مجرم بنا خاموش کھڑا میرے سوال کا انتظار کر رہا تھا لیکن غفلت میں کوئی قدم اٹھانے یا کوئی فیصلہ کرنے سے بہتر تھا کہ میں اس سے بعد میں بات کروں۔ میں نے نارچ

آف کر کے کہا۔ ”وزیر خاں، جب تم صفائی کے اس کام سے فارغ ہو جاؤ تو میرے پاس آ جانا ابھی فوراً نہیں صبح تک۔“ وہ کچھ نہیں بولا اور میں خاموشی سے پلٹ کر ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد میں ہوٹل کے قریب پہنچا تو مجھے خلاف معمول تاریکی اور خاموشی کے بجائے ہوٹل کے سامنے خاصی ہلچل دکھائی دی۔ سامنے والی لائٹس جل رہی تھیں۔ دروازے کے سامنے ایک پولیس وین اور ایک کار نظر آ رہی تھی۔ دو پولیس والے باہر بیڑا کھڑے تھے۔ ایک نے مجھے سیدھا اندر جاتے دیکھ کے اپنے قانونی اختیار کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ ”اوائے کدھر جاتا ہے منہ اٹھا کے۔“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ناصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرمی

C-63 فز 111 سیشن ڈسٹ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

میں نے اسے صرف گھور کے دیکھا اور جواب دیے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر ہوٹل کا مالک سراسیمہ سا کھڑا تھا۔ اس کے سامنے انسپکٹر کے عہدے کا ایک افسر بڑے طمطراق سے کرسی پر بیٹھا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ ہوٹل کا سارا ماتحت عملہ کچھ فاصلے پر ایک صف میں دست بستہ کھڑا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے اچانک کہا۔ ”لوجی وہ آگئے راجا صاحب جی۔“ اور ایک بیرے کو میرے لیے کرسی لانے کا حکم دیا۔

انسپکٹر نے فرد جرم عائد کرنے کے انداز میں پوچھا۔ ”جناب کی سواری اس وقت کہاں سے تشریف لارہی ہے؟“ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جانتے ہو مجھے؟“ میں نے اسے ایک مشتعل کرنے والا جواب دیا۔ ”یہ میں آپ کو کیوں بتاؤں کہ میں کسی کو قتل کرنے گیا تھا؟“

تھانے دار کی سب کے سامنے کرکری ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ مسکراہٹ ضبط نہ کر سکے۔ ان میں ہوٹل کا مالک بھی شامل تھا۔ تھانیدار نے بڑے چلال میں کڑک کے کہا۔ ”اوائے بول تو کہ ایک قتل کر کے فرار ہو گیا تھا کوئی گواہ بنانے کے لیے۔“

ہوٹل کے مالک نے فوراً صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ ”راجا صاحب! یہاں صاحب کو کسی نے ان کے کمرے میں قتل کر دیا ہے۔“ ”اچھا۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”ان کی جو بیگم آج ان کی خدمت میں حاضر تھیں۔ وہ کیا فرماتی ہیں؟“

”تھانیدار صاحب، یہ کراچی کے بہت نامور صحافی ہیں راجا صاحب!“

تھانیدار نے کچھ سوچ کے کہا۔ ”چلو بھی باقی سب ادھر سے دفع ہو جاؤ۔ تم سے بعد میں پوچھ گچھ ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”ایک کرسی اور لاؤ۔“ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”آپ تشریف رکھیے۔“ میں نے ہوٹل کے مالک سے کہا۔

مالک کے کچھ کہنے سے پہلے ایک ویٹر نے کرسی رکھ دی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ مالک نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور قانون کے خدائی فوجدار کے سامنے بیٹھنے کی سعادت حاصل کی۔ ”وہ عورت، اس کا نام بلیقیں عرف بلو ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔“

”اس کی قریب کی نظر اتنی کمزور ہے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی اس کے ساتھ لیٹے ہوئے بندے کو مار گیا اور اسے پتا نہیں چلا۔“

”وہ کہتی ہے میں سو گئی تھی۔ ہم نے آپ کو دیکھا مگر

آپ کمرے میں نہیں تھے۔“

”چنانچہ آپ نے فرض کر لیا کہ میں لاش کو ٹھکانے لگانے گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے صاحب کو انہی کے ریوالور سے گولی چلا کے مارا ہو گا جس سے کل انہوں نے ایک چھپکلی کا قتل کیا تھا۔“

تھانیدار نے برا سامنہ بنایا۔ ”دیکھو راجا صاحب۔ یہ بہت سنگین واردات ہے۔ آپ بہت بڑے صحافی ہو اور مہمان ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ سے پوچھ گچھ نہیں ہو سکتی۔“

ہوٹل کے مالک نے پھر دخل دیا۔ ”صاحب کو کسی نے چھری کے وار کر کے قتل کیا۔ تھانیدار صاحب کا خیال ہے کہ یہ کام ایک عورت نہیں کر سکتی۔ ویسے وہ زیر حراست ہے۔“

”سچ..... بے چاری بیوہ۔ لاش کے پاس بیٹھی خون کے آنسو بہا رہی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

تھانیدار بگڑ گیا۔ ”آپ جانتے ہو..... یہ مذاق کا ٹائم ہے۔“ میں نے ہوٹل کے مالک سے کہا۔ ”یہ چائے کا ٹائم ہے۔ تھانیدار صاحب کو بے شک ٹھنڈا پلاؤ تاکہ یہ ٹھنڈے ہوں اور ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔“

مالک نے پھر صورت حال کو سنبھالا۔ ”لاش کمرے میں نہیں ہے صرف خون ہے بیڈ پر۔“

”اور وہ خون صاحب کا ہی ہے، کسی چھپکلی کا نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ ہر بات کو مذاق میں مت لیں صحافی صاحب۔“ تھانیدار گرم ہو گیا۔ ”ہم نے ساری عمر گزاری ہے پولیس میں۔“

”کیا پولیس میں عمر گزارنے والے سب لوگ خون دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ یہ خون کس کا ہے؟“ میں نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ ”اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری طرح وہ صاحب بھی ٹپکتے ہوئے آجائیں یا آپ کا خیال یہ ہے کہ قتل کے بعد میں لاش کو اٹھا کے لے گیا اور کہیں نہر میں پھینک آیا یا کسی کھڈے میں۔“

”آخر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟“ تھانیدار نے خشکی سے کہا۔

”میں بتا دوں گا۔ پہلے آپ بتائیں کہ آپ اس پیشہ کرنے والی عورت بلیقیں عرف بلو کو اتنی رعایت کیوں دے رہے ہیں؟ اس سے پوچھ گچھ میں اتنی شرافت برتنے کی کوئی توجہ ہوگی۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے نہیں معلوم آپ کہتے ہیں کہ نہیں معلوم تو راجا سے پوچھتے ہیں، تم فکر مت کرو اور کوئی

عورت اس کی بیوی ہی کیوں نہ ہوتی۔ اب تک تھانے میں اقبال جرم کر چکی ہوتی۔ اس فن میں تو آپ ماہر ہوں گے۔“

ویر نے چائے سامنے رکھی۔ ”رعایت میں کسی کو نہیں دیتا۔ خواہ وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔“

”مگر اس بلو سے کچھ ایسے مراسم ہیں کہ آپ اس شریف عورت کی بدنامی نہیں چاہتے۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے؟“ میں نے کہا۔

تھانیدار کی ساری اکڑ فوں بوں نکل گئی تھی جیسے دھاگا کھولنے سے غبارے کی ہوا نکلتی ہے۔ ”دیکھیں راجا صاحب، آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”رائٹ میں دو دن کے لیے کسی اور کام سے آیا تھا مگر اب میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے قیام کی مدت بڑھا دوں۔ اسٹوری اچھی بن رہی ہے۔ کیوں نہ علاقہ ایس پی سے بھی بات کر لوں۔ وہ کوئی تفتیشی ٹیم بنا دے۔“

انسپکٹر نے پریشانی سے ہوٹل کے مالک کی طرف دیکھا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے راجا صاحب۔“

”ضرورت مجھے نہیں آپ کو ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا آپ نہیں چاہتے کہ اس قتل کا سراغ لگایا جائے۔ قاتل پکڑا جائے۔“

”قاتل تو پکڑا جاسکتا ہے۔ قتل کا سراغ ملے نہ ملے۔“

ہوٹل کے مالک نے تائید میں سر ہلایا۔ ”مگر اس سے فائدہ کسی کا نہیں ہو سکتا۔“ میں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ بھی سچ ہے۔ مرنے والا تو واپس آنے سے رہا۔ کون چاہے گا کہ وہ واپس آئے۔“

”کوئی نہیں۔“ ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ”وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کا نہ ہونا، ان کے ہونے سے بہتر ہے۔“

”یہ آپ لوگ کس قسم کی مزاحیہ قوالی کر رہے ہیں؟“ میں نے بے چینی سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”آدمی کو پریکٹیکل ہونا چاہیے راجا صاحب۔ جس آدمی کو رونے والا کوئی نہ ہو اس کے لیے ہم کیوں جذباتی ہوں۔ اپنا وقت خواہوہ کی بھاگ دوڑ میں ضائع کریں اور فرض کرو کسی قاتل کو پکڑ لیں تو پھر آگے کتنا وقت برباد ہوگا۔“

سیشن کورٹ کا۔ کتنا پیسا خرچ ہوگا وکیل صفائی پر؟“ اس نے تائید کے لیے ہوٹل کے مالک کو دیکھا۔

”بالکل جناب۔ اور سیشن کورٹ نے اسے بے گناہ قرار دے کر بری کر دیا کسی بھی وجہ سے۔ صفائی کے گواہ آگئے مگر استغاثہ کو گواہ نہ ملا تو سخت ساری برباد گئی۔ اس کے برعکس ہوا تو قاتل اکیلے کرے گا۔ ہائی کورٹ میں جائے گا۔

چشم دید گواہ

وقت اور پیسے کا زیاں ہی زیاں۔“

انسپکٹر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”کوئی بندہ پاگل کہتے کو یا شیطان کو مار دے تو اسے سزا دلوانے میں کتنے نقل کا ثواب ہے راجا صاحب۔ نیکی کرنے والے کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“

میں نے دباؤ کے کہا۔ ”اسٹاپ دس۔ یہ سب کیا ہے؟ جب میں آیا تو آپ لوگوں نے دوسرا ڈراما کیا تھا۔“

تھانیدار مسکراتے لگا۔ ”وہ بھی کرنا پڑتا ہے جی۔ قانون کا رعب تو رہنا چاہیے۔ بدنامی ہوگی تو کاروبار کا نقصان ان کا ہوگا..... میرا کیا ہے۔ چھ سات بندے یہاں کام کرتے ہیں۔ بیرے خانہ ماں اور صفائی کرنے والا سب کی چھتروں کی جائے تو شام تک کوئی قتل کا اعتراف کر لے گا مگر کسی غریب پر ظلم کرنا کوئی اچھی بات ہے۔“

ہوٹل کا مالک بولا۔ ”بس آپ کے تعاون کی ضرورت ہے جناب عالی۔ تھانیدار صاحب پر اسرار کشدگی کا پرچار درج کرنے پر تیار ہیں۔“

اب صبح ہوگئی تھی۔ اب صورت حال پوری طرح مجھ پر واضح ہو چکی تھی اور میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ ایک قابل ترین لائحہ عمل ہے۔ میں خود کب چاہتا تھا کہ قاتل پکڑا جائے۔

اچانک وزیر خاں دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کا کوٹ سامنے سے کھلا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں رات بھر جاگنے پر سرخ ہو رہی تھیں۔ دو سپاہی اس کو پیچھے سے دھکا دیتے تھے تو وہ خود کومند کے بل گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”آؤ بھی وزیر خاں۔ آج کا پروگرام پکا ہے نا۔“ پھر میں تھانیدار سے مخاطب ہوا۔ ”تھانیدار صاحب وزیر خاں کی شاہی بھی اس دورے میں میرے بہت کام آئی۔ گزشتہ رات تو میں نے وزیر خاں کی مدد سے خانم پور دیکھ لیا۔ آس پاس کا سارا علاقہ گھوم لیا۔ وزیر خاں تو ریاست کی چلتی پھرتی تاریخ ہے۔“

اسے دھکیل کر آگے لانے والے کانسٹیبل اپنے افسر اعلیٰ کے کسی خفیہ اشارے پر واپس چلے گئے تھے۔ وزیر خاں دم بخود کھڑا تھا۔

میں نے کہا۔ ”بھی کرسی لا دو وزیر خاں کے لیے اور ہاں بھی کیا مستعد آدمی ہے اس عمر میں بھی۔ رات بھر میرے ساتھ رہا اور دیکھ لیں صبح پھر حاضر ہو گیا بھی لے کر۔“

وزیر خاں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ”آج کا کیا پروگرام ہے حضور والا؟“

289

288

287

286

285

284

283

282

281

280

279

278

277

276

275

274

273

272

271

270

269

268

267

266

265

264

263

262

261

260

259

258

257

256

255

254

253

252

251

250

249

248

247

246

245

244

243

242

241

240

239

238

237

236

235

234

233

232

231

230

229

228

227

226

225

224

223

222

221

220

219

218

217

216

215

214

213

212

211

210

209

208

207

206

205

204

203

202

201

200

199

198

197

196

195

194

193

192

191

190

189

188

187

186

185

184

183

182

181

180

179

178

177

176

175

174

173

172

171

170

169

168

167

166

165

164

163

162

161

160

159

158

157

156

155

154

153

152

151

150

149

148

147

146

145

144

143

142

141

140

139

138

137

136

135

134

133

132

131

130

129

128

127

126

125

124

123

122

121

120

119

118

117

116

115

114

113

112

111

110

109

108

107

106

105

104

103

10

”بھئی ابھی تو میں کچھ ٹھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ آرام کر لوں پھر چلتے ہیں۔“

وہ کچھ دیر خاموش کھڑا اجازت طلب نظروں سے قانون کے حکمران کو دیکھتا رہا۔ تھانیدار نے آہستہ سے سر ہلایا۔ وزیر خاں آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کا نام مشتبہ افراد کی فہرست سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اس کے لیے ایک صحافی کا قلم استعمال ہوا تھا۔

☆☆☆

کراچی جانے والی گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ دیر کتنی ہوگی۔ وزیر خاں میرے ساتھ خانم پور کے ریلوے اسٹیشن کی ایک بیچ پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھ رہی تھیں۔

”حضور والا۔ آپ نے مجھے اور میری بیٹی کو بڑی رسوائی سے بچالیا۔ میں تو اس عمر میں مٹی بھی ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ چند سائیس باقی رہ گئی ہیں لیکن یہاں زبان خلق پر کیسے کیسے افسانے ہوتے۔ نجمہ کی بدنامی کے اور..... میرے عزیز داماد رئیس الدین کی زندگی اور موت کے۔ میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔“

میں نے اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔ ”بھول جاؤ سب۔ اب تک تم نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے ہر جگہ لکھا لیکن وزیر خاں ہر جگہ اور پورا بھلا کون لکھ سکتا ہے۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”آپ صحیح فرماتے ہیں حضور والا۔“

”تمہارے کوٹ کا تیسرا بٹن بھی ٹوٹ گیا؟“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ ”جناب والا نے تو اندازہ کر ہی لیا ہوگا، نہ وہ پلاسٹک کے تھے اور نہ وہ پتیل تھا۔ وہ خالص سونا تھا، چوبیس قیراط کا پیرانا سونا۔ ایک ایک تولے کا ایک ایک بٹن تھا اور پھر مہر بھی تھی خانم پور کی۔ ایک ایک کر کے وہ سب لے گیا، نوچ کر لے گیا۔ اپنی شراب نوشی کے لیے۔ اپنی عیاشی کے لیے اور میں نے دیا۔ انکار کیسے کرتا۔ اس کے علاوہ میرے پاس جو تھا وہ سب اسی نے مجھ سے چھینا تھا سب سے پہلے تو میری اس کوہ نور ہیرے سے زیادہ بیش قیمتی بیٹی کو جو میری آنکھوں کا نور تھی، پھر میرا گھر۔ میری ساری عمر کی کمائی، پیسا۔ سب کچھ وہی تولیتا رہا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”سب برداشت کیا میں نے لیکن حضور والا..... یہ الزام میں کیسے برداشت کرتا جو اس نے میری فرشتہ سیرت نجمہ

پر لگایا۔“ اس کی میلی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ”جو گالی اس نے مجھے دی کون باپ ہے جو اسے سن کر چپ رہتا۔“

”ایسا کیا کہا تھا اس نے؟“ میں نے ہمدردی سے سوال کیا۔

”اس نے..... اس نے..... حضور والا یہ زبان وہ الفاظ دہرانے سے قاصر ہے۔ اس نے کہا کہ یہ جو راجا ہے، کہاں کا راجا ہے سالہ۔ اتنی دور سے آیا ہے میری بیوی کے چکر میں۔ چھپ چھپا کے اس سے ملتا ہے۔ اتنا شوقین ہے تو کل رات میں نہیں آؤں گا۔ تم اسے لے جانا..... مگر دیکھو نجمہ میری بیوی ہے اب تمہاری بیٹی نہیں ہے۔ پیسا سب مجھے ملنا چاہیے۔“ وہ منہ چھپا کے سسکیوں سے روتا رہا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ سنگٹل ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ”اللہ نے چاہا تو تم سے پھر ملاقات ہو گی لیکن یہ پہلی ملاقات۔ سمجھو کہ یہ ہوئی ہی نہیں۔ خدا حافظ!“

☆☆☆

ایک بریکنگ نیوز جو ہمارے قارئین نے ہر ٹی وی چینل پر ملاحظہ کی ہوگی اور پھر اخبارات میں بھی پڑھی ہوگی۔ ”ہم نہایت افسوس سے اعلان کرتے ہیں کہ رکن صوبائی اسمبلی چودھری کرم داد ایک مختصر علالت کے بعد صرف ستر سال کی عمر میں مقامی اسپتال میں انتقال فرما گئے۔ آپ کا سیاسی کیریئر کئی عشروں پر محیط تھا۔ عوام کی خدمت کو آپ نے ہمیشہ اپنا شعار رکھا۔ ملک کے غربت زدہ عوام کا درد آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور آپ تمام عمر مستحق افراد کی مدد اس اصول کے مطابق کرتے رہے کہ ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ آپ کا تعلق ایک قدیم سیاسی خانوادے سے تھا۔ اعلیٰ تعلیم آپ نے ولایت سے حاصل کی لیکن علم کی لگن ایسی تھی کہ چند سال قبل آپ نے بی ایچ ڈی کی ڈگری امریکا کی شہرہ آفاق یونیورسٹی سے حاصل کی جس میں آپ کے مقالے کا عنوان تھا۔ ”تلاش حسن“ آپ نے کثیر الاشاعت اخبار ”تلاش حق“ کے بعد شہرہ آفاق جریدہ بھی اسی نام سے جاری کیا اور آزادی صحافت کے فروغ کے لیے نیوز چینل بھی جسے مختصراً ”ٹی کیو این“ کہا جاتا ہے۔ سیاسی مدبرین اور حکومتی ترجمان نے اسے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

آپ نے پس ماندگان میں ایک بیوہ اور صرف ایک بیٹی چھوڑی ہے۔ وزیراعظم اور صدر مملکت نے ٹیلی فون پر ان سے تعزیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ.....“

ۛ